بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذہن جو قرآن بناتا ہے

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
رُکن مجلسِ مشاورت، ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

مرتب: صائم خواجہ

تمام حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : ذہن جو قرآن بناتا ہے

مصنف : خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

سنِ اشاعت : مئی 2009ء

طابع : یمانی پرنٹرز لاہور

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
1-	پیش رس	5
2-	ذہن، جو قرآن بناتا ہے	11
3-	ترکی سے خوش کن خبروں کی آمد ایک تجزیہ اور قرآن کی آواز	25
4-	التحریر الیسیر فی اصول التفسیر	37
5-	قرآن کریم میں ربٰو کی وضاحت اور اس کی مذمت	46
6-	قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے	67
7-	اطاعتِ رسول کا قرآنی طریقہ	95
8-	اطاعتِ رسول کے بارے میں دو متضاد زاویہ فکر	110
9-	''محدث'' کا انکارِ حدیث نمبر	114
10-	امتِ مسلمہ کی نشأۃِ ثانیہ کا قرآنی طریقہ	137
11-	حضرت امام مہدی کی آمد کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے	149
12-	قرآنی حقوقِ انسانی	155
13-	روشن خیالی کے اندھیرے	170
14-	الانتقاد والسدّاد فی اصول الاجتہاد	185
15-	اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی	200
16-	موقر ماہنامہ 'محدث' کی خدمتِ عالیہ میں	218
17-	مفسرینِ کرام کی ایک لغزش کے انسانیت سوز نتائج	227
18-	مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے	236
19-	''قرآن فہمی و حدیث نبوی'' (موقر ماہنامہ ''محدث'' سے چند گذارشات)	254

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
-20	قرآن کریم کے خلاف فکری بحران کی نشاندہی	272
-21	روشن خیال معاشرہ	290
-22	ایک آیۂ کریمہ کی وضاحت	311
-23	چند غور طلب سوالات	319
-24	دین کے اجزاء اسلامی مملکت کی بنیاد ہوتے ہیں	330
-25	دین میں اطاعت کا مرجع زندہ اتھارٹی ہوتی ہے	344
-26	ایڈیٹر 'ڈیلی ٹائمز' کے نام	357
-27	حلالہ	370
-28	اسلامی نظام کے بارے میں دو اہم نکات کی وضاحت	376
-29	''محدث'' کی خدمتِ عالیہ میں	383
-30	رجم کی سزا خلاف قرآن ہے	396
-31	البحث	407
-32	آتشِ نمرود	411
-33	دین و مذہب میں قانون سازی کے فاصلے	417
-34	غیر اسلامی حکومت میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں ہو سکتی	431
-35	حضور ﷺ کے بعد حضور ﷺ کا قائم مقام کون ہے	448
-36	انتظامی امور کی اطاعت	463
-37	خالص قرآنی نظریات کی واحد تحریک	473
-38	مباہلہ۔۔دینی و مذہبی نقطۂ نظر سے	483
-39	شریعت کے نفاذ کا مطالبہ	493

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش رس

ہم مسلمانوں میں جو فکری فقدان پایا جاتا ہے' اس کا احساس مسلمانوں کو کافی عرصہ سے ہو رہا ہے' اور ہر شخص اس فکری فقدان کا نوحہ کناں ہے۔ معروف اخبار 'ڈیلی ٹائمز' میں اس موضوع پر ایک طویل اداریہ مورخہ 27/11/2008 کو طبع ہوا ہے۔ اس اداریہ کے صرف ایک پیرا گراف کا اردو ترجمہ پیش خدمت کیا جاتا ہے جو آپ کی توجہ کا متقاضی ہے۔

> ''غور وفکر کا فقدان تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے اور یہ فقدان مذہبی پیشواؤں کے فروغ پانے اور ان کے اقتدار میں آنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان کا یہ اقتدار پاکستان میں ان جہادی تنظیموں کی وجہ سے ہوا ہے' جن تنظیموں کو حکومت نے امداد دی جیسا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے (اپنی کتاب) میں لکھا ہے مسلمانوں کا غور وفکر ہر جگہ پسپائی سے دوچار ہے اور جو بھی اسلامی مفکرین ہیں وہ سب ملک بدر ہیں۔ آج پاکستان میں معمولی پست درجہ کا طرز فکر ہے جو بہت پریشان کن بات ہے۔ بحث وتمحیص کی ہر مجلس میں یہی معمولی طرز فکر پایا جاتا ہے۔''

اس ایک مختصر سے پیراگراف میں نہ صرف مسلمانوں کی موجودہ فکری حالت کی نشاندہی کر دی گئی ہے بلکہ اس کا سبب بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ فکری انحطاط پیشوائیت کے فروغ کی وجہ سے ہوا ہے اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس کے لئے یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ علماء کو یہ اقتدار ان تنظیموں کی وجہ سے ملا ہے' جن کو حکومت امداد دے رہی تھی۔

اصل بات غور کرنے کی یہ ہے کہ قرآن کریم جیسی کتاب عظیم جو غور وفکر کی دعوت دیتی

چلی آ رہی ہے۔ اس کی موجودگی میں ہم مسلمانوں نے غور و فکر کرنے کو کیوں ترک کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس کا جواب خوب واضح ہے ہم مسلمانوں نے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف وہ نظریات اپنائے جنہوں نے ازخود غور و فکر کی نہ صرف اہمیت کو کم کر دیا بلکہ غور دفکر کرنے کو قابلِ مذمت قرار دے دیا۔

(1) قرآنِ کریم نے حضورﷺ کی زندگی کو ہم سب مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے (60:6)۔ قرآنِ کریم نے حضورﷺ کے غور و فکر کی بھی تعریف کی ہے (47:30, 60:10, 12:108)۔ حضورﷺ کے دور میں دس لاکھ مربع میل پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنی وسیع حکومت کا انتظام حضورﷺ خود اپنے غور و فکر سے کر رہے تھے لیکن ہم مسلمانوں کی بدبختی کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ رائج کیا گیا کہ حضورﷺ اپنے ارادہ اور غور و فکر سے کوئی کام نہیں کر سکتے تھے وہ ہر بات وحی خفی کی رو سے کرتے تھے، جس میں حضورﷺ کا فکر شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس عقیدہ کے لئے ہمارے علماء صرف ایک آیت کا سہارا لیتے ہیں:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (53:3)۔

نہیں بولتا اپنی نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔

مولانا عثمانی صاحب نے اس کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے:

> ''یعنی کوئی کام تو کیا ایک حرف بھی آپﷺ کے دہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا تھا جو خواہش نفس پر مبنی ہو بلکہ آپ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں وحی متلو کو قرآن اور غیر متلو کو حدیث کہا جاتا ہے۔''

یہاں مولانا نے خواہش نفس کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا دارومدار ظاہر ہے عقل پر ہی ہوتا ہے۔ مولانا نے عقل کے بجائے خواہش نفس' کے الفاظ استعمال کر دیئے۔ مولانا عثمانی نے حضورﷺ کے اقوال میں جو دین و دنیا کی تفریق کی ہے وہ بھی حضرت کا صرف تکلف ہی ہے ورنہ آیۂ کریمہ

کی جو تفسیر وہ کر رہے ہیں اس سے اس تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ مولانا عثمانی اور ہمارے دیگر علماء کرام ھُوَ کا مرجع ینطق قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ضمائر افعال کی طرف راجع نہیں ہوتیں اس لئے مجبوراً وہ اس کو مصدری معنے میں لے لیتے ہیں اور مطلق نطق رسول کو وحی قرار دیتے ہیں۔ ان کی اپنی تفسیر کے مطابق اس میں دین و دنیا کی تفریق ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر یہ بھی ایک مغالطہ ہی ہے کیونکہ ان کی تقسیم سے بخاری شریف کی کچھ حدیثیں تو وحی قرار پاتی ہیں اور کچھ احادیث بغیر وحی کے حضورﷺ کے فکری اقوال قرار پاتے ہیں۔ ان کی تقسیم کا یہ منطقی نتیجہ ہے لیکن ہمارے علماء کرام اس منطقی نتیجہ سے ابا کرتے ہیں اور ساری احادیث کو وحی خفی قرار دے کر، فہم رسول کا مطلق انکار کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے حضورﷺ کے فہم کو ان کے اسوۂ حسنہ سے خارج کر دیا جاتا ہے، اور پھر مسلمان بھی اس کے مکلف نہیں رہتے۔

مسلمانوں میں غور و فکر کے انحطاط کا دوسرا قوی ترین سبب تصوف کا فروغ ہے۔ تصوف کی بنیاد قنوط (Frustration) پر ہوتی ہے۔ کوئی قوم جس قدر مصائب و نوائب سے دوچار ہوگی، اس میں تصوف فروغ پاتا چلا جائے گا۔ ہم مسلمانوں کی بدقسمتی سے ہماری آٹھویں صدی ہجری یعنی بارہویں صدی عیسوی کا عرصہ بڑا زبردست Upheaval کا دور تھا۔ اس پوری صدی میں مسلمانوں پر تاتاریوں کے حملے جاری رہے۔ ہر جگہ خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ تاتاریوں کے حملوں نے ساری دنیائے اسلام کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ایک ایک تاتاری بیس بیس مسلمانوں کو قتل کر دیتا تھا۔ بغداد کا سقوط بھی اسی دور میں ہوا تھا۔ اس پریشان کن دور میں تصوف کو خوب فروغ ملا۔ ہمارے بڑے بڑے صوفیاء، اولیاء اللہ اسی دور سے منسلک ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی، بابا گنج شکر پاک پتن، حضرت شاہ شرف الدین قلندر صاحب پانی پتی، مولانا روم، سب اسی دور کی پیداوار ہیں۔

تصوف کی بنیاد ہی یہ ہے کہ عقل و حواس سے حاصل کردہ علم قابل بھروسہ نہیں ہوتا۔ قابل اعتبار علم صرف وہ ہے جو مراقبوں، مجاہدوں، اور ریاضتوں کے بعد ہر شخص کو براہ راست اللہ

تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ کشف والہام مل سکتا ہے۔اس عقیدہ نے غوروفکر کی بالکل تردید کردی۔
مولانا روم نے فرمایا۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبین سخت بے تمکیں بود
گر باستدلال کارے دین بدے
فخرِ رازی راز دار دین بُدے

ہم مسلمانوں کے بہترین دماغ تصوف کو فروغ دینے میں لگ گئے۔ حجتہ الاسلام امام غزالی جنہوں نے اپنی نصف اوائل عمر فلسفہ کی ترویج میں گذاری اور مقاصد الفلاسفہ جیسی عمدہ کتب تصنیف فرمائیں۔انہوں نے باقی نصف زندگی فلسفہ وعقل کی تردید میں گذاردی اور المنقذ من الضلال جیسی کتب تصنیف فرما کر عقل کی تردید اور تصوف کی تصویب فرمائی۔جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہمارے ہاں امام غزالی کے بعد کوئی بلند پایۂ مفکر پیدا نہیں ہوا۔

(3) ہمارے ہاں عباسی حکومتوں کے دوران جو قوانین منضبط ہوئے وہ اسلامی فقہ کہلائے جاتے ہیں۔ان عباسی حکومتوں میں دو طرح کے قوانین بنائے جارہے تھے۔ایک قسم کے قوانین تو وہ تھے جو حکومت کو رواں دواں رکھنے اور روزانہ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بنائے جاتے تھے۔ یہ حکومت کے انتظامی امور کے قوانین تھے جو حکومت کے وزراء وحکام تشکیل دیتے تھے۔ دوسرے قوانین وہ تھے جو مذہب کے متعلق تھے۔ یہ مذہبی قوانین اس دور کے فقہائے کرام بناتے تھے۔پہلی قسم کے قوانین اب تقریباً معدوم ہیں۔ان کی کوئی تفصیل اس وقت نہیں ملتی کہ وہ اپنی حکومتوں کو کس طرح Govern کرتے تھے۔لیکن ہماری بدقسمتی کہ دوسری قسم کے قوانین یعنی اس دور کے فقہائے کرام کے تشکیل کردہ مذہبی قوانین اب تک ہم پر مستولی چلے آرہے ہیں' ان مذہبی قوانین نے مسلمانوں میں تقدس کا درجہ حاصل کرلیا ہے اور ان قوانین کو قرآن وحدیث کی طرح غیر متبدل قرار دیا جانے لگا۔ حالانکہ یہ قوانین خود غیر اسلامی حکومتوں کے بنائے ہوئے تھے۔ان کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے' اس دور کے خلفاء تلوار کے زور پر حکومتیں حاصل

کر کے مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے۔ اس فقہ کا بیشتر حصہ ان بادشاہوں کی حکومتوں کو Justify کرنے اور ان کو Serve کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہمارے علماء کرام نے مزید قانون سازی کا دروازہ بند کر کے غور وفکر سوچ بچار کے دروازے بالکل بند کر دیئے۔

مسلمانوں کے فکری زوال میں جن اسباب وعوامل نے کردار ادا کیا تھا ان میں سے چند کا تذکرہ آپ کی خدمت عالی میں پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام عوامل کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں فکری جمود طاری ہو گیا۔ اور ملوکیت کے غلبہ اور اس سے پیشوائیت کے تعاون کی وجہ سے دین کا تصور بالکل مفقود ہو گیا اور ان کا دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ آپ خود غور فرمائیں کہ تصوف بالکل دین کا نقیض ہے۔ تصوف میں انفرادی پرستش پر نجات کا کلی انحصار ہوتا ہے جبکہ دین میں اجتماعی اطاعت ہوتی ہے۔ دین میں اجتماعی پرستش کی اجازت ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ تمام خلاف قرآن عقائد بطور مسلمہ چلے آ رہے تھے اور مسلمانوں پر چاروں طرف سے خلاف قرآن عقائد کی یلغار ہو رہی تھی کہ قدرت کے اشاروں اور فطرت کے تقاضوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت مسلمانوں کے شریک حال ہوئی۔ اس نے مسلمانوں کی زبوں حالی پر رحم فرمایا کہ اس برصغیر میں خالص قرآن کریم کی آواز بلند ہونی شروع ہوئی۔ یہ رجعت الی القرآن کی آوازیں شروع میں پست تھیں لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد تحریک طلوع اسلام اس آواز کی داعی بن گئی۔ اس عالی مرتبہ تحریک نے خالص قرآنی نظریات کو اپنایا اور مسلمانوں کے مروجہ اسلام کے ایک ایک نظریہ کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھا' اس تحریک نے نہایت جرأت و بسالت اور بغیر لومتہ لائم کی پروا کئے' مسلمانوں کی ایک ایک خلاف قرآن مسلمہ پر قرآنی نظر سے انتقاد کیا اور احقاق حق اور ابطال باطل کا وہ جاں گسل فریضہ ادا کیا کہ یہ تحریک قلیل مدت میں ہی قرآنی دانشوروں کی آنکھوں کا تارا اور ان کا نور بن گئی۔ البتہ ہماری پیشوائیت' جو ہمیشہ قرآن و عقل کے خلاف رہی۔ اس کے نزدیک یہ تحریک معتوب ہی رہی۔ اس تحریک نے وحی خفی' تصوف' تقلید جیسے خلاف عقل عقائد کی تردید کر کے مسلمانوں میں غور وفکر کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس تحریک کے بانی مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز مرحوم تھے۔ انہوں نے اس تحریک کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اپنے خون جگر

سے اس کی آبیاری کی۔ان کی زندگی میں یہ آواز دنیا کے کونے کونے تک پہنچ گئی تھی اور آج بھی اس تحریک کو دنیا بھر کے قرآنی دانشوروں میں مقبولیت عامہ حاصل ہو رہی ہے۔

خواجہ ازہر عباس ایم۔اے، فاضل درسِ نظامی اس عالی مرتبہ تحریک سے 1948ء سے منسلک چلے آرہے ہیں۔انہوں نے لاہور میں پورے پچیس سال محترم المقام پرویز کے ساتھ ان کی تربیت میں گذارے۔خواجہ صاحب نے خود بھی چونکہ مغربی و مشرقی علوم حاصل کئے ہوئے تھے۔اس لئے انہوں نے محترم پرویز صاحب سے پورا پورا استفادہ کیا۔ان کے یہ مضامین طلوع اسلام کے مختلف پرچوں میں طبع ہوتے رہے ہیں۔جن کو طلوع اسلام کے قارئین نے بہت پسند کیا تھا۔اسی وجہ سے طلوع اسلام کے قارئین اور قرآنی دانشوروں کی عرصہ سے یہ خواہش تھی کہ خواجہ صاحب کے ان مضامین کو ایک کتابی شکل میں طبع کرا دیا جائے۔لیکن مصارف کی وجہ سے قارئین کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی۔

محترم جناب جاوید گلزار صاحب' کراچی کے ایک بڑے معروف Industrialist اور نہایت دیانتدار تاجر ہیں۔انہیں قرآن کریم سے عشق ہے اور وہ بہت عرصہ سے اس تحریک سے وابستہ ہیں۔انہیں خواجہ صاحب کے یہ مضامین بہت پسند ہیں۔اور ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ یہ مضامین کتابی شکل میں طبع ہو جائیں اس لئے انہوں نے ازخود مالی تعاون کی پیش کش کر دی اور اس کی طباعت کے جملہ اخراجات خود ادا فرمائے۔ہم ان کے اس تعاون پر صمیم دل سے تشکر گزار ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی یہ خدمت قبول فرمائے۔

میں سلیم بھائی اور شعیب حسین گجر کا بھی بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے صائب مشوروں سے نوازا۔ان کے قیمتی مشوروں سے اس کتاب کی ترتیب اور طباعت میں بہت سہولتیں میسر ہو گئیں۔

والسلام

صائم خواجہ

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذہن' جو قرآن بناتا ہے

قرآن کریم' فرقان حمید' پوری انسانیت کے لئے حبل المتین اور عروة الوثقیٰ ہے کہ جس کو کسی حالت میں بھی شکست تو ایک طرف ذرا سی تراخ تک بھی نہیں آ سکتی۔ پوری انسانیت اس پر پورا پورا بھروسہ کر سکتی ہے۔ یہ خود روشنی ہے (5/15) جو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس کی روشنی میں سفر حیات طے کرے۔ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں' اور پوری انسانیت کے اختلافات و تنازعات اس سے رفع ہو سکتے ہیں۔ اس کے مثل کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ ولن تجد من دونہ ملتحدا (18/27) اور تم اس کے سوا کہیں پناہ گاہ نہیں پاؤ گے۔ یہ انسانیت کے لئے آخری پناہ گاہ ہے۔ ہمیشہ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے مصنف کی حیثیت اور علمیت سے لگایا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اس کتاب کی عظمت کا کیا کہنا کہ اس کا ''مصنف'' خود اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے عنوان Topic سے بھی لگایا جاتا ہے تو اس کتاب کا عنوان Topic بہترین معاشرہ کی تشکیل ہے اور مردہ قوموں کو زندگی بخشنا ہے۔ اس کی تعلیم کے نتائج ملاحظہ کرنے ہوں تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو نگاہ میں لایئے کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی قوم' نہایت مختصر عرصہ میں قیصر و کسریٰ کے مقام کی وارث بن گئی۔ قرونِ اولیٰ کی جماعت مومنین کی عظمت وسطوت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو وہ ذلیل وخوار ہو گئے۔ قرآن کریم کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ کسی پہاڑ پر نازل ہوتا تو یہ پہاڑ اس کے ڈر سے پھٹ جاتا (59/21)' ساری انسانیت کا راہنما' امام' مشکل کشا' جنم جنم کا ساتھی' جو قوم بھی اس کو اپنا لے فلک کی پہنائیوں کو چھو لے' ہم مسلمان اس

قرآن کریم کے متبع اور اس پر عمل پیرا ہونے کے مدعی ہیں' لیکن حق یہ ہے کہ ہم اس کی تعلیم کو عام ہونے اور انسانیت کو اس کے قریب آنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ کیونکہ دیگر اقوام ہمیں دیکھ کر یہ غلط ما ر لیتی ہیں کہ ہم قرآن کریم کی تعلیم کو اختیار کرنے کے بعد اس حالت میں ہیں تو وہ کیوں اس تعلیم کو اختیار کریں اور ہماری طرح ذلیل وخوار ہوں۔ اگر چشم حقیقت سے دیکھا جائے تو وہ اقوام یہ تاثر لینے میں حق بجانب بھی ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیں قرآن کا متبع سمجھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے نظریات کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اور ہمارے جو خلاف قرآن نظریات ہیں وہ خود زوال' ادبار' اور تباہی و بربادی کے داعی ہیں۔ فرقہ بندی' دنیا کو حقارت سے دیکھنا' تصوف کے زیر اثر Perceptual Knowledge کو حقیر جاننا' عقل سے حاصل کردہ علوم کی اہانت کرنا' علم کا ذریعہ صرف باطنی واردات کو سمجھنا' روایات کے زیر اثر قرآن کریم کی خلاف عقل تفسیر کرنا' ایک ہزار سال بیشتر کے بنائے ہوئے قوانین کو وحی الٰہی کی طرح غیر متبدل قرار دینا۔ عربوں کی معاشرت کو دین کا حصہ سمجھ کر ان سب پر عمل کرنے پر اصرار کرنا اور معاشرہ کو Static بنا دینا' یہ سب نظریات زوال کے داعی ہیں اور کوئی بھی ترقی پذیر قوم ان نظریات کو اپنائے گی وہ انشاء اللہ چند سال میں زوال پذیر ہو جائے گی۔ ہم مسلمانوں کے لئے یہ اہم ترین بات ہے کہ جب تک ہم حدیث کو وحی الٰہی سمجھتے رہیں گے اور اس کی رو سے کردہ تفسیر کو آخری تفسیر سمجھیں گے اور قرآن کریم کی روشنی اور روشن ہدایت کو انہیں میں محصور و محدود کر دیں گے اور جب تک اپنے ایک ہزار سال پرانے قوانین کو غیر متبدل سمجھتے رہیں گے' مسلمان ہزار جتن کر کے دیکھ لیں' کسی صورت میں بھی ترقی نہیں کر سکتے اور یہی اور صرف یہی دو ستون ہیں جن پر ہماری پوری پیشوائیت قائم ہے۔ آپ یہ دو ستون توڑ دیں پیشوائیت دھڑام سے نیچے گر جائے گی۔ مسلمانوں کی تو ترقی کا راز ہی اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ خلاف قرآن نظریات کو ترک کر دیں۔ قرآن کریم کی وہ تفسیر کریں جو موجودہ علوم کی بھی راہنمائی کرے۔ موجودہ علوم نے عقل انسانیت کو جہاں تک پہنچا دیا ہے وہ بے شک قابل تعریف و تبریک ہے۔ اب قرآن کریم کی وہ تفسیر پیش کی جائے جہاں قرآن کریم عقل

انسانی کو لے جانا چاہتا ہے۔ وحی میں خود اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہ عقل انسانی کو اپنی طرف کھینچتی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے وحی کی صحیح تعلیم سامنے آ رہی ہو اور اس کا واحد طریقہ تفسیر بالروایت کو فوراً چھوڑ کر تفسیر القرآن بالقرآن میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ تفسیر القرآن بالقرآن سے خارج از قرآن نظریات کٹکر الگ ہو جاتے ہیں اور تصریف آیات سے صرف اور صرف قرآن کریم کی خالص تعلیم سامنے آنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۔

سرکتی جاتی ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ
نکلتا جا رہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ

اور قرآن کریم خود آپ سے بولنے لگتا ہے۔ قرآن کریم انسان کا جو ذہن بنانا چاہتا ہے افسوس کہ ہم نے وہ نظریات قبول ہی نہیں کئے۔ ہمارا ذہن تو ان خیالات کی آماجگاہ ہے جو سراسر قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم جو ذہن بنانا چاہتا ہے اس کی اولین پہچان یہ ہے کہ وہ زندگی کو نہ صرف ایک حقیقت سمجھتا ہو بلکہ اس کو بامقصد Purposeful بھی جانتا ہو۔ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان نہیں لاتے زندگی کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بھی حیوانات کی طرح طبعی جسم رکھتا ہے اس کا جسم فطرت کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ان ہی قوانین کے مطابق اسے موت آجاتی ہے۔ قرآن حکیم اس نظریہ کو حیوانی سطح کی زندگی قرار دیتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: والذین کفروا یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم (47/12)۔ اور جو لوگ انسانی نظریہ زندگی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں چین کرتے ہیں اور (اس طرح بے فکری سے) کھاتے پیتے ہیں اور آخر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اس کے برخلاف قرآن یہ ذہن بناتا ہے کہ انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں ہے اس کے پاس اس جسم کے علاوہ انسانی ذات' ''زندگی'' Self بھی ہے جو اس کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے۔ اس انسانی ذات کی نشوونما اس کا فریضہ ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی تربیت کے لئے طبعی قوانین مقرر ہیں اسی طرح ذات کی

بالیدگی حاصل کرنے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوانین عطا کئے گئے ہیں۔ جو مستقل اقدار کہلاتے ہیں اور جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔نشوونمایافتہ ذات' انسانی جسم کی موت کے بعد مرتی نہیں بلکہ زندہ رہتی ہے اور مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

اس زندگی کو ارتقائی منازل میں پہنچانے اور اس کو نشوونما دینے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا الگ ملک ہو اس میں ان کی اپنی حکومت ہو' اور اس حکومت کا فریضہ یہ ہو کہ ان اقدار کے نفاذ سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ جو حکومت مستقل اقدار پر قائم ہوگی' اس میں انسانی ذات کی نشوونما از خود ہوتی جاتی ہے اور اس حکومت کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔قرآن کریم کا بنایا ہوا ذہن اس حکومت میں قرآن کریم کو اور صرف قرآن کریم کو حجت تسلیم کرتا ہے اور حکومت کے سارے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہوتے ہیں۔ وما اختلفتم فيه من شئ فحكمه الى الله (42/10)۔ اور جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ قرآن کے مطابق ہونا چاہئے اس حکومت کا قیام اس غرض سے ہوتا ہے کہ وہ ساری انسانیت کی خدمت کرے۔ كنتم خير امة اخرجت الناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تومنون بالله (3/110)۔ ہم نے اے جماعت مومنین تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے تاکہ تم ایسا نظام قائم کرو جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع رساں ہو' اس کے لئے ضروری ہے کہ تم ان باتوں کا حکم دو جسے قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکو جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ تم دوسروں کے لئے نفع رساں اسی صورت میں ہو سکتے ہو کہ جب تم خود ان قوانین کی صداقت پر پورا یقین رکھتے ہو۔ مسلمان کا تو کام ہی نہیں کہ وہ کسی کو نقصان پہنچائے وہ تو ساری انسانیت کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم کے معروف جاری کریں اور قرآن نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے انسانیت کو روکیں۔ مزید ارشاد ہوا کہ: وكذلك

جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیداً (2/143)۔اور ہم نے تمہیں ایک ایسی قوم بنایا جسے ساری دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلہ پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو اور نہ کسی سے کھچی ہوئی ہو اور اس کا فریضہ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوام عالم کے اعمال کی محاسب و نگراں ہو اور ان کے اپنے اعمال کا نگران ان کا رسول ہو اور اس کے بعد اس کے جانشین ہوں جنہیں اس نظام خداوندی میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔قرآنی ذہن کے مالک افراد جو حکومت قائم کرتے ہیں اس حکومت میں علاوہ اس کے کہ امن وامان قائم ہوتا ہے اور ہر شخص کو رزق فراوانی سے ملتا ہے' اس حکومت کی چند خاص خصوصیات ہوتی ہیں جو قرآن کریم کی تعلیم سے متاثر ہونے کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔

قرآن کریم' فرقان حمید' نے جو انقلابی نظریات اس دور تاریک میں عطا فرمائے ان میں سے ایک اعلیٰ ترین نظریہ یہ ہے کہ انسان کی حکومت انسان پر قطعاً حرام ہے اور حکومت کا حق بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔قرآن کریم تو الٰہ کا لفظ ہی حاکم کے معنے میں استعمال کرتا ہے۔ جب فرعون اور حضرت موسیٰ کی کشمکش زور پکڑ گئی اور فرعون کو خوف محسوس ہوا کہ حضرت موسیٰ اس کے لئے خطرہ کا باعث نہ بن جائیں تو اس نے بڑی تہدید و تعدی سے حضرت موسیٰ کو دھمکی دے کر کہا: قال لئن اتخذت الھا غیری لا جعلنک من المسجونین (26/29)۔تو فرعون نے کہا کہ اگر تم نے میرے سوا اور کسی کو حاکم بنایا تو میں ضرور تمہیں قید کر دوں گا۔اور یہ نعرہ کہ ہم اللہ کے سوا اور کسی کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتے ہم کم سے کم پانچ بار تو روزانہ اپنی اذان میں بلند کرتے ہیں۔وھو الذی فی السماء الٰہ و فی الارض الٰہ (43/84)' یاد رکھو خارجی کائنات میں بھی وہی الٰہ (حاکم) ہے اور انسانی دنیا میں بھی وہی حاکم (الٰہ) ہے۔جس طرح ساری کائنات اس کے احکام کے تابع چل رہی ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی حکومت اسی کے احکام کے ماتحت چلنی چاہئے۔حق حکومت سوائے اسی کی ذات کے کسی

اور کو حاصل نہیں۔ حکومت کی کوئی بھی شکل ہو' قرآن کریم اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ قانون سازی کے اختیارات کسی ایک انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کے ہاتھوں میں ہوں اور اسی طرح لا محالہ دوسرے انسان ان کی مرضی کے تابع زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ انسان کی انتہائی تحقیر و تذلیل ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی مرضی کے تابع چلے۔ اس سے انسان شرف انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کو علامہ اقبال نے نہایت مختصر اور غایت درجہ کے پرزور الفاظ میں اپنی ایک رباعی میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت و لے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی در خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من نہ دیدم کہ سگے پیشِ سگے سرخم کرد

(مفہوم) ''آدمی نے بے وقوفی سے دوسرے آدمی کی فرمانبرداری کرنی شروع کر دی۔ آزادی ایک نعمت تھی۔ لیکن انسان نے یہ آزادی قباد و جم جیسے بادشاہوں کے سپرد کر دی۔ اور خود اپنے جیسے انسانوں کی فرمانبرداری کرنی شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں تو آدمی کتوں سے بھی بدتر ہے کہ میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ کوئی کتا اپنے جیسے کتے کی فرمانبرداری کرتا ہو۔'' قرآن کریم کی رو سے کسی کو حق حکومت حاصل نہیں۔ کوئی قانون سازی نہیں کر سکتا۔ قرآنی حکومت تو صرف ایک ادارہ (Agency) ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین نافذ کرتی ہے۔ ان قوانین کو نافذ کرنے والے پہلے خود ان کی اطاعت کرتے ہیں اور پھر دوسرں سے بھی ان کی اطاعت کراتے ہیں۔ وہ خود بھی ان قوانین کے محکوم ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان کا محکوم رکھتے ہیں۔ اس حکومت میں حاکم و محکوم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی اور نہ ہی حکام و افسران بالا کو اس میں کسی قسم کی مراعات Privileges حاصل ہوتی ہیں کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں اور نہ ہی کسی پابندی سے ان کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ ہر شخص قانون کا پابند ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت کے اولین سربراہ حضور ﷺ نے فرمایا: ان اتبع

الا مایوحی من ربی (7/203) میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔فانما علیه ما حمل و علیکم ما حملتم (24/54)۔ جو تم پر فرض ہے تم اس کے ذمہ دار ہو اور اسی طرح جو رسول پر فرض ہے وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ سورۂ زخرف میں ارشاد ہوا: وانه لذکر لک و لقومک و سوف تسئلون (43/44)۔اور یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لئے ایک قانون ہے اور عنقریب ہی تم لوگوں سے اس کی باز پرس کی جائے گی۔اس آیت کریمہ میں 'لک' یعنی تیرے لئے کا لفظ اضافہ کر کے خاص طور پر حضور ﷺ کو بھی باز پرس کا مکلف بنایا گیا ہے۔جب حضور ﷺ' جو اولین سربراہِ مملکت ہونے کے علاوہ رسول بھی تھے' وہ قانون کے اس قدر پابند تھے تو آنے والے سربراہان کیسے قانون سے آزاد ہو سکتے ہیں۔قرآنی مملکت کا سربراہ اور ہر افسر قانون کا پابند ہوتا ہے۔

مختلف ممالک میں جس قدر بھی حکومتیں قائم ہیں ان میں سے بیشتر میں بہت اچھے قوانین جاری ہیں۔عقل انسانی نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔اس لئے آج کے قوانین ہزار دو ہزار سال پیشتر کے قوانین سے بہت زیادہ اچھے ہیں۔دنیا میں فلاحی مملکتیں موجود ہیں جو اپنی اپنی رعایا کی ہر طرح سے فلاح و بہبود کا خیال رکھتی ہیں۔لیکن ان تمام مملکتوں میں کوئی ایسا انتظام نہیں ہے کہ اس کے باشندے از خود اس حکومت کی اطاعت کرنے کی طرف راغب ہوں۔اور اس کی اطاعت کو اپنے لئے فائدہ مند خیال کرتے ہوں' یہی وجہ ہے کہ سیکولر حکومتوں میں جو حاکم ہیں یا جو بااثر لوگ ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قانون کی گرفت سے بچ سکتے ہیں وہ جرائم کرنے سے اجتناب نہیں کرتے اور جس قدر کوئی شخص بااثر ہوتا ہے اس قدر وہ جرائم کا ارتکاب کرنے پر خود کو سزا سے محفوظ سمجھتا ہے۔وہاں صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ جرم کرنے والا پیشتر سے ہی یہ انتظام کرے کہ وہ قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا۔اسی لئے ایسے ممالک میں جرائم ہوتے رہتے ہیں۔جرائم کو روکنے بلکہ اس کا کلیتہً سدباب کرنے کا طریقہ اسلامی حکومت میں یہ ہے کہ وہاں کے عوام کا اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ اس حکومت کی اطاعت اللہ و رسول کی مرادف ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص جرم کرنے کے بعد قانون کی گرفت میں نہیں بھی آتا تب بھی اس کا اس سے یہ نقصان تو ضرور ہوتا ہے کہ اگر چہ وہ دنیاوی سزا سے تو محفوظ رہا لیکن اللہ و رسول کے ہاں تو گنہگار شمار ہوگا۔ اسلامی حکومت کی یہ وہ اساس محکم ہے کہ جس کے Momentum (حرکت اندرونی) پر وہ حکومت چلتی ہے اگر آپ اس اساس محکم کو نکال دیں تو اسلامی حکومت نہ قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی چل سکتی ہے۔ عام طور پر ہم مسلمانوں میں اسلامی حکومت کی یہ تعریف (Definition) کی جاتی ہے کہ ''اسلامی حکومت وہ حکومت ہوتی ہے کہ جس میں قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں'' اور اس حکومت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت کے مرادف قرار نہیں دیا جاتا۔ اسلامی حکومت کا عملی طور پر نفاذ ہمارے ہاں کہیں بھی نہیں ہے۔ ایران میں بڑی جدوجہد کے بعد اسلامی حکومت قائم کی گئی لیکن وہاں پھر وہی خلاف قرآن نظریہ قائم رہا۔ انہوں نے اپنی حکومت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار نہیں دیا۔ اسی وجہ سے ایرانی انقلاب کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کاش کہ وہ قرآن کریم کا یہ نکتہ سمجھ جاتے تو ایران میں انقلاب کامیاب ہو جاتا۔ اسلامی حکومت کی توجیہ جواز ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس میں جرم اور گناہ یعنی Crime اور Sin ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے جو شخص گناہ نہیں کرے گا وہ جرم (Crime) یعنی حکومت کی خلاف ورزی بھی نہیں کرے گا۔ یہ بات دو تین مثالوں سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ فرض فرمائیں کہ اگر کوئی شخص سخت گرمی کے دنوں میں روزہ سے ہے۔ گھر میں بالکل تنہا ہے۔ فرج کا ٹھنڈا پانی اس کے پاس رکھا ہے۔ پیاس کی شدت اس کو پریشان کر رہی ہے لیکن وہ روزہ نہیں توڑے گا' وہ سمجھتا ہے کہ روزہ توڑنا گناہ Sin ہے۔ وہی شخص' روزہ کی اسی حالت میں کار میں جا رہا ہے۔ ٹریفک سگنل پر اگر کوئی سپاہی موجود نہیں ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی Red Light' عبور کر جائے گا اور وہاں رک جانے کو نظر انداز کر جائے گا لیکن اگر اس کو اس بات کا یقین ہو کہ ایسا کرنے سے وہ ''اللہ و رسول'' کی اسی طرح نافرمانی کر رہا ہے جس طرح وہ روزہ توڑنے سے کرتا تو وہ لال بتی کو کراس نہیں کرے گا اور اس جرم کے ارتکاب سے اسی طرح پرہیز کرے گا

جس طرح روزہ توڑنے کے گناہ سے کرتا ہے۔اسی طرح آپ فرض کریں کہ کوئی افسر ہے اور محکمہ میں اس کی کوئی خاص گرفت نہیں ہے اس لئے وہ دفتر دیر سے آتا ہے۔وہ قانونی گرفت سے تو بچ گیا لیکن اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو وہ اس جرم یا گناہ سے نہیں بچ سکے گا جو اس کی ذات پر "اللہ ورسول" کی نافرمانی کرنے کے سبب مرتب ہوتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص لاہور سے کراچی کا سفر کرتا ہے اور ٹکٹ نہیں خریدتا' اتفاق سے راستہ میں اس کی چیکنگ نہیں ہوئی۔قانون کی گرفت میں تو وہ نہیں آیا' لیکن "اللہ ورسول" کی نافرمانی کا مرتکب ضرور ہوا۔یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جس کے باعث اسلامی حکومت کے حاکم ومحکوم' پوری رعایا ازخود حکومت کے فرمانبردار اور مطیع ہوتے ہیں اور اسلامی حکومت میں ہر شخص ازخود قانون کی پابندی کرتا ہے۔ ذہن' جو قرآن بناتا ہے وہ اس حکومت کو قائم کرنے کا بھی متقاضی ہوتا ہے اور ازخود اسکا مطیع وفرمانبردار بھی رہتا ہے۔

اسلامی حکومت روشن خیالی کی بہترین مثال ہوتی ہے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔قرآن کریم ایک ایسی روشن کتاب ہے کہ جس کو تمام نوع انسانی کے لئے قیامت تک مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات بننا تھا اس لئے اس کتاب میں ہدایات بطور اصول دی گئی ہیں۔ اس نے جزئیات کو عمداً بیان نہیں فرمایا۔ قرآن کریم (Objectives) اہداف مقرر فرمادیتا ہے اور ان کے حاصل کرنے کا طریقہ خود مقرر نہیں فرماتا بلکہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان کو طے کیا جاتا ہے۔اس طرح اسلامی حکومت جدید سے جدید ترین نظریات پر عمل پیرا ہوسکتی ہے۔قرآن کریم ایسے معاشرہ کو برہان پر قائم کرتا ہے۔ ہر بات دلیل سے کرتا ہے: هاتوا برهانكم ان كنتم صٰدقين (27/64, 2/111) ' اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ۔نیز ارشاد ہوتا ہے: يا ايها الذين امنوا ان تتقوا الله يجعل لكم فرقانا ويكفر عنكم سياتكم ويغفر لكم والله ذو الفضل العظيم (8/29)۔(اے ایمان والو) اگر تم قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کروگے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کردے گا اور تمہاری معاشی ناہمواریاں دور کردے گا اور تمام خطرات سے

تمہاری حفاظت فرمائے گا۔امتیازی زندگی سے مراد یہ ہے کہ قرآنی ذہن والوں کی زندگی دوسرے لوگوں سے اس قدر مختلف ہوتی ہے کہ فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ قرآنی ذہن کے لوگ ہیں۔ نیز اس سے یہ مفہوم بھی ہے کہ قرآنی ذہن والوں میں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے سے ایک ایسا ملکہ اور ایک ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ فوراً حق و باطل، غلط و صحیح میں فرق محسوس کر لیتے ہیں۔ان کی اس صلاحیت کو قرآن کریم نے فرقان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔اس معاشرہ میں لوگ ہر ہر موقع پر درست اور غلط امور میں فوراً فرق محسوس کر لیں گے۔اس کے علاوہ قرآنی ذہن والے نہایت حلیم الطبع اور ضبط کے مالک ہوتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے: لا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (41/34)۔بھلائی اور برائی کبھی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو تو تم دیکھو گے کہ جس کے ساتھ تمہاری دشمنی تھی وہ اچانک تمہارا دلی دوست بن گیا۔جس معاشرہ میں یہ صورت وسعتِ ظرف اور اخلاق حمیدہ کی ہو اس معاشرہ میں آپس کے تعلقات بہت اچھے اور محبت وخلوص پر استوار ہوں گے۔قرآنی ذہن رکھنے والے مومنین کی خصوصیات سورۂ فرقان میں آیت نمبر 63 سے 74 تک، عباد الرحمٰن (اللہ کے بندوں) کے عنوان کے ذیل میں مفصل بیان کی گئی ہیں۔طوالت کے خوف سے ان کو تحریر نہیں کیا جا رہا ہے۔ جو صاحبان قرآنی ذہن کی صفات و خصوصیات معلوم کرنا چاہیں وہ ان آیات کریمات کا مفہوم، مفہوم القرآن میں خود ملاحظہ فرمالیں اور پھر یہ غور فرمائیں کہ جس معاشرہ میں ان صفات وخصوصیات کے شہری آباد ہوں گے وہ معاشرہ کس درجہ روشن خیال، ایثار پسند اور محبت وخلوص پر مبنی ہو گا۔

یوں تو ہر سٹیٹ کی اپنی اپنی Pre-Requisites ہوتی ہیں۔اسلامی حکومت چونکہ نظریاتی ریاست (Ideological State) ہوتی ہے۔اس لئے اس کا تو مدار و انحصار ہی اس کی آئیڈیالوجی پر ہے۔اسلامی حکومت کے دو ستون ہوتے ہیں جن کے بغیر اسلامی حکومت نہ تو قائم ہی ہو سکتی ہے اور نہ ہی چل سکتی ہے۔ایک اساس کا مفصل ذکر ہو چکا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ

اس کی اطاعت ''اللہ ورسول'' کی اطاعت ہوتی ہے اوراس کی عدم موجودگی میں ''اللہ ورسول'' کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی۔ انسان اور خدا کا تعلق و رابطہ ہی اس نظام کے توسط سے ہوتا ہے۔ اگر وہ نظام اور حکومت قائم ہے تو انسان اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا رابطہ وتعلق برقرار ہے اور اگر وہ نظام نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے انسان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اللہ ورسول کی اطاعت چونکہ ہر مسلمان کا مطمح نظر ہوتا ہے اس لئے ہر مسلمان اس بات پر مجبور ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرے۔ اسلامی حکومت کی دوسری اساس اس نظریہ پر قائم ہے کہ انسان صرف مادی جسم کا نام نہیں ہے جو عام طبعی قوانین کے ماتحت ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس کے اجزاء کے انتشار سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا' بلکہ انسان' جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی رکھتا ہے جسے اس کی ذات' نفس یا ''زندگی'' کہا جاتا ہے اور جو نا قابل فنا ہے۔ اس کی پرورش اور تربیت انسان کا فرض ہے۔ اور اس کی پرورش قرآن کریم کی مستقل اقدار کے ماتحت ہوتی ہے۔ نفس انسانی پر انسان کے ہر عمل کا اثر مرتب ہوتا ہے اور انسان کے ان اعمال کے اثرات سے اس میں ضعف و استحکام پیدا ہوتا ہے۔ قرآنی ذہن حکومت کی نگرانی کے بغیر بھی کوئی جرم یا گناہ اس لئے نہیں کرتا کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ برے اعمال اور معاشرہ کو خراب کرنے والے کاموں سے' اس کے نفس پر برا اثر مرتب ہوگا۔ یہ تو اس کے ایمان کی مضبوطی پر منحصر ہے کہ اس کا اس بات پر کتنا یقین ہے۔ ہر شخص زہر اس لئے نہیں کھاتا کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے وہ فوراً مر جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی کا پختہ یقین ہے کہ حرام کھانے سے اس کے نفس کو اضمحلال ہوگا وہ کبھی حرام مال نہیں کھائے گا۔ حرام مال صرف وہ شخص کھائے گا جسے اس کے برے اثرات مرتب ہونے کا پورا یقین نہ ہو۔ قرآنی ذہن چونکہ نفس انسانی پر اعمال کے اثرات مرتب ہونے پر مکمل یقین رکھتا ہے' اس لئے وہ نہ حرام مال کھائے گا اور نہ ہی کوئی ایسا اقدام لے گا جو اسلامی حکومت کے قوانین کے خلاف ہو یا جس سے معاشرہ میں فساد و ابتری پھیلنے کا خطرہ ہو۔ نفس انسانی پر اثرات کے مرتب ہونے کا عقیدہ وہ بنیان مرصوص ہے جس سے معاشرہ جنت نظیر بن جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کے پیشِ نظر تو ساری انسانیت ہوتی ہے' جہاں تک نفع رسانی' زندگی کی اہمیت' رزق کی فراہمی' رہائش' تعلیم' سکون واطمینان اور اسی قسم کی دیگر بنیادی ضروریات کا تعلق ہے' قرآن کریم مسلم وغیر مسلم میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتا۔ مولانا حالی کا مشہور شعر ہے ؎

یہ پہلا سبق تھا کتاب ھُدیٰ کا
کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

اسلامی حکومت میں اقلیتوں کی ساری ضروریات کو فراہم کرنا حکومت کا فرض ہے۔ ہمارے فقہ ملوکیت میں غیر مسلموں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔ لیکن قرآن کریم میں شہادت کے سلسلہ میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں کی ہے' اس لئے غیر مسلم کی شہادت قابلِ قبول ہے۔

قرآن کریم میں جزیہ کا لفظ صرف ایک مرتبہ آیا ہے' حتیٰ یعطوا جز (9/29) جزیہ کا اطلاق اس وقت ہوتا تھا جب مسلمان کسی غیر مسلم ملک کو فتح کرتے تھے تو وہاں کی رعایا اپنے مفتوح ہونے کو تسلیم کرنے کے لئے جزیہ بطور ایک Token کے ادا کرتے تھے۔ اب حالات ہی تبدیل ہو گئے ہیں نہ اب کوئی ملک کسی ملک کو فتح کرتا ہے اور نہ ہی جزیہ وصول کرنے کی صورت یا ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے معبد Synagouge' خانقاہیں' مساجد' جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے' غیر مسلموں کی تمام عبادت گاہوں کی حفاظت اسلامی حکومت پر فرض ولازمی ہوتی ہے (22/40) اس کے علاوہ یہ کہ غیر مسلم اگر تمہارے پاس آ کر پناہ مانگے' تو اسے پناہ دو پھر اسے اچھی طرح واضح کر دو کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم کی کیا پوزیشن ہوگی اور کیا کیا حقوق اس کو حاصل ہوں گے۔ اگر اس غیر مسلم کو' اس کی یہ پوزیشن قابل قبول نہ ہو اور وہ اسلامی حکومت میں رہنے کو آمادہ نہ ہو تو تم اسے بحفاظت اس کی پناہ گاہ تک پہنچا دو (9/6)۔ مقصد تو غیر مسلموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا ہے۔ اس ضمن میں یہ حکم بھی ہے کہ اگر کسی ملک میں حکمران جابر ہیں اور ظلم وجور کر رہے ہیں' اور وہاں کی رعایا ان سے عاجز ہے تو اگر وہاں کی مظلوم رعایا مسلمانوں کو مدد کے لئے پکاریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ

اس ملک کے نادار، مظلوم، غریب عوام کی مدد کو پہنچیں اور انہیں ان جابر حکمرانوں سے نجات دلوائیں (4/75)۔ خواہ وہ مظلوم غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ غیر مسلموں اور غیر اسلامی حکومتوں سے روابط قائم کرنے کے سلسلہ میں جہاد کا موضوع بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم اس لفظ کو بہت ہی Mis-use کیا گیا ہے۔ لیکن مختصراً یہ عرض ہے کہ قرآن میں جہاد کی اجازت صرف حسب ذیل حالات میں دی گئی ہے۔

(1) اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے (22/40)۔

(2) مظلومین کی امداد کے لئے خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں بھی ہوں (4/75)۔

(3) غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے لئے۔

(4) جو قوم عہد شکنی کرے گی اس سے تصادم ضروری ہے (8/55)۔

(5) اگر کسی جگہ لاقانونیت پھیل جائے تو اس کی روک تھام کے لئے۔

جہاد کے لئے بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ اسلامی حکومت جہاد کرے گی۔ فرداً فرداً یا مختلف تنظیمیں بنا کر جہاد کرنا درست نہیں ہے۔ اسلامی حکومت بھی ایک بار ہی جہاد شروع نہیں کرتی بلکہ جب اسلامی حکومت ان متذکرہ بالا مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو یہ نہیں کہ اس علاقہ پر ایک دفعہ ہی حملہ کر دے بلکہ وہاں کی حکومت اور اس کے باشندوں پر واضح کرتی ہے کہ ان کے خلاف اس جہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ اس کے بعد ان سے مختلف شرائط پر گفتگو ہوتی ہے۔ اگر کوئی صورت معاہدات کی نہیں بنتی تو مجبوراً ''تلوار'' اٹھائی جاتی ہے۔ ان خلاف معمول حالات کے علاوہ قرآنی ذہن کبھی بھی لڑائی پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بہت ہی غیر معمولی حالات ہوتے ہیں جب کہ جہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آپ دیانتداری سے غور فرمائیں کہ ان میں سے کون سی صورت ایسی ہے جس میں کوئی شخص بھی جہاد کو ضروری قرار نہ دیتا ہو اور اس کے کرنے پر اعتراض کر سکتا ہو۔ یہ ساری وہ صورتیں ہیں جن میں قرآن نے جنگ کی اجازت دی تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ البتہ موجودہ دور میں اس

لفظ کو اس قدر بدنام کیا گیا ہے کہ ہر شخص "جہاد" کو برا تصور کرنے لگا ہے۔ جہاد تو ظلم و جور کو دور کرنے اور دنیا میں امن و امان قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ اور اگر اس کے علاوہ اس کو کسی جگہ استعمال کیا جائے تو وہ قرآنی جہاد نہیں ہوگا۔

وهٰهنا تم منا الكلام

علىٰ مصطفنا الوف سلام

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترکی سے خوش کن خبروں کی آمد

ایک تجزیہ اور قرآن کی آواز

دنیا کا باطنی اضطراب اور مسلمانون کی اپنی تباہی و بربادی ان کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ بیدار ہوں اور قرآن کے قریب آئیں' مسلمانوں کے 56 ممالک تھے Kosovo کے آزاد ہونے سے ایک مسلمان ملک کا اور اضافہ ہوگیا ہے۔کوسووو اور ترکی دونوں یورپ میں واقع ہیں۔ ترکی اسلام کو بطور ضابطہ حیات اور دین کے اختیار کرنا چاہتا ہے لیکن ان کے ذہن میں اسلام کا تصور مذہب کا ہے اور مذہب کسی طرح بھی دین کی حیثیت سے نافذ نہیں ہوسکتا۔ترکی کے سکالرز اور مفکرین سخت مشکل اور کشمکش میں مبتلا ہیں اور سرتوڑ کوشش کررہے ہیں کہ اسلام کو بطور نظام کے پیش کریں۔کافی عرصہ سے ترکی کی اس کوشش کی جستہ جستہ اور شدہ شدہ خبریں موصول ہو رہی تھیں چونکہ ہمارے ہاں ترکی جاننے والے کم لوگ ہیں اور ترکی میں بھی اردو کے عالم کم ہیں' اس لئے یہ خبریں زیادہ نہیں آرہی تھیں اب بی بی سی (B.B.C) نے ایک تفصیلی خبر دی ہے جس کو گارڈین لندن نے اپنی اشاعت مورخہ 28-02-2008 میں شائع کیا ہے۔اس خبر کا ترجمہ پیش خدمت ہے' اس ہی خبر کو روزنامہ ایکسپریس' کراچی نے بھی مورخہ 28-02-2008 کی اشاعت میں اپنے الفاظ میں شائع کیا ہے۔یہ دونوں تراشے ملاحظہ فرمائیں۔گارڈین' لندن میں تحریر ہے۔

ترکی میں اسلام کو اکیسویں صدی میں قابلِ عمل بنانے کی کوشش

(ا) شریعت کی اساس کی تجدید نو اور قرآن کی تفسیر نو۔

(۲) مسلمانوں کے نظریات اور مغربی افکار میں تطبیق۔

ترکی نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے کہ شریعت کی اساس کی تعبیر نو کرے۔ جبکہ سرکاری طور پر قرآن کریم کی موجودہ دور کے مطابق تفسیر کرے۔

وزیراعظم اردگان Erdogan کی اسلام پسند گورنمنٹ کی اصولِ فقہ کی تجدید کرنے کی کوشش اور اسلام کو اکیسویں صدی میں اس طرح قابل عمل بنانے کی جدوجہد کہ مسلمانوں کے نظریات اور یورپ کے نظریات ہم آہنگ ہو جائیں، بہت بڑی مہم خیال کی جارہی ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اس طرح عورتوں کے خلاف امتیاز، بربریت پر مبنی سزائیں جیسے رجم اور اعضا کا کاٹنا وغیرہ ختم ہو جائیں گی اور اس طرح اسلام اس ملک میں جو مغرب و مشرق کے درمیان واقع ہے اور اپنے کو مغرب میں شمار کرانا چاہتا ہے، ایک طاقت بن کر ابھر آئے گا۔

محکمہ مذہبی امور کے ماتحت، انقرہ یونیورسٹی کے اسلامی علماء کی ایک جماعت نے احادیث کی نئے سرے سے تفسیر کا کام تقریباً ختم کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں وہ اقوال جو حضور ﷺ کی جانب منسوب ہیں اور جو اسلامی قانون کا ماخذ بنتے ہیں، ان کی بھی جدید تعبیر کرلی ہے۔ مصطفیٰ اکیول جو اردگان گورنمنٹ کے آزاد خیال گروہ کے ترجمان ہیں انہوں نے کہا ہے کہ ایک ٹیم جو تجدید نو کا کام کررہی ہے اس نے اپنا کام تقریباً مکمل کرلیا ہے البتہ اس ٹیم کو ان احادیث کی وجہ سے پریشانی ہے جو عورتوں کے متعلق ہیں، ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ کو یہ کہہ کر کہ وہ مستند نہیں ہیں خارج کر دیا جائے۔ یہ ایک بہت بڑا عملی اقدام ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان احادیث کے ذیل میں حاشیے (Notes) دے دیئے جائیں کہ ان کو تاریخ کے مختلف تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ واضح رہے کہ مذہبی امور کا یہ محکمہ ترکی کی آٹھ ہزار مساجد کی نگرانی کرتا ہے اور ان مساجد کے آئمہ کی تقرری بھی یہی محکمہ کرتا ہے۔

فادی حاکورہ Fadi Hakura جو ترکی کے International

Institute of Strategic Studies میں ایک ماہر ہیں' انہوں نے اس اقدام کو سنی اسلام کو موجودہ دور کی سماجی اور اخلاقی اقدار کے مطابق بنانا قرار دیا ہے۔

وہ (اس انسٹیٹیوٹ کے ماہرین) اس اقدام کو کوئی انقلابی قدم قرار نہیں دیتے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اقدام صدر اول کے اسلام کی طرف مراجعت ہے اور اس طرح اس اسلام سے وہ تمام قدامت پرستی دور ہو جائے گی جس نے کئی صدیوں سے اسلام کو منجمد کر کے رکھ دیا ہے یہ اقدام اسی طرح کا ہے جیسا کہ عیسائیت میں ریفارمیشن ہوئی تھی اگرچہ بالکل اس طرح کا نہیں ہے۔

علی بار دو کوگلو Ali Bardokogolo' آزاد خیال مذہبی سکالر ہیں۔ انہیں اردگان نے مذہبی محکمہ کا سربراہ مقرر کیا ہے۔ اس محکمہ میں انقرہ کے علماء 5 جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن تحریر کر رہے ہیں۔ اس تفسیر میں وہ قرآن کے پیغام کو موجودہ دور کے مطابق بیان کر رہے ہیں۔ (یہاں تین پیراگراف کا ترجمہ ترک کیا جاتا ہے' اس کے بعد تحریر ہے)۔

(احادیث) ایک نظر میں:

احادیث حضورﷺ اور آپﷺ کے اصحابؓ کے واقعات کا بیان ہے اور قانون' سیرت اور تاریخ کے لئے ایک اہم ماخذ شمار کی جاتی ہیں۔ احادیث ان امور کو بیان کرتی ہیں جو حضورﷺ نے کئے' کہے' یا جو امور آپ نے پسند فرمائے۔ زیادہ تر مسلمان احادیث کو قرآن کی تفسیر خیال کرتے ہیں۔ اسلامی اصول فقہ میں قرآن مسلمانوں کے طرز عمل کی ہدایات دیتا ہے۔ لیکن اس میں بہت سے امور کے متعلق مخصوص اصول نہیں ہیں۔ اسلامی شریعت اور اسلامی قانون کا نوے فیصد حصہ حدیث کے زیر اثر تشکیل دیا گیا ہے۔ اس (نوے فیصد حصہ) میں بھی زانی' مرتد' جہاد اور عورتوں سے برتاؤ کرنے کے قوانین زیادہ تر اختلافی اور متنازعہ فیہ ہیں۔ (ترجمہ ختم ہوا)۔

اب آپ روزنامہ ایکسپریس کا تراشہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

ترکی میں احادیث کے از سرِ نو جائزے اور تشریح کی تیاری

بعض احادیث رسول ﷺ سے منسوب کردی گئیں مختلف نسلوں نے سیاسی مقاصد کے لئے تبدیلیاں کیں اسکالرز

انقرہ (ایکسپریس نیوز ڈیسک) ترکی میں ایک دستاویز کی تیاری کی جارہی ہے جس میں اسلام کی از سرِ نو تشریح اور مذہب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بات کی گئی ہے اس دستاویز کو انقلابی قرار دیا جارہا ہے وزارت مذہبی امور نے انقرہ یونیورسٹی میں علماء کی ایک ٹیم کی خدمات حاصل کی ہیں جسے احادیث کا از سرِ نو جائزہ لینے کا کام سونپا گیا ہے ترک حکومت کا دعویٰ ہے کہ بہت سی ایسی احادیث ہیں جن کے بارے میں خیال کیا جارہا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب کردی گئی ہیں اور بہت سی ایسی احادیث ہیں جن کی از سرِ نو تشریح کی ضرورت ہے بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ اسلام کے عقائد کی از سرِ نو تشریح کی جارہی ہے تاکہ مذہب کی تجدید کی جاسکے احادیث پر از سرِ نو نظر ڈالنے کی ضرورت کی حمایت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اسلام میں دلیل اور منطق جو 14 سو سال پہلے اس کی بنیاد میں شامل تھی اسی روح کو تلاش کیا جارہا ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ترکی میں مذہب میں اصلاحات کا آغاز ہے انقرہ یونیورسٹی کے مذہب کے شعبے میں احادیث کا باریکی سے جائزہ لیا گیا ہے اس منصوبے کے مشیر کورمز کا کہنا تھا کہ بہت سی ایسی احادیث بھی ہیں جن کے بارے میں یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ وہ پیغمبر ﷺ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد وجود میں آئیں اصلاحات کے حامیوں کا استدلال ہے کہ اسلامی اقدار کو مختلف ادوار میں دیگر ثقافتوں نے (جن میں سے اکثر قدامت پسند تھیں) بتدریج اپنے سماجی مفادات اور مقاصد کے لئے استعمال کیا احادیث کا نئے سرے سے جائزہ لینے والوں کا کہنا ہے کہ مختلف نسلوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے احادیث میں تبدیلیاں کیں اور انہیں پیغمبر اسلامؐ سے منسوب کر دیا۔ ترکی کا ارادہ ہے کہ صدیوں کی ان ثقافتی تحریفوں سے جان چھڑائی جائے اور اسلام کی اصل اساس کی طرف لوٹا جاسکے پروفیسر محمد گومیز ترکی کے محکمہ مذہبی امور کے ایک سینئر اہلکار ہیں اور

احادیث کے عالم بھی ہیں' انہوں نے کہا کہ اصلاح حدیث منصوبے کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ احادیث کا ازسرِ نو جائزہ لینا درست ہے اور ایسا جامع تحقیق اور مطالعے کی بنیاد پر کیا جا رہا ہے' پروفیسر گورمیز نے کہا کہ پیغمبرﷺ نے ایک خطبے میں فرمایا کہ انہیں اس دن کا شدت سے انتظار ہے جب خواتین تنہا لمبے سفر پر جا سکیں گی' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامﷺ کا مقصد کیا تھا' انہوں نے کہا کہ اس طرح کی پابندی ابھی تک کتابوں میں موجود ہے اور یہ عورتوں کے آزادانہ سفر پر قدغن لگاتی ہے' ترکی نے اصلاحات کے پروگرام کے تحت ساڑھے چار سو خواتین کو مذہب کی تعلیم دے کر انہیں واعظ بنایا ہے' ان خواتین کو ترکی کے وسیع دیہی علاقوں میں عورتوں کو مذہب کی روح سے روشناس کرانے کا کام سونپا گیا ہے' لندن میں قائم چیتھم ہاؤس کے ترک امور کے ماہر ہاکورا کے مطابق ترکی اسلام کو ازسرِ نو دریافت کر رہا ہے۔

(ایکسپریس نیوز' 28-02-2008)

آپ نے ترکی سے متعلق دونوں اخبارات کے تراشے ملاحظہ فرمائے۔

ترکی میں موجودہ کشمکش کو سمجھنے کے لئے' اس کشمکش کا پس منظر پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے اس کا مختصر ترین پس منظر (Back Ground) پیش خدمت عالی ہے۔

ترکی میں سلطنت عثمانیہ کی بنیاد ایک ترک غازی عثمان نے 1299ء میں ڈالی تھی۔ سلطان مراد اول' سلطان بایزید' سلطان محمد فاتح کے ادوار میں اس حکومت نے بہت ترقی کی اور سترہویں عیسوی کے آخر تک سلطنت عثمانیہ تین براعظموں ایشیا' یورپ اور افریقہ پر مسلمانوں کی سب سے بڑی اور مدت کے اعتبار سے طویل سلطنت بن گئی۔ سترہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ کے زوال کے آثار نمودار ہوئے۔ 1683ء میں اس کو آسٹریا اور 1717ء میں اس کو ہنگری سے شکست اٹھانا پڑی۔ سب یورپی طاقتیں خلافتِ عثمانیہ کو ''یورپ کا مردِ بیمار'' شمار کرنے لگیں۔ اس سلطنت کے گرد و نواح میں جدید جمہوری حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ آئینی'

قانونی اور انسانی اقدار کے تقاضوں کی بنیاد پر ان ریاستوں میں مزید اصلاحات ہوتی چلی جا رہی تھیں لیکن ترکی میں وہ پرانا فقہ بطور قانون کے رائج تھا جس میں جمہوری' آئینی اور دستوری طرز حکومت کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سابقہ فقہ کو نافذ کرنے سے بادشاہوں کو دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو ان کے جبر و تشدد اور استبداد کا جواز مہیا ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہ اسلامی قانون کے نفاذ کا تمغہ Credit حاصل کرتے ہیں۔ ترکی میں یہی صورتِ حال تھی۔ اس کے خلاف سب سے پہلے ابراہیم شناسی آفندی نے تحریک انقلاب کی آواز بلند کی۔ جون 1862ء میں انہوں نے ''تصویرِ افکار'' نام کا اخبار شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد ''جدید عثمانیوں'' نے سیاسی مجتہدانہ فضا قائم کی۔ فواد پاشا صدرِ اعظم اور عالی پاشا وزیر خارجہ کی حکومت میں 3 جون 1865ء کو ایک خفیہ تنظیم قائم کی گئی جس کے یہ تین مقاصد تھے۔

(۱) حکومتِ وقت میں اصلاحات کی جائیں۔

(۲) بادشاہت کا خاتمہ کیا جائے۔

(۳) آئینی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔

اس دور میں ضیاء پاشا اور علی سعادی آفندی نے بڑا نام پایا۔ اور اجتہاد پر سخت اصرار کیا۔ اجتہاد کی حامی اس انقلابی تحریک کو اس وقت اور بھی مدد ملی جب 1866ء میں شاہی خاندان کے شہزادے مصطفیٰ پاشا نے اس کی حمایت کرنی شروع کر دی۔ وہ جلا وطن ہو کر پیرس چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے سلطان کے نام ''کھلا خط'' لکھا جسے ترکی کے انقلاب میں سنگِ میل کا درجہ دیا جاتا ہے۔ 1897ء میں مراد بے نے ایک کتاب شائع کی جو اس دور کے ''جوانانِ ترک'' کے خیالات کی ترجمان تھی۔ اس کتاب میں مراد بے نے ترکی کے زوال کی ساری ذمہ داری سلطان عبدالحمید اور یورپی طاقتوں پر ڈال دی۔ خلیفۃ المسلمین اور علماء سے مایوس ہو کر' جن تعلیم یافتہ لوگوں نے ترکی کو بچانے کی کوشش کی وہ ''نوجوانانِ ترک'' کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ خلیفۃ المسلمین کی منافقانہ چالوں' اسلام کے استحصال اور حالات کی نزاکت سے تنگ آ گئے تھے انہوں

نے پہلے 1896ء میں ناکام فوجی بغاوت میں حصہ لیا مگر جولائی 1908ء میں وہ کامیاب ہو گئے۔انہوں نے خلیفہ کو مجبور کر کے آئین بحال کرالیا۔اس کو ینگ ترک ریولیوشن" Young Turk Revolution کہا جاتا ہے۔ان"نوجوانان ترک" نے ترکی میں اصلاحات کرنی شروع کیں تو ان کو واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ خلافتِ عثمانیہ میں جو شریعت نافذ تھی اس کا قرآن وسنت سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ چنانچہ ان"نوجوانانِ ترک" نے اپنے ہاں رائج فقہی تصورات کا تجزیہ کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ جس فقہ کو وہ رائج کئے ہوئے تھے وہ صرف قدیم فقہا کے آراءاوراجتہادات تھے جوان کے اپنے قیاس پر مبنی تھے جس فقہ کو فقہ حنفی کہا جاتا ہے وہ دراصل امام ابو حنیفہؒ کے اجتہادات سے ستر فیصد مختلف ہے اور اس میں امام ابو حنیفہؒ کا حصہ (Contribution) صرف تیس (30) فیصد ہے۔اس مروجہ فقہ کی تدوین امام ابوحنیفہ کے بعد ان کے شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد نے کی تھی۔ نیز انہیں اس بات کا بھی علم ہوا کہ یہ فقہ اس وقت مدون ہوئی جب ملوکیت اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ملوکیت کو امام ابوحنیفہؒ نے خلاف اسلام قرار دیا تھا۔اس کے تحت ملازمت کرنے کو ناجائز گردانا تھا۔انہوں نے ملوکیت اور ملکیتِ زمین دونوں حرام قرار دی تھیں۔لیکن جب ابو یوسف قاضی القضاہ ہوئے تو انہوں نے ان کو جائز قرار دے دیا۔

"ترک نوجوانان" کے بعد وہ بلند ترین شخصیت جسے ترکی میں اجتہاد کا بانی کہا جا سکتا ہے وہ محمد ضیاء بے ہیں۔ جو ضیاء گوکلپ کے نام سے مشہور ہیں۔وہ 1875ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے علاقہ دیار بکر میں پیدا ہوئے۔وہ علامہ اقبالؒ کے ہم عصر تھے۔انہوں نے 49 سال کی عمر میں 1924ء میں وفات پائی۔انہوں نے استنبول میں تعلیم حاصل کی۔وہ جنگ عظیم اول میں انور پاشا کی حکومت کے طرفدار تھے۔ بعد میں وہ مصطفیٰ کمال پاشا پیپلز پارٹی (Peoples Party) کے رکن بنے۔انہوں نے ترک نیشنلزم کی فکر کو جنم دیا اور اپنے اشعار کے ذریعے اپنے فکر کو عام کیا۔اکتوبر 1923ء میں مصطفیٰ کمال کی قیادت میں جو جمہوریہ ترکیہ قائم ہوئی وہ ان کے افکار کا ہی

نتیجہ تھی وہ فقہ، تصوف، علم کلام کو فرسودہ روایات کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ وہ اجتہاد اور تحقیق کے قائل تھے۔ ضیاء گلوکلپ نے ترکوں پر زور دیا کہ وہ عربی، فارسی اور ترکی اثرات کو، جو اسلام پر چھا گئے ہیں انہیں دور کریں اور خالص اسلام کو اس کی تابندگی اور درخشندگی کے ساتھ ظاہر کریں۔ ان کا نظریہ تھا کہ ترکی کے جدید مفکرین کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ تحقیق کریں کہ اصل اسلام کیا ہے اور اس پر فارسی، عربی، ترکی، روایات نے کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔

ضیاء گوکلپ کے بعد ترکی کے مفکرین میں سعید حلیم پاشا کا مرتبہ نہایت بلند و نمایاں ہے۔ انہوں نے قدیم فقہ کو موجودہ ترکی کے مسائل حل کرنے کے لئے بالکل غیر مفید ثابت کیا اور فقہ جدید کی تدوین پر اصرار کیا۔ ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ نے سعید پاشا کی جدوجہد اور ان کے افکار کی بہت تعریف کی ہے جس کا تذکرہ رسالہ طلوع اسلام میں بہت مرتبہ آیا ہے۔ سعید حلیم پاشا کے افکار کی ترویج و تشہیر کے باعث ترکوں نے مذہبی و سیاسی اجتہاد میں جو کام کئے ان میں ان کے دو گروپ بن گئے۔ ایک حزبِ وطن تھا اور دوسرا گروہ حزبِ اصلاحِ مذہب تھا۔ یہ دونوں گروہ سلطنت عثمانیہ میں مروجہ قدیم فقہ کے مخالف تھے اور اسی فقہ کو اپنے زوال کا باعث گردانتے تھے۔ چنانچہ حزبِ وطن نے تو کلی طور مذہب سے ہی انکار کر دیا۔ اور ترکی کے سیکولر ہونے کے قائل ہو گئے۔ جبکہ حزبِ اصلاح مذہب جس کے نمائندے سعید حلیم پاشا تھے وہ فقہ میں اصلاح کا قائل تھا۔ سعید حلیم پاشا ترکی کے وزیر اعظم بھی تھے ان کا خیال تھا کہ قانونِ شریعت کی ازسرِ نو تشکیل، جدید افکار اور تجربات کی روشنی میں کی جانی چاہئے۔ 1717ء تا 1919ء کے دوران قومی اور بین الاقوامی واقعات نے اسلام پر پڑے ہوئے فقہی جمود کو توڑ کے رکھ دیا اور ترکوں پر اسلام کی صحیح تعلیم واضح ہو گئی۔ چنانچہ اس علمی و فکری بیداری کے بعد یکم نومبر 1922ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی Grand National Assembly نے تین قراردادیں منظور کیں۔

(1) سلطنت ختم کی جاتی ہے۔

(2) اب خلافت کا حق ریاست جمہوریہ ترکیہ کو حاصل ہو گیا ہے۔

(3) گرینڈ نیشنل اسمبلی، خاندانِ عثمانیہ میں سے سب سے بڑے عالم اور قابل شخص کو خلیفہ منتخب کرے گی۔

یہ گرینڈ نیشنل اسمبلی کے وہ اجتہادات ہیں جو اب بھی تاریخ میں ثبت ہیں۔ خلافت کسی فرد کے بجائے قوم کی منتخب اسمبلی کا حق تسلیم کر لی گئی۔ اب اس اسمبلی کو اختیار تھا کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کرے۔ چنانچہ 1922ء تک تقریباً بارہ سو سال سے جو ملوکیت اور شخصی خلافت قرآن کے خلاف فقط فقہ کے جواز پر چلتی رہی وہ 1922ء میں منقرض ہوگئی۔

جنگ عظیم اول میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا لیکن مصطفیٰ کمال نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا تھا جس کے سبب ان کے انور پاشا سے سخت اختلافات ہو گئے کیونکہ انہیں جرمنی کی شکست کا یقین تھا۔ جرمنی اور ترکی کی شکست کے بعد اپریل 1920ء کو مصطفیٰ کمال نے انقرہ میں گرینڈ نیشنل اسمبلی کا اجلاس طلب کیا، یہ اجلاس انقرہ کی سب سے بڑی مسجد حاجی بیرم ولی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مصطفیٰ کمال کو گرینڈ نیشنل اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا۔ 29 اکتوبر 1923ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعے ترکی کو جمہوریہ قرار دیا گیا اور مصطفیٰ کمال کو اس کا پہلا صدر بنایا گیا۔

ان انتہائی تشویشناک حالات میں ترکی میں مصطفیٰ کمال ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ ترکی پر جو چاروں طرف سے یلغار تھی انہوں نے اس کا دفاع کیا اور غازی کہلائے۔ انہوں نے قوم کو آزادی دلائی، آمریت کو ختم کیا اور جمہوریت قائم کی اور قوم سے اتاترک کا خطاب حاصل کیا۔ گذشتہ دو سو سال کے دوران خلیفہ وقت اور علماء نے تنگ نظری اور رجعت پسندی کی وجہ سے نہ تو اجتہاد کرنے دیا تھا اور نہ اسلام کی تعبیر نو کی اجازت دی تھی۔ جس کے نتیجہ میں ایک عظیم الشان سلطنت عثمانیہ کفر کے قبضہ میں چلی گئی۔ اپنے اقتدار کے ابتدائی دور میں مصطفیٰ کمال نے ضیاء گلوکلپ اور سعید حلیم پاشا کے افکار و نظریات کی راہنمائی میں نئے اجتہاد سے کام لے کر ایک جدید اسلامی جمہوری ریاست قائم کرنے کی کوشش کی لیکن شیخ الاسلام اور علماء

نے ان کو اس کی اجازت ہی نہیں دی کیونکہ اجتہاد کرنے سے سابقہ فقہ ختم ہو جاتا ہے اور فقہ کے ختم ہو جانے سے علماء کی موت واقع ہوتی ہے۔ علماء کا وجود تو احادیث و فقہ سے ہی قائم ہوتا ہے۔ اگر آپ ان کو مسترد کر دیں تو علماء کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ علماء کی اس ضد' ہٹ دھرمی اور تنگ نظری سے پریشان ہو کر بالآخر مصطفیٰ کمال نے ترکی کو سیکولر حکومت قرار دے دیا۔

ترکی میں رجعت پسندی اور اجتہاد کی کشمکش کی مختصر ترین سرگذشت پیش خدمت عالی کی گئی ہے۔ ان دو سو سال کے عرصہ میں علماء نے حد درجہ یہی کوشش کی کہ ترکی میں اجتہاد نو نہ ہو۔ ہمارے علمائے کرام یہ تو برداشت کر لیتے ہیں کہ حکومت سیکولر ہو جائے اور اسلام کی بساط لپیٹ دی جائے' لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ فقہ میں اجتہاد نو کیا جائے۔

صدر اول کے بعد سے ہمارے دور میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمان اسلام کو بطور دین کے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس بات کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کر رہے ہیں۔ اگر اس وقت پھر مذہب کو ہی دین بنا کر نافذ کیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ ناکامی ہو گا اور اس کے بعد کئی صدیوں تک مسلمانوں کو دین کے قیام کی ہمت نہیں ہو گی۔ سوڈان میں جنرل نمیری نے فقہ پر مبنی شریعت کو نافذ کیا تھا۔ اس میں نہ قرآن کریم سے کوئی راہنمائی تھی اور نہ ہی اجتہاد کیا گیا تھا۔ چونکہ وہ حالات حاضرہ کے مطابق نہیں تھی۔ اس لئے ناکام ہوئی۔ ایران کا انقلاب آپ کے سامنے ہے۔ وہاں کے علماء نے بھی اپنی تنگ نظری اور رجعت پسندی کی وجہ سے سابقہ فقہ جاری کیا۔ ترکی کے مفکرین نے سوڈان اور ایران کی ناکامی سے سبق حاصل کیا تو وہ شاید اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائیں لیکن بظاہر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی کیونکہ ان کے سامنے نہ تو قرآن خالص ہے اور نہ ہی دین کا تصور۔ ان کے موجودہ اہداف قرآن کی تعبیر نو اور احادیث کی صحت و سقم کا جائزہ لینا ہے۔ قرآن کی تفسیر نو صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب قرآن کے اصول تفسیر تبدیل کئے جائیں ہمارے مفسرین کرام ایک ہزار سال سے جن اصولوں پر تفسیر کرتے چلے آ رہے ہیں' بنیادی طور پر وہ اصول ہی غلط ہیں۔ ان اصولوں کے ماتحت تفسیر نو ہو ہی نہیں سکتی۔ اصل مسئلہ احادیث کے صحیح و غلط

ہونے کا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ حدیث قانون کا ماخذ ہے یا نہیں۔ اگر حدیث صحیح بھی ہے تب بھی وہ قانون کا ماخذ نہیں ہوسکتی۔ قانون کا ماخذ صرف اور صرف قرآن ہے حدیث کو قانون کا ماخذ تسلیم کرنے سے ہی اسلامی قانون قرآن کے خلاف جاتا ہے۔ اسی طرح اجماع و قیاس کو بھی ماخذ قانون تسلیم کرنے سے اسلامی قانون جامد ہو جاتا ہے۔ ترکوں کے پیش نظر جو اہداف ہیں' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ درست راہ پر گامزن نہیں ہیں۔ خوب یاد رکھیں کہ جب تک مسلمان احادیث اور فقہ کا کابوس اپنے اوپر سے نہیں اتارتے وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

اسلام کو بطور دین نافذ کرنے کا معیار و میزان یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہو اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پھر انفرادی پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کا دوسرا معیار یہ ہو کہ اس حکومت کے قیام سے قرآن کریم میں دیئے گئے خدا کے وعدے پورے ہوتے ہیں۔ اگر اس نظام کے ذریعے قرآن کریم کے یہ وعدے پورے ہو رہے ہیں تو سمجھ لیں کہ واقعاً ہم نے دین قائم کر دیا ہے اور اگر وہ وعدے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو ہمیں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہئے کہ ہم قرآن پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا Pragmatic Test ہے جو ہمیں کسی اشتباہ میں نہیں چھوڑتا۔ قرآن کریم کا ایک وعدہ یہ ہے کہ قیام دین کے بعد ہر شخص کو رزق مہیا ہو گا۔ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6:151)۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ قرآن کا دوسرا وعدہ یہ ہے کہ دین کے قیام سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگا بلکہ یہ کہ غلبہ و اقتدار صرف اور صرف مسلمانوں کا خاص حق ہوگا۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (63:8)۔ (ترجمہ) ''عزت'' صرف اللہ کے لئے ہے' اس کے رسول کے لئے' مومنین کے لئے۔ یہاں لامِ حصر لا کر واضح کر دیا کہ غلبہ صرف مسلمانوں کو ہی رہے گا باقی اقوام سب ان کی محکوم و مغلوب ہوں گی۔ قرآن کریم کا تیسرا وعدہ یہ ہے کہ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً (24:55)۔ اس نظام میں پوری طرح امن ہوگا۔ آج انسانیت امن کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اس نظام کے ذریعے ترکی میں بھی امن ہوگا اور

ترکی اس امن کوExport بھی کرے گا۔ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً (3:97)۔ جو اس نظام میں داخل ہوگیا وہ امن میں آ گیا۔ ترکی میں یا جہاں بھی قیام دین سے یہ وعدے پورے ہو رہے ہوں وہ یقیناً قرآن کا نظام ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک وعدہ پورا نہیں ہو رہا ہے تو سمجھ لیجئے کہ دین کا قیام نہیں ہوا ہے۔

دین کا یہ واضح تصور پوری امت مسلمہ میں کہیں نہیں ہے۔ یہ صرف اور صرف تحریک طلوع اسلام کو اس کا شرف حاصل ہے کہ وہ قرآن کی اصل تعلیم تک پہنچ پائی ہے۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ خاص اس نقطہ ماسکہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور اس کو پاکستان میں بھی عام کریں اور ترکی تک اس آواز کو پہچانے کی پوری پوری کوشش کریں۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ(41:33)۔

اس سے بہتر کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی طرف بلائے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

التحریر الیسیر فی اصول التفسیر

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرما کر انسانیت کے لئے اپنی نعمت پوری کر دی۔ اس نعمت کا نتیجہ تھا کہ صدر اول میں مسلمانوں نے اسی پر عمل کر کے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو انسانیت کے لئے سکون و اطمینان کا ضامن تھا۔ چونکہ ان حضرات کا سارا انحصار قرآن کریم پر ہی تھا اس لئے سب سے پہلے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تفاسیر لکھی جانی شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلی تفسیر جو ہمارے دینی لٹریچر میں اس وقت موجود ہے وہ تفسیر طبری ہے جو تقریباً 300 ہجری میں تحریر کی گئی اس کے بعد دیگر تفاسیر بڑی تعداد میں تحریر کی گئی مگر سب کا انحصار زیادہ تر اسی تفسیر پر تھا۔

ہمارے ہاں جو تفاسیر تحریر کی گئی ہیں ان کو تحریر کرنے سے پیشتر قرآن فہمی کے اصول مقرر نہیں کئے گئے تھے اور بغیر اصول مقرر کئے۔ تفاسیر کے انبار کے انبار لگا دیئے گئے۔ ابتدا سے ہی تفسیر تحریر کرنے کا ایک یہی طریقہ چلا آ رہا ہے کہ سب سے پہلے آیت کریمہ کا شان نزول معلوم کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس سے متعلقہ احادیث مبارکہ تلاش کی جاتی تھیں۔ جن سے اس آیت کریمہ کی تشریح ہوتی تھی۔ سب سے بڑا عالم اور مفسر وہ شمار ہوتا تھا جو اس آیت کریمہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ احادیث مبارکہ جمع کر سکے اور ان میں سے صحیح ترین احادیث کا انتخاب کر کے ان کو تحریر کر دے۔ یہ طریقہ تفسیر زیادہ تر اس وجہ سے اختیار کیا گیا تھا کہ ہم مسلمانوں میں ایک عام عقیدہ یہ تھا کہ حدیث بھی وحی (خفی) ہے اور یہ وحی خفی، قرآن کریم کی، جو کہ خود وحی جلی ہے، تفسیر کرتی ہے۔ چنانچہ اسی عقیدہ کو بنیاد بنا کر یہ تمام تفاسیر تحریر کی گئی تھیں، اور آج تک اسی اساس و بنیاد پر تحریر کی جا رہی ہیں۔ اسی وحی خفی کی بناء پر ان آیات کی تفسیر کی گئی ہے جو حضور ﷺ سے عرصہ دراز

پیشتر سے متعلق تھیں۔ مثلاً حضرت آدم کا قد' ان کا لنکا میں ہبوط' حضرت نوح کی کشتی کی پیمائش' کشتی میں سوار جوڑوں کی تفاصیل' حضرت مریم علیہا السلام کے ہاں جو کھانے آتے تھے ان کے نام' امی موسیٰ سے متعلق صد ہا روایات' یا آئندہ سے متعلق دجال' دابۃ الارض' نزول عیسیٰ آمد مہدی سے منسوب روایات' ان سب کا تعلق اور مدار وحی خفی کے عقیدہ پر تھا' لیکن اگر یہ عقیدہ کہ حدیث بھی قرآن کی مثل وحی ہے' غلط گردانا جائے' تو تفاسیر کا یہ تمام حصہ از خود ساقط ہو جاتا ہے اور اس کی اہمیت ایک پرکاہ کے برابر بھی نہیں رہتی۔

جہاں تک شان نزول کے نظریہ کا تعلق ہے وہ خود قرآن فہمی میں ایک رکاوٹ بنتا ہے جو صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے قرآن کے قریب نہیں آنے دیتا۔ قرآن کریم' اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی تدبیر امور کے مطابق نازل ہوا ہے وقتی حادثات و واقعات یا چند مخصوص افراد و شخصیات کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات کا نزول نہیں ہوا۔ اگر وہ حادثہ و قضیہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا وہ آیت نازل نہیں ہوتی۔ یا اگر زیادہ واقعات رونما ہوتے تو کیا زیادہ آیات کا نزول ہو جاتا۔ اگر واقعہ افک قصہ مباہلہ واقعہ مغافیر وغیرہ واقعات رونما نہ ہوتے تو کیا یہ آیات کریمات نازل نہ ہوتیں' شان نزول کے عقیدہ سے قرآن کریم کے احکامات کی ابدیت' عمومیت اور اس کی عالمگیریت ختم ہو جاتی ہے اور آیت کریمہ صرف ایک واقعہ یا چند افراد سے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہے۔ مزید یہ کہ کسی بھی آیت کا شان نزول یقینی نہیں ہے۔ اکثر آیات کے کئی کئی شان نزول ہیں اور مختلف فرقوں کے بالکل مختلف شان نزول ہیں۔ جن کی وجہ سے صحیح صورت حال کا معلوم ہونا بالکل ناممکن ہے۔ قرآن کریم کی آیات یقینی اور حتمی ہیں۔ جبکہ روایات اور شان نزول بالکل ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ اس صورت میں آیات کا مدار روایات اور شان نزول پر رکھنا بالکل غیر مناسب اور عقل کے خلاف ہے۔

قرآن کریم کی رو سے انبیاء کرام کے دو بہت اہم اور بنیادی فرائض ہوتے تھے۔ ایک تو وحی الٰہی کی تبلیغ۔ اگر دحی چلتی تلواروں کے دوران بھی نازل ہوتی تھی تو نبی کا فرض تھا کہ اس کو فوراً

امت تک پہنچادے۔یا ایھا النبی بلغ ما انزل الیک من ربک(۵/۶۷)۔ اے رسول، جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس کو پہنچادو دوسرا فرض نبی کا یہ ہوتا تھا کہ اس وحی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل فرمائے اور اس نظام کو دیگر نظامہائے حیات پر غالب کردے ھو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظھره علی دین کله (۹/۳۳) اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کردے۔ ان ہی دونوں احکامات کے پیش نظر حضور نے تبلیغ وحی کے ساتھ ساتھ معاشرہ بھی قائم کیا اور قرآن حکیم کے احکامات اس میں جاری فرمائے۔ حضور نے اپنے زندگی کے دوران جو دین قائم فرمایا اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت کے مرادف تھی۔ خلافت راشدہ کے دوران بھی وہ دین قائم رہا اور قرآن کریم کا نظام جاری رہا۔ مسلمانوں کی، بلکہ پوری انسانیت کی بدقسمتی کہ وہ نظام درہم برہم ہوگیا اور مسلمانوں میں ملوکیت قائم ہوگئی۔ ملوکیت قائم ہونے کے بعد دین کی بجائے مذہب نے غلبہ پایا۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت بھی بجائے نظام کی اطاعت کے قرآن وحدیث کی اطاعت قرار پائی۔ کہ قرآن کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت مقصود ہوتی تھی اور حدیث کی اطاعت سے رسول کی اطاعت۔ ملوکیت، مذہب، اور ان تمام خلاف قرآن نظریات کے فروغ پانے کے بھی دوسوسال بعد ہمارے ہاں تفاسیر تحریر ہونی شروع ہوئیں۔ ان تفاسیر میں بھی قرآن کریم کو مذہب کی حیثیت سے ہی پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ قرآن کریم کا کوئی تعلق مذہب سے نہیں۔ جب یہ تفاسیر تحریر کی گئیں اس وقت اسلامی نظام، خلافت، اور دین کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ قرآن کریم خود زندگی ہے اور مردہ قوموں کو زندگی بخشندہ جب کہ ان تفاسیر میں قرآن کریم کو ایک مذہب کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام تفاسیر میں ملوکیت، پیشوائیت، جاگیرداری، بردہ فروشی، جیسے خلاف قرآن نظریات کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ اور قرآن کریم کی صحیح تعلیم، جو کہ حرارت بخش، اور پوری انسانیت کے لئے حلال المشکلات ہے، اس کی ان تفاسیر قرآن میں ایک رمق تک باقی نہیں رہی۔

ان اصولی خامیوں و نقائص کے علاوہ جو ایک نقص سابقہ تفاسیر میں ہے وہ عقیدہ نسخ کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آیت نے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ عموماً طریقہ کسی حکم یا قانون کو منسوخ کرنے کا یہی ہے کہ اس بات کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ اس قانون کے وضع کرنے سے فلاں سابقہ قانون منسوخ شمار کیا جاتا ہے۔ تو اس طرح کسی قسم کا ابہام و التباس باقی نہیں رہتا۔ لیکن نسخ آیات کے متعلق عجیب عقیدہ اختیار کیا گیا کہ کسی آیت میں اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ اس آیت نے کون سی آیت کو منسوخ کیا۔ یا یہ آیت کسی آیت سے منسوخ ہے۔ بلکہ علی العموم یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ چند آیات نے دوسری چند آیات کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس سے جو ابہام، تضاد اور تناقض واقع ہوتا ہے وہ بدیہی ہے۔ بعض مرتبہ منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو (500) تک پہنچ گئی۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ان کی تعداد کم کر کے صرف پانچ تک رہنے دی۔ بلکہ جن لوگوں نے اس عقیدہ ناسخ و منسوخ کے متعلق کتابیں تحریر کیں ان کی تو کوشش یہی رہی کہ زیادہ سے زیادہ آیات کو منسوخ دکھائیں۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک تو نصف سے زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں۔ بہرحال اس غیر مناسب، خلاف قرآن نظریہ کی وجہ سے تفسیر میں عجیب کشمکش واقع ہوتی ہے، جو قرآن فہمی میں ایک زبردست رکاوٹ ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے خود قرآن فہمی کے چند اصول مقرر فرما دیئے ہیں۔ مگر اس بات پر تعجب و تحیر ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے ان اصولوں کو اس طرح نظر انداز کیا ہے کہ گویا وہ ان کے لئے قابل اعتناء ہی نہیں تھے۔ سب سے پہلے قرآن کریم نے یہ واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ ہر رسول کی کتاب اس کی مخاطب قوم کی زبان میں آئی ہے وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم (14:4) اور ہم نے جتنے رسول بھی بھیجے ہیں وہ اپنی قوم کی زبان میں پیغام حق پہنچاتے تھے تا کہ وہ اس طرح لوگوں پر قوانین خداوندی کو واضح کر دیں اور یہی اصول حضور کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا کہ جب فرمایا فو رب السماء و الارض انه لحق مثل ما انتم تنطقون

(51:27) پس زمین و آسمان کا رب گواہ ہے کہ بیشک یہ (قرآن) سچ ہے اور اس کے مانند و مثل ہے جو کچھ کہ تم بولتے ہو۔ قرآن کریم کا انداز بیان بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح تم گفتگو کرتے ہو۔ اس لئے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے محاورہ عرب کا خیال رکھنا اور اس پر مہارت' عارست اور عبور ہونا ضروری شرط ہے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ محاورہ عرب کو پیش نظر رکھنا لازمی چیز ہے۔ اس کے الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھا جائے اور اس کے مطابق اس کا مفہوم اخذ کیا جائے۔

دوسرا اصول جو خود قرآن کریم کا مقرر کردہ ہے وہ تصریف آیات کا اصول ہے۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک مضمون کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے۔ کہیں اس کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے اور مختلف مقامات پر اس کی تفصیل دیتا ہے۔ ہمارے مفسرین کرام سے یہ بھی تسامح ہوا کہ انہوں نے قرآن کریم کو بچوں کے کورس کی طرح کی کتاب سمجھ کے اس کی تفسیر کرنی شروع کی اور ایک ایک آیت کا مفہوم بیان کرنا شروع کیا۔ اس سے آیات تو شاید سمجھ میں آ سکتی ہوں۔ لیکن قرآن کریم کی مجموعی تعلیم سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تصریف آیات خود قرآن کا متعین کردہ طریقہ ہے۔ جب اس نے فرمایا کہ انظر کیف نصرف الآیات ثم ھم یصرفوں 6:46 دیکھو کس کس طرح ہم اپنی آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں مگر پھر بھی وہ اعراض کرتے ہیں۔ اس آیت سے واضح ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تصریف آیات لازمی چیز ہے اور جو قرآن فہمی میں تصریف آیات سے کام نہیں لیتا وہ قرآن سے اعراض کی راہ اختیار کرتا ہے اور یہی طریقہ خود حضور کا بھی تھا جب قرآن کریم نے فرمایا و کذالک نصرف الایت ولیقولوا درست ولنبینه لقوم یعلمون 6:105 اور اے رسول ہم اسی طرح آیات کو بار بار لاتے ہیں تا کہ لوگ کہہ دیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا ہے اور تا کہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دیں۔ ان تینوں آیات کریمات سے معلوم ہوا کہ قرآن فہمی کا طریقہ تصریف آیات ہے اور نیز یہ کہ حضور خود بھی تصریف آیات کے ذریعے قرآن سمجھتے تھے اور لوگوں کو بھی اسی تصریف آیات کے طریقہ سے قرآن سمجھاتے تھے۔

قرآن کریم نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم کی تبیین وتشریح خود قرآن کے اندر ہے اس سلسلہ میں چونکہ آیات بہت ہیں اس لئے ان کا سب کا درج کرنا طوالت کا باعث ہے۔ ان میں سے چند کے حوالہ جات دیئے جاتے ہیں۔ قارئین کرام خود ان کو قرآن کے نسخہ سے ملاحظہ فرما لیں۔

(2:118,24:58,24:18,5:89,2:24,2:221,2:18)

وغیرہ نیز فرمایا ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدی من بعدما بینہ للناس فی الکتاب اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللعنون (2:159) بے شک جو لوگ اسے چھپاتے ہیں جو ہم نے نوع انسانی کے لئے واضح دلائل اور ہدایت نازل فرمائی ہے بعد اس کے کہ ہم نے اسے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی۔ اس آیت کریمہ میں ما بینہ للناس فی الکتاب کے الفاظ نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ قرآن کریم کی تشریح، توضیح اور تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے کر دی ہے اور فی الکتاب کے لفظ سے ثابت ہے کہ وہ کتاب میں ہے اس موضوع پر اس سے واضح اور کون سے الفاظ ہو سکتے ہیں جو یہ مفہوم و مضمون ادا کر سکیں اس آیت کریمہ کے بعد کتاب کی توضیح کتاب کے اندر ہونے سے بظاہر انکار کی قطعاً کوئی راہ نہیں رہتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ اپنی کتاب کی تبیین خود ہم نے کتاب کے اندر کر دی ہے تو پھر کتاب سے باہر مزید کسی تبیین کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے اور اللہ کی تبیین کے بعد مزید تبیین کے کیا معنے؟

قرآن کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ اطاعت و اتباع صرف اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کا کیا جائے۔ اس کے علاوہ کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (7:3) جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے صرف اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ اولیاء کی پیروی نہ کرو۔ چونکہ قرآن

کریم اپنی کسی بات میں بھی کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہے اس لئے مندرجہ بالا آیت (7:3) کے مطابق قرآن فہمی کی اساس اول یہ ہے کہ قرآن کی بیان کی ہوئی جس چیز کی تفصیل درکار ہو' وہ قرآن سے ہی تلاش کی جائے۔ کیونکہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کر دی ہے جو علم وفہم رکھتے ہیں (6:99,6:68) قرآن کریم سے خارج نظریات کو قرآن کریم کی تفسیر میں شامل کرنے سے قرآن کریم کی اطاعت خالص نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دوسروں کی اطاعت شامل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم نے سورہ نور میں بہت واضح طور پر زانی کی سزا سو کوڑے مقرر فرمائی ہے' مگر ہمارے مفسرین کرام اور فقہاء عظام نے اس کی سزا سنگسار مقرر کی ہے۔ زانی کو سنگسار کرنے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ ان مفسرین اور فقہاء کی اطاعت ہوتی ہے جنہوں نے یہ سزا تجویز کی ہے اسی طرح قرآن کریم میں ارتداد کی کوئی سزا نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اسی طرح دیگر بے شمار مسائل ہیں یتیم پوتے کی میراث' غلام ولونڈیوں کا مسئلہ' وراثت کے خلاف قرآن حصص' اسی طرح عقائد میں' تقدیر کا عقیدہ' رویت باری' حیات ووفات مسیح' آمد مہدی' ایصال ثواب' شفاعت' دجال وغیرہ کے عقائد خارج از قرآن' موضوع احادیث پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خالص اطاعت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب قرآن کریم کی تفسیر صرف قرآن کریم کی دیگر آیات سے کی جائے اگر اس کی تفسیر میں خارج از قرآن مصادر پر انحصار کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت خالص نہیں رہے گی۔

قرآن کریم کا تیسرا مجوزہ اصول یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کا علمی احاطہ کیا جائے' کیونکہ اس کا وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو اس کا علمی احاطہ نہیں کرتے۔ فرمایا کہ بل کذبوا بما لم یحیطوا به علماً (10:39) 'قرآن کی ان لوگوں نے تکذیب کی جنہوں نے اس کا علمی احاطہ نہیں کیا۔ قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے کہ قرآن سمجھنے والے کی خود اپنی علمی سطح اس کے اپنے زمانہ کے لحاظ سے مستحکم ہو۔ وحی الٰہی کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں عقل انسانی مسئلہ کے اردگرد گھومتی رہے' اور اس مسئلہ کی گرفت نہ کر سکے' وحی الٰہی اس مسئلہ کی

گرفت کرا دیتی ہے۔ مختلف علوم کے ماہرین اپنے مخصوص علم میں مہارت کر کے پھر قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص پولیٹکل سائنس میں راہ نمائی حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس مضمون کی موجودہ کتب کا مطالعہ کرے' اور اس زمانہ کی علمی سطح تک جہاں یہ علم پہنچا ہے وہاں تک اپنا مبلغ علم بلند کرے اور وہ مسائل جن کو گرفت کرنے سے عقل انسانی قاصر ہے وہ اپنے سامنے رکھے۔ مثلاً اس مضمون میں یہی وہ اہم موضوعات ہیں جن میں اس مضمون کے ماہرین کا باہم اختلاف و تنازع ہے کہ قوم کی definition کیا ہے۔ قانون کیا ہے اور اس کے مصادر کیا ہیں۔ سٹیٹ کے ترکیبی عناصر کیا ہیں۔ سٹیٹ کا سیٹ سے کیا تعلق ہے۔ سٹیٹ کا فرد سے کیا تعلق ہے۔ فرد کا فرد سے کیا تعلق ہے۔ فرد مقصود بالذات ہے یا سٹیٹ وقس علی ھذا' یہ وہ مسائل ہیں جن میں آج عقل انسانی کو سخت اختلاف ہے۔ یہ مسائل پیش نظر رکھ کر جب پولیٹکل سائنس کا کوئی عالم قرآن کریم سے راہ نمائی تلاش کرے گا' تو جن آیات میں ان کا جواب ہو گا وہ آیات اس کے سامنے ابھر کر آ جائیں گی (Crop up ہو جائیں گی) اور اسے ان سوالات کے جواب ان آیات سے مل جائیں گے۔ کیونکہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے فادعونی استجب لکم مجھے پکارو میں جواب دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا جواب اس کے کلام سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ کسی اہم مسئلہ میں قرآن کریم سے راہ نمائی طلب کی جائے اور وہ اس کا جواب نہ دے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس علم سے ناواقف ہو اور وہ قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہے تو وہ ان آیات پر قطعاً تنبہ حاصل نہیں کرے گا۔ یہ طریقہ قرآن فہمی کا دوسرے علوم میں بھی لازم ہے۔ کیونکہ جب تک متعلقہ علم کا مسئلہ یا سوال ذہن میں نہ ہو وہ آیت جس میں اس کا جواب ہو گا' وہ نمایاں نہیں ہو سکے گی' اس لئے ہر دور کی علمی سطح حاصل کر کے ہی قرآن کریم سمجھ میں آ سکتا ہے۔

بر سبیل تنزل اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ احادیث مبارکہ قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس دور کی علمی سطح بہت پست تھی اور چونکہ مخاطبین کی علمی کیفیت فزوں و پست

تھی، اس لئے احادیث مبارکہ میں بھی ان کی ذہنی حالت کو سامنے رکھ کر ہی آیات کی تفسیر بیان کی گئی تھی جوان کے دور کے مطابق تھی لیکن وہ آئندہ ادوار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں قرآن کریم تو چونکہ وحی الہی ہے، اس کے مفاہیم ومعانی علمی سطح کے ساتھ ساتھ بلند ہوتے چلے جائیں گے، لیکن احادیث مبارکہ کی یہ صورت قطعاً نہیں ہو سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے شان نزول کا نظریہ شروع کیا اور روایات سے آیات کے مفہوم متعین کئے، ان کے سامنے قرآن کریم کی ابدیت سرمدیت، اور عالم گیریت تھی ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن کریم ان کے دور کے لئے ایک ہدایت وضابطہ مقرر ہوا ہے اور وہ ہی اس کا مفہوم اپنے حالات اور زمانہ کے مطابق مقرر کر لیں۔ انہوں نے اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا کہ قرآن کریم ایک ابدی ضابطہ ہے اور اس کا کسی ایک مقام اور زمانہ سے اختصاص نہیں ہے۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اس کے معانی و مفاہیم واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ اور نئے نئے معانی اس سے صادر ہوتے چلے جائیں گے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں تمام تفاسیر شان نزول کے مطابق اور روایات کی رو سے تحریر کی گئی ہیں اور اسی نقطہ نگاہ اور اسلوب کی حامل ہیں اور جب تک ہم اس طریقہ (Frame work) کو نہیں بدلیں گے، قرآن کریم کی تفسیر تصریف آیات سے نہیں کریں گے، قرآن کریم کا صحیح مفہوم اور اس کی درست تعلیم کسی طرح بھی حاصل نہیں کر سکیں گے قرآن کریم کے اصلی نظریات سے محروم رہیں گے اور قرآن کو مہجور بنائے رکھیں گے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم میں ربوٰ کی وضاحت اور اس کی مذمت

قرآن کریم اور احادیث نبوی میں ربوٰ کے متعلق بہت واضح احکام درج ہیں اور اس کی حرمت پر صدر اول سے لے کر آج تک مجموعی طور پر امت میں اتفاق رہا ہے لیکن اس پر اس نوعیت سے کبھی بھی غور و فکر نہیں کیا گیا جس طرح آج یہ مسئلہ زیر غور ہے۔ ہم مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے فوری بعد ملوکیت نے پوری طرح غلبہ و استیلاء حاصل کیا اور ملوکیت کے اسی غلبہ و استیلاء کے دوران اسلامی قوانین وضع ہوئے اور انہی قوانین کی بعد میں جمع و تدوین ہوئی۔ اول تو وہ دور تمدن کا بہت ابتدائی دور تھا اور اس زمانے تک بینکاری، انشورنس، وغیرہ ادارے قائم نہیں ہوئے تھے جس کی وجہ سے ربوٰ کی اس قدر اہمیت ہوتی کہ اس پر آج کل کی طرح غور و فکر کرنا پڑتا، تاہم جن کاروبار اور بیع و شریٰ کا اس دور میں رواج تھا ان میں ربوٰ کے عنصر کو اس طرح نظر انداز کر دیا گیا کہ ان کے متعلق کبھی یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ قرآن کریم کی رو سے وہ ربوٰ کی تعریف میں آتے ہیں۔ (تفصیل ان امور کی آگے آتی ہے) مسلمانوں کے قوانین، جنہیں فقہ اسلامی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے چونکہ ملوکیت کے دور میں مدون ہوئے اس لئے اس دور کے علماء نے ملوکیت اور ملوکیت سے ساز باز کرنے والے سب اداروں کا قوانین شرعی سے اس طرح جواز نکالا، کہ ملوکیت اور ان اداروں پر کسی طرح کی زد نہ پڑے اور بادشاہ وقت کو کسی مزاحمت سے دوچار نہ ہونا پڑے، اگر اس نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو ہمارے مروجہ فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف نظر آتا ہے۔ اس کے لئے بھی اگرچہ اصل وجہ تو ملوکیت ہی تھی، لیکن مزید وجہ یہ ہوئی کہ اس وقت تک عقل انسانی نے اتنی ترقی بھی نہیں کی تھی۔ آج سے ایک ہزار سال پیشتر ساری دنیا اور

بالخصوص یورپ میں بھی قوانین بہت سخت گیر اور بربریت پر مبنی تھے اسی طرح مسلم ممالک میں بھی اس دور کے فقہانے جو قوانین وضع کئے تو اپنے دور سے متاثر تھے اور وہ موجودہ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان قوانین میں عام شہری کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ عورتوں کے حقوق بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسی طرح ربوٰ کے احکام بھی وقت کے تقاضوں سے متاثر ہوئے اور جو صحیح نوعیت ربوٰ کی قرآن کریم کے مطابق تھی وہ نگاہوں سے مستور رہی۔

تمدن کی ابتداء سے ہی انسان نے یہ کوشش کی کہ ایسا معاشرہ تشکیل دیا جائے جس میں انسان سکون اور آرام کی زندگی بسر کر سکے اور زیادہ سے زیادہ افراد کو ان کے حقوق ملتے رہیں' اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ انسانی معاشروں نے اس طرح رفتہ رفتہ ترقی کی اور وقت کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہتر معاشرے تعمیر ہوتے چلے گئے۔ فلاسفہ یونان نے اپنے غور وفکر کا بیشتر حصہ اسی مسئلہ کے حل کرنے میں صرف کر دیا اور اپنے اپنے دور کے مطابق انہوں نے بھی مرفہ الحال ریاستیں قائم کیں۔ اس کے بعد رومتہ الکبریٰ میں اس سے بہتر تہذیب و تمدن نے راہ پائی۔ ہمارے دور میں مغربی اقوام نے بہترین معاشرے قائم کرنے کی کوشش کی۔ موجودہ دور میں جو بہترین معاشرے متشکل ہوئے ان میں جمہوریت اور اشتراکیت سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے اگر چہ اب اس پر تبصرہ کرنے کا وقت گذر گیا ہے۔ تاہم مضمون زیر عنوان کے حوالہ سے یہ بات تحریر کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے نظام میں ربوٰ سے اجتناب کیا اور پیدائش دولت کے وسائل افراد کی ملکیت سے نکال کر جماعتی اور اجتماعی ملکیت میں دے دیئے گئے اور ضروریات زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا کام بھی جماعت ہی کے سپرد ہوا۔ بظاہر تو یہ طریقہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا عملی پہلو جب سامنے آئے تو اس کے نقائص بھی کھلتے چلے گئے اور اس کے نتائج بھی اتنے ہی خراب نکلے کہ ان کو اختیار کرنا بے سود معلوم ہوا۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وسائل پیداوار سے کام لینے اور پیداوار کو تقسیم کرنے کا انتظام خواہ نظری طور پر پوری سوسائٹی کے سپرد ہو' لیکن عملاً یہ کام ایک مختصری جماعت ہی کے سپرد

ہوگا' جو کسی نہ کسی طرح اس کام کو اپنے لئے مختص کرے گی۔ خواہ یہ مختصر سی جماعت بزور اوپر آئے اور خواہ لوگوں کی نمائندگی سے' اس طرح ساری سوسائٹی اس مٹھی بھر جماعت کے زیر انتظام ہوگی۔ وہی چند لوگ عملاً اس سوسائٹی کے حکمران ہوں گے کیونکہ سارے وسائل پر اس مختصر گروہ کا تسلط ہو گا۔ مزدور نہ تو سٹرائک کر سکیں گے اور نہ ہی کوئی دوسرا ذرائع کے لئے کھلا ہوگا کہ وہ اس کو چھوڑ کر اس کا سہارا تلاش کر سکیں۔ اس لئے یہ سوسائٹی یا اسٹیٹ سارے سرمایہ داروں کو اور سارے زمینداروں کو کھا کر سب سے بڑا سرمایہ دار اور سب سے بڑا کارخانہ دار بن جاتی ہے۔

دوسرا متمدن معاشرہ جو ہمارے دور میں سب سے زیادہ قابل تقلید نظر آتا ہے وہ سرمایہ داری کا معاشرہ ہے اور آج کل عملاً زیادہ تر ممالک میں یہی جاری بھی ہو رہا ہے اور اس کی ہی خوبیاں اور فضائل اکثر ورد زبان ہیں لیکن یہ بھی کوئی Ideal معاشرہ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ہر انسان اس بات کے لئے آزاد ہے کہ وہ جتنا بھی سرمایہ کما سکے' کمالے' کسی قسم کی کوئی پابندی حرام وحلال کی اس پر نہیں ہے اور اس سرمایہ کو حاصل کرنے کے بعد اسکو کلی اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس کو استعمال کرے۔ جس قدر وسائل پیداوار اس کے قابو میں آئیں وہ نہ صرف ان کو قابو میں رکھ سکتا ہے بلکہ اگر چاہے تو دوسروں کو ان کے انتفاع سے محروم رکھ سکتا ہے۔ اس طرح وہ وسائل پیداوار' اور اپنے حاصل کردہ سرمایہ کے زور پر روز بروز زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر کے دوسروں کو محروم کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ معاشرے میں صرف دو قسم کے افراد باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک وہ جو تمام دولت اور وسائل سمیٹ کر ان سے ہر طرح کا انتفاع حاصل کرتا ہے اور دوسرا وہ گروہ جو تمام وسائل اور دولت سے محروم ہو کر دو وقت کے کھانے کے لئے بھی محتاج ہوتا ہے اور اس کا مقصد حیات پہلے گروہ کی خدمت اور اسکی دولت میں اضافہ کرنا رہ جاتا ہے۔ یہ اول الذکر گروہ' یعنی سرمایہ دار ٹولہ' یہ سارا سرمایہ ربا کے زور پر حاصل کرتا ہے۔ اس کے لئے بینک قائم کئے جاتے ہیں۔ جوائنٹ سٹاک کمپنی .Joint Stock Co کھولی جاتی ہیں' انشورنس کمپنیاں شروع کی جاتی ہیں اور Provident Funds قائم کئے جاتے ہیں۔

اور آج کل ایک نئی صورت ''مضاربہ'' کی نکلی ہے جو روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ ان تمام تدابیر میں ایک ہی خواہش مشترک ہے' جو ان تمام تدابیر کے پیچھے جذبہ محرکہ کا کام کرتی ہے اور وہ ہے سرمایہ سے مزید سرمایہ پیدا کرنا اور اس میں جو چیز خون کی طرح دوڑتی پھرتی ہے وہ ہے ربا یعنی سود۔

آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں اسی میں ایک پورا نظام جو دنیا کی معتدبہ آبادی پر مشتمل تھا' پورے ۷۰ سال قائم رہ کر بالکل ناکام ہو چکا ہے۔ یہ نظام نہایت خوش آئند نعروں اور بلند آہنگ دعوؤں کے ساتھ آیا تھا اور اسکو قائم کرنے میں لاکھوں جانوں کا اتلاف ہوا تھا۔ صرف سٹالین کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اس نے ۴۰ لاکھ افراد کا خون کیا تھا۔ تب یہ نظام پوری طرح مسلط ہو سکا تھا۔ دوسری طرف سرمایہ داری پر مبنی ممالک ہیں جو ایک دوسرے کی دولت حاصل کرنے کی فکر میں رات دن مصروف ہیں۔ آج دنیا کی سیاست ''منڈیوں'' کے گرد گھوم رہی ہے اور ہر قوم دوسری قوم کی دولت کو اپنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ اب تک عقل انسانی جو بھی نظام بنا سکی' انسانیت کو فلاح اس میں حاصل نہیں ہو سکی اور انسان ایک ایسے نظام کی تلاش میں ہے جس میں اس کو سکون حاصل ہو سکے۔

قرآن کریم کا موقف یہ ہے کہ عقل انسانی کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایسی مستقل اقدار' Permanent Values وضع کر سکے کہ ان پر قائم شدہ معاشرہ' امن وسکون کا علمبردار ہو۔ عقل انسانی ایسا معاشرہ قائم کر ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ عقل انسانی ہمیشہ اپنا مفاد پیش نظر رکھتی ہے۔ جب بھی وہ کوئی معاشرہ تشکیل دے گی اس میں وہ اپنا مفاد' یا اپنے گروہ کا مفاد' یا اپنی قوم کا مفاد پیش نظر رکھے گی اور دوسری قوموں کی حق تلفی کی مرتکب ہوگی۔ یہ صرف وحی کی خصوصیت ہے کہ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتی ہے جس میں ہر شخص اپنا حق حاصل کرتا ہے اور سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے نزول کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا کہ اس معاشرہ میں کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا۔

فاما یا تینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا

هم یحزنون۔ (۲/۳۸)

قرآن کریم نے بہترین معاشرہ کو Define ہی اس طرح کیا ہے کہ اس میں کسی قسم کا خوف یا کسی طرح کی insecurity نہیں ہوتی۔

قرآن کریم انسان کی راہنمائی کرتا ہے اور ایک مکمل سیاسی' اقتصادی' معاشرتی نظام دیتا ہے جس کو متمکن کرنے کے ہم سب مسلمان مکلّف و پابند ہیں۔ صحیح معنوں میں ہم مسلمان کہلانے کے مستحق ہی اس وقت ہیں جب ہم اس کا یہ نظام پوری طرح متشکل کریں۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر نظام ایک اکائی ہوتا ہے جو نا قابل تقسیم ہوتا ہے اور اس کو من وعن جاری کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کسی نظام کا کچھ حصہ اپنانا اور کچھ سے اعراض کرنا' اس نظام کو ناکام کرنے کے مرادف ہے۔ کیونکہ اس طرح نہ تو وہ نظام صحیح طور پر قائم ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے درست نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے حکم فرمایا کہ ادخلو فی السلم کافة۔ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو' یعنی اس کا پورا نظام اجتماعی حیثیت سے اختیار کرو۔ دوسری جگہ اسی مفہوم کو ادا کرتے ہوئے فرمایا افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض (۲/۸۵) کیا تم قرآن کریم کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور ایک حصہ سے کفر کرتے ہو اور قرآن کریم نے اس کا نتیجہ دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں عذاب قرار دیا ہے اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ قرآن کریم کا نظام من حیث الکل اپنانا ضروری ہے۔

دوسری بات جو قابل التفات ہے وہ یہ ہے قرآن کریم اپنا نظام بتدریج نافذ کرتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اس کا نظام ایک مرتبہ ارادہ کرتے ہی کوئی قوم پورا نافذ کر دے اس کا درست طریق کار یہ ہے کہ پہلے لوگوں کو اس کے لئے تیار کیا جائے۔ ذہنی طور پر لوگوں کو اس بات کا قائل کیا جائے کہ عقل انسانی کوئی متوازن معاشرہ قائم نہیں کر سکتی اور انسانیت کی آخری پناہ گاہ صرف قرآن کریم کے دیئے ہوئے نظام میں ہی حاصل ہو سکتی ہے جب مخلص لوگوں کی ایک جماعت

اس بات پر مطمئن ہو جائے تو قرآن کریم کے قوانین نافذ کرنے شروع ہوں۔ حضورؐ نے قرآن کریم کی راہنمائی میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ پورے تیرہ سال حضور نے مکہ میں قیام فرمایا اور مخلص صحابہ کی ایک جماعت کو اس نظام کے قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ چونکہ مکہ میں اس کی سخت مخالفت ہوتی اس لئے حضور مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں ان مخلص مہاجر اور مقامی صحابہ کی معاونت سے ان احکامات کو عملی شکل دینا شروع کی۔ اس میں تدریج پیش نظر رہی۔ عرب شراب کے سختی سے عادی تھے ان کے خمیر میں شراب رچا بسا ہوا تھا۔ ان کو اس لعنت سے مجتنب رہنے کے لئے پہلے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ ولا تقربوا الصلوة وانتم سکری۔ اس کے بعد شراب کے عیوب ونقائص یہاں فرمائے۔ واثمهما اکبر من نفعهما۔(۲/۲۱۹)۔

پھر اس کے بعد جب ان کو اس کی برائی سے آگاہ کر دیا اور لوگوں کو اس سے متنفر کر دیا تو اسکی حرمت کا اعلان فرما دیا۔ اسی طرح عربوں میں غلام عام تھے۔ گھر گھر میں غلام موجود تھے ان کو اگر ایک مرتبہ ہی آزاد کر دیا جاتا تو ان کی Economy بالکل غیر متوازن ہو جاتی۔ اس لئے پہلے غلاموں سے حسن سلوک کے احکام آئے۔ اس کے بعد ان کو کفارہ کے طور پر آزاد کرنے کا حکم دیا گیا اور اس کے بعد قرآن کریم نے غلامی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور قیامت تک کے لئے اس کا راستہ مسدود کر دیا۔ کیونکہ قرآن کریم لوگوں کو آزاد کرانے کے لئے آیا ہے غلام بنانے کے لئے نہیں۔ فرمایا کہ فاما منا بعد واما فداءً۔(۴۷/۴)

قرآن کریم نے معاشی قوانین کے نفاذ کے لئے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے قرآن کریم پورا معاشی نظام عنایت فرماتا ہے۔ اس کے کچھ احکام عبوری دور کے لئے ہیں اور کچھ انتہائی دور کے لئے ہیں جس کا قیام قرآن کریم کا مطمح نگاہ ہے۔ لیکن ربٰو ہر حال میں حرام مطلق ہی رہا ہے اسکی کسی دور میں گنجائش نہیں رہی اور نہ ہی اس میں تدریج کا عمل اختیار کیا گیا۔ مضمون زیر نظر میں پہلے اسلامی معاشرہ کے عبوری دور کے احکام اور اس کے بعد انتہائی دور کے احکام پیش خدمت کئے

جائیں گے اور اصل بحث مسئلہ ربوٰ کی پیش خدمت ہوگی۔

پہلی چیز جس پر قرآن کریم اصرار کرتا ہے وہ اس کے حلال وحرام ذرائع کی تقسیم ہے۔ قرآن کریم حلال ذرائع کے اندر دولت کمانے کی اجازت دیتا ہے۔لیکن حرام ذرائع سے دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت کرتا ہے۔اس نے چوری' رشوت' ڈاکہ' ناپ تول میں کمی' شراب کی بیع و شریٰ' خیانت' دھوکہ دہی' مال یتیم اور سودخواری کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ یہ انسانوں کے ذہن نشین کراتا ہے کہ یہ تمام امور نہایت مکروہ ہیں اور ان میں سے کسی ذریعے سے بھی دولت کمانا مناسب نہیں ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں ان تمام امور کو نہایت استحقار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ان ذرائع سے حاصل کردہ دولت کو میت محبوب شمار کیا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم جائز طریقوں سے بھی جو دولت کمائی جائے' اس کو بھی جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے دولت کی گردش رک جاتی ہے۔ دولت جمع کرنے والا خود بھی اس کا غلط استعمال کرتا ہے بلکہ پوری سوسائٹی کے خلاف جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایسا کرنے والوں کو دردناک عذاب کی خبر دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ..... الخ

اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم درست طریقے پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اپنی جائز ضروریات کے لئے رکھ کر باقی جو مال بھی کسی کے پاس ہے' اس کو دوسروں کے لئے' خرچ کردے۔ اس حکم کے جاری کرنے سے قرآن کریم کا نظریہ سرمایہ داری کے نظریہ کے بالکل متضاد ہو جاتا ہے۔ پھر قرآن کریم ان دونوں احکامات یعنی جمع کرنے کی ممانعت اور خرچ کرنے کے اصرار سے جو ذہنیت پیدا کرتا ہے وہ سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سرمایہ دار یہ تصور ہی نہیں کرسکتا کہ ایک شخص اپنا روپیہ سود کے بغیر دوسرے پر کیوں خرچ کرے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے وراثت کا قانون بھی عبوری دور کے لئے تجویز کیا ہے کہ

حلال طریقوں سے حاصل کردہ دولت میں تمام عمر اخراجات کرنے کے باوجود بھی جو دولت بچ جائے اس کو تقسیم کرنے کے لئے پھر قرآن کریم نے وراثت کا قانون دیا ہے۔ دوسرے معاشی نظاموں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص نے جو دولت سمیٹ کر جمع کی ہے وہ اس کے بعد چند اشخاص میں ہی تقسیم ہو جائے مگر قرآنی قانون وراثت کا مقصد یہ ہے کہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نزدیک اور دور کے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جائے اور اگر اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے متبنیٰ بنانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اسلام نہ صرف دولت سمیٹنے کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ اس کو پھیلانا چاہتا ہے تاکہ دولت کی گردش میں آسانی ہو۔

اسی طرح مال غنیمت کے احکام ہیں۔ اس جگہ بھی وہی مقصد پیش نظر ہے۔ جنگ میں جو مال غنیمت حاصل ہو اس کے متعلق قرآن کریم نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے پانچ حصص کئے جائیں، چار حصص فوج میں تقسیم کر دیئے جائیں اور ایک حصہ اس غرض سے مخصوص کر دیا جائے کہ وہ عام قومی کاموں میں صرف ہو۔ ارشاد باری ہے۔ واعلموا انما غنمتم...... (۸/۴۱)۔

یہاں مفسرین کا اتفاق ہے کہ اللہ اور رسول کے حصہ سے مراد وہ حصہ ہے جو اجتماعی امور کے لئے خرچ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت کریمہ کے مطابق خمس میں بھی تین طبقوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ پہلا طبقہ قوم کے بچے ہیں تاکہ ان کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام ہو سکے اور وہ آسانی سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ دوسرا طبقہ مساکین کا ہے جن میں بیوہ عورتیں، اپاہج اور معذور لوگ سب شامل ہیں۔ تیسری قسم ابن سبیل یعنی مسافر کی ہے۔ قرآن کریم نے اپنی اخلاقی تعلیم میں مسافر نوازی کا خاص اہتمام رکھا ہے۔ خمس کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ و صدقات میں بھی مسافر کا حصہ رکھا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے اسلامی ممالک میں تجارت، سیاحت، تعلیم، نقل و حرکت کو بہت آسان بنا دیا ہے اسلامی مملکت کی حدود کے اندر اندر کوئی شخص بھی سفر کرنے میں پریشانی محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ کسی قسم کی پریشانی یا Insecurity سے دوچار نہیں ہو

سکتا۔

زکوٰۃ

یہ محض ایک نیکی یا خیرات نہیں ہے بلکہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ قرآن کریم میں ۳۷ مقامات پر اس کا اور نماز کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور سخت تاکید کی گئی ہے کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں اور نجات اخروی کا مدار ان پر ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ زکوٰۃ نہ صرف اس امت پر فرض ہوئی ہے بلکہ سابقہ امم پر بھی یہ فرض تھی۔ سورۃ انبیاء ۵/۷۳، مریم ۸۳/۵۵۔ زکوٰۃ جہاں معاشرہ کی بھلائی کے لئے ضروری ہے وہاں یہ دینے والوں کی روحانی ترقی کا باعث بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کا ٹیکس نہیں ہے بلکہ عبادت کا جزو ہے اور نفس انسانی کی اصلاح کا ایک اہم حصہ ہے جس طرح صلوٰۃ فرض ہے اسی طرح یہ فرض ہے۔ دینی فریضے اور دینی اہمیت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صدر اول میں جب حضرت ابوبکرؓ کے دور میں یمن کے لوگوں نے زکوٰۃ روک لی تھی، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جہاد کیا اور اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ انہوں نے اس کی دوبارہ ادائیگی شروع نہیں کی۔

ان تمام طریقوں سے قرآن کریم ایسا معاشی نظام قائم کرتا ہے جس سے ایک طرف ہر طرح کا معاشی ظلم ختم ہوتا ہے اور بے جا استحصال کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو دوسری طرف معاشرے میں اخلاقی فضائل کا نشوونما ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے پیش نظر ایسا معاشرہ بنانا نہیں ہے جس میں کوئی کسی کے ساتھ نیکی نہ کرے اور اس میں اخلاقی فضائل کا نشوونما نہ ہو اس کے برعکس اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ، رضاکارانہ ہمدردی اور احسان کا سلوک کریں اور ان کے درمیان آپس میں محبت پیدا ہو۔ اس کے لئے وہ زیادہ زور لوگوں میں ایمان پیدا کرنے اور ان کو صحیح تعلیم وتربیت دینے اور اچھے انسان بنانے پر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اپنے اجتماعی فلاح کے قوانین نافذ کرتا ہے جن کا ذکر سابقہ سطور میں کیا گیا ہے۔ اس طرح ایک توازن بدوش معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ معاشرہ جو قرآن کریم قائم کرتا

ہے ایک ایسے عبوری دور کے لئے ہے جس میں وہ افراد معاشرہ کو تیار کرتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ قرآن کریم کا متعین شدہ معاشرہ قائم کریں اور اسی انتہائی معاشرے میں ربوٰ کا صحیح تصور قرآن کریم کی رو سے متعین ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مسئلہ ربوٰ کی مفصل بحث پیش خدمت ہے۔

ربوٰ کی لغوی بحث

عربی کی مستند لغات لسان العرب' اقرب الموارد' اور تاج العروس کے مطابق ربوٰ کے معنی زیادتی اور بڑھوتی کے ہیں' اور قرآن کریم نے بھی ان آیات میں اس لفظ کو انہی معانی میں استعمال کیا ہے۔

ربا یربو۔ زیادہ ہونا۔ لیربوا فی اموال الناس ۳۰/۳۹ تا کہ لوگوں کے اموال میں زیادتی ہو۔ اربی کے معنی زیادہ کثیر دولت میں بڑھا ہوا ۱۶/۹۲ ربوۃ' زمین کا بلند حصہ ۲۳/۴۰ رابیا سیلاب پر ابھرنے والی جھاگ ۱۳/۱۷۔

ربوٰ کی شرعی تعریف درج ذیل ہے۔

(۱) قرض کی اصل رقم پر جو زائد رقم مدت و مہلت کے مقابلے میں حاصل کی جائے وہ ربوٰ ہے۔

(۲) احکام القرآن میں امام جصاص نے ربوٰ کی یہ تعریف بیان کی ہے۔

وھو القرض المشروط فیہ الاجل و زیادۃ علی المستقرض۔

ربوٰ قرض کا وہ معاملہ ہے جس میں میعاد مقرر کی گئی ہو اور قرض لینے والے پر قرض کی اصل رقم سے کچھ زیادہ دینے کی شرط لگائی گئی ہو۔

(۳) حضرت علی المرتضیٰ نے فرمایا وقال رسول اللہ کل قرض جرا نفعا فھو ربوٰ۔

حضور نے فرمایا کہ ہر وہ قرض جو نفع کماتا ہو تو اس کا یہ نفع سود ہے۔ (المطالب العالیہ از ابن حجر)

(۴) سنن کبریٰ میں ہے۔

حضرت فضالہ (صحابی) فرماتے ہیں کہ جو قرض نفع کھینچتا ہے وہ سود کی ایک قسم ہے۔

(۵) ایک شخص حضرت عبداللہ ابن عمر کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا ہے مگر یہ شرط لگائی ہے کہ مجھے اس سے زیادہ دو گے جو میں نے تمہیں دیا ہے۔ابن عمرؓ نے فرمایا یہی تو ربٰو ہے۔(موطاامام مالک' طبع قاہرہ' باب الربانی الدین' جلد۲' ص۶۷۲)۔

(۶) مسلمانوں نے اپنے نبی کریم سے نقل کی بنا پر اجماع کیا ہے کہ قرض کے اصل مال پر اضافے اور زیادتی کی شرط لگانا سود ہے۔اگر چہ یہ اضافہ ایک مٹھی گھاس یا ایک پیسہ ہو۔(التمہید' ابن عبدالبر۔ج۴' ص ۶۸)۔

(۷) سود سے مراد وہ اضافہ ہے جو مال کے مالک کے لئے کیا جاتا ہے۔جس وجہ سے کہ اس نے اپنے مقروض کے لئے مدت بڑھادی ہے اور اپنے قرض کی وصولی موخر کر دی ہے۔(تفسیر ابن جریر ج۳' ص ۱۰۳)

ربٰو کی جو تعریف definition مذکورہ بالا شقوں میں دی گئی ہے۔ یہ اس ربٰو کی تعریف ہے جس کی حرمت قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہے۔اس کی حرمت بھی قطعی ہے اورا سکی تعریف بھی متفق علیہ ہے اور اس میں کسی قسم کا ابہام بھی نہیں ہے اور یہی وہ ربٰو ہے جو عربوں میں معروف تھا اور جس کو وہ بیع کی طرح حلال سمجھتے تھے۔اس کو ربٰو القرآن بھی کہتے ہیں اس لئے کہ اسکی حرمت قرآن کریم سے ثابت ہے۔اسے ربٰو جلی اور ربٰو حقیقی بھی کہا جاتا ہے۔اس لئے کہ یہ کھلا اور حقیقی معنوں میں سود ہے۔لغات' عرب دور جاہلیت کے حالات' احادیث وآثار سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ربٰو کے مفہوم یا تعریف میں کبھی شبہ پیدا نہیں ہوا۔ربٰو کا یہی مفہوم ہمیشہ سے چلا آرہا ہے یعنی قرض پر مشروط اضافہ اور اس کی قانونی وفقہی تعریف درج کر دی گئی ہے۔ عربوں کے ہاں ربٰو کا ایک ہی طریقہ رائج تھا کہ ایک شخص کسی کو ایک ہزار روپے قرض دیتا اور ایک سال کے بعد اس سے گیارہ سو روپے وصول کرتا۔ یہ سو روپے جو ہزار روپے پر ایک سال میں اضافہ ہوتا تھا یہ اس زمانہ کا ربٰو تھا۔جس کو قرآن کریم نے بالصراحت حرام قرار دیا ہے۔ارشاد

باری ہے۔وان تبتم فلکمُ روس اموالکم ۲/۲۷۵۔اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لئے صرف راس المال یعنی اصل زر جائز ہے اور ہر طرح کا اضافہ حرام ہے۔اس زمانہ میں ربٰو کا صرف یہ ایک طریقہ رائج تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روپے پر روپے کا اضافہ بغیر کسی محنت کے حرام ہے فقہا کی تعریف اور قرآن کریم کی تعریف ایک ہی ہے یعنی روپیہ کا اضافہ بغیر کسی محنت کے ربٰو ہے اور یہ حرام ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے جب دور ملوکیت میں ربٰو کے متعلق قوانین منضبط ہوئے تو اس اصول کو جو قرآن کریم سے بالکل واضح ہے' اور خود فقہائے کرام نے بھی جس کو اختیار کیا' اس اصول کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور اس کی اصل وجہ اس دور کی ملوکیت اور پیداواری اداروں کے Pressure groups تھے۔نقد رقم پر اضافہ کو تو اسلامی قوانین نے ناجائز قرار دیا۔لیکن اسی رقم سے اگر زمین خرید کر کے کسی کو بٹائی پر دے دی جائے' تو اس کو حلال قرار دیا گیا حالانکہ ساری محنت کسان اور اس کے بچے سارا سال کرتے ہیں اور زمین کا مالک اس سے آدھی رقم وصول کر لیتا ہے اور یہ رقم مسلسل وصول کرتا رہتا ہے اور اصل زر زمین کی صورت میں محفوظ رہتا ہے۔قرآن کریم کے اصول کی رو سے یہ ربٰو ہے۔اسی طرح مضاربت کو بھی اسلامی قوانین نے جائز قرار دیا ہے۔لیکن قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے اس لئے کہ روپیہ بغیر محنت کے اس میں زیادہ ہوتا ہے۔قرآن کریم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لیس الانسان الا ماسعیٰ. یعنی انسان کے لئے صرف محنت کی کمائی جائز ہے اس کے علاوہ کوئی ذریعہ بغیر محنت کے پیسہ کمانے کا جائز نہیں ہے۔لیکن اس وقت ربٰو کے سلسلہ میں جو دشواری پیش آ رہی ہے وہ صرف فقہا کا تسامح ہے۔قرآن کریم نے ارض (زمین) کے متعلق فرمایا کہ وجعلنا لکم فیھا معایش. ۷/۱۰ اور ہم نے تمہارے لئے زمین میں سامان معیشت رکھے ہیں۔یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ سامان زیست کا اصلی سرچشمہ ارض (زمین) ہی ہے۔اس لئے یہ لفظ وسائل و ذرائع رزق کے لئے استعمال ہوا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ یہ کسی فرد کی ملکیت میں نہیں جاسکتی والارض وضعھا للانام (۵۵/۱۰) کے یہی معنی ہیں کہ زمین کو ہم نے مخلوق کے

فائدے کے لئے بنایا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے متاعاً لکم و لا نعامکم' تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے زندگی کا سامان لہذا کوئی نظام جس میں زمین نوع انسانی کے مشترکہ فائدہ کے بجائے کسی خاص گروہ کے فائدہ کے لئے مخصوص ہو جائے قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسی لئے ایک جگہ تاکید مزید کے لئے ارشاد ہے کہ سواءً للسائلین (۴۱/۱۰) اس سرچشمہ رزق کو تمام لوگوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ وسائل پیداوار' روشنی' ہوا' دھوپ' پانی' زمین' قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ معاشرہ ایسا انتظام کر سکے کہ جس سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ جب جاگیرداری اور زمینداری کو ہر نظام کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا قرآن کریم نے اس وقت یہ انقلابی آواز بلند کی اور ایک Revolutionary Idea دیا کہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ ہر شخص کے لئے بلا مزد و معاوضہ ہے۔ دنیا نے اس وقت اس انقلابی نظریہ کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ لیکن اب زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس طرف چلی آ رہی ہے۔ لیکن خود مسلمانوں نے اس کو نظر انداز کر دیا اور اس خالص ربٰو کو شیر مادر کی طرح حلال قرار دے دیا۔

ربٰو کے نقائص

قرآن کریم نے خود ربٰو کے نقائص بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ویتخبطہ الشیطن من المس (۲/۲۷۵)' یہ لوگ یوں کھڑے ہوتے ہیں جسے انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اس میں ذہنی جنون اور قلبی اضطراب کی شدت سب کی سب آ جاتی ہے جو اس شخص کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ جس کے دل میں ہوس زر نے آگ لگا رکھی ہو۔ اس جنون کے نتیجہ میں انسانی حرکات میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے اور سوچ و فکر اور نمود و تدبر کا مادہ اس میں نہیں رہتا۔ سود خواروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ ہوس زر سے بے چین رہتے ہیں اور سوچ اور فکر سوائے اضافہ زر کے کسی اور چیز کی نہیں رہتی۔ قارئین کرام نے خود مشاہدہ کیا ہوگا (جو راقم السطور نے کئی مرتبہ کیا ہے) کہ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو دولت کے اعتبار سے کروڑ پتی ہیں۔ لیکن صحت کا یہ حال ہے کہ

روٹی کے پاپڑ موگ کی دال کے پانی سے' صرف ایک وقت کھانے کی اجازت ڈاکٹر دیتا ہے۔ اور طرح طرح کی دوائیں استعمال کرنے پر یہ معمولی غذا ہضم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ دماغ سارا روپے کمانے پر لگا ہوا ہے اس لئے صحت بحال نہیں ہوتی اور فکر اور تردد کی وجہ سے نظام ہضم صحیح کام نہیں کرتا۔ ہر چیز کھانے کو ترستے ہیں' لیکن جنون زر پرستی مزید ہوس پیدا کرتا جاتا ہے۔

دوسرا نقص قرآن کریم نے فرمایا کہ سود سے مجموعی حیثیت سے قوم کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ فرمایا لا تاکلوا الربوٰ اضعافا مضعفة ۳/۱۳۰۔ اس کے عام معنی تو یہی کردیئے جاتے ہیں کہ سود در سود یعنی سود مرکب نہ کھاؤ۔ لیکن امام راغب نے مفردات میں کئی حوالہ جات دے کر ثابت کیا ہے کہ مضاعفۃ دراصل ضَعْفٌ سے ہے ضِعْفٌ سے نہیں' اس لئے آیت کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ ربٰو جسے تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنے روپے کو بڑھاتا ہے۔ بڑھاتا نہیں' بلکہ درحقیقت کم کرتا ہے۔ سود سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی انسانی صلاحیتوں میں کمی واقع ہوتی ہے۔ ربٰو سے قومی دولت کم ہوتی ہے۔ کمزوریوں پر کمزوریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

(۳) سود سے روپے کی گردش نہیں رہتی بلکہ روپیہ سمٹ کر چند ہاتھوں میں رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس فعل کی شدید مذمت فرمائی ہے کہ روپیہ چند ہاتھوں میں منجمد ہو جائے۔ فرمایا کی لا یکون دولة بین الاغنیاء منکم ۵۹/۷' تا کہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی گھومتا نہ رہے۔ قرآن کریم نے معاشیات کا بہت اہم اصول صرف چار لفظوں میں بیان کر دیا۔ معاشرہ کا فساد اسی سے ہوتا ہے کہ دولت ایک خاص اوپر کے طبقہ میں گردش کرتی رہے۔۔ قرآن کریم کی رو سے نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہنی چاہئے اور نہ دولت ایک خاص حلقہ میں گردش کرتی رہے۔ بلکہ اسے رفاہ عامہ کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔

(۴) ایک اور حقیقت بعنوان عیب جو قرآن کریم نے واضح فرمائی ہے ومن عاد فاولئک اصحاب النار۔(۲/۲۷۵) یعنی جو لوگ پھر وہی کام کریں یعنی سود سے باز نہ آئیں تو وہ ضرور آگ میں پڑنے والے ہیں (یعنی اصحاب النار ہیں) نائرہ کے معنی

عداوت، فتنے، اور بغض کے ہیں کیونکہ عداوت اور بغض بھی ایک اندرونی آگ ہے۔ نار القوم کے معنی ہیں قوم نے شکست کھائی (محیط المحیط) اس سے عذاب النار کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی انسانی اعمال کے وہ تباہ کن نتائج جن سے متاع حیات جل کے راکھ کا ڈھیر ہو جائے۔ اس میں اس دنیا کی تباہی بھی شامل ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی بربادی بھی۔ اصحاب النار وہ لوگ ہیں جو خوف و حزن کے عذاب میں مبتلا ہوں ۳۸/۲، قرآن کریم نے کہا ہے کہ ابلیس کی تخلیق نار سے ہوئی ہے ۷/۵۸، اس لئے جہاں نار سے بچنے کی تاکید ہے اس کے معنی ابلیسی روش سے بچنا ہے ابلیس تخریبی قوت کا مظہر ہے اسی لئے عذاب النار تخریبی اعمال کے تباہ کن نتائج کا نام ہے جس سے انسان کی تمدنی، معاشرتی، زندگی کا نقشہ بھی بگڑ جاتا ہے اور اس کی اپنی ذات کی صلاحیتیں بھی جھلس جاتی ہیں۔ اس طرح اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت لمبی لمبی لڑائیاں جو قوموں کو پیش آتی ہیں جو لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور لاکھوں بچوں کو یتیم بنا دیتی ہیں وہ جب ہی جاری رہ سکتی ہیں جب کہ سود کے ذریعے مالی حالت کو قائم رکھا جائے۔ پہلی جنگ عظیم میں سات کروڑ روپیہ یومیہ صرف انگریزی گورنمنٹ کا خرچ ہوتا تھا، اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ جرمنی کا خرچ ہوتا تھا۔ اگر سود کا دروازہ کھلا ہوا نہ ہوتا، تو دونوں حکومتیں یہ خرچ ایک سال بھی برداشت نہ کر سکتیں اور ان کا سارا اندوختہ جلد ختم ہو جاتا۔ لیکن یہ دونوں حکومتیں سود کے ذریعے کئی سال تک جنگ چلاتی رہیں۔ سود لڑائی کا ایک بڑا سبب ہے اور لڑائی کے دوران دونوں متحارب گروہ آگ کی زندگی بسر کرتے ہیں یہی مثال قرآن کریم نے اس آیت کریمہ میں بیان فرمائی ہے کہ سود لینے والے آگ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام جس تمدن کو قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد دوسروں سے نیک سلوک کرنے اور غرباء کی فلاح پر رکھی گئی ہے۔ لیکن سود کا کاروبار کرنے والے حسن سلوک کو جانتے ہی نہیں صرف دولت کا اضافہ ان کے مدنظر ہوتا ہے خواہ دوسروں کا گلا گھونٹ کر کیا جائے۔ چونکہ اس ذریعے سے دوسروں سے نیک سلوک کرنے اور غرباء کو ترقی دینے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور

جنگوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اس لئے اسلام نے اس کی کلی طور پر ممانعت فرما دی ہے۔

ربٰو کے متعلق مندرجہ بالا چار عیوب قرآن کریم نے آیت کے ایک ہی حصہ میں واضح فرما دیئے ہیں اور پوری شدت سے ربٰو کی حد درجہ ممانعت اور حرمت جاری فرما دی۔ اگر غور کیا جائے تو اسی آیت کریمہ میں قرآن کریم نے ربٰو کی تعریف Definition صرف چار الفاظ میں بیان فرما دی۔ فرمایا

وان تبتم فلکم روس اموالکم

اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے راس المال ہے۔

قرآن کریم کی رو سے ربٰو کے معنی ہیں اصل زر سے زائد کچھ لینا۔ یہ ایک جامع اصول ہے لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہمارے ہاں اس سے عام طور پر یہ مراد لیا جاتا ہے کہ اس سے صرف رقم یعنی نقد روپے پر زیادہ لینا حرام ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ قرآن کریم کی تو پوری عمارت ہی اس بنیاد پر اٹھتی ہے کہ معاوضہ محنت کا لیا جائے اور روپے پر روپے کا اضافہ حرام ہے۔ انسان صرف اپنی محنت کے معاوضے کا حقدار ہے' سرمایہ کا معاوضہ طلب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن روپے کے اکتساب میں جس معاملہ میں بھی روپیہ بغیر محنت کے حاصل ہو وہ ربٰو ہے۔ اس تعریف definition میں جاگیرداری' ملوکیت' سرمایہ داری' مخابرہ' مضاربت' پیشوائیت سب شامل ہو جاتی ہیں۔ موجودہ صورت حال میں غور و فکر کرتے وقت یہی دشواری پیش آتی ہے کہ اگر قرآن کریم کی تعریف پر عمل کیا جائے تو یہ تمام ادارے سود کی حدود میں آ جاتے ہیں ان کو جاری رکھنے کا کوئی جواز قرآن کریم سے نہیں تھا۔ لیکن دوسری طرف ہمارے فقہی قوانین ہیں جنہوں نے ان کو جائز قرار دیا ہوا ہے اور ان کی حاصل کردہ آمدنی کو شیر مادر کی طرح حلال قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں یا تو قرآن کریم کی تعریف کو ترک کرنا پڑتا ہے' یا دور ملوکیت کے قوانین کو قرآن کریم کے خلاف قرار دے کر ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں صدقہ اور ربٰو کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا ہے۔

یمحق اللہ الربوٰ ویربی الصدقات ۲/۲۷۶۔اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔اس آیت کریمہ میں صدقات کو ربٰو کی اور ربٰو کو صدقات کی ضد بتایا گیا ہے۔آیت نمبر ۲/۲۷۱ میں صدقات کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ یکفر عنکم من سیٔا تکم' صدقہ تمہاری بدحالیاں دور کرتا ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ ربٰو (سود) سے معاشرہ میں معاشی بدحالیاں پیدا ہوتی ہیں۔اسی لئے قرآن کریم نے سود کی بجائے صدقات کا نظام قائم کرنے کا حکم دیا ہے کہ صدقات کا اجتماعی نظم و نسق قائم کیا جائے۔قرآن کریم کی رو سے صدقات اپنے اپنے طور پر انفرادی طریقہ پر صرف نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کئے جاتے ہیں۔اس وقت کے مرکزی نظام (یعنی حضور نبی کریمؐ) سے کہا گیا کہ ان سے صدقات خود وصول فرماؤ ۹/۱۰۳) اور مومنین کو تاکید کی گئی کہ تم جو کچھ اجتماعی مفاد کی خاطر دو گے' اس سے تمہاری صرف حفاظت ہی نہیں ہوگی بلکہ مزید نشوونما بھی ہوتی جائے گی ۹۲/۱۸۔

قرآن کریم کی اصطلاحات

قرآن کریم نے اپنی اصطلاحات خود وضع کیں اور ان کا مفہوم خود متعین اور واضح کر کے' ان کو استعمال کیا ہے۔نظام' قانون' معاشرہ یہ سب عربی زبان کے الفاظ ہیں' لیکن قرآن کریم نے ان کو استعمال نہیں کیا بلکہ ان کی جگہ اپنی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔اسی طرح صلوٰۃ' زکوٰۃ' صدقہ' حج' کے الفاظ عربی زبان کے ہیں لیکن قرآن کریم نے ان کو اپنی اصطلاحات کے طور پر نئے معانی پہنا کر ان کو استعمال کیا ہے۔اسی طرح قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے یکجا الفاظ بار بار استعمال کئے ہیں جو اس کی ایک خاص اصطلاح ہے۔قرآن کریم نے اس کو اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی یا اسلامی نظام کا حاکم اعلیٰ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔چونکہ حضور نے یہ قرآنی نظام حکومت خود قائم فرمایا تھا۔اس لئے اپنے دور میں حضورؐ خود اس کی مرکزی اتھارٹی تھے۔اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام جس کو حضورؐ نے اس زمین پر عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا' اس نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔چنانچہ آیات نمبر ۳۶/۴' ۶۲/۴' ۹/۴۷' ۹/ اور دیگر بے شمار آیات میں قرآن

کریم نے اس کو اسی معانی میں استعمال کیا ہے' چونکہ یہ نظام حضورؐ کے بعد بھی جاری رہنا تھا' اس لئے آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔ اسی طرح جس جگہ بھی وہ نظام قائم ہو گیا اس کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔ اسی طرح جس جگہ بھی وہ نظام قائم ہو گیا اس کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہو گی۔ اللہ اور رسول کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی وہ اجتماعی طور پر اسی نظام کی معرفت ہو سکتی ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جس سے قرآن فہمی کا دروازہ کھلتا ہے۔ قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے الفاظ اسلامی ہیئت اجتماعیہ کے لئے استعمال کئے ہیں۔ مندرجہ صدر آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم سود لینا بند نہیں کرتے تو اللہ و رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ربٰو کو ترک نہیں کرتے وہ اسلامی ہیئت اجتماعیہ سے بغاوت کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے اسلامی نظام اور ربٰو کا نظام بالکل دو متضاد نظام ہیں جو ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ربٰو سود کا نام نہیں ہے' یہ بنیاد ہے اس نظام کی جو قرآن کے معاشی نظام کی ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کر کے' کم سے کم اپنے پاس رکھ کے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ ربٰو کے نظام میں ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ محنت دوسرے لوگ کریں اور اسے بغیر محنت کے زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس طرح ایک دوسرے کی ضد' نقیض اور ایک دوسرے سے متبائن ہیں کہ قرآن کریم نے ربٰو کے نظام کو اللہ اور رسول کے خلاف' یعنی اسلامی نظام کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربٰو کے مسئلہ کا کوئی حل تلاش کر لیں اس قسم کی کوشش ہم نے اس سے پیشتر اپنے جاگیرداری اور سرمایہ داری دور (یعنی عہد بنی عباس) میں کی تو اسکے نتیجہ میں مضاربت' مخابرت' بٹائی وغیرہ سب جائز قرار دے دیئے گئے۔ اگر ہم نے اب اس دور میں سرمایہ دارانہ نظام کو بحالہ قائم رکھتے ہوئے اس میں سود کو ختم کرنے کی کوشش کی تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن کے معاشی نظام میں تو سود خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور غیر قرآنی نظام میں یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

صرف اس کی حقیقت اور نام بدل سکتے ہیں۔

قرآن کریم کے مدنظر جو پروگرام ہے اور جو معاشرہ قائم کرنا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس معاشرے کے تمام افراد کے سامنے چند بنیادی تصورات پیش کئے جائیں جن پر وہ دل کی پوری گہرائیوں سے متفق ہوں اور جسے قرآن کریم کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ وہ ان تصورات پر ایمان لائیں یعنی انہیں بالکل درست تسلیم کریں۔

(ا) ان میں پہلا تصور یہ ہے کہ عقل انسانی اپنے مسائل حل کرنے سے قاصر ہے اور انسان کی صحیح راہنمائی کے لئے وحی الٰہی ضروری ہے۔ انسان وحی کی راہنمائی کے بغیر صحیح معاشرہ قائم نہیں کرسکتا۔ جن مستقل اقدار پر صحیح معاشرہ کی بنیاد ہوتی ہے "عقل انسانی وہ مستقل اقدار متعین نہیں کر سکتی۔ یہ دحی الٰہی کی ہی مستقل اقدار فراہم کرسکتی ہے۔ انسان ہزار کوشش کر لے بغیر وحی الٰہی کی راہنمائی کے متوازن معاشرہ قائم نہیں کرسکتا۔ اس مسئلہ پر قرآن کریم نے بہت روشنی ڈالی ہے اور معمولی مطالعہ اور محنت سے اس معاملہ میں بہت مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

دوسری حقیقت جس پر ایمان لانا ضروری ہے' یہ ہے کہ انسان صرف جسم کا ہی نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسری شے بھی ہے جو اس کو انسان بناتی ہے اور اس کا نام فلسفہ کی اصطلاح میں Psyche یا Ego ہے اور قرآن کریم نے اس کا نام "نفس" قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے جسم کی پرورش کھانے سے ہوتی ہے اور اس 'نفس' کی پرورش دوسروں کو دینے سے ہوتی ہے۔ جو شخص جس قدر دوسروں کو دے گا' اسی قدر اس کے نفس کی پرورش ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کریم کا اصول یہ ہے الذی یوتی ما لہ یتزکی جو اپنا مال دوسروں پر صرف کرے گا اس کا نفس اسی قدر تزکیہ حاصل کرے گا۔ یہ تزکیہ ہی انسانی زندگی کا مقصود ہے اور اسی پر اس کی سعادت اور نجات اخروی کا انحصار ہے اور یہی ایک جذبہ محرکہ ہوگا جو انسانوں کو زیادہ سے زیادہ کمانے اور دوسروں پر صرف کرنے کے لئے آمادہ کرے گا۔ یہی وہ Incentive ہے جس کی کمی کمیونزم اور سوشلزم میں تھی اور وہ اس کمی کو کسی طرح بھی پورا نہیں کر سکے۔ جذبہ محرکہ سے ہی یہ

تربیت ہوتی ہے کہ پھر انسان اپنا مال و دولت دوسروں پر صرف کرنے لگتا ہے۔ یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ۔ وہ لوگ اپنا مال دوسروں پر صرف کرتے ہیں حالانکہ انہیں کتنی ہی تنگی کیوں نہ ہو پھر تیسری حقیقت جس پر ایمان لانا ضروری ہوگا یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ جس قدر مال بھی انسان کے پاس ہے وہ دوسروں کی منفعت کے لئے عام کر دے یسئلونک ماذا ینفقون قل العفوا۔ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز صرف کریں۔ آپ کہہ دیں کہ ضرورت سے زیادہ جو کچھ بھی ہے وہ دوسروں کی منفعت کے لئے کھلا رکھیں اور مال کو مقصود بالذات نہ بنائیں بلکہ صرف ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ سمجھیں اس کے بعد جو کچھ مال و دولت باقی ہو وہ دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔

چوتھی بات جو پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وسائل پیداوار عنایت ہوئے ہیں ان پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی وہ کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے ان سے ہر شخص متمتع ہو سکتا ہے اور دوسروں کے لئے ان کے استعمال پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ ساری انسانیت کے نفع کے لئے برابر ہیں۔ سواءً للسائلین۔

پانچویں بات جو اسلامی نظام کے ہر فرد کو پیش نظر رکھنی ہوگی یہ ہے کہ دولت کا جمع کرنا معاشرہ کو غیر متوازن بناتا ہے اور اسلامی معاشرہ میں Surplus money کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقائق جن پر قرآن کریم اپنے پروگرام کے مطابق معاشرہ استوار کرتا ہے۔ یہی بنیادیں اس کے لئے قوت محرکہ بن جاتی ہیں انہیں کی قوت پر وہ اپنے معاشرہ کی عمارت بلند کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ محض نظری مسائل نہیں ہوتے بلکہ ان کو عملی طور پر متشکل کرنے سے ان کے نتائج برآمد ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں نہ کسی قسم کے دھوکہ کا امکان ہے نہ کسی قسم کے نقصان کا اور یہی نتائج اس کے پرکھنے کا معیار ہیں کہ اصل قرآنی معاشرہ متشکل ہو گیا ہے یا نہیں۔

اصل مقصد انسانی ذات کی نشوونما اور ارتقاء ہے جو صرف اس معاشرہ میں ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس

میں ہر فرد اپنی محنت کی کمائی دوسروں پر صرف کرتا ہے۔ اس مذکورہ مثالی معاشرہ میں ربٰو کے متعلق قرآن کریم اپنے قوانین بیان فرماتا ہے کہ اس اسلامی معاشرہ میں ربٰو حرام ہے اور بدلہ صرف محنت کا ہے جبکہ صدقات، صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے قوانین اس میں جاری ہو چکے ہوں گے۔ وہ ایک پورا معاشری نظام ہوگا جس میں ربٰو کے قوانین از خود منطبق ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کے برخلاف ایسی صورت میں جب کہ انسانی معاشرہ خود ساختہ قوانین پر متشکل ہو، ملکیت زمین جائز ہو، وسائل پیداوار انسانی ملکیت میں اس طرح ہوں کہ چند افراد نے ان پر اس طرح قبضہ کیا ہو کہ باقی انسانیت ان سے بالکل محروم ہو، ہر شخص زیادہ سے زیادہ کمانے اور کم سے کم خرچ کرنے کی خواہش رکھتا ہو، ایک دوسرے کی دولت پر نہ صرف نظر ہو، بلکہ اس کو ہر طریقہ سے حاصل کرنا مدنظر ہو، ذرائع آمدنی میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ ہو، ایسے معاشرے میں ربٰو کے قوانین جاری کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ غریب اور مفلس معاشرہ میں چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا جاری کرنا ہے، یا جیسے کرپٹ اور بے ایمان معاشرہ میں اسلام کے قوانین شہادت جاری کرنا ہے۔ درست طریقہ یہی ہے کہ معاشرہ مرفہ الحال ہو اور ہر شخص کو رزق فراہم ہو، تو اس میں چور کی سزا کے لئے ہاتھ کا کاٹنا مناسب ہے۔ اسی طرح با کردار، صالح افراد پر مشتمل معاشرہ میں قرآنی قوانین شہادت جاری کرنا درست ہے۔ بالکل اسی طرح قرآنی معاشرہ میں ہی ربٰو کے قوانین کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں ان کا اطلاق بالکل غیر متعلق Irrelevant ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، نظام حیات ایک اکائی ہوتا ہے، اس میں کتر بیونت یا Patch-Work سے کام نہیں چلتا اور جو کوئی ایسا کرے گا قرآن کریم کے مطابق وہ اس کتر بیونت کی وجہ سے اس دنیا میں بھی گھاٹے میں رہے گا اور آخرت میں بھی۔ اس کے لئے پورے معاشرے میں انقلاب لانا ضروری ہے۔ پہلے قرآن کریم کا نظام جاری کیا جائے پھر اس میں ربٰو کے قوانین جاری ہوں۔

وہ بدلنا چاہتے ہیں نظم میخانہ تمام
آپ نے بدلا ہے لیکن صرف میخانہ کا نام

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے

قرآن کریم قوموں کے عروج وزوال کے اسباب بیان فرماتا ہے اور گذشتہ اقوام کے حالات بطور استشہاد پیش کرتا ہے کہ سابقہ اقوام کو ان ہی اصولوں کے مطابق عروج وزوال سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ عرب جن ساری اقوام سے بخوبی واقف تھے ان میں سے ایک قوم عاد بھی تھی۔ سورہ ہود میں قوم عاد کے جرائم و مصائب اور حضرت ہودؑ کی تعلیم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد قرآن کریم صرف ایک آیت میں ان کی ذہنی پستی اور قلبی خباثت کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ وتلک عاد جحد و ابایت ربھم و عصوا رسلہ و اتبعوا امر کل جبار عنید (۱۱/۵۹)۔ یہ قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام وقوانین سے انکار کیا اور اپنے رسولوں کی دعوت سے سرکشی برتی لیکن (حیرت یہ ہے) کہ اپنے ان سرکش اور ظالم حکام کی اطاعت کرتے رہے جو عمداً حق کی مخالفت کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حالات آج ہم مسلمانوں کے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام اور قانون خداوندی کے اجراء سے ابا کرتے ہیں لیکن جو بھی جابر اور ظالم حکمران برسر اقتدار آیا اس کی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے بالکل رضامند ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے انسان کی حکومت انسان پر مطلقاً حرام قرار دی ہے اور انسانوں کو قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں دیا۔ ان الحکم الا للہ (۱۲/۴۰)۔ حکومت سوائے اللہ تعالیٰ اور کسی کو زیب نہیں دیتی۔ لا یشرك فی حکمہ احداً (۱۸/۲۶)۔ اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین (قرآن مجید) کے مطابق زندگی بسر کرنے لگیں تو قرآن کے وعدہ کے

مطابق وہ تمام اقوام پر غالب بھی ہوں گے اور دیگر تمام اقوام کے نگران بھی۔

مسلمانوں کا عروج و زوال ان کے دین اور نظام کے عروج و زوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں پر ہر حالت میں فرض ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کے ماتحت زندگی بسر کریں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے مطلقاً گریز کریں۔ صدر اول میں مسلمانوں کے عروج کا راز بھی اسی میں مضمر تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو متمکن کیا اور اس کے ماتحت زندگی بسر کی۔ جب سے مسلمانوں نے دین خداوندی کو ترک کیا اسی دن سے ان پر زوال و ادبار کی ابتداء ہو گئی۔ زندگی کی جتنی پریشانیاں' برائیاں' معائب و اسقام ہو سکتے تھے وہ سب امتِ مسلمہ میں در آئے۔ نکبت و افلاس' غربت و جہالت' محکومی و مسکینی' تملق و خوشامد' پریشانی و درماندگی' مسلمانوں کا شعار زندگی بن گئے۔ لیکن سب سے بڑی لعنت اور مصیبت جس نے مسلمانوں کو بالکل تباہ حال اور برباد کر دیا وہ ان کا آپس کا افتراق و اشتقاق تھا اور ہے جس نے ایک ہزار سال سے فرقہ بندی کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور روز بروز اس کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کا دشمن اور خون کا پیاسا ہو گیا ہے اور ایک دوسرے کو قتل تک کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ جو قوتیں اور صلاحیتیں مسلمان دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے' وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو بنصِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

منیبین الیه واتقوه واقیموا الصلوة ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعاً' کل حزب بما لدیهم فرحون (۳۰/۳۱)۔ ترجمہ۔ خدا کی طرف رجوع رکھو' اور اس سے ڈرو' نماز کی پابندی کرو اور شرک کرنے والوں میں سے مت ہو جانا کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بہت سے گروہ ہو گئے اور ہر گروہ اپنے اس طریقہ پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔ اس آیت کریمہ کی رو سے دین کو

ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور خود گروہ در گروہ ہو جانا شرک ہے جس سے اجتناب لازمی ہے اور قرآن کریم نے فرقہ بندی کو جو شرک قرار دیا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دین میں تو آخری سند قرآن کریم ہوتا ہے' جو اللہ کی کتاب ہے' لیکن فرقہ بندی کے بعد ہر شخص اپنے فرقہ کا پابند ہوتا ہے اور ہر فرقہ میں آخری سند وہ ذات ہوتی ہے جس کی نسبت سے وہ فرقہ بنتا ہے۔ اس لئے فرقہ بندی میں آخری سند قرآن کے ساتھ اس فرقہ کی منتسب الیہ ذات بھی شامل ہو جاتی ہے اس لئے وہ فرقہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ایک دوسری جگہ ارشاد عالی ہے ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا لست منھم فی شئی (۶/۱۵۹)۔ بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (ترجمہ مولانا اشرف علی) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات کے مطابق تو ایک امت واحدہ بنتی ہے۔ یہ الگ فرقہ بنانے والے ایک متوازی دین کے متبع ہو گئے۔ اس لئے ان کا تعلق رسولؐ اللہ سے نہیں رہتا۔ تاکید مزید کے طور پر قرآن کریم نے سورہ آل عمران میں نہایت پرشکوہ الفاظ میں فرمایا واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا (۳/۱۰۳)۔ تم سب مل کے قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رہو اور فرقوں میں تقسیم نہ ہو جانا۔ یہ وہ آیتِ کریمہ ہے جو ہمارے دین کی اساسِ محکم اور بنیانِ مرصوص ہے۔ اسی میں ہماری ترقی و عروج کا راز پنہاں ہے اور اسی سے خود دین کا استحکام و تمکن ممکن ہے۔ یہ حبل اللہ ہی وہ محکم سہارا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے جو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا اور یہ کسی مقام و زماں' قوم' خطہ سے مخصوص نہیں۔ ذہن انسان کے خود ساختہ قوانین زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے فرسودہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضابطہ خداوندی ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے اور تمام حدود و قیود اور امتیازات سے ماورا اور بالاتر ہے۔ اس کے اصول ابدی اور مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ اسی آیت مجیدہ پر ذرا سا غور کرنے سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت بہت پرزور' موثر اور اپنے مفہوم پر بہت اصرار کرنے والی ہے۔ آیت کا ایک حصہ اللہ پر دوسرا حصہ نبی پر

مبنی ہے تا کہ اپنے مفہوم اور حکم پر سخت تاکید کر سکے۔ قرآن کریم کو تھامے رہو اور فرقہ بندی نہ کرو۔ آیت سے واضح ہے کہ فرقہ بندی صرف اس صورت میں ہوتی ہے' جب حبل اللہ چھوڑ دی جائے۔ جب تک اللہ کی رسی کو تھامے رہیں گے' فرقہ بندی نہیں ہو سکتی۔ فرقہ بندی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھنا محض اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ آیت کے الفاظ اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ فرقہ بندی سے بچنے کا واحد ذریعہ قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رکھنا ہے۔ اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح اور روشن ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق قرآن سے نہیں رہتا کیونکہ فرقہ بنتا ہی جب ہے کہ جب قرآن کو چھوڑ دیا جائے۔

ان تینوں آیات کریمات سے واضح ہوا کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ' اس کے رسول اور قرآن کریم میں سے کسی سے کوئی تعلق برقرار نہیں رہتا۔

قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی نہ صرف کفر اور شرک ہے بلکہ اس کا نتیجہ تباہی' بربادی اور رسوا کن عذاب ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد گرامی ہے ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاء ھم البینت واولئک لھم عذاب عظیم (۳/۱۰۴)۔ خبردار رہو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت آ جانے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یہاں قرآن کریم نے اختلاف اور فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم قرار دیا ہے اور جو عذاب اس کے نتیجہ میں وارد ہوتا ہے اس کی مختلف شکلیں ہیں جو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہیں۔ بھوک' پیاس' تکلیف' خوف وحزن' خانماں خرابی' سب کے لئے قرآن کریم میں عذاب کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کریم نے ان تمام سختیوں' تکلیفوں کے لئے جو فرعون کی قوم غالب نے اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا کر رکھی تھیں عذاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (۲۰/۴۷)۔ سورہ بقرہ میں مفلحون کے مقابلہ میں لھم عذاب عظیم (۲/۷)۔ لا کر واضح کر دیا کہ عذاب کے ملنے سے زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی و ناکامی' ذلت و خواری' محکومی و

عاجزی' افلاس' غربت' ان تمام صفات کو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر عذاب سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم ہے۔ اس لئے یہ تمام صفات منطقی طور پر فرقہ بندی کے نتیجہ میں حاصل ہونا لازمی ہیں اور قرآن کریم کی تنزیل کی صداقت ہم سب کے سامنے ہے کہ ہم میں فرقہ بندی اور تفرقہ اندازی کی وجہ سے وہ سارے معائب و اسقام موجود ہیں جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کے نتیجہ میں لفظ عذاب کے ضمن میں شمار کرائے ہیں۔

قرآن کریم نے اسلام کو ملتہ ابراہیم کہا ہے (۲/۱۳۵) یعنی وہ طریقہ جسے وحی خداوندی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا۔ دوسری جگہ فرمایا ملتہ ابیکم ابراہیم ھو سمکم المسلمین من قبل وفی ھذا (۲۲/۷۸) تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو' اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے' نزول قرآن سے پہلے بھی اور قرآن میں بھی۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ ہم حضرت ابراہیم کی ملت ہیں۔ انہوں نے ہی ہمارا نام ''مسلم'' رکھا ہے جو ان کے وقت سے لے کر آج تک ہمارا نام ہے' اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے نام سے موسوم کرنا اور کسی تشخص سے خود کو معروف کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ تاکید بھی فرمائی کہ فلا تموتن الا وانتم مسلمون (۲/۱۳۲) پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔ انسان کی آخری حالت موت کی ہی ہوتی ہے جس میں ہر انسان چاہتا ہے کہ ایسی حالت میں فوت ہو کہ اس کا پروردگار اس سے راضی ہو۔ اس آخری حالت کے لئے بھی یہ تاکید ہے کہ اس وقت بھی سوائے مسلمان ہونے کے اور کوئی حالت نہ ہونی چاہئے۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کی اس قدر مذمت و تنقیص کی کہ اسے شرک ٹھہرایا اور قرآن کریم کی رد سے فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ اللہ تعالیٰ سے ہے' نہ رسول اللہ سے' اور نہ ہی قرآن کریم سے باقی رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی خجالت' لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں یہ فرقہ بندی ایک ہزار سال سے چلی آ رہی ہے اور مسلمان اس کو تسلیم (Recognise) کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر حیرت

واستعجاب اس بات پر ہے کہ ہماری پیشوائیت بھی اس کو تسلیم کرتی ہے اور کبھی اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتی بلکہ خود اپنے کو کسی نہ کسی فرقہ سے متعلق قرار دیتی ہے۔ وہ صرف اس بات کے خلاف ہے کہ آپس میں تصادم وتزاحم نہ ہو اور ملک میں اس کی وجہ سے فساد برپا نہ ہو اگر مختلف فرقے آپس میں رواداری' محبت وتعاون سے زندگی بسر کرلیں تو ہماری پیشوائیت کو فرقہ بندی سے قطعاً کوئی تعرض نہیں ہے۔ اتحاد بین المسلمین کے معنی ہی یہی ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد رکھیں اور باہمی تزاحم وتصادم سے اجتناب کریں لیکن اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی منع ہے اور شرک ہے۔ خواہ وہ آپس میں محبت ومودت ہی سے کیوں نہ رہیں۔ فرقہ بندی چونکہ ہم نے قبول کی ہوئی ہے اس لئے اس کے اثرات' عقائد کے علاوہ تفسیر' حدیث' تاریخ سب میں ہی سرایت کئے ہوئے ہیں اور ہر فرقے نے عقائد کے اختلاف کے علاوہ تفسیر' حدیث' تاریخ کو بھی متاثر کیا جس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

قرآن کریم نے قرآن فہمی کے اصول وضوابط خود متعین فرمائے ہیں جن کے مطابق اگر قرآن کریم کو سمجھا جائے تو دو اور دو چار کی طرح قرآن کریم خود سمجھ میں آتا چلا جاتا ہے۔ منجملہ دیگر اصولوں کے قرآن فہمی کا پہلا اصول جو خود قرآن نے وضاحت سے بیان فرمایا ہے تصریف آیات ہے انظر کیف نصرف الایت لعلهم یفقهون (٦/٦٥) (ترجمہ) دیکھئے تو سہی ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ لوگ ان کو سمجھ جائیں۔ حضورؐ کے متعلق بھی بیان فرمایا کہ حضورؐ کا طریقہ بھی قرآن فہمی کا تصریف آیات ہی تھا۔ وکذلک نصرف الایت ولیقولوا درست ولنبینه لقوم یعلمون (٦/١٠٥) (مفہوم) اور اے رسول ہم اسی طرح آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کردیں۔ فلہذا ثابت ہوا کہ رسول اکرم اس قرآنی حکم کے مطابق تصریف آیات ہی کے ذریعے درس قرآن دیا کرتے تھے

یعنی آپ کا طریقہ تفقہ بھی تصریف آیات ہی تھا لیکن ہمارے ہاں کی تفاسیر میں اس قدر اہم طریقہ جو خود حضور کی سنت بھی ہے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ کسی معروف تفسیر کو اٹھا کر دیکھ لیں، اس اصول کو کسی مفسر نے بھی پیش نگاہ نہیں رکھا بلکہ اس کے بجائے شان نزول کو قرآن فہمی کا اہم اصول شمار کیا گیا ہے، جو ہر مفسر نے اپنے پیش نگاہ رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تصریف آیات سے کسی فرقہ کی تائید مشکل تھی۔ شان نزول کی وجہ سے مختلف فرقوں کی تائید آسانی سے مہیا ہو جاتی ہے۔ شان نزول مختلف ہونے سے آیت کا مفہوم ہی بالکل مختلف ہو جاتا ہے مثلاً جو آیات مجموعی طور پر صحابہ کی تعریف و توصیف میں وارد ہوئیں اور جن کا تعلق کسی بھی خاص شخصیت سے نہیں تھا شان نزول نے ان آیات کو مختلف حضرات کے متعلق قرار دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ نے ان سے کسی کی تعریف مقصود لی اور دوسرے فرقے نے کسی دوسرے صاحب کی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ہی آیت کے دو دو تین تین شان نزول بیان کر دیئے گئے۔ قرآن کریم عالمگیر ضابطہ حیات ہے (۱/ ۲۸)۔ اس کے احکام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہیں لیکن شان نزول کی وجہ سے قرآنی احکام کی عمومیت کو، جو قیامت تک کے لئے پوری نوع انسانی کے لئے تھی صرف چند افراد تک محدود کر دیا گیا ہے۔ آپ سارا قرآن کریم پڑھ جائیں، ہر ایک آیت کسی نہ کسی شخصیت یا کسی نہ کسی واقعہ سے متعلق کر دی گئی ہوگی (مثالیں آگے آتی ہیں) اور اس کی عمومیت ختم کر دی جاتی ہے۔ اس طرح شان نزول کا عقیدہ نہ صرف قرآن کریم کے سمجھنے میں ایک رکاوٹ ہے بلکہ اس سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے، اور صرف فرقہ بندی کی تقویت کے لئے ہی اس کو ایجاد کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں حضور کو کفار کے لئے طلب مغفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے فرمایا استغفر لهم اولا تستغفر لهم، ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم (۹/۸۰) (مفہوم) اے رسول ان منافقین کے لئے آپ مغفرت طلب کریں یا نہ کریں، ہمارے لئے برابر ہے۔ اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے تو پھر بھی

اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ آیت کریمہ اتنی صاف اور واضح ہے کہ ہر شخص اس کا مفہوم باآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس میں حضورؐ کو منافقین کے لئے مغفرت طلب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ حضورؐ اگر ان کے لئے طلبِ مغفرت کر بھی لیں تو وہ بے سود ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔ اس وضاحت کے بعد اب آپ ایک اور آیت کا شانِ نزول ملاحظہ فرمائیں۔

عبداللہ نافع بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی (منافق) جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا، حضورؐ کے پاس آیا، اور عرض کیا یارسول اللہ، ہمیں اپنا کرتہ عنایت فرمادیں کہ ہم اس کا کفن بنائیں اور آپؐ اس پر (جنازے کی) نماز پڑھائیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ نبی صلعم نے اس کو اپنا کرتہ عنایت کیا اور فرمایا کہ مجھے خبر دینا تو میں نماز پڑھا دوں گا۔ جب آپ نے اس پر نماز پڑھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپ کو کھینچا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین پر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ (۹/۸۰)۔ آپ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ) تم ان کے لئے دعا مغفرت کرو یا نہ کرو۔ اگر تم ان کے لئے ستر بار بھی دعائے مغفرت کرو گے تو بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا۔ چنانچہ آپ نے اس پر نماز پڑھی تو یہ آیت اتری ولا تصل علی احد منهم مات ابداً (۹/۸۴) اور ان میں سے کسی پر کبھی نماز نہ پڑھنا جب وہ مر جائیں (بخاری شریف قرآن محل کراچی جلد اول صفحہ ۴۸۵)۔ یہ ہے ولا تصل علی احد منهم مات ابداً کا شانِ نزول کہ آیت کریمہ اولا تستغفر لهم کے انداز بلاغت سے حضرت عمرؓ تو یہ بات سمجھ گئے کہ حضورﷺ کو منافقین کے لئے دعائے مغفرت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن خود حضورؐ نے قرآنی انداز فصاحت و بلاغت سے الٹا مفہوم اخذ فرمایا کہ "استغفر لهم اولا تستغفر لهم" کے الفاظ میں آپ کو منافقوں کے لئے طلبِ مغفرت کرنے یا نہ کرنے کے دونوں اختیار عطا فرمائے گئے ہیں اور اس غلط اخذ شدہ مفہوم کی بناء پر حضرت عمرؓ کے منع کرنے بلکہ مصلے پر سے کھینچنے کے باوجود آیت نمبر (۹/۸۰) کی مخالفت کا

ارتکاب کر جائیں۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے فہم کی تصدیق اور حضورؐ کے فہم کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کے لئے کہ آپ نے (۹/۸۰) کا مفہوم درست نہیں سمجھا' یہ آیت کریمہ ولا تصل علی احد منهم نازل فرمائی۔

ایک اور آیت کریمہ مع ترجمہ کے ملاحظہ فرمائیں۔وان كنتم مرضىٰ او على سفر اوجاء احد منكم من الغائط او لمستم النساء فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيداً طيباً فامسحوا بو جوهكم وايدكم منه. ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج (۵/٦)(ترجمہ)اگر تم بیمار ہو یا تم سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا بیوی سے لمس کرے اور پانی نہ پائے تو آلائش کو پاکیزہ مٹی کے ساتھ صاف کر لیا کرو اور منہ اور ہاتھوں سے گرد و غبار پونچھ لیا کرو۔اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتا۔آیت کریمہ بالکل صاف ہے۔قرآن کریم ہر مسئلے کی ضروری شقیں ساتھ ساتھ بیان کرتا چلا جارہا ہے۔کسی قسم کا کوئی ابہام واشکال نہیں ہے۔معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی اس آیت کو بخوبی سمجھ کے اس پر عمل کر سکتا ہے لیکن اب اس کا شان نزول ملاحظہ فرمائیں۔

حضور اکرمؐ صحابہ کرامؓ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔قافلہ ایسے مقام پر تھا جہاں پانی موجود نہیں تھا۔قافلے کو روانگی کا حکم ہوا چنانچہ کوچ ہونے والا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا۔ہار کی تلاش میں نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو طعنے دینے شروع کر دیئے کہ دیکھیں آپ کی بیٹی نے کیا کیا۔نماز کا وقت جارہا ہے' پانی یہاں ہے نہیں اور اس نے قافلہ کو روک دیا ہے۔اس پر حضرت ابوبکر نے انہیں بہت سخت وست کہا لیکن انہوں نے اس لئے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ حضورؐ ان کے زانو پر سر رکھ کر سوئے ہوئے تھے۔حضرت عائشہ صحابۂ رسول' اور اپنے والد بزرگوار کے طعنوں کو زہر کا گھونٹ کر کے پی گئیں تو اس وقت تیمم کا حکم نازل ہوا کہ پانی نہ ہو تو تیمم کر لیا کرو۔(ملخص بخاری شریف' قرآن محل' صفحہ ۷۷۰)

آیت بالکل واضح ہے۔کسی تفسیر یا شان نزول کی ضرورت نہیں۔لیکن شان نزول نے

ناموس رسالت وعزت صحابہ کو مجروح کیا۔

عقلی اعتبار سے بھی شان نزول کا تصور درست معلوم نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اگر بالفرض وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی یا اگر واقعات زیادہ پیش آ جاتے یا ان سے مختلف نوعیت کے پیش آتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ممکن تھا۔ یہ نظریہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔ قرآن کریم کے نجماً نجماً نازل ہونے پر کفار اعتراض کرتے تھے کہ قرآن یکمشت کیوں نہیں نازل ہو گیا۔ سورہ فرقان میں ان کا اعتراض اور ان کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جبکہ فرمایا وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القران جملتہ واحدۃ کذلک لنثبت بہ فوادك و رتلنہ ترتیلا (۲۵/۳۲) (مفہوم) اور جو لوگ اس ضابطہ حیات سے انکار کرتے ہیں ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ قرآن کریم پورے کا پورا یک وقت کیوں نہ نازل کر دیا گیا (تا کہ اس کی مجموعی تعلیم شروع میں ہی معلوم ہو جاتی) اے رسول اس قرآن کو اس لئے بتدریج نازل کیا کہ اسکے وقتاً فوقتاً نازل ہونے سے آپ کے دل کو تقویت رہے اور ہم نے اس کی بہترین ترتیب دی ہے۔ اس آیت مبارکہ سے بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ قرآن کریم ایک خاص پروگرام اور ترتیب کے مطابق نازل ہوا ہے۔ یہ Haphazardly نازل نہیں ہوا اور اس کے نزول سے کسی بھی واقعہ یا شخصیت کا کوئی تعلق نہیں تھا اور قرآن فہمی کے لئے شان نزول معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تفسیر کے بعد اسی طرح روایات، جن میں احادیث رسول کہا جاتا ہے فرقہ بندی کی زد میں آ گئیں۔ مختلف فرقوں نے اپنے اپنے ذخیرے جمع کئے۔ ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن احادیث کا انتخاب کیا، وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلے کا نتیجہ تھا۔ ان روایات کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس خدا کی سند تھی اور نہ ہی اس کی سند حضورؐ نے عنایت فرمائی تھی۔ نہ ہی ان کے پاس پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ (Written Material) تھا جس سے

انہوں نے ان روایات کا انتخاب کرلیا ہو۔لوگوں کی زبانی باتیں تھیں جنہیں انہوں نے اپنے عقائد ومیلانات وترجیحات کے مطابق چھان پھٹک کر کے اپنے مجامیع میں شامل کیا۔ان میں سے بیشتر وہ تھیں جو ان کے عقائد کو تقویت دیتی تھیں۔اسی وجہ سے مختلف فرقوں کی مختلف کتب احادیث مرتب ہوئیں۔صحاح ستہ اور کتب اربعہ کی احادیث کو آپ ایک نظر مطالعہ فرمائیں۔مشکل سے کوئی قدر مشترک ملے گی۔قرآن کریم سے تو فرقہ بندی کو کوئی تقویت نہیں ملتی البتہ احادیث کے مجموعے اپنے اپنے فرقوں کو نہ صرف تقویت دیتے ہیں بلکہ فرقہ بندی کو بھی جائز قرار دیتے ہیں جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور تصریف آیات کے بجائے احادیث کے ذریعے جب آیات کی تفسیر کی جاتی ہے تو اور بھی فرقہ پرستی میں اضافہ ہوتا ہے۔

شان نزول اور احادیث سے اگرچہ فرقہ بندی کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا اور اب بھی انہیں کے سہارے فرقہ بندی قائم ہے۔لیکن جس چیز نے اس سے بھی زیادہ فرقہ بندی کو مضبوط کیا وہ یہ نظریہ تھا کہ حضور کو قرآن کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور وحی ہوتی تھی اور وہ وحی' وحی خفی تھی اور موجودہ احادیث کے ذخیرے بھی وحی خفی ہی ہیں۔وحی جلی کو وحی متلوء اور وحی خفی کو وحی غیر متلوء کہتے ہیں۔حالانکہ وحی الٰہی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔خارج از قرآن وحی کا تصور بالکل باطل ہے۔مسلمانوں کے زوال کا وہ پہلا دن تھا جس دن یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ کچھ وحی تو قرآن کے اندر ہے اور کچھ وحی قرآن کے باہر۔احادیث میں ہے یہ عقیدہ اپنے اپنے نظریات کو جائز قرار دینے اور انہیں Justify کرنے کے لئے قائم کیا گیا اور اس نے مسلمانوں میں ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کرلی اور ان کے زوال وادبار کا باعث بنا۔اس سے ایک ایسا دروازہ کھل گیا کہ ہر عقیدہ کو وحی الٰہی قرار دے کر حضور کی طرف منسوب کر دیا گیا لیکن قرآن حکیم سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔قرآن کریم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وحی الٰہی صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے چنانچہ ارشاد ہے وما علمنه الشعر وما ینبغی له ان هو الا ذکر و قران مبین (۳۶/۶۹) اور ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ آپ کے

شایان شان بھی نہیں۔ وہ تو محض ایک نصیحت اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے۔(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

اس آیت کریمہ میں نفی و اثبات کے ساتھ نہایت واضح طور پر کہا گیا ہے کہ حضور کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن ہے اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کے متعلق نفی کی گئی ہے کیونکہ یہاں ھو ضمیر کا مرجع تعلیم ہے اور جو کچھ بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف ذکر یعنی قرآن ہے۔ذکر کی وضاحت خود قرآن کریم نے سورہ حم سجدہ میں یوں فرمائی کہ ان الذین کفروا بالذکر لما جاء ھم وانہ لکتب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (۴۱/۴۲) جو لوگ اس قرآن کو جب کہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں اور یہ قرآن باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے۔ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔(مولانا اشرف علی) اس آیت شریفہ نے ذکر کی خود وضاحت کر دی کہ ذکر قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے البتہ ایک اشکال بیان ذکر اور قرآن کے درمیان والی واؤ کا بھی عمداً پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ واؤ 'واؤ عاطفہ ہے اور چونکہ معطف اور موطوف علیھم میں مغائرت ہوتی ہے اس لئے قرآن اور ذکر دو مختلف چیزیں ہیں لیکن درست بات یہ ہے کہ یہ واؤ' واؤ عاطفہ نہیں ہے' بلکہ یہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے چنانچہ ارشاد عالی ہے ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق (۹/۳۳) وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی سچا دین دے کر بھیجا ہے اگر اس آیت میں واؤ کو واؤ عاطفہ شمار کیا جائے جو مغائرت کی متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور شے ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے۔ جو بالبداہت غلط ہے لہٰذا یہاں واؤ' واؤ بیانیہ ہی لی جاسکتی ہے۔اسی طرح ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ بیانیہ تفسیریہ ہے جس کے معنی ہیں کہ حضور کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن تعلیم کیا گیا ہے اور حضور کو اس کے

علاوہ کوئی علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل نہیں ہوا۔ غیب کا علم بھی حضور کو جو کچھ دیا گیا وہ وحی کے ذریعے قرآن میں ہی دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت بھی قرآن نے کر دی۔ چنانچہ سورہ یوسف' سورہ ہود اور سورہ آل عمران تینوں مقامات پر تقریباً ایک سے ہی الفاظ میں یہ بات واضح کی ہے کہ ذلک من انباء الغیب نوحیه الیک (۳/۴۴) یہ غیب کی خبریں ہیں ہم ان کی وحی بھیجتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ذریعہ حضور کو آئندہ یا گزشتہ معلومات حاصل کرنے کا نہیں تھا۔ اس لئے آئندہ کی خبریں جو دجال سے متعلق یا جو حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے متعلق ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور آئندہ کے بہت سے واقعات کے بارے میں وہ تمام روایات بے بنیاد ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے اور ان سے صرف فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے اور فرقہ بندی کو تقویت دینے کے سلسلہ میں ہی یہ روایات بیان کی گئی ہیں۔

فرقہ بندی جہاں اور علوم میں سرایت کر گئی ہے' اسی سلسلہ میں ہماری تاریخ بھی آتی ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا و من یقتل مومناً متعمدا فجزاوہ جھنم خالداً فیھا و غضب اللہ علیه ولعنه' واعدله عذاباً عظیماً (۴/۹۳)۔ اگر کوئی مومن کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہوگا۔ اس پر اللہ کا غضب وارد ہو گا۔ وہ خدا کی نگاہوں میں ملعون ہوگا اس کے لئے خدا نے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

قتل عمد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں اور اس کے بعد صدر اول کی مروجہ تاریخ میں ذرا اس واقعہ فاجعہ کے منظر کو سامنے لائیں کہ جنگ جمل اور صفین میں صحابہ کبارؓ کی نصف تعداد ایک طرف کھڑی ہے اور دوسری نصف اس کے سامنے دوسری طرف اور دونوں ایک دوسرے پر تلواروں اور نیزوں سے حملہ کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں جنگ جمل میں دس ہزار عام مومنین نہیں بلکہ صحابہ کرام ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں اور دوسری جنگ جمل میں اسی طرح ستر ہزار صحابہ قتل کئے جاتے ہیں حالانکہ قرآن کریم نے آیات نمبر (۲۹/ ۴۸' ۹۲/ ۱۹) میں بالتصریح کہہ دیا ہے کہ صحابہؓ آپس میں لڑ نہیں سکتے۔ ہماری تاریخ میں کوئی بات یقینی نہیں۔ عموماً

واقعات مختلف فیہ ہیں' حضورؐ کی پیدائش و وفات کی تواریخ' حضورؐ کی اولاد' خصوصاً صاحبزادوں کی تعداد' طے شدہ نہیں' حضورؐ کے والدین کریمین کا ایمان لانا مختلف فیہ ہے۔ حضرت ابوطالب کے ایمان لانے یا نہ لانے کے متعلق اب تک کتب تحریر کی جاتی ہیں' مناظرے ہوتے ہیں لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں ہے حتیٰ کہ نماز بھی جو ہمارے دین کی اہم ترین عبادت ہے اختلافات سے مستثنیٰ نہیں۔ حضورؐ نے دس سال مسلسل صحابہؓ کے مجمع میں نماز ادا کی اور دن میں پانچ مرتبہ ادا کی لیکن یہ طے نہیں ہوسکتا کہ حضورؐ کس طرح نماز ادا کرتے تھے۔ ہاتھ باندھتے تھے یا کھولتے تھے اور اگر باندھتے تھے تو کس جگہ باندھتے تھے۔ نماز کے علاوہ کسی بھی عبادت' روزہ' زکوٰۃ' خمس' جہاد' حج میں اتفاق نہیں اور آج کسی طرح معلوم نہیں ہوسکتا کہ حضورؐ ان کی ادائیگی کس طرح فرماتے تھے۔ حضورؐ کے انتقال کے فوری بعد' خلافت کا مسئلہ پیش آیا اس کے لئے اس قدر مختلف' متضاد بیانات اور مواد کتب میں تحریر ہے کہ پڑھنے والا کسی دوٹوک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ خصوصاً سقیفہ بنی ساعدہ کے جو حالات مرقوم ہیں وہ صحابہؓ کی کوئی قابل تعریف تصویر پیش نہیں کرتے غرضیکہ تاریخ خود فرقہ بندی کی زد میں رہی اور آج کوئی صورت' کسی مسئلہ میں بھی دوٹوک فیصلہ کرنے کی نہیں ہے۔ تقریباً سوا ڈیڑھ سو کتب ہیں جو مستند خیال کی جاتی ہیں۔ جو صاحبان آج کل تاریخ اسلام میں ریسرچ کرتے ہیں وہ انہیں کتابوں میں غوطہ مارتے رہتے ہیں اور اپنے سابقہ طے شدہ عقائد کے مطابق ''لولوء لا لاء'' تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ مضمون چونکہ مختصر ہے اور حوالہ جات پیش کرنے سے طوالت کا خدشہ ہے اس لئے حوالہ جات نہیں دیئے گئے' ورنہ متضاد متخالف حوالہ جات کی کوئی کمی نہیں لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ تاریخ مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اب تک اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو کتنی سختی اور تاکید سے منع کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا کوئی علمی اور عملی گوشہ فرقہ بندی سے محفوظ نہیں رہا۔ شروع میں یہ مندرجہ بالا سب علوم فرقہ بندی سے متاثر ہوئے اور اب یہ علوم فرقہ بندی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک Vicious Circle ہے جس کا توڑنا مشکل ہے البتہ قرآن

کریم کا دعویٰ ہے کہ جب تم مشکلات میں گھر جاؤ اور کوئی راہ نکلنے کی نظر نہ آئے تو قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کرو۔ وہی حلّال المشکلات اور مشکل کشا ہے۔ وقال ربکم ادعونی استجب لکم (۶۰/۴۰) اور تمہارے پروردگار نے فرمایا کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست کا جواب دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا جواب اس کے کلام' قرآن کریم سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

قرآن کریم کے مطابق مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے علاوہ کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ ان الحکم الا للہ (۶/۵۷) حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ ہر شخص سے کلام نہیں کرتا اس لئے اس نے اپنے انبیاء کرام کے ذریعے اپنے احکامات اپنی کتابوں میں نازل فرمائے تا کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جا سکے۔ آخری کتاب قرآن کریم حضورؐ کے توسط سے انسانیت کو عطا کی گئی اور چونکہ حضورؐ نے قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم فرمائی اور حضورؐ اس کے اولین سربراہ تھے' اس لئے حضورؐ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار پائی۔ فرقہ بندی کے انسداد اور قرآن فہمی کے لئے یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کا سمجھنا از بسکہ ضروری ہے کہ قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے۔ صلوٰۃ' زکوٰۃ' حج' تقویٰ' دین' طاغوت' فی سبیل اللہ وغیرہ یہ سب عربی زبان کے الفاظ ہیں جو نزول قرآن سے پیشتر سے عربوں میں متداول تھے لیکن قرآن کریم ان کو اپنے معانی پہنا کر اپنی اصطلاحات کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح ''اللہ و رسول'' کے الفاظ قرآن کریم اپنی ایک مخصوص جامع اور اہم اصطلاح کے طور پر استعمال فرماتا ہے چونکہ اللہ و رسول کے دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس لئے ہمارے ہاں عام طور پر اس سے مراد دو الگ الگ اطاعتیں قرار دی جاتی ہیں اور اللہ کی اطاعت سے مراد قرآن کریم کی اطاعت اور رسول کی اطاعت سے احادیث کی اطاعت مراد لی جاتی ہے۔ اس طرح عملاً رسول کا ترجمہ احادیث قرار پاتا ہے اور چونکہ احادیث مختلف فرقوں کی مختلف ہیں اس لئے اللہ و رسول کی اطاعت بھی مختلف طریقوں سے ادا کی جانے لگی اور یہیں سے فرقہ بندی کا آغاز ہوتا ہے جو آج تک قائم ہے لیکن قرآن کریم میں ذرا سا بھی غور

وتفحص کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے اللہ ورسول کے الفاظ دو الگ الگ مطاعوں (جن کی اطاعت کی جائے) کے لئے استعمال نہیں کئے بلکہ اس سے مراد اسلامی حکومت کی آخری اتھارٹی ہوتی ہے۔ حضور چونکہ اسلامی حکومت کے سربراہ تھے اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ ہو رہے تھے اس لئے ان کی اطاعت میں اللہ ورسول دونوں کی اطاعت مضمر تھی۔ قرآن کریم کے مطابق اللہ ورسول کی اطاعت سے مراد اسلامی نظام کے حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور یہ ایک اطاعت ہے اور اس کے لئے قرآن کریم سے متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔لیکن چونکہ اس مضمون کا موضوع یہ نہیں ہے' اس لئے صرف چند آیات بطور ثبوت کے پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ جنگ احد میں جب مسلمانوں کی فوج پراگندہ ہوگئی اور حضورؐ بالکل تن تنہا رہ گئے تو آپ نے صحابہ کرامؓ کو آواز دی جس پر وہ دوبارہ حضورؐ کے گرداگرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے۔ بظاہر یہ آواز حضورؐ کی تھی لیکن چونکہ یہ حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہیں تھا بلکہ آپ نے بحیثیت سربراہ مملکت اسلامیہ یہ آواز دی تھی' اس لئے اس آواز کو اللہ ورسول کی آواز قرار دیا گیا ہے۔ارشاد گرامی ہے "الذین استجابو اللہ و الرسول من بعد ما اصابھم القرح للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم" (۳/۱۷۲) ترجمہ۔جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد خدا اور رسول کا کہنا مانا ان میں سے جن لوگوں نے نیکی اور پرہیز گاری کی ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔

۲۔ اس نظام کے خلاف بغاوت کر کے فساد کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ ورسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

انما جزء والذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم او ارجلھم من خلاف او ینفو من الارض (۵/۳۳)۔

ترجمہ۔جو لوگ خدا اور اس کے رسول سے لڑتے بھڑتے اور امر (کام) کو نہیں مانتے اور

فساد پھیلانے کی غرض سے ملکوں ملکوں دوڑتے پھرتے ہیں ان کی سزا ایسی ہی ہے کہ یا تو مار ڈالے جائیں یا انہیں سولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں ہیر پھیر کے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں اپنے (وطن کی) سرزمین سے شہر بدر کر دیا جائے۔ (ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب)

اس آیت کریمہ میں اللہ و رسول سے مراد اسلامی نظام ہے اور اللہ و رسول سے محاربہ کا مطلب اسلامی نظام سے محاربہ کرنا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کون لڑ سکتا ہے۔

۳۔ ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا ولاخرۃ (۳۳/۵۷)

ترجمہ۔ بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے۔

اس آیت مجیدہ میں اگر اللہ سے مراد ذات خداوندی اور رسول سے حضور ﷺ کی ذات مراد لے لی جائے تو بات بالکل مبہم ہو جاتی ہے۔ رسول کو تو اذیت دی جا سکتی ہے کیونکہ وہ انسان تھے اور ارد گرد کے لوگوں کی ان تک رسائی تھی کہ ہر طرح کی تکلیف ان کو دی جا سکتی تھی اور عملاً دی بھی گئی لیکن اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ وہ انسان کی رسائی سے باہر ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دینے سے مراد نظامِ خداوندی کو نقصان دینا ہے۔

ایک آیت کریمہ اس بارے میں اتنی روشن اور بین ہے کہ اس بات کے ثبوت میں صحتِ قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ومن یخرج من بیتہ مھاجراً الی اللہ و رسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ وکان اللہ غفوراً رحیماً (۴/۱۰۰)

ترجمہ۔ اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کئے جانے سے سوائے اسلامی حکومت (مدینہ) کی طرف ہجرت کرنے کے اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا اور اللہ و رسول کی اصطلاح اسلامی حکومت کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

اللہ و رسول کے دو الفاظ ہیں لیکن چونکہ قرآن کریم نے اس کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے (بوجہ اختصار جس کی صرف چار مثالیں پیش خدمت کی جا چکی ہیں) اس لئے دوسرے مقامات پر ضمیر واحد لا کر بخوبی روشن کر دیا گیا ہے کہ یہ دو اطاعتیں (قرآن و حدیث) نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ایک اطاعت ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ و رسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین (۹/۶۲)۔

ترجمہ۔ یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو راضی کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو اس کو راضی کر لیں۔

یہاں اللہ و رسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ یرضوہ میں ضمیر واحد لائی گئی ہے۔ واحد حرف لا کر انہیں ایک شمار کرنے سے صرف یہ واضح کرتا ہے کہ جملہ اللہ و رسول اصطلاح کے طور پر کسی ایک چیز کے لئے لایا گیا ہے جو صرف ایک ہے اور دو نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ''اغنھم اللہ و رسولہ من فضلہ'' (۹/۷۴) ترجمہ۔ انہیں اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

یعنی اس واحد مرکزی نظام نے جو حضور نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے اس نے انہیں غنی کر دیا۔ فــضــلــــه میں ضمیر واحد لا کر دونوں الفاظ اللہ اور رسول کو بطور ایک اصطلاح استعمال کر کے ایک قرار دیا گیا ہے۔

جب تک یہ اطاعتیں ایک رہیں اور اسلام بطور دین کے قائم رہا اور قرآن کریم بطور ضابطہ حیات اس میں نافذ رہا اور اس دین کی اطاعت ہی اللہ اور رسول کی اطاعت شمار کی جاتی رہی' اس وقت تک مسلمانوں میں نہ کسی قسم کا تفرقہ تھا اور نہ ہی کوئی مذہبی فرقہ راہ پا سکا۔ مذہبی فرقہ بننے کا امکان ہی نہیں تھا کیونکہ اس نظام کی اطاعت سب پر لازمی تھی۔ جو اسلامی حکومت کے مرکز کی طرف سے حکم جاری ہوتا' اس کا اطلاق ایک ایک شہری پر لازمی تھا اور اس کی اطاعت سب پر فرض تھی اور اس کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت تھی لیکن جب نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت کی بدقسمتی سے دین کا نظام ختم ہوا اور ان اطاعتوں سے بجائے ایک اطاعت کے دو اطاعتیں شمار کی جانے لگیں تو مسلمانوں میں فرقہ بندی کی ابتداء ہو گئی۔ فرقے مذہب میں ہوتے ہیں' دین کے نظام میں تو فرقہ بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جس دن سے اللہ اور رسول کی اطاعت کا غلط مفہوم لینا شروع کیا گیا وہ ہی مسلمانوں کے ادبار کا پہلا سنگ میل تھا۔ سب سے پہلے دین اور دنیا کی تفریق پیدا ہوئی اور مختلف حضرات اور مختلف گروہوں کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت کا مفہوم مختلف ہو گیا اور اسی اختلاف کی وجہ سے فرقے بن گئے اور امتداد زمانہ سے ان میں مزید استحکام پیدا ہوتا چلا گیا چونکہ حکومت کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت نہیں رہی اور اللہ و رسول کی اطاعت انفرادی قرار دی جانے لگی' اس لئے اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے مختلف فقہ بنے اور ہر فقہ کے متبعین دوسرے فقہ کے پیروکاروں کو گمراہ سمجھنے لگے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں میں تفریق فقہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ایک فقہ کے متبعین کا ایک فرقہ ہے اور دوسرے فقہ کے متبعین دوسرا فرقہ شمار ہوتے ہیں اور فقہ کے اختلاف کی وجہ سے ہی آپس میں اس قدر بغض و عناد ہے۔

عقائد کا تعلق دنیا میں عملی زندگی پر براہ راست کم پڑتا ہے جو واقعات تاریخ اسلام میں گزر چکے ان کو نہ تو کوئی مٹا سکتا (Un-do) ہے اور نہ ہی ان کا کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ہماری روز کی زندگی میں جس چیز کا اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے اور جس سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے وہ فقہ کا ہی اختلاف ہے۔ وہی ہماری عبادات پر حاوی ہے اور اسی کی بنیاد پر عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں اور انہیں کو عدالتوں میں نظائر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن ہماری فقہ جس کو ہم سب اس قدر اہمیت اور تقدس دیتے ہیں اس کی اصل صورت حال یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اور اس پر غور کرنے کے سلسلہ میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

اولاً جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے یہ تمام فقہ بنوعباس کے دور میں مدون ہوئے تھے اور وہ دور بادشاہت، پیشوائیت، جاگیرداری، استحصال، سرمایہ داری کا دور تھا۔ بادشاہت کی وجہ سے سخت استبداد تھا، فکر کی آزادی بالکل مسلوب تھی۔ اقلیتوں، مزدوروں، کسانوں، غریبوں، بچوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا خصوصاً عورتوں کے حقوق کا بالکل فقدان تھا۔ عورتوں کے متعلق زیادہ تر قوانین قرآن کریم کے بالکل خلاف بنائے گئے۔ وہ قرآن کریم جو انسانیت کو آزاد کرانے کے لئے آیا تھا، اسی سے بردہ فروشی اور غلامی کے قوانین کی سند حاصل کی گئی۔ قرآن کریم نے جتنے ذرائع Exploitation of man by man کے مدد کئے تھے، فقہ نے ان سب کو بالکل کھول دیا، قرآن کریم جتنی Revolutionary اور Progressive کتاب ہے، اتنا ہی اس کو فقہ کے قوانین میں جکڑ کے Retro-gressive بنا دیا۔

ثانیاً قابل غور یہ بات ہے کہ وہ دور بالکل ابتدائی اور سادہ دور تھا۔ آج کل کے مشکل اور پیچیدہ مسائل اس زمانہ میں درپیش نہیں تھے۔ آج کے پیچیدہ مسائل کا دس فیصد حصہ بھی اس وقت موجود نہیں تھا، موجودہ دور کے مسائل کا اس زمانہ میں فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ثالثاً یہ امر قابل لحاظ ہے کہ انسانی عقل اور انسانی معاشرے آہستہ آہستہ ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں، آج سے ایک ہزار سال پیشتر مغربی ممالک میں بھی جو قوانین بہت سخت، خلاف

عقل اور جامد تھے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے قوانین کی تشکیل میں عقل و بصیرت سے کام لیا' اور آج ان کے قوانین اس ایک ہزار سال پیشتر کے قوانین سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں آج سے ایک ہزار سال پیشتر انسانی عقل اور انسانی معاشرے اس قابل نہیں تھے کہ وہ ایسے عمدہ' قابل عمل اور بصیرت پر مبنی قوانین بنا سکیں کہ وہ آج ہمارا ساتھ دے سکیں۔ وحی الٰہی کی تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آئندہ آنے والے دور کا نہ صرف ساتھ دے سکے' بلکہ ہر دور میں راہنمائی بھی کرے اور عقل انسانی سے آگے آگے بھی رہے لیکن انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ عقل انسانی اپنے ماحول سے یقیناً متاثر ہوتی ہے اور وہ کسی حال میں بھی اپنے زمانہ سے آگے نہیں جا سکتی۔ ہمارے فقہائے عظامؒ کے بنائے ہوئے قوانین بھی اپنے مخصوص معاشروں سے متاثر ہوئے ہیں اور وہ اپنے دور کے لئے تو خود مکتفی تھے آج کے دور کا وہ ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

رابعاً یہ نکتہ پیش خدمت کرنا ضروری ہے کہ اسلامی حکومت اور مسلم حکومت میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ ہر مسلم حکومت اسلامی حکومت نہیں ہوتی مثلاً ہمارے اس دور میں ترکی' مصر' مراکش' انڈونیشیا وغیرہ کی حکومتیں مسلم حکومتیں ہیں کیونکہ وہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ہے لیکن یہ حکومتیں اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح بنو عباس کے دور کی حکومت بے شک مسلم حکومت تھی کیونکہ اس کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن وہ اسلامی حکومت نہیں تھی۔ بادشاہت کا ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلامی حکومت نہیں تھی بلکہ بادشاہت پر مبنی نظام تھا اور بادشاہ وقت کا حکم صحت شمار ہوتا تھا۔ وہ غیر اسلامی حکومت تھی۔ غیر اسلامی حکومت کے نافذ کردہ قوانین اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ چونکہ یہ قوانین خود غیر اسلامی حکومت کے مدون کردہ تھے' اس لئے وہ کسی طرح بھی اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جا سکتے لیکن ہم نے انہیں قوانین کو اسلامی ٹھہرا کر اپنی فقہ قرار دیا ہوا ہے۔ فقہ اسلامی یا شریعت اسلامی' اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین ہوتے ہیں۔ آج اگر پھر سے اسلامی نظام کسی جگہ متمکن ہو جائے تو اس حکومت

کے قوانین ہی فقہ اسلامی اور اسلامی شریعت ہوں گے ہم ان سابقہ غیر اسلامی حکومتوں کے قوانین کا اتباع کرنے کے پابند نہیں ہیں۔

قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء (۷/۳) ترجمہ۔ جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ قرآن کریم نے "اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم کے جملہ موجبہ سے صرف قرآن کریم کے اتباع کا حکم فرمایا اور ولا تتبعوا من دونه اولیاء کے سابقہ جملہ سے قرآن کریم کے علاوہ ہر مذہب، فرقہ، فقہ، مشرب اور مسلک کے اتباع کی نفی فرما دی لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ قرآن کریم محض تبرکا ہی رہ گیا ہے اور اتباع کے لئے مختلف فقہ اور اپنی اپنی منتخب شخصیتیں مقرر کی گئی ہیں جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے اور جس کی پیش گوئی قرآن کریم نے آیت نمبر (۳/۱۰۴) میں پہلے ہی کر دی ہوئی ہے کہ جو قوم ایسی روش اختیار کرے گی اس کے لئے عذاب عظیم ہے۔ واضح رہے کہ مسلمان صرف وحی الٰہی اور ہر اس حکومت کے جس میں الٰہی قوانین جاری ہوں، کا اتباع کرنے کے مکلف ہیں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کی پابندی ان پر لازم نہیں ہے کیونکہ اسلام نام ہے اس نظام کی اطاعت کا جو قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرے اور اس راستہ کا اتباع جو قرآن میں متعین کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں اتباع سنت پر بہت اصرار کیا جاتا ہے اور سنت کے مفہوم میں اتنا توسع رکھا گیا ہے کہ حضورؐ کے ذاتی تشخصی امور بھی سنت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حضورؐ ایک خاص خطہ زمین، اور ایک خاص دور میں تولد ہوئے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس ملک کی معاشرت ہی اختیار فرمانی ضروری تھی۔ حضورؐ کے وہ معمولات جو حضورؐ کے خورونوش، نشست و برخاست، عام روش زندگی سے متعلق تھے۔ انہیں بھی سنت کی تعریف میں شامل کر کے ان کے اتباع پر اصرار کیا جاتا ہے لیکن حیرت ہے کہ حضور کی اولین سنت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ حضورﷺ کی اولین

سنت یہ ہے کہ وہ صرف قرآن کا اتباع کرتے تھے۔ان اتبع الا ما یوحی الی (۱۰/۵) میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔اور اس کی خلاف ورزی سے جو عذاب خداوندی وارد ہوتا ہے اس سے وہ خائف رہتے تھے۔(۱۰/۱۵) حضور کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔واتبع ما یوحی الیک (۱۰/۱۰۹) اے رسول جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو۔اسی راستہ کے اتباع کو حضورؐ نے صراط مستقیم کا اتباع قرار دیا ہے۔ان ھذا صراط مستقیماً فاتبعوہ (۶/۱۵۴)۔یہ ہے وہ صراط مستقیم جس پر میں گامزن ہوں، تم سب بھی اسی کا اتباع کرو۔اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کا اتباع ہی اتباع سنت رسول اللہ ہے اسے اور کسی جگہ تلاش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں اور جو حضرات اتباع سنت پر اصرار کرتے ہیں انہیں سب سے پہلے حضورؐ کی اسی سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔قرآن کریم نے حضور ﷺ کو اول المسلمین قرار دیا ہے حضورؐ نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلم ہی کہا ہے اور اس میں تقدم زمانی کے ساتھ ساتھ تفوق کیفی بھی شامل ہے یعنی حضورؐ نہ صرف سب سے پہلے مسلمان ہوئے بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی حضورؐ اول المسلمین ہیں۔ان کی مثل اور نظیر اور کوئی مسلمان نہیں۔قرآن کریم کے واضح حکم کا اتباع کرتے ہوئے حضورؐ نے اپنے کو ہمیشہ مسلم ہی قرار دیا، اس لئے اس سنت سے اہم اور ضروری سنت اور کون سی ہو سکتی ہے لیکن افسوس کہ جو حضرات اور تمام سنتوں جیسے خاص سائز کا مسواک کرنا، ایک خاص وضع کا لباس پہننا، بیٹھ کے پانی پینا وغیرہ جیسی سنتوں تک کی نگہداشت کرتے ہیں وہ اس سنت پر بالکل عمل نہیں کرتے۔

سابقہ صفحات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے اور فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب سے بالکل نہیں رہتا۔ان میں سے ہر شق کے بارے میں متعلقہ آیات ساتھ ساتھ درج کی گئی ہیں۔مزید یہ تحریر کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی سنت بھی وہی ہے کہ فرقہ بندی سے مجتنب رہا جائے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہا جائے لیکن حیرت کی بات ہے کہ دستور پاکستان میں ان دونوں باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا

گیا ہے اور فرقہ واریت کو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل (۱) ۲۲۷ میں درج ہے۔

''تمام موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو''۔

اس شق کے مطابق تمام قوانین کا ماخذ صرف قرآن و سنت کو قرار دیا گیا تھا اور کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف وضع نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے بعد صدارتی حکم نمبر ۱۴ مجریہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء میں ان قوانین کے سلسلہ میں مزید ترمیم ان الفاظ میں کر دی گئی۔

وضاحت: جب ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں کے کسی فرقہ کے پرسنل لاء (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن و سنت سے مراد اس فرقہ کی اپنی تعبیر ہوگی''۔

دستور کی شق نمبر (۱) ۲۲۷ کی اس ترمیم سے فرقہ بندی کو پورا پورا آئینی تحفظ مل گیا جس سے عملاً دو دشواریوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ پہلی دشواری یہ ہوگی کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے مختلف فرقوں کے لئے شخصی قوانین کی حد تک، مختلف قوانین وضع کئے جائیں گے۔ اس طرح ایک ملک میں کئی قوانین کا نفاذ ہوگا۔ دوسری بات جو قابل غور ہے۔ یہ ہے کہ اس طرح پرسنل لاء اور پبلک لاء میں قوانین تقسیم کر دیئے گئے۔ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق بالکل غیر قرآنی ہے۔ یہ تفریق غیر اسلامی حکومت میں ہوتی ہے جہاں پبلک لاء تو سیکولر ہوتے ہیں تو وہاں پرسنل لاء اسلامی جاری کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب حکومت ہی اسلامی ہو تو وہاں پرسنل اور پبلک لاء کی تفریق مناسب نہیں۔ اسلامی حکومت میں قوانین، حکومت کی طرف سے مدون اور جاری ہوتے ہیں۔ ان کا اطلاق سب مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس لئے ضر[illegible] ہے کہ قرآن و سنت کو مختلف فرقوں کے معیارات میں جانچنے کی پابندی کو ختم کر دیا جائے۔ کیو[illegible] جب تک یہ پابندی ختم نہیں ہوگی نہ عدالت کچھ کر سکے گی اور نہ قرآن و سنت کو صحیح مقام حاصل ہوگا لہٰذا ملک میں فرقہ بندی کو مزید تقویت ملنے سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قوانین

کو وضع کرلے کے لئے عدالت کو صرف قرآن وسنت تک ہی پابند کیا جائے اور اس کے علاوہ ہر اس پابندی سے آزاد کردیا جائے جس سے قانون سازی میں مزید دشواریاں بھی پیدا ہوں اور فرقہ بندی کو بھی مزید فروغ حاصل ہونے کا خدشہ ہو۔ نیز ہر مسلمان شہری کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ قرآن کریم کی اطاعت اور حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف مسلمان کہے' اور اس کے علاوہ کسی اور نام سے اپنے آپ کو موسوم نہ کرے۔ اگر حکومت مناسب سمجھے اور عوام تعاون کریں تو حکومت اس کو قانون کی حیثیت سے نافذ کردے اور اس کے عدم تعمیل کی صورت کو جرم قرار دے۔

آج مسلمان جس مجبور ومقہور حالت میں ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے فرقہ بندی کی لعنت سے جان چھڑانا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مسلمان غالب رہنے کے لئے آیا ہے مغلوب ہونے کے لئے نہیں۔ امت مسلمہ کو حکم ہے کہ ان اتبع ملته ابراهيم حنيفا (۱۶/۱۲۳) تم ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔ حضرت ابراہیم کو اماماً للناس کہا گیا کہ وہ ساری انسانیت کے امام ہیں۔ ان کا مقام ساری انسانیت کے لئے رہبر اور قائد کا مقام ہے اور ہم مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى (۲/۱۲۵) تم مقام ابراہیم کو اپنے لئے مصلیٰ بنالو یعنی مقام کے بالکل پیچھے پیچھے چلو چونکہ ابراہیم کا مقام نوع انسانی کی امامت تھی اس لئے تمہارا مقام بھی نوع انسانی کی امامت اور رہبری ہونا چاہئے نیز یہ کہ مسلمانوں کو عالم انسانیت کا نگران بنایا وکذلک جعلنكم امته وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا (۲/۱۴۳) اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی قوم بنایا کہ جو عالمگیر حیثیت کی مالک ہے۔ ایسی بین الاقوامی کہ دنیا کی تمام قومیں' تم سے برابر فاصلے پر رہوں۔ تمہارے لئے عدل وانصاف کے زاویہ نگاہ سے تمام اقوال یکساں ہوں۔ تمہارا منصب یہ ہے کہ تم ان تمام اقوام کے اعمال وکردار کے نگران رہو اور خود تمہارے اعمال کا محاسبہ کرنے والا' اس نظام کی مرکزی اتھارٹی اور اسلامی حکومت

کا حاکم اعلیٰ ہو یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی' ان سب پر نگران اور ان کا مرکز رسول اور رسول کے بعد ان کے جانشین ان کے اعمال کے نگران۔ افسوس صد افسوس اور صد ہزار افسوس کا مقام ہے کہ قرآن کریم کے مطابق ملت اسلامیہ کا دنیا میں کیا مرتبہ و فریضہ تھا۔ ایک وہ قرآن کریم کی بیان کردہ ملت اسلامیہ ہے اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہونے کے مدعی ہیں کہ دوسروں کے اعمال کے نگران ہونا تو بڑی بات ہے ہم خود اقوام عالم میں سب سے زیادہ ذلیل و پست ہیں کیونکہ ہم نے آپس میں فرقہ بندی اور دشمنی اور عناد پیدا کیا ہوا ہے۔

جن قوموں کے پاس وحی الٰہی کی روشنی نہیں وہ کسی بھی قدر کے پابند نہیں۔ ان کی کوئی مستقل اقدار (Values) ہی نہیں۔ جس قدر (Value) میں فائدہ دیکھا وہ اختیار کر لی۔ مگر ہم مسلمانوں کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ ہمارے پاس وحی ہونے کے سبب سے ہمارے پاس مستقل اقدار ہیں جن پر عمل کرنے کے ہم پابند ہیں اور وہی ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہیں۔ ان اقدار پر عمل کرنا نہ صرف ہمارے لئے ضروری ہے بلکہ اس بات کی نگرانی کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے کہ عالم انسانیت میں وہ اقدار (انسانی حقوق) نافذ و جاری ہوں۔ قرآن کریم نے ان مستقل اقدار کے لئے ایک جامع اصطلاح معروف و منکر کی استعمال کی ہے جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین سے لے کر قرآن کریم کی مستقل اقدار سب شامل ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی مستقل اقدار میں سے ایک قدر تکریم انسانیت ہے۔ مسلمان قوم کا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا میں اس بات کی نگرانی کرے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں تکریم انسانیت ہو رہی ہے یا نہیں۔ جان کی قدر و قیمت' محنت کا پورا پورا بدلہ' عفت' عصمت' زمین پر ساری انسانیت کے لئے برابر کا استحقاق' ہر شخص کو اس سے برابر کا فائدہ اٹھانے کا موقع دینا' بنیادی ضروریات کا فراہم ہونا' رزق' تعلیم' مکان کا ہر شخص کے لئے مہیا ہونا عدل و انصاف کا آسان اور مفت حاصل ہونا۔ اس قسم کے بے شمار معروف ہیں جن کا نفاذ اسلامی حکومت کرتی ہے اور دیگر اقوام کی نگرانی کرتی ہے کہ ان سب میں یہ معروف جاری ہوں۔ قرآن کریم کے مطابق امت مسلمہ کا یہ مقام ہے اور عملاً جو

ہماری حالت ہےاس کے لئے حالم مپرس صورت ببین کی مثال صادق آتی ہے۔

ہم مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ ہماری خود پیدا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ دیگر غیر مسلم اقوام ہماری اس حالت سے نہ صرف خوش ہیں بلکہ چاہتی ہیں کہ ہم مستقل اسی حالت میں اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہیں۔ ہم اس بات کا اندازہ ہی نہیں کرتے کہ غیر مسلم اقوام کو ہمارے سے کتنی عداوت ہے اور کتنی دشمنی ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کی دشمنی کی ایک رمق جو ظاہر ہوتی ہے غیر مناسب نہیں ہوگا اگر اس کا مختصراً تذکرہ اس مضمون کے بالکل آخر میں کر دیا جائے تا کہ قارئین کرام کو اندازہ ہو کہ غیر مسلم اقوام کو کس قدر دشمنی ہم سے ہے۔

Mr. Samuel P. Huntington ہارورڈز یونیورسٹی میں معروف پروفیسر ہیں ان کا ایک مضمون The clash of civilizations ایک مشہور رسالہ Foreign Affairs کے ۱۹۹۳ء Summer کے Issue میں طبع ہوا ہے۔ اس مضمون نے بہت شہرت پائی۔ ایک تو صاحب مضمون معروف شخصیت ہیں دوسرے مضمون کا موضوع پرکشش ہے اور مضمون بھی علمی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ملخص اس مضمون کا یہ ہے کہ دنیا میں آئندہ جو تصادم ہوگا وہ تہاذیب کا ہوگا۔ ایک طرف مسلمان اور کنفوشس کے پیروکار یعنی چینی وغیرہ ہوں گے اور دوسری طرف مغربی تہذیب ہوگی۔ مضمون پرمغز ہے اور پروفیسر صاحب موصوف نے تاریخی حوالہ جات و واقعات پیش کرنے کے بعد اپنے نظریہ کو بخوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا زیر نظر مضمون کو اس کی صحت و سقم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس زیر نظر مضمون کا جس بات سے تعلق ہے اور جو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ مضمون کے بالکل آخر میں انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ مغرب کو چاہئے کہ اپنی تہذیب کو ترقی دے اور خاص طور پر شمالی امریکہ، لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور جاپان اور روس سے بھی تعاون پر مبنی تعلقات کو فروغ دے۔ مختلف تجاویز کے بعد اصل بات جو انہوں نے تحریر کی ہے اور جس کے لئے اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

To exploit differences and conflicts among Confucian and Islamic States.

کنفوشش کے پیروکاروں اور اسلامی حکومتوں میں' آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہیے یعنی کنفوشش کے پیروکاروں میں جو اختلافات ہیں ان کو فروغ دینا چاہیے اور مسلم ممالک کے باشندوں میں بھی جو اختلافات' مناقشات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ وہ تجاویز ہیں جو پروفیسر صاحب موصوف نے بین الاقوامی سطح پر پیش کی ہیں۔

مسلمانوں کی عزت وذلت' اقبال' ادبار' عروج وزوال ان کے دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ان کا دین قائم ہے تو یقیناً مسلمانوں کو عروج حاصل ہوگا۔ اگر انہوں نے اپنے دین سے اعراض کیا' اپنے خود ساختہ قوانین جاری کئے تو مسلمانوں کو کبھی عروج حاصل نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کے لئے عروج وتمکن حاصل کرنے اور فرقہ بندی کی لعنت کو دور کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان قرآن کریم کے نظام کو جاری کریں اور اسلام کو بحیثیت دین کے متمکن کریں۔ مسلمانوں کی قائم کردہ اسلامی حکومت قرآن کریم کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق قانون وضع کرے وہی ان کی فقہ اور وہی ان کی شریعت ہوگی۔ ہر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین ہی اس دور کے لئے فقہ اور شریعت ہوتے ہیں۔ سابقہ فقہ اور شریعتوں کے بجائے' ان کا اتباع ہی ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ اس طرح فرقہ بندی وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔

آخر میں تمام مسلمان بھائیوں سے نہایت دل سوزی' دردمندی سے درخواست ہے کہ خدارا اپنی حالت زار پر رحم کرو۔ اس سے زیادہ زوال وادبار شاذ ہی کسی اور قوم کے نصیب میں لکھا ہو۔ کیوں اللہ کے غضب اور عذاب کو آوازیں دے دے کر بلاتے ہو۔ اپنی عورتوں' بچوں' آل اولاد کو پیش نظر رکھو۔ ان پر رحم کھاؤ' آپس کی فرقہ بندی اور دشمنی ترک کرے' قرآن کریم کا اتباع کر کے دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کرو۔

(بشکریہ آواز' لاہور' بابت جون ۱۹۹۹ء)

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اطاعتِ رسول کا قرآنی طریقہ

غلبہ و اقتدار صرف ذات باری تعالیٰ عزاسمہ کے لئے مخصوص ہے اور وہ ہی ذات والا صفات اس کا مستحق ہے اسی لئے قرآن کریم ہی اس کی جملہ صفات عالیہ میں سے ایک صفت العزیز ۱۲۵/۲۰ بیان فرمائی گئی ہے اور یعنی ساری کائنات میں غلبہ و اقتدار اس کے قانون کو حاصل ہے اور کوئی طاقت ایسی نہیں ہے' جو اس کے قانون پر غالب آ جائے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے طبعی قوانین بھی شامل ہیں اور انسانی معاشرہ کے قوانین بھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً وحی الٰہی کے ذریعے انسانیت کو ملتے رہے۔ انسانی معاشرہ میں اس قسم کا غلبہ ہر اس قوم کو حاصل ہوسکتا ہے جو اس نظام کے تحت قوانین خداوندی کے مطابق معاشرہ تشکیل کرے۔ وللہ العزۃ و للرسولہ وللمومنین ولکن المنٰفقین لا یعلمون ۸/۶۳۔ حالانکہ عزت تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے مگر منافقین نہیں جانتے نیز فرمایا من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمعیا ۸/۳۴' جو شخص بھی عزت کا خواہاں ہو تو (خدا سے مانگے) کیونکہ ساری عزت تو خدا ہی کی ہے۔ اسی کے نظام سے وابستگی میں ہی عزت و غلبہ ہے۔ قرآن کریم کے یہ دعاوی صرف نظری ہی نہیں تھے۔ بلکہ صدر اول میں حضور علیہ السلام اور آپ کے عالی مقام ساتھیوں نے قرآن کریم کے ان دعاوی کی صداقت کو عملاً ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور نہایت پروقار مضبوط معاشرہ قائم کیا کہ جس کے سامنے اس دور کے سارے باطل نظام پر مبنی معاشرے مغلوب و عاجز ہو گئے۔ اس معاشرہ کے غالب اور مقتدر ہونے کی اصل وجہ اس معاشرہ کی وہ Ideology' وہ نظام حیات' وہ کلمۂ طیبہ تھا جس پر اس معاشرے کو قائم کیا گیا

تھا اور جس کو بحیثیت مجموعی جاری کیا گیا تھا۔ قرآن کریم کا انتباہ ہے کہ نظام حیات قابل انقسام (Divisible) نہیں ہوتا۔ اس پر کلی طور پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ ادخلوا فی السلم کافته ولا تتبعوا فطوت الشیطن ۲/۲۰۸۔ ایمان والو تم سب ایک بار اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو اور اگر نظام حیات کے حصے بخرے کئے تو اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو افتومنون ببعض الکتب وتکفرون ببعض نعما جزاء من یفعل و ذالک منکم الا خزی فی الحیوة الدنیا ۲/۸۵' کیا تم کتاب خدا کی بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو' پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو۔

لیکن بدقسمتی سے چونکہ مسلمانوں میں ملوکیت در آئی اس لئے اس نظام حیات کا بحیثیت مجموعی جاری ہونا ناممکن ہو گیا۔ ملوکیت تو خود قرآن کریم کے نظام کے بالکل خلاف ہے۔ اس میں تو قرآنی نظام کا جاری ہونا بالکل دو متضاد چیزیں تھیں۔ ملوکیت کے ابتدائی دور میں معاشرہ اپنے (Momentum) (قوتِ درونی) کے زور پر چلتا رہا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس میں زوال شروع ہوا۔ ملوکیت کو جو کچھ نقصان انسانیت کو پہنچانا تھا اس سے تو مفر ہی نہیں تھا۔ لیکن یہ توقع تھی کہ ملوکیت کی گرفت کمزور ہو جانے کے بعد پھر اس نظام کو دوبارہ جاری کیا جا سکتا تھا لیکن جس چیز سے اس سے بھی زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا وہ ملوکیت کی وہ سازش تھی جس میں اس نے اس نظام حیات کی بنیادی اصول ہی تبدیل کر دیئے اور جس کی بناء پر دوبارہ اس نظام کا قیام ہی ناممکن ہو گیا۔ یہ قرآنی نظام اور اصل الاصول اور اساس محکم یہ تھا کہ اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت کے مرادف تھی۔ اور انسان اور اللہ تعالیٰ کا تعلق صرف اس نظام کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ اس میں انسان اور اللہ تعالیٰ کے ذاتی اور نجی تعلق کی بالکل نفی ہو جاتی تھی۔ یہ نظام زندہ ہونا چاہئے' محسوس اور عملی شکل میں اس کے قوانین کا اجراء ہونا چاہئے۔ یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون ۔(ترجمہ) اے ایمان

والواللہ ورسول کی اطاعت کرو،اوراس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ وہ نظام ایسی عملی شکل میں موجود ہو کہ اس سے روگردانی کا امکان موجود ہو۔اسی لئے اس سے روگرانی کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہےاوراسی نظام کی اطاعت کواللہ ورسول کی اطاعت گرداناگیا ہےلیکن چونکہ اس نظام کے قائم کرنے میں ملوکیت کواپنی موت دکھائی دیتی تھی۔اس لئے اس نے نہ صرف اس نظام کوہی ختم کردیا بلکہ اس نظام کے کبھی بھی قائم ہونے کا امکان ہمیشہ ہمیشہ لئے بالکل ختم کردیا۔اوراللہ ورسول کی اطاعت کا قرآنی تصورہی بدل دیا۔جس سے نظام قائم کرنے کا ذرابھی امکان باقی رہتااور یہ نظریہ قائم کیا کہ اللہ ورسول کی دواطاعتیں ہیں جن کا عملی طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہےاوراحادیث کی اطاعت سے رسول ﷺ کی اطاعت ہوتی ہےاور چونکہ یہ اطاعتیں ذاتی اورنجی طور پر ہر معاشرے میں ہوسکتی ہیں،اس لئے اس نظام کے برپا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں اوراس طرح ملوکیت نے اپنا تحفظ فراہم کرلیا اور یہی مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا دائمی سبب ہوااور اسی وجہ سے آج تک ہم مسلمانوں میں تباہی و بربادی مسلط ہےاورمختلف ممالک میں ملوکیت بھی قائم ہے کیونکہ نظری حیثیت سے ملوکیت کا جواز موجود ہےاور جب تک ہم مسلمان اس نظریہ پرنظرثانی نہیں کریں گے نہ ملوکیت کا نظام ختم ہوگا،اور نہ ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی۔اور جب تک اللہ ورسول کی اطاعت قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق نہیں ہوگی ہم مسلمان کسی طرح بھی غلبہ و اقتدارحاصل نہیں کرسکیں گے۔

اللہ ورسول کی اطاعت کا قرآنی طریقہ اس کے نظام کی اطاعت اور ان دونوں اطاعتوں کوایک شمار کرنا ہے۔یہ حقیقت قرآن کریم میں اس قدرواضح اورتاکید کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس سے انکارنہیں کیاجاسکتا۔ان مقامات کوتوجہ سے دیکھنے کے بعداس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن کریم نے اللہ ورسول کے الفاظ اپنی اصطلاح کے طور پر بیان فرمائے ہیں۔جس سے حکومت اسلامی کااقتداراعلیٰ مراد ہےاور یہ کہ یہ ایک اطاعت ہے۔

(۱) یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑ دیا تھا جو کہ انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ کیا تھا۔ اس عہد توڑنے کو اللہ و رسول کی مخالفت قرار دیا ہے' اس لئے کہ یہ مخالفت نظام اسلامی کی مخالفت تھی۔

ذلک بانهم شاقو الله و رسوله' ومن يشاق الله فان الله شديد العقاب (۵۹/۴)۔ (ترجمہ) یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے خدا اور رسول کی مخالفت کی اور جس نے خدا کی مخالفت کی تو خدا بڑا عذاب دینے والا ہے۔

(۲) ان الذين يوذون الله و رسوله لعنهم الله فى الدنيا والاخره واعد لهم عذابا مهينا (۳۳/۵۷)۔ بےشک جو لوگ اللہ کو اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر خدا نے دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لئے رسوائی کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اگر اللہ سے مراد اللہ کی ذات اور رسول سے مراد رسول کی ذات لی جائے تو آیت کبھی بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ کیونکہ حضور کو تو ایذاء پہنچائی جا سکتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کو کون ایذاء پہنچا سکتا ہے۔ اس کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس آیت میں مراد نظام خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

(۳) يحلفون بالله لكم ليرضوكم والله و رسوله احق ان يرضوه ان كانوا مومنين (۹/۲)۔

یہاں اللہ و رسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ یرضوہ میں ضمیر واحد لائی گئی ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان والو منافق تمہیں راضی کرنے کے لئے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں' حالانکہ اللہ اور رسول زیادہ حقدار ہے کہ اگر وہ مومن ہیں تو اس کو راضی رکھیں یعنی ر آنی نظام کے وفادار رہیں۔ اب بات واضح ہے کہ اللہ اور رسول کے لئے ضمیر واحد آئی ہے۔ ن اللہ و رسول ایک نہیں۔ اللہ اللہ ہے' رسول رسول ہے۔ خالق و مخلوق ایک نہیں ہو سکتے۔ پس

اللہ اور رسول کے لئے واحد ضمیر ہی لاکر اور انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے جملہ اللہ اور رسول اصطلاح کے طور پر کسی ایسی چیز کے لئے لایا گیا ہے جو ایک ہے' دو نہیں ہیں۔

(۴) برأة من اللہ و رسولہ الی الذین عاھد تم من المتشرکین (۹/۱)۔

جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح) کا معاہدہ کیا ہے۔ ان کے لئے اللہ و رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔

(۵) وآذان من اللہ و رسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری من المشرکین و رسولہ۔

اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہے۔

(۶) کیف یکون للمشرکین عقد عنداللہ و عند رسولہ الا الذین عاھدتم عندالمسجد الحرام۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مشرکوں کا عہد "اللہ اور اس کے رسول" کے نزدیک عہد ہوتا ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب عہد و پیمان باندھا تھا۔

یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ ہیں۔ لیکن انہیں اللہ و رسول کے معاہدات کہا گیا ہے۔ اس وضاحت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ اس نکتہ کی طرف مرکوز کی جائے کہ اگر چہ یہ تمام احکامات رسول اللہ کی طرف سے جاری ہو رہے تھے لیکن درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات ہیں' اس لئے کہ یہ اسلامی حکومت کے مرکز کی طرف سے جاری ہو رہے ہیں۔

(۷) اس سلسلہ میں سورہ النساء کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ صحت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے ارشاد ہوتا ہے ومن یخرج من بیتہ مھا جرا الی اللہ و رسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ وکان اللہ غفورا رحیما (۴/۱۰۰)۔

(ترجمہ) اور جو شخص اپنے گھر سے جلاوطن ہو کر خدا اور اس کے رسول کی طرف نکل کھڑا ہوا پھر اسے (منزل مقصود تک پہنچنے سے پیشتر) موت آ جائے تو خدا پر اس کا ثواب لازم ہے اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ اور رسول کے معنی اسلامی حکومت کے علاوہ اور ہو ہی نہیں سکتے۔

ان مندرجہ بالا مقامات سے ظاہر ہے کہ اللہ و رسول سے مراد اسلامی حکومت ہے اور اس کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہے اور رسول اللہ کی اطاعت کرنے کا یہی قرآنی طریقہ ہے لیکن ہمارے ہاں ملوکیت کے دور کا مروجہ طریقہ رسول اللہ کی اطاعت کا یہ ہے کہ حدیث کے اتباع سے رسول اللہ کی اطاعت ہوتی ہے' جو قرآنی طریقہ سے بالکل متضاد ہے اس وقت سب سے اہم نکتہ جو نہایت غور و فکر کا متقاضی ہے وہ یہی ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت کرنے کا قرآنی طریقہ کیا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے جو راقم سطور کتر ین نے سابقہ سات آیات کریمات سے واضح کیا ہے کہ حضور کی اطاعت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اللہ کا دیا ہوا نظام جس کو عملاً حضور ﷺ نے متشکل کر کے دکھایا تھا' اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی' کیونکہ یہ نظام کوئی وقتی یا ہنگامی طور پر قائم نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے اس نظام کی اطاعت ہی ہمیشہ اللہ و رسول کی اطاعت گردانی جائے گی۔ **وکیف تکفرون وانتم تتلیٰ علیکم ایت اللہ وفیکم رسولہ ومن یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراط مستقیم** (۳/۱۰۱)۔ (ترجمہ) اور تم کیونکر کافر بن جاؤ گے (حالانکہ) تمہارے سامنے خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور اس کے رسول بھی تم میں موجود ہیں اور جو شخص خدا سے وابستہ ہو وہ تو ضرور سیدھی راہ پر لگا دیا گیا ہے۔

اس آیت مجیدہ میں **فیکم رسولہ** کے الفاظ غور طلب ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حضور ﷺ کی حیات تک تو تم ہدایت پر رہو گے اور پھر تم ہدایت سے پھر جاؤ گے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم کیسے کفر کر سکتے ہو جبکہ قوانین خداوندی تمہارے پاس موجود ہیں نیز یہ کہ ان قوانین کو عملی

طور پر چلانے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی تمہارے درمیان موجود ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے تم کفر نہیں کر سکتے۔ اس آیت کریمہ اور آیات وانتم تسمعون واذا دعا کم لما یحییکم (۸/۲۴) سے واضح ہے کہ وہ اتھارٹی زندہ ہے جس کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں یہ نظریہ ہے کہ فیکم رسولہ سے مراد حدیث و روایات ہیں اور عملاً روایات کی اطاعت سے ہی رسول کی اطاعت کی جاتی ہے۔ موجودہ جمع شدہ روایات کے نہ تو الفاظ ہی حضورﷺ کے ہیں نہ ہی حضورﷺ کے دور میں مدون ہوئیں۔ نہ ان کو حضورﷺ کی سند حاصل ہے نہ ان سے زندہ اتھارٹی کا تصور ملتا ہے۔ تو ان کی اطاعت سے حضور کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے۔ ان سے صرف رواۃ کرام کی اطاعت تو ضرور ہوتی ہے جن کے الفاظ میں وہ روایات مروی ہیں حضورﷺ کی اطاعت ان سے قطعاً نہیں ہوتی۔

ہمارے ہاں دینی حلقوں میں آیت کریمہ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (۳/۳۰) ان سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کہ خدا (بھی) ہم کو دوست رکھے گا' تلاوت کی جاتی ہے اور اس آیت سے اتباع رسول کے بارے میں کتب و روایات کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے اور اس پر اصرار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ ان اتبع الا ما یوحی الی (۶/۵۰) میں صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے اوحی الی ھذا القران. میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔ دونوں آیات کی ترتیب سے واضح ہے کہ حضور صرف قرآن کا اتباع فرماتے تھے اور اصل متبوع وحی الٰہی ہے جس کے تابع خود حضور تھے۔ اسی طرح اگر چہ حضورﷺ ہمارے درمیان میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے درمیان میں اصل متبوع وحی الٰہی یعنی قرآن کریم اپنی منزہ شکل میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ بس آیت مندرجہ بالا میں اتباع رسول کی صورت میں اتباع قرآن کا حکم دیا گیا ہے' کتب روایات کے اتباع کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ دین کا دارومدار یقینیات پر ہوتا ہے اس کا دارومدار ظنیات پر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ یقینی چیز کا

اتباع کا حکم ہوتا ہے۔ظنی چیزوں کے اتباع کا حکم اس سرکار سے مل ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ خود ارشاد الٰہی ہے ان الظن لا یغنی من الحق شیئا اس آیت کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظن کے اتباع کا حکم نہیں مل سکتا۔روایات ظنی ہیں اور اس زمرہ میں شامل ہیں، اس لئے ان کے اتباع کا حکم کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں مل سکتا۔

اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ۔حضور اکرم ﷺ کو حکم ہوا کہ ملت ابراہیم کا اتباع اختیار کریں۔ثم اوحینا الیک ان اتبع ملت ابراہیم حنیفا (۱۶/۱۲۳)، پھر ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی کہ ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرو۔اس آیت کریمہ میں تو صرف حضرت ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔لیکن دوسری جگہ سورہ انعام میں متعدد انبیاء کرام حضرات اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، یسوع، یونس، لوط، ان سترہ انبیاء کرام کے نام گنوانے کے بعد حکم ہوا کہ اولئک الذین ھدی اللہ فبھدا ھم اقتدہ (۶/۹۰)، یہ (انبیاء کرام) وہ لوگ تھے جن کی خدا نے ہدایت کی، پس تم بھی ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔

اب ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کے پاس نہ تو حضرت ابراہیم کے دور کی روایات موجود تھیں اور نہ ہی ان تمام سترہ انبیاء کرام کے ادوار کی احادیث موجود تھیں، لیکن اس کے باوجود حضور کو ان کی ہدایت کی پیروی کا حکم دیا گیا اور یقیناً یقیناً حضور ﷺ نے ان تمام انبیاء کرام کی ہدایت کی پیروی فرمائی۔تو کیا وہ پیروی حضور ﷺ نے ان انبیاء کرام کی احادیث کی رو سے کی تھی، قطعاً نہیں۔عقلاً یہ بات قابل تسلیم نہیں ہوسکتی۔سنت اللہ یہی رہی ہے کہ وحی الٰہی کی تعلیم نوح علیہ السلام سے لے کر حضور تک ایک ہی رہی ہے۔جب حضور ﷺ نے اپنے پر نازل شدہ وحی کا اتباع کیا، تو ان سابقہ انبیاء کرام کی وحی کا بھی اتباع اس میں شامل ہوگیا۔مایوحی اور ما انزل کا اتباع ہی انبیاء کرام کا اتباع ہوتا ہے۔جس طرح حضور نے مایوحی کا اتباع کر کے جملہ انبیاء کا اتباع کیا ہے، اسی طرح ہم بھی اگر مایوحی کا اتباع کریں گے تو یہ حضور ﷺ کا ہی اتباع ہوگا

اور یہ اتباع قرآن کریم کے طریقہ کے مطابق ہونے کے علاوہ، حضورﷺ کی سنت کے مطابق بھی ہوگا کہ حضور خود بھی انبیاء کرام کا اتباع اسی طرح فرماتے تھے اور جن حضرات کو حضور کی سنت پر عمل کرنے پر اصرار ہے، یہ طریقہ ان کے مفاد کے مطابق ہے۔ اس طرح نہ تو حضورﷺ نے روایات کی طرف توجہ فرمائی، اور نہ ہی اب مسلمانوں کو ان کی طرف توجہ دینے کی احتیاج ہے۔ و فتدبروا۔

اس سلسلہ میں اسوۂ حسنہ کے متعلق بھی یہ تصور دیا جاتا ہے کہ چونکہ حضورﷺ کی زندگی ہم سب کے لئے ایک مثالی زندگی ہے، اس لئے حضورﷺ کی حیات مبارکہ کے تمام احوال وکوائف ہمیشہ پیش نظر رکھنے چاہئیں اور ان پر شب و روز عمل پیرا ہونا چاہئے۔

اس سے بھی احادیث کا سہارا لیا جاتا ہے کہ احادیث کے بغیر حضورﷺ کا اسوۂ حسنہ اختیار نہیں کیا جا سکتا اور آیت کریمہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ (۳۳/۲۱)۔ اس کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے کہ حضورﷺ کے اسوہ حسنہ کے لئے احادیث کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ بعینہٖ یہی الفاظ دو مرتبہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے لئے بھی بیان کئے گئے ہیں کہ اے مسلمانو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ساتھیوں کی زندگی تمہارے لئے ایک مثالی زندگی ہے۔ فرمایا قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معه اذقالوا لقومھم انا برء وامنکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم و بدابیننا وبینکم العداوۃ والبعضآء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ (۶۰/۴)۔ اے مسلمانو تمہارے واسطے تو ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا اچھا نمونہ (موجود) ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو، بیزار ہیں۔ ہم تو تمہارے (دین کے) منکر ہیں اور جب تک تم خدا پر ایمان نہ لاؤ ہمارے تمہارے درمیان کھلم کھلا عداوت و دشمنی قائم ہوگئی ہے۔ نیز دو ہی آیات کے بعد ارشاد ہوا۔ لقد کان لکم فیھم اسوۃ حسنۃ لمن کان

یـرجوا الله والیوم الآخر (۶/۶۰)۔(مسلمانو) ان لوگوں کا تمہارے واسطے جو خدا اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہو' اچھا نمونہ ہے۔قرآن کریم نے نہ صرف حضرت ابراہیم بلکہ ان کے ساتھیوں کی زندگی بھی ہمارے لئے اسوۃ حسنہ قرار دی ہے۔لیکن قرآن کریم نے خود ہی بیان فرما دیا کہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کا جو عمل قابل نمونہ ہے وہ ان کا منکرین دعوت قرآنی کے ساتھ تعلقات منقطع کرنا ہے اور ان سے کھلم کھلا دشمنی اختیار کرنا ہے' اور یہ کہ غیر مسلموں کو دوست نہیں بنایا جا سکتا اور ان سے تعلقات نہیں رکھے جا سکتے۔ یہ نظریہ اور اس پر خود حضرت ابراہیم کا' اور ان کے معزز ساتھیوں کا عمل پیرا ہونا' ہم سب مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

بالکل اسی طرح ہمیں حضور کے اسوہ حسنہ کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ جنگ احزاب کا واقعہ ہے کہ جب مصائب اور مشکلات اپنی آخری حد تک پہنچ چکی تھیں باہر سے دشمن کی مخالفت سیلاب بلا کی طرح امنڈ کر آ رہی تھی اور اندر سے منافقین کی فریب کاریاں قدم قدم پر پریشانی کا موجب بن رہی تھیں اور ان حالات میں ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر کر رہا تھا۔لیکن ان حالات میں بھی حضور ﷺ روشنی کے مینار کی طرح جم کے کھڑے رہے' اور ان کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہ آنے پائی۔رسول اللہ کی یہ استقامت' سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لئے وجہ سکون واطمینان تھی اور نیز یہ کہ ہر اس شخص کے لئے بہترین نمونہ تھی (اور ہے) جو خدا اور روز آخرت کی امید رکھتا ہو' اور خدا کی یاد بکثرت کرتا ہو۔ جو اللہ تعالیٰ کے قانون کی ہمہ گیری اور نتیجہ خیزی پر یقین کامل رکھتا ہو اور مستقبل کی زندگی کی خوشگواریوں پر جس کی نگاہ ہو اور جو ہر وقت قانون خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا ہو۔جس نمونہ کی وضاحت قرآن کریم نے خود اپنی آیات میں فرما دی' ان میں احادیث و روایات کا سہارا لینے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی۔حضور ﷺ کا جو اسوہ حسنہ امت کے لئے واجب الاتباع ہے وہ قرآن کریم نے خود ہی بیان فرما دیا ہے اور یہ آیات کریمات بھی منجملہ ان آیات کے ہیں۔جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے مایوحی اور ما انزل کا اتباع ہی حضور کا اتباع ہے اور اس کے لئے خارج از قرآن روایات کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی

ہے۔ یہاں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ہماری احادیث میں جو احادیث حضورﷺ کے اسوہ حسنہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں' ان کا بیشتر حصہ حضور کے ذاتی معمولات' اور نجی معاملات سے متعلق ہے جس کا تعلق نہ تو دین سے ہے اور نہ ہی ان کا اتباع امت پر لازمی ہے اور بیشتر ان میں سے ایسی بھی ہیں جو انبیاء کرام اور خود حضورﷺ کی سیرت کو بہتر طریقہ پر پیش نہیں کرتیں اور آیت مبارکہ ولکم فی رسول اللہ اسوۃ سے یہ دلیل دینا کہ ان کو جمع کرنا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے' درست نہیں ہے۔ حضورﷺ کے ذاتی معمولات' شب و روز کے اعمال کا اتباع مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ اس لئے ان احادیث کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اور جو اسوہ حسنہ حضورﷺ کا واجب الاتباع ہے وہ خود قرآن کریم نے بیان فرمادیا ہے اور اپنی دفتین میں محفوظ کر دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا مودودی نے بہت وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

''جو امور آپ نے عادتاً کئے ہیں' ان کو سنت بنا دینا اور تمام انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں' اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔'' (رسائل مسائل حصہ اول صفحہ ۳۰۰)۔

نیز لکھا ہے:

''تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبیﷺ تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی علیہ السلام نے ان اصولوں کی پیروی کرنے کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر' جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہیں تھا۔'' (رسائل وسائل حصہ اول ص ۳۱۷)۔

مولانا صاحب محترم کے اقتباسات صرف بطور استشہاد پیش کئے گئے ہیں جو اکثر حضرات کے لئے

سند نہیں ہیں' اور مولانا نے بھی اپنی تائید کے لئے کوئی آیت کریمہ بھی پیش نہیں فرمائی ہے۔ اس لئے اپنے موقف کے ثبوت کے لئے قرآن کریم کی آیت بطور حجت پیش کی جاتی ہے۔

سورہ الممتحنہ میں ارشاد ہوا۔ یاایھا النبی اذا جاء ك المومنت یبا یعنک علی ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یشرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولاد ھن ولا یا تین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن و ارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبا یعھن واستغفرلھن اللہ ان اللہ غفور رحیم (۶۰/۱۲)۔

(ترجمہ) اے رسول جب تمہارے پاس ایمان دار عورتیں تم سے اس بات پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ نہ کسی کو خدا کا شریک بنائیں گی اور نہ چوری کریں گی' نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالیں گی' اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں کے سامنے کوئی بہتان گھڑ کے لائیں گی اور نہ کسی نیک کام میں تمہاری نافرمانی کریں گی' تو تم ان سے بیعت لے لو۔ اور خدا سے ان کی مغفرت کی دعا مانگو بے شک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کریمہ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ قانونی معاملات میں حضورﷺ کا اتباع لازی ہوگا۔ اور ذاتی رائے کی پابندی لازی نہیں ہے۔ یہاں قرآن کریم نے معروف کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا ترجمہ ومفہوم راقم کمترین نے قانونی معاملات تحریر کیا ہے۔ معروف قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جس سے مراد قرآنی حکومت کے قوانین ہیں۔ نیز کسی بھی معاشرہ کی رسم ورواج' جو پیشتر سے چلی آ رہی ہوں۔ اگر قرآنی حکومت ان کو اختیار کرے' تو وہ بھی قرآنی قوانین کے زمرہ میں آ جائیں گی۔ قرآنی حکومت کے جملہ احکامات معروف ہیں اور اس کی اطاعت ہر شہری پر فرض ہوگی۔ اگر کوئی شہری کسی طریقہ سے' اپنے اثر ورسوخ سے' قوانین کی گرفت سے بچ جائے' تو یہ ممکن ہے' لیکن اللہ ورسول کے ہاں اس کا جو مواخذہ ہوگا وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔ مثلاً سرکاری دفاتر اگر 9 بجے صبح شروع ہوتے ہیں تو یہ قانون اسلامی حکومت کا معروف ہے

اور ہر ملازم پر فرض ہے کہ وہ 9 بجے حاضر ہو' کوئی ملازم' افسران بالا سے مل کر' اس پابندی سے انحراف کر سکتا ہے لیکن جو مواخذہ اس اسلامی حکومت کی نافرمانی کا اس کے نفس پر مرتب ہوگا وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔ یہی وہ اساس محکم ہے جس کی بناء پر اسلامی حکومت اپنے momentum پر رواں دواں رہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ معاشرہ جنت بداماں ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی نافرمانی' اللہ ورسول کی معصیت ہوتی ہے اس میں جرم اور گناہ' Sin اور Crime ایک ہو جاتے ہیں۔ ہر وہ مذہبی شخص جو گناہ نہیں کرتا' وہ جرم بھی نہیں کرے گا' جو زکوٰۃ کی ادائیگی پابندی سے کرتا ہے' وہ (قرآنی حکومت میں) انکم ٹیکس بھی اسی طرح یہ سمجھ کے ادا کرے گا کہ اس کا ادا کرنا بھی زکوٰۃ کی طرح فرض ہے' اور اس کے ادا نہ کرنے سے گناہ ہوگا اور اللہ ورسول کی نافرمانی ہوگی۔ مندرجہ ذیل آیات کریمات سے معروف کا مفہوم اور واضح ہو جاتا ہے۔ آپ قرآن کریم کے نسخے سے یہ آیات ملاحظہ فرمائیں۔ (۲/۲۴' ۱۱۴/۴/۲' ۶۲/۶' ۶۵/۱۱۲' ۹)

معروف کے معانی واضح ہونے کے بعد سابقہ آیت کریمہ سورہ ممتحنہ کا مفہوم اور واضح ہو جاتا ہے کہ حضور کا اتباع معروف یعنی اسلامی حکومت کے احکامات وقوانین میں لازمی اور ضروری ہے۔ لیکن ذاتی رائے کی پابندی ہم پر لازم نہیں۔ اگر حضورﷺ کسی دن چاول نوش فرماتے تھے تو یہ ضروری نہیں تھا کہ مدینہ منورہ میں جملہ صحابہ اس دن چاول ہی تناول فرماتے' اس میں ہر شخص کی ذاتی آزادی برقرار تھی' کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کھانا کھا سکتا تھا۔ اس میں حضورﷺ کا اتباع لازمی نہیں تھا۔

جیسا کہ شروع مضمون میں عرض کیا گیا ہے کہ ملوکیت سے جو نقصان اسلام اور مسلمانوں کو ہوا' وہ ملوکیت کے منقرض ہونے کے بعد قابل تلافی تھا۔ مگر ملوکیت کے دوران اسلام کے بنیادی نظریات میں جو تبدیلی کی گئی ہے' وہ اب تک ہمیں سخت نقصان پہنچا رہی ہے۔ یہ نقصان ہمارا خود فراہم کردہ ہے' اب جبکہ ملوکیت کے انقراض کو عرصہ ہو گیا ہے' ہم مسلمان اس پوزیشن میں

ہیں کہ قرآن کریم کو سامنے رکھیں اور اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ متعین کر لیں۔ یہ بھی ایک خوش آئند بات ہے کہ تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے علمائے قرآن نے آواز بلند کی۔ اور اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ واضح طور پر امت کے سامنے پیش کر دیا۔ تقریباً ۶۰ سال سے تحریک طلوع اسلام اس نظریہ کی بھرپور اشاعت کر رہی ہے۔ اب اس نظریہ پر خالی الذہن ہو کر دل جمعی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ علمائے کرام کی سہولت کی خاطر ساری بحث کا ملخص پیش خدمت ہے۔

(۱) اطاعت رسول کا ایک طریقہ جو ہم میں برسوں سے متوارث چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ روایات کی اطاعت سے رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس میں کسی مقام، وقت کی تخصیص نہیں۔ ہر شخص ہر خطۂ زمین میں قرآن کے ذریعے اللہ کی اور احادیث کے ذریعے حضور ﷺ کی اطاعت کر سکتا ہے۔ اس میں نہ مسلمانوں کے اپنے الگ ملک کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسلامی حکومت کی۔ جو حضرات ہر وقت عشق رسول میں سرشار اور محبت رسول میں غلطاں و پیچاں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ حضور کے عطا کردہ قانون کو عملاً نافذ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ انگریز کے دور میں بھی قانون انگریز کا نافذ تھا۔ قرآن کے قوانین کا کسی جگہ اجراء نہیں تھا۔ لیکن یہ حضرات عشق رسول کے مدعی بھی تھے اور حضور کے اطاعت کنندہ بھی۔

(۲) اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ یہ ہے کہ صرف ''اسلامی حکومت'' کی اطاعت کرنے سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے، جیسا کہ سابقہ آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ صرف ایک اطاعت ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کے دور میں ان کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہو رہی تھی۔ حضور کے بعد جو بھی ''اسلامی حکومت'' کا سربراہ ہوگا اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس میں اسلامی حکومت کا قیام لازمی ہے۔ اسلام کی رو سے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس نظام کی معرفت ہوتا ہے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ سے ذاتی، نجی تعلق کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن چونکہ ہم مسلمان ملوکیت میں رہے، پھر انگریز کا طویل دور رہا۔ اس لئے یہ تصور ختم ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت

اسلامی حکومت کا قیام مشکل بھی تھا اور اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ بھی فراہم نہیں ہو سکتا تھا۔

اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ جو تحریکیں اسلام کے نظام کی داعی ہیں' انہیں ضرور اس درخواست پر غور کرنا چاہئے کہ اگر اللہ و رسول کی اطاعت قرآن و حدیث سے ہو سکتی ہے تو اسلامی نظام کے قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت تو صرف اس صورت میں ہوتی ہے کہ اطاعت رسول کا قرآنی طریقہ اختیار کیا جائے اور اسلامی حکومت قائم کر کے اس کی اطاعت کی جائے۔ اسلامی حکومت کے قیام اور اس کے استقلال کے لئے تو اساس محکم ہی یہ ہے کہ اس سے اور صرف اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے قیام کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جہاں تک حضور ﷺ سے محبت کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص حضور ﷺ سے محبت کرتا ہے اور عقیدہ رکھتا ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اطاعتِ رسول کے بارے میں دو متضاد زاویۂ فکر

انبیائے کرامؑ پر فرض ہوتا تھا کہ جب بھی وحی کا نزول ہو وہ فوراً اس کو انسانیت تک پہنچا دیں، خواہ وہ نزول چلتی تلواروں کے دوران ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ **بلغ ما انزل الیک من ربک**۔ نیز یہ بھی فرض ہوتا تھا کہ وحی کے مطابق معاشرہ کی تعمیر کریں۔ اس دین کو متمکن کریں اور اس کو غالب کرنے کی کوشش کریں **لیظھرہ علی دین کلہ**۔ حضورﷺ نے ان ہدایات کے مطابق وحی کی تبلیغ فرمائی اور اس کے مطابق قرآنی حکومت قائم فرمائی، جو انسانیت کا بہترین دور تھا اور جسے چشم فلک دوبارہ دیکھنے کے لئے سرگرداں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام، جسے حضورﷺ نے عملاً اس روئے زمین پر قائم فرمایا۔ اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضورﷺ چونکہ اپنے دور میں اس نظام کے سربراہ تھے، اس لئے عملاً اس نظام کی اطاعت کے لئے حضورﷺ کی اطاعت لازمی قرار پائی۔ کیونکہ اس نظام کی اطاعت حضورﷺ کی اطاعت کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ حضورﷺ کے بعد، حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور جب تک بھی وہ دور ممتد رہا، اس نظام کے سربراہ کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ جب ہم مسلمانوں میں ملوکیت در آئی، تو وہ نظام درہم برہم ہو گیا لیکن اللہ و رسول کی اطاعت تو ہر حال میں فرض تھی اس لئے یہ نظریہ رواج دیا گیا کہ قرآن کریم سے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث شریف پر عمل کرنے سے حضورﷺ کی اطاعت ہو جائے گی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے احادیث کے ذخیرے جمع کئے گئے تاکہ حضورﷺ کی اطاعت کا فرض ان پر عمل کر کے، پورا کر دیا جائے۔ اس مشکل کو حل کر دینے کے بعد اسلامی حکومت یا دین خداوندی

کے قیام کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن وحدیث پر الگ الگ عمل کرنے سے اللہ و رسول کی اطاعت کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔

یہ صورت حال ہم مسلمانوں میں تقریباً ایک ہزار سال سے چلی آ رہی تھی۔ ملوکیت کے طویل دور اور اس کے بعد یورپ کے سامراجی غلبہ کی لمبی مدت کی وجہ سے مسلمانوں میں اسلامی نظام کا تصور بالکل محو ہو گیا تھا۔ اور اس طویل عرصہ میں اطاعت رسول کے بارے میں بھی کبھی دو آراء پیدا نہیں ہوئیں۔ صرف ایک ہی طریقہ یعنی احادیث پر عمل کرنا' اطاعت رسول کا مستند ذریعہ گردانا گیا۔ لیکن زمانے کے تقاضے اور فطرت کے اشارے کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ عقل انسانی کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی نے انسانیت کو فوز و فلاح کی راہ نہیں دکھلائی۔ دکھ اور درد کا مارا ہوا مسلمان پھر اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ قرآن کریم کے دامن میں اور اس کے نظام میں پناہ لے۔ گزشتہ تقریباً ایک سو سال سے رجعت الی القرآن کی آواز' مختلف گوشوں سے بلند ہونی شروع ہوئی۔ پہلے یہ آواز کمزور اور ضعیف بھی تھی اور قدرے غیر واضح بھی۔ لیکن مسلمانوں کے حالات اس درجہ نامساعد اور تباہ کن تھے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ قرآن کریم کا نظام قائم کیا جائے اور اسی کو اپنا مطمح نظر بنائیں۔ اس میں اولیت کا شرف پاکستان کے مفکرین کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد ایران' الجیریا' مصر' سیریا' سوڈان اور دیگر مسلمان ممالک میں یہ فکر عام ہوا۔

لیکن اس سارے فکر و عمل میں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ روایتی اور ملوکیت کے تراشیدہ اسلام (جو ہمارے ہاں مروج ہے اور جو ہمارے دینی مدارس میں تعلیم دیا جاتا ہے) میں نظام کا کوئی تصور نہیں ہے اور اس میں اللہ و رسول کی اطاعت بھی قرآن وحدیث کے اتباع سے بخوبی ہو رہی ہے۔ پھر کونسی مشکل ہے جس کے باعث نظام قائم کیا جائے۔ اسلامی نظام کی ضرورت تو صرف اس صورت میں پیش آتی ہے کہ جب آپ اللہ و رسول کی اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیں اور اس سے مقصود اسلامی حکومت کے سربراہ کو قرار دیں۔

اطاعت رسول کے دو الگ الگ اور واضح طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو وہی ہے جو

ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے یعنی قرآن و حدیث کا اتباع کریں اور "اللہ و رسول" کی اطاعت سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس میں کسی قسم کے تردد کی ضرورت ہے نہ اسلامی نظام کی ضرورت۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کی جا سکتی ہے اور اسی طرح اللہ و رسول کی اطاعت ہم کرتے ہیں آ رہے ہیں۔ لیکن دوسرا طریقہ اللہ و رسول کی اطاعت کا اسلامی نظام کے ذریعے ہے۔ آپ نظام قائم کریں۔ اس نظام کی اطاعت کریں اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس میں عملاً اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس صورت میں وہ نظام قرآن کریم کے اصول و اقدار کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق احکامات جاری کرے گا اور ان احکامات کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ یہ اطاعت رسول کا دوسرا طریقہ ہے۔ جو اول الذکر طریقہ سے بالکل منفرد ہے۔ چونکہ یہ طریقہ' مروجہ طریقہ سے مختلف ہے۔ اس لئے اس طریقے کے داعین' خصوصاً ادارہ طلوع اسلام نے' اس طریقہ کے جواز میں واضح دلائل بھی پیش کئے اور تقریباً 50 سال میں کثیر تعداد میں مبسوط مضامین شائع کئے۔ جن کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ موضوع اس مختصر مضمون میں نہیں آ سکتا۔ فی الوقت گفتگو کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اطاعت رسول کے دو جدا جدا طریقے پیش کئے جا رہے ہیں جن پر بالکل مختلف طور پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ حدیث کے اتباع کے ذریعے اطاعت رسول ہر معاشرہ میں (حتیٰ کہ سیکولر معاشرہ میں بھی) ممکن ہے' لیکن اسلامی نظام کے ذریعے اطاعت رسول صرف اس نظام میں ہی ممکن ہے جس نظام کے قیام کی اس دور میں دعوت دی جا رہی ہے۔ جو بات گہرے غور کی متقاضی ہے وہ یہ ہے کہ جو حضرات اسلامی نظام کے داعی ہیں انہیں تو ہر حال میں نظام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت کا ذریعہ قرار دینا پڑے گی۔ ورنہ ان کے پاس نظام کے قیام کا کوئی محرک Incentive نہیں رہتا۔ نیز یہ کہ حدیث کی اطاعت سے رسول کی اطاعت مراد لینا' اسلامی نظام کے قیام میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے اور اس کے قیام کا جواز اور ضرورت بھی باقی نہیں رہتی ہے۔ جو حضرات حدیث کی اطاعت سے رسول کی اطاعت مراد لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں انہیں

یہ بھی غور فرمانا چاہئے کہ وہ حضرات قرآن کریم کو وحی جلی اور حدیث شریف کو وحی خفی گردانتے ہیں۔ جب وحی جلی یعنی قرآن کریم سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے' تو حدیث شریف' جو کہ وحی خفی ہے' اس سے حضورﷺ کی اطاعت کیسے ہوسکتی ہے' ایک وحی سے اللہ کی اطاعت اور دوسری وحی سے رسول کی اطاعت' چہ معنی دارد۔

آج سارا عالم اسلام مصائب سے دوچار ہے اور ہم مسلمان انسانیت کا آخری سہارا قرآن کریم کے نظام کو سمجھتے ہیں۔ خود قرآن کریم کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ **ولن تجد من دونہ ملتحدا** (۱۸/۲۷) تم اس کے سوا کہیں بھی ہرگز پناہ کی جگہ نہ پاؤ گے۔ یہ مقام شکر ہے کہ اس دور میں تقریباً ہر مسلمان ملک میں اسلامی نظام کے دعاۃ موجود ہیں۔ آج سے پیشتر کبھی بھی اسلامی نظام کے قیام پر اس قدر اصرار نہیں ہوا۔ اب کرنے کا ضروری کام یہ ہے کہ اطاعت رسول کا مسئلہ' علمی انداز سے طے کرلیا جائے کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی نظام کے قیام میں اساسی حیثیت کا حامل ہے۔ جب تک اطاعت رسول کا مسئلہ طے نہیں ہوگا' مختلف دعاۃ وتحاریک میں آپس میں تعاون واشتراک عمل بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی نظام کے دعاۃ کو سب سے پہلے اس مسئلہ کو ضرور طے کرلینا چاہئے۔

وھہنا منا تم الکلام

علی مصطفٰنا الوف سلام

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محدث'' کا انکارِ حدیث نمبر

ماہنامہ ''محدث'' ملتِ اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلّہ ہے جو عرصہ دراز سے لاہور سے شائع ہوتا ہے اور دینی حلقوں میں معروف اور پسندیدہ مجلّہ ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ جناب حضرت حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب ہیں۔ جو مشہور عالم دین ہیں اور اپنی علمی اور دینی وجاہت کے باعث اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اس مجلّہ میں حدیث کی اہمیت' عظمت' ضرورت اور دفاع سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگست و ستمبر 2003ء کا ماہنامہ ''فتنہِ انکار حدیث'' اشاعت خاص کے طور پر شائع ہوا ہے۔ راقم کمترین چونکہ ملک سے باہر تھا اس لئے یہ رسالہ اب چند یوم پیشتر ہی موصول ہوا ہے۔ اس ماہنامہ میں انکار حدیث کے اسباب' اس کی تاریخ' اس کے نظریات اور انکار کرنے والوں کے باہمی اختلافات کو پیش کیا گیا ہے اور سارا مواد بہت محنت اور کاوش سے دستیاب کیا گیا ہے۔ زیادہ اعتراض اطاعت رسول ﷺ کی تعبیر اور مرکز ملت کے تصور پر کیا گیا ہے۔ اپنے نظریات کا اظہار اور قرآن کریم کی تعبیر کا حق سب کو پہنچتا ہے اور قرآن کریم سے محبت اور مسلمانوں کے حال پر غم خواری سب کو ہے۔ یہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہم سب مسلمانوں کو قرآن کریم سے محبت ہے' ملت مسلمہ کا مفاد پیش نظر ہے اور ہر شخص کو اس بات کی تڑپ ہے کہ مسلمان قرآن کریم پر عمل کر کے اپنی زبوں حالی سے نجات پائیں اور ایک زندہ اور متحرک قوم بن جائیں۔ نظریات کے اختلاف اور قرآن فہمی کے مختلف طریقے اختیار کرنے سے' ہمیں ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی ایک دوسرے سے مغائرت اختیار کرنی چاہئے۔ بلکہ ہر اختلاف افہام و تفہیم سے دور کرنا چاہئے۔ احقاق حق اور ابطال کے لئے اس سے بہتر اور

کوئی طریقہ نہیں۔

قرآن حکیم کا اصل الاصول اور العروۃ الوثقیٰ یہ ہے کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا واجب الاتباع ہے۔اس کے علاوہ کسی کا حکم واجب الاتباع نہیں ہے۔ان الحکم الا للہ (۶/۵۷)۔ولا یشرك فی حکمہ احدا(۱۸/۲۶)آیات اس پر دال ہیں۔قرآن کریم نے ضابطہ حیات (Ideology) کو نا قابل تقسیم قرار دیا ہے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش کو قطعاً منع فرمایا ہے۔افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض۔قرآن کریم کا نظریہ ہے کہ اگر خالص قرآن کریم کی اطاعت نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ خزی فی الحیوٰۃ الدنیا والآخرۃ ہوگا۔اس لئے مسلمانوں پر لازم تھا کہ خالص قرآن کریم کے نظریات کا اتباع کرتے اور اس میں خارج از قرآن نظریات کو داخل نہ ہونے دیتے۔لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی بلکہ پوری انسانیت کی بدبختی کا وہ روز اول تھا جب مسلمانوں نے ملوکیت کے زیر اثر دو دروازے ایسے وا کر دیئے جن سے قرآن کریم کے نظریات واحکامات پرکھنے کا معیار ہاتھ سے جاتا رہا اور اس کی وحی الہیٰ ہونے کی منفرد حقیقت بھی ختم ہوگئی۔ بلکہ اس کے خالص نظریات کی اہمیت بھی جاتی رہی۔اس کے نظریات میں انسانی خیالات کی آمیزش ہوگئی اور یوں قرآن کریم کے نظریات' عقائد واحکامات خالص نہیں رہے۔جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی خالص نہیں رہی۔

حدیث شریف کے سلسلہ میں اصل نقطہ ماسکہ اس کی اہمیت وعظمت' اس کی شرعی و آئینی حیثیت' اس کی حفاظت وصیانت اور صحت وسقم نہیں ہے۔ بلکہ اصلی بحث اس کا وحی الہیٰ قرار دینا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً علمائے کرام وفقہائے عظام احادیث پر برابر مضامین تحریر کرتے چلے آرہے ہیں اور کتابوں پر کتابیں شائع ہوتی جارہی ہیں۔لیکن کوئی صاحب تصنیف عالم تھوڑی دیر رک کر یہ نہیں سوچتا کہ اصل بحث ہے کیا؟ اور اس کا جواب کیا ہے؟ متذکرہ صدر موقر جریدہ میں بھی اس مسئلہ کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا اور صرف ایک مقام پر حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ

صاحب مدظلہ نے اس کا تذکرہ صفحہ 218 پر فرمایا کہ "یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن کی طرح سنت وحدیث رسول بھی منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو۔" مولانا روم کا شعر بھی تحریر فرمایا۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

جبکہ حضرت اقدس نے سنت نبوی کو حکمت اور وحی خفی قرار دیا ہے (صفحہ ۲۱۹) (حکمت کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے اس معاملہ میں بھی حضرت سے تسامُح ہوا ہے)۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علماء کرام اس نقطۂ نگاہ سے واقف نہیں ہیں بلکہ حدیث کی ساری بحث میں یہ موضوع ایسا ہے کہ علماء کرام خوب واقف ہیں کہ ان کا یہ موقف نہایت کمزور اور انتہائی ضعیف ہے اور کسی طریقہ سے بھی احادیث جو عرصہ بعد جمع و مدون کی گئیں، وحی ثابت نہیں کی جاسکتیں اور وحی ثابت نہ ہونے کی صورت میں حدیث شریف کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل رسالہ میں حدیث پر جامع مضامین تحریر کیئے گئے، عربوں کے حافظے کو سراہا گیا، جو بالکل غیر متعلقہ عنوان ہے۔ مگر اس مسئلہ کو صرف ایک جگہ بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ ساری بحث کا مرکز و محور یہی ایک نقطہ ہے اور امت مسلمہ کو جس قدر نقصان اس غلط نظریہ سے ہوا اور کسی نظریہ سے نہیں ہوا۔ جبکہ حقیقتاً حدیث شریف کے وحی الٰہی نہ ہونے سے علماء کرام کی ساری تیار کردہ عمارت خاک کے تودہ کی طرح زمین بوس ہو جاتی ہے۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ہم جن مجامع کو بطور Euphemism احادیث کا ذخیرہ کہتے ہیں وہ اصلاً حدیث کا ذخیرہ نہیں ہے۔ وہ الفاظ جو حضور ﷺ کے دہنِ مبارک سے صادر ہوئے وہ حدیث تھے۔ لیکن جب وہ مفہوم راوی نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تو وہ حدیث نہیں رہے۔ بلکہ روایت بن گئے اور وہ الفاظ حضور ﷺ کے نہیں رہے بلکہ راوی کے اپنے الفاظ ہو گئے۔ کیونکہ علماء خود اعتراف کرتے ہیں کہ احادیث بالمعنی روایت ہوئی ہیں اور اسی لئے احادیث

کے آخر میں او کما قال علیہ السلام شامل کیا جاتا ہے۔آج جن احادیث کو وحی قرار دیا جاتا ہے اول تو یہ احادیث حضور ﷺ کی احادیث ہی نہیں ہیں' بلکہ ذخیرۂ روایات ہیں' کیونکہ ڈھائی سو سال تک جو الفاظ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلاً ایک زبان سے دوسری زبان اور دوسری سے تیسری' چوتھی' پانچویں' چھٹی پر منتقل ہوتے آ رہے ہوں ان کا اپنی اصل شکل میں رہنا بالکل ناممکن ہے۔فلہٰذا وہ روایات احادیثِ رسول ﷺ ہیں ہی نہیں اور جتنی بحث رسالہ مذکورہ میں حدیث کے بارے میں کی گئی ہے کیونکہ وہ حدیث کو وحی قرار دینے کے بعد کی گئی ہے' لہٰذا وہ اس نقطہ کے پیش نظر رکھنے سے بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس اساس پر ساری عمارت تعمیر کی گئی تھی وہ اساس ہی غلط ہے۔ کیونکہ رواۃ کرام کے بیان کردہ اپنے الفاظ کسی حال میں بھی وحی نہیں ہو سکتے۔اس نقطہ پر علماء کرام جس قدر بھی غور وخوض فرمائیں وہ کم ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ تمام دلائل جو احادیث کی شرعی و آئینی حیثیت کے سلسلہ میں پیش کئے گئے وہ بالکل غیر متعلقہ (misfit) قرار پا جاتے ہیں۔البتہ یہ بات کہ حدیث یا صحیح معنوں میں روایات وحی نہیں ہیں' اس کا ثبوت فراہم کرنا علمائے قرآن کی ذمہ داری اور ان کا فرض تھا۔جس کو انہوں نے خوب خوب ادا کیا اور ردہ وہ دلائل و براہین پیش کئے' جن کے جوابات دینے سے علماء روایات قطعاً قاصر رہے۔

قرآن کریم نے وحی کی امتیازی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن کو محک و میزان قرار دے کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن حکیم تو واقعتاً وحی ہے' لیکن روایات چونکہ ان امتیازی خصوصیات کی حامل نہیں ہیں۔لہٰذا وہ وحی نہیں ہیں۔وحی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔

وحی کی مثل نہیں بن سکتی: وحی کی ایک امتیازی خصوصیت جو متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے یہ ہے کہ اس کی مثل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس بارے میں قرآن کریم کی واضح نص موجود ہے کہ اس کی مثل نہیں لائی جا سکتی۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتو بسورہ من مثلہ (القرآن ۲/۲۳)۔(ترجمہ) اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے شک میں پڑے ہو پس اگر تم سچے ہو تو تم (بھی) ایک ایسی ہی سورت بنا لاؤ۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے واضح طور پر وحی کا معیار مقرر فرما دیا ہے' کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔ اس آیت کریمہ میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آیت میں معارضہ صرف قرآن کریم کا نہیں کیا گیا کہ کفار قرآن کا مثل نہیں لا سکتے۔ بلکہ اس آیت میں معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے چونکہ یہاں ما تعمیم کا ہے۔ جس کے معنی ہیں معارضہ ہر اس چیز کا کیا گیا ہے جو کچھ بھی نازل کی گئی ہے اور صرف قرآن کا معارضہ نہیں کیا گیا۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے کے بعد ہر شخص با آسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے جس کا مثیل ونظیر نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ کوئی چیز بھی بے مثل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ روایات بھی بے مثل نہیں ہیں اور ہر طرح کی روایات کتب معتبرہ میں چلی آ رہی ہیں۔

وحی قطعی ہوتی ہے۔ ظنی نہیں ہو سکتی: ایمان و عمل کی ساری عمارت یقین پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں ذرا بھی شک وتردد واقع ہو جائے تو اس پر دل جمعی کے ساتھ ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان سے ایمان کا مطالبہ کیا تو وحی کو محفوظ اور منضبط شکل میں رکھنے کا بھی وعدہ اور اہتمام فرمایا تا کہ ہر شخص یقینی طور پر ایمان لا سکے اسی لئے حضور ﷺ نے قرآن کو محفوظ کراکرامت کے حوالہ کیا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم بھی یقینی طور پر اس وحی پر ایمان لائے اس کے علاوہ وہ برگزیدہ ہستیاں کسی وحی پر ایمان نہیں لائیں۔ قرآن کے علاوہ ہر چیز ظنی ہے اور ظن پر تو ایمان لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس پر کسی شخص کی طبیعت بھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ارشاد حق ہے۔

ان الظن لا یغنی من الحق شیاً (۵۳/۲۸)

تحقیق گمان حق سے کچھ کفایت نہیں کرتا۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچو بہت گمانوں سے، تحقیق بعض گمان گناہ ہیں۔

ان واضح آیات کے باوجود جن میں مومنین کو ظن سے بچنے کی ہدایت ہے کیا خود اللہ تعالیٰ انسان کو اس حالت پر مجبور کرتا کہ اس کے ایمان و یقین کی بنیاد واضح نہ ہو اور اس سے کسی غیر واضح چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یقیناً وحی قطعی اور یقینی ہوتی ہے اور وہ صرف قرآن کریم ہے۔ قولہ الحق۔ روایات کے مشہور جامعین بھی اس سے متفق ہیں کہ روایات قطعی نہیں ہوتیں کیونکہ ہر وہ روایت جس کا آغاز قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہوتا ہے، اس کا اختتام او کما قال علیہ السلام پر ہوتا ہے۔

وحی متلو ہوتی ہے: ہم مسلمانوں میں صدر اول کے کچھ بعد سے وحی کی تقسیم متلو اور غیر متلو میں کردی گئی تھی جس کی رو سے قرآن کریم وحی متلو ہے اور حدیث شریف وحی غیر متلو قرار پائی۔ لیکن قرآن کریم نے وحی کو صرف متلو قرار دیا ہے غیر متلو وحی کا تصور بھی خلاف قرآن ہے۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاسمہ ہے۔

کذلک ارسلنک فی امة قد خلت من قبلھا امم لتتلوا علیھم الذی اوحینا الیک وھم یکفرون بالرحمن (۱۳/۳۰)

اسی طرح (اے محمد) ہم نے تم کو اس امت میں، جس سے پہلے بہت امتیں گزر چکی ہیں بھیجا تاکہ تم ان پر وہ جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے، تلاوت کردو۔

اس آیت کریمہ سے بالکل واضح ہے کہ مطلق ما یوحیٰ متلو ہے جس کی تلاوت حضور امت کے سامنے فرمایا کرتے تھے۔ وحی کل کی کل متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اس آیت کے پیش نظر غیر

متلووحی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

وحی صرف جلی ہے: وحی کی ایک قسم کو خفی ماننا اور اس کو قرآن کے باہر تسلیم کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ وحی صرف جلی ہوتی ہے جبکہ حضورﷺ کو حکم تھا کہ وحی کو امت تک ضرور پہنچادیں اور اس کو مخفی نہ رکھیں تو وحی خفی کس طرح ہوسکتی ہے۔ حضورﷺ کو حکم خداوندی تھا۔

لا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک' وان لم تفعل فما بلغت رسالته (۵/۶۷)۔

اے رسول جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچادو۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

وحی الٰہی کی تبلیغ حضورﷺ پر ایسی فرض تھی کہ کسی حال میں بھی اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن حدیثیں صرف حیا یا دل جوئی کے خیال سے روکی جاسکتی تھیں۔ رسول کریمﷺ کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ کھانا تیار ہونے سے کافی عرصہ پہلے آجاتے تھے اور کھانا ختم کرنے کے بعد بھی حضورﷺ کے خانۂ محترم میں بیٹھے رہتے تھے۔ جو اگرچہ حضورﷺ کو گراں گذرتا تھا۔ اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع فرمادیتے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن آپ شرم وحیا اور دل جوئی کی وجہ سے ایسی بچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے۔ لیکن جب یہی بات قرآن کریم میں نازل ہوگئی تو اس وقت اس بات کے بیان میں حیا آپ کو ہرگز مانع نہ ہوسکی۔ اس سے ثابت ہے کہ وحی کو تو حضورﷺ کسی حال میں بھی خفیہ رکھ ہی نہیں سکتے تھے' فوری طور پر آپ اس وحی کو امت میں پہنچادیتے تھے۔ وحی خفی کا تصور ہی باطل ہے۔

وحی میں تضاد نہیں ہوسکتا: ولو کان من عند غیر الله لو جدوا فیه اختلافاً کثیراً (۴/۸۲)۔ (ترجمہ) اور اگر یہ اللہ کے سوا' کسی اور کی طرف سے ہوتا' تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔

آیت مندرجہ بالا نے یہ بات واضح کردی کہ وحی میں تضاد واقع نہیں ہوسکتا۔ لیکن

احادیث رسول ﷺ کا معاملہ بالکل اس کے نقیض ہے۔ ہر فرقہ کی مختلف احادیث ہیں اور ہر فرقے کی احادیث دوسرے فرقے کی احادیث سے مختلف ہیں۔ مختلف فرقوں کی مختلف اور ایک دوسرے سے متضاد احادیث ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وحی نہیں ہیں۔

وحی کی مندرجہ بالا خصوصیات کے پیش نظر یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ وحی صرف قرآن کریم میں ہے اور روایات کسی طور پر بھی وحی ثابت نہیں ہوسکتیں لہٰذا وہ دین کا حصہ نہیں ہیں۔ مکمل دین قرآن کریم کے اندر ہے۔

امت صرف قرآن کی وارث ہے۔ وحی خارج از قرآن کی وارث نہیں: والذی اوحینا الیک من الکتٰب ھوا لحق مصدقاً لما بین یدیہ ان اللہ لعبادہ خبیر بصیر۔ ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا (ترجمہ) اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل ٹھیک ہے اور جو (کتابیں اس سے پہلے کی) اس کے سامنے ہیں یہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے، بے شک اللہ اپنے بندوں سے خوب واقف ہے اور دیکھ رہا ہے۔ پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے خاص ان کو کتاب کا وارث بنایا جنہیں ہم نے منتخب کیا۔

اس آیت کریمہ میں من بیانیہ ہے اور کسی صورت بھی تبعیضیہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن کا بعض حصہ حق ہے اور بعض باطل۔ لیکن چونکہ یہ بات درست نہیں ہے اس لئے یہاں من بیانیہ ہی لیا جاسکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

نیز یہ کہ ثم اورثنا الکتٰب سے مزید وضاحت کی گئی ہے کہ وحی صرف کتاب ہے جس کا وارث امت مسلمہ کو قرار دیا گیا ہے۔ امت مسلمہ صرف کتاب کی وارث ہے۔ اگر وحی قرآن کریم کے علاوہ بھی ہوتی تو امت مسلمہ اس کی بھی وارث قرار پاتی۔ یہ آیت کریمہ ایسی واضح ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ امت مسلمہ صرف قرآن کی وارث ہے

اور اسی کے اتباع کی مکلف۔

حکمت کے متعلق بھی علماء روایات کا عقیدہ ہے کہ حکمت سے مراد حدیث شریف ہے اور یہی بات حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ صاحب نے رسالہ موقرہ کے صفحہ ۲۱۸ پر مرقوم فرمائی ہے۔ ہر چند کہ یہ عقیدہ صرف حضرت مولانا صاحب موصوف کا منفرد عقیدہ نہیں ہے بلکہ تمام علماء روایات کا یہی عقیدہ ہے۔ تاہم یہ باالبداہت قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآنی آیات سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ حکمت یقیناً منزل من اللہ ہے مگر یہ بھی قرآن کریم کے اندر ہی محفوظ ہے ہر قانون کی غایت اس کی لم اس کا Rationale اس کی حکمت اور اس کی Why of it ہوتی ہے مثلاً ان تنصر اللہ ینصر کم ویثبت اقدامکم میں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ اگر تم نے اللہ کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔ اللہ کی مدد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہمارے قدموں کو جمادے گا۔ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر میں صلوٰۃ کی حکمت یہ فرمائی گئی ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے باز رکھتی ہے۔ روزوں کی حکمت لتکبر اللہ علی ماھذکم بیان فرمائی ہے کہ روزوں کی حکمت یہ ہے کہ قانون خداوندی کو غالب کیا جائے۔ آیت کریمہ فمن تبع ھدی فلا خوف علیھم ولا یحزنون میں ہدایت خداوندی نازل فرمانے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر وحی الٰہی کا اتباع کیا جائے گا تو معاشرہ میں کسی قسم کا خوف وحزن باقی نہیں رہے گا۔ اتباع وحی کی حکمت یہ ہے کہ معاشرہ سے خوف وحزن جاتا رہے۔ کتاب وحکمت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں اور قرآن حکیم کے اندر محفوظ ہیں۔

انزل علیک الکتاب والحکمۃ (۴/۱۱۳)

خدا نے تیری طرف کتاب وحکمت کو نازل کیا۔

وما انزل علیکم من الکتٰب و الحکمۃ یعظکم بہ (۲/۲۳۱)۔

اور جو کچھ تمہارے پر کتاب وحکمت سے اتارا ہے' تم کو اس کے ساتھ نصیحت کرتا ہے۔
کتاب وحکمت کے لئے صرف ایک ضمیر بہ استعمال کر کے واضح کر دیا کہ کتاب وحکمت ایک ہی چیز ہے۔ نیز سورۃ احزاب میں فرمایا۔

واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من آیت اللہ و الحکمۃ ان اللہ کان لطیفا خبیراً۔

(اے نبی کی بیویو) تمہارے گھروں میں جو آیات خداوندی اور حکمت تلاوت کی جاتی ہے اس کو یاد رکھو' بے شک اللہ تعالیٰ لطیف وخبیر ہے۔

اس سے واضح ہے کہ حکمت کی تلاوت ہوتی ہے اور حکمت غیر متلو وحی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی قرآن سے باہر ہوسکتی ہے۔

جریدہ موقرہ میں ایک مکمل مضمون ''پرویز اور اطاعت رسول'' کے عنوان سے بھی تحریر کیا گیا ہے۔ جو محترم المقام جناب پروفیسر منظور احسن عباسی صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ یوں تو اس موقر رسالہ کے سارے مضامین سنجیدہ ہیں اور زبان بھی متین ہے اور مضامین تحقیق پر مبنی ہیں' لیکن پروفیسر صاحب موصوف کا انداز بالکل سوقیانہ ہے اور زبان بھی متانت سے گری ہوئی ہے۔ دینی مضامین میں یہ بات بہ نظر استحسان نہیں دیکھی جاتی اگر چہ فلمی دنیا کی بات دیگر ہے۔ آپ کس قدر بھی کسی سے اختلاف فرمائیں' لیکن نہ تو شرافت کا دامن ہاتھ سے دینا چاہئے اور نہ ہی زبان سوقیانہ اختیار کرنی چاہئے۔ ہمارے ہاں اگر چہ علماء کرام کو متہم کیا جاتا ہے کہ وہ مجادلہ ومحاربانہ لہجہ اور تلخ اور ترش زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس جریدہ میں تمام علماء نے عموماً شریفانہ لہجہ اختیار کیا ہے' لیکن تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب نے' جن کو زیادہ محتاط ہونا چاہئے تھا انہوں نے پورا مضمون استخفاف' استحقار اور استہزاء کے پیرایہ میں رقم فرمایا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اور حضرت مولانا محمد رمضان صاحب سلفی نے پرویز صاحب کے حوالہ سے ''مرکز ملت'' کے تصور سے تعرض فرمایا ہے' حضرت مولانا نے تو صرف انتقاد فرمایا ہے (جس کا جواب آگے آتا ہے) البتہ پروفیسر

صاحب موصوف نے انتقاد کے علاوہ متبادل مرکز ملت ''حقیقی مرکز ملت کیا ہے'' کے نام سے پیش بھی فرمایا ہے۔ان کے اپنے الفاظ Verbative لفظ بہ لفظ' حرف بہ حرف' تحریر کئے جاتے ہیں:

''مرکز ملت وہ نہیں ہے جو اس وقت مسٹر پرویز کے ماؤف ذہن میں ہے بلکہ وہ ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم ہوا۔اور اب تک قائم ہے اور اسی کو چمٹے رہنے اور اسی سے وابستہ رہنے کا ارشاد اس حدیث میں ہے۔وعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدین من بعدی' عضدا علیها بالتواجذ و تمسکوا بها و ایاکم محدثات الامور۔تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے بعد خلفاء راشدین مہدین کے طریقے کی پیروی کرو اور اس کو دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ رکھو اور اسی پر جے رہو' اور خبردار نئی باتوں سے بچتے رہنا۔نئی بات جس سے بچنے کی حضورؐ نے تاکید فرمائی ہے یہی مرکز ملت کا ناشدنی تصور ہے جس کے نام سے بھی ملت اسلامیہ بلکہ ملل عالم ناواقف ہیں''۔(یہاں پروفیسر صاحب کا اقتباس ختم ہوا۔)

پروفیسر صاحب نے اپنے طویل مضمون کی جہاں لم ختم کی ہے اسے علم مناظرہ میں مُصادرہ علیٰ المطلوب کہتے ہیں۔یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل۔اہل علم خوب واقف ہیں کہ ''خصم'' کے سامنے جب دعویٰ ہی دلیل بن جائے تو وہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہوتا۔جو لوگ حدیث کو حجت نہیں مانتے ان کے سامنے حدیث سے دلیل دینا کونسی عقلمندی ہے۔

اطاعت رسولؐ کا صحیح طریقہ: علماء قرآن کے نزدیک' قرآن کریم میں غور و تفحص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اتباع وحی ہی اطاعت رسول ﷺ ہے چنانچہ آیت کریمہ' ان اولی الناس بابراهیم للذین اتبعوه وهذا النبی والذین امنوا والله لی المومنین (۶۸/۳)۔(ترجمہ) بلاشبہ تمام لوگوں میں سے ابراہیم کے بعد سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو اس کی اتباع کرتے ہیں اور یہ نبی اور ان کے ساتھی مومن بھی (ابراہیم کے بہت قریب

ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ حضورﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قریب ترین شخص اس لئے بتایا گیا ہے کہ آپ ملتِ ابراہیم کے پیروکار تھے۔ نیز صحابہ کرامؓ کو بھی حضرت ابراہیمؑ کا اقرب کہا گیا ہے کیونکہ صحابہؓ حضورؐ کے متبع تھے اور حضورؐ حضرت ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ اسی طرح وہ صحابہؓ بھی ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضورؐ کے پاس حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے موصول شدہ احادیث و روایات کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں تھا کہ آپ احادیث ابراہیمؑ کا اتباع کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اقرب بنے ہوں۔ اس کی اصل صورت، سورہ نمبر ۱۰۶/۹ و ۱۰۹/۱۰ سے واضح ہوتی ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ بھی وحی کے مطیع تھے اور حضورؐ بھی وحی کے متبع تھے اسی لئے حضورؐ کا اتباع بعینہٖ حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ اسی طرح صحابہؓ کا اتباع قرآن حضرت ابراہیمؑ کا اتباع تھا۔ نیز اسی توجیہ سے یہ بات قابل تسلیم ہے کہ چونکہ حضورؐ خود قرآن کریم کے متبع تھے اس لئے قرآن کا اتباع کرنے سے ہی حضورؐ کا صحیح اتباع ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مایوحیٰ اور ماانزل کا اتباع ہی انبیاء کرام کا اتباع ہے اور جملہ انبیاء کی طرف مایوحیٰ اور ماانزل صرف کتاب ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ **فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتاب** کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی کیونکہ جملہ انبیاء کرام کی وحی اور کتب کی تعلیم ایک ہی تھی اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس لئے جملہ انبیاء کرام ایک ہی تعلیم کے متبع تھے پس ثابت ہوا کہ قرآن کریم کا اتباع ہی حضرت ابراہیمؑ سمیت جملہ انبیاء کا اتباع ہے۔ اسی کی اتباع ملت ابراہیم یعنی ضابطۂ ابراہیم کی اتباع ہے۔ اسی (قرآن) کی اتباع اسوۂ ابراہیمی (۶۰/۴) کی اتباع ہے اور اسی کا اتباع اسوۂ محمدیؐ کا اتباع ہے (۳۳/۲۱) جس کے لئے حدیث شریف یا وحی خفی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اللہ و رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت تصور کرنا درست نہیں ہے۔ یعنی اللہ کا حکم الگ اور رسول کا حکم الگ، حالانکہ دو حاکم اور

دوحکم ماننا قرآن کریم کی محکم آیات کے خلاف ہے۔ان الحکم الا للہ (۶/۵۷)لا یشرک فی حکمہ احداً (۱۸/۲۶)۔ان آیات کے مطابق اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا یہ ترجمہ "اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" مطلقاً غلط ہے بلکہ اس میں واؤ کے معنی بذریعہ ہیں جیسے کہ برآۃ من اللہ و رسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین فسیحوا فی الارض اربعة اشھر وا علموا انکم غیر معجزی اللہ وان اللہ مخزی الکٰفرین (۹/۱)۔(ترجمہ)بیزاری ہے اللہ کی بذریعے اپنے رسول کے ان لوگوں سے جن کے ساتھ تم نے مشرکوں سے عہد کیا تھا۔ (اور اعلان اور فیصلہ ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعے کہ اے مشرکو) تم زمین پر چار ماہ حرمت والے چل پھر لو۔اور جان لو یہ کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور بے شک اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔

اسی طرح آذان من اللہ و رسولہ الخ' میں "وٗ" بذریعہ کے معنی میں آئی ہے (ترجمہ) اعلان ہے اللہ کا اپنے رسول کے ذریعے حج اکبر کے دن کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے بیزاری کا اعلان اپنے رسول کے ذریعے کرایا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ اللہ اور رسول کے دو اعلان نہیں تھے بلکہ ایک ہی اعلان تھا۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے کرایا تھا کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے۔نیز ما وعدنا اللہ و رسولہ الا غروراً (۳۳/۱۲)(ترجمہ)(منافق کہنے لگے) نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے بذریعہ اپنے رسول کے مگر فریب دینے کو) یہاں بھی واؤ بمعنی بذریعے آیا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے ذریعے ہی وعدہ فرماتا ہے' خود آ کر نہ کوئی وعدہ لیتا ہے اور نہ کوئی وعدہ دیتا ہے۔

اللہ و رسول سے مراد مرکز ملت ہے: اصل یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت دو مطاعوں کی

اطاعت نہیں ہے۔ جیسا کہ تین مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا اور کسی کی بھی ہے حتیٰ کہ خود رسولؐ کے متعلق بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان کو بھی حق حاصل نہیں ہے کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائیں۔ لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکز دین وہ Central Authority ہے جہاں سے قرآنی احکامات نافذ ہوں اور جہاں اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعے کی جا سکتی ہو۔ یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت ہے قرآن کریم میں اس قدر واضح ہے کہ جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

(۱) یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ' ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون (۸/۲۰) اے مومنو! تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو در آنحالیکہ تم سن رہے ہو۔

یہاں اللہ و رسول دو کا ذکر ہے اور عنہ' کی ضمیر واحد ہے۔ اسی طرح سورہ انفال میں دوسری جگہ ہے۔

(۲) یاایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴)۔ اے جماعت مومنین تم اللہ اور رسول کی دعوت کا جواب دو جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کر دے۔

یہاں بھی اللہ و رسول کا ذکر ہے اور صیغہ (دعاکم) واحد ہے۔ اسی طرح سورہ نور میں ہے۔

(۳) واذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون وان یکن لھم الحق یاتوآ الیہ مذعنین (۲۴/۴۸)۔ (ترجمہ) اور جب ان لوگوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے تو ان میں کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو (جس سے وہ سمجھیں کہ فیصلہ ان کے حق میں جائے گا) وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے

ہیں۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے لیکن بعد میں لیحکم میں صیغہ واحد ہے اور الیہ میں ضمیر واحد ہے۔

(۴) یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ و للرسول (۱/۸)

(ترجمہ) تجھ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے۔

اس آیت سے آگے چل کر ہے۔

(۵) واعلموا انما غنمتم من شئي فان للہ فمسه وللرسول

(ترجمہ) اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مال غنیمت سے ملے اس کا پانچواں حصہ ''اللہ اور رسول'' کا ہے۔

(۶) کتب اللہ لا غلبن انا و رسلی (۲۱/۵۸)۔(ترجمہ) ضرور ہے کہ میں اور میرے رسل غالب رہیں گے۔

ان تمام مقامات نیز (۳۳/۵) میں اللہ اور رسول سے مراد امام، امیر، مرکزی اتھارٹی، یا مرکز ملت ہے۔ یہ مفہوم کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مفسرین نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اس پر ہمارے دور کی دو تفسیریں ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی اور تفہیم القرآن جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم کی شاہد ہیں۔

ثابت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے الفاظ ایک قرآنی اصطلاح کے طور پر آئے ہیں اور اس سے مراد اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے جو نظام حضور ﷺ نے قائم فرمایا ہے اور اس نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت کوئی الگ اطاعت نہیں ہے جس کے لئے حدیث شریف یا وحی خفی کا ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

ہمارے ہاں چونکہ ملوکیت کے در آنے کی وجہ سے اسلامی نظام کا تصور محو ہو گیا تھا۔ اس

لئے اس نظام کے چلانے کی آخری اتھارٹی کے تصور کی بھی ضرورت نہیں رہی' لیکن آپ جب بھی اسلام بطور نظام مانیں گے' آخر کوئی نہ کوئی تو حاکم اعلیٰ کا مقام متعین فرمائیں گے۔ اگر آپ کو مرکز ملت کا لفظ خوش آئند معلوم نہیں ہوتا۔ آپ اس کا کوئی اور نام قرار دے لیں۔ لیکن کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھنا ہوگا۔ ہاں البتہ اگر آپ نظام کا تصور ساقط کر دیں' اور مذہب کو نجی' ذاتی معاملہ قرار دے لیں تو پھر بے شک کسی فائنل اتھارٹی کی ضرورت نہیں رہے گی' اور یہی علماء کرام کی دلی خواہش ہے اور یہی اسلام کا تصور ان کا ایک ہزار سال سے چلا آ رہا ہے' اس صورت میں عملاً اطاعت رسول کا مفہوم روایات پر عمل کرنا رہ جاتا ہے۔ لیکن اس میں اسلام کے بحیثیت نظام کے غلبہ حاصل کرنے کا کوئی تصور نہیں رہتا۔ کیونکہ روایات پر عمل غیر اسلامی حکومت میں بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔

تاکید مزید اور تائید قرآنی کے طور پر عرض ہے کہ سورۂ یٰسین شریف میں ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاسمہ ہے وما علمنه الشعر وما ينبغی له' ان هوالا ذکر و قرآن مبين۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم بھی حضور اکرم کو انسانیت کی راہنمائی کے لئے ملا وہ صرف اور صرف قرآن کریم ہے۔ قرآن کے علاوہ اور کوئی علم حضور ﷺ کو ذات باری تعالیٰ سے حاصل نہیں ہوا۔ عربی دان حضرات اور بالخصوص ہمارے علماء کرام اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو' تو صرف استثنیٰ یعنی الا حصر کا فائدہ دیتا ہے کہ نہیں وہ تعلیم ہماری کچھ بھی مگر وہ صرف قرآن ہے' ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ عاطفہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آئی ہے گذشتہ واقعات کا جو علم حضرت مریمؑ اور حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں حضور ﷺ کو عطا ہوا' اس کی وضاحت فرما دی کہ ذالک من انباء الغيب نوحی اليك۔ اسی طرح فتح مکہ کا علم حضور کو ہوا' وہ قرآن کریم کے ذریعے ہی ہوا' قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی ذریعۂ علم حضور کے پاس گذشتہ اور آئندہ واقعات معلوم کرنے کا نہیں تھا۔ جو روایات حضرت امام مہدی کی تشریف آوری' نزول مسیح' دجال' دابۃ الارض کے واقعات کی تفصیل ہیں ان میں سے کسی کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے لہٰذا یہ سب موضوع اور قرآن حکیم کی صریح تعلیم کے

خلاف ہیں لیکن ہماری بدقسمتی کہ یہ تمام نظریات ہم میں موجود ہیں اوران ہی غلط عقائد کی وجہ سے باطل فرقے موجود ہیں۔

ابتدائے مضمون میں عرض کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے زوال کے دو بنیادی اسباب ہیں۔جن میں سے ایک کی تفصیل عرض کردی گئی ہے کہ حدیث کو وحی قرار دینے سے قرآن کریم کے اصل نظریات پس پشت کر دیئے گئے اور غیر قرآنی نظریات پیش نظر رہنے لگے۔دوسرا سبب قرآن فہمی کا غلط طریقہ ہے جس سے قرآن کریم کی صحیح تعلیم نظروں سے اوجھل ہوگئی۔اب اس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

ہماری تفاسیر میں ایک نظریہ شان نزول کا پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں یہودی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور یہ فلاں منافق کے بارے میں۔یہ آیت فلاں صحابی کی شان میں نازل ہوئی تھی اور یہ آیت اہل بیت کے فلاں محترم فرد کے لئے اس طرح قرآنی احکام کی عمومیت عالمگیریت ابدیت کو جو قیامت تک پوری نوع انسانی کے لئے ہے صرف چند افراد تک محدود کر کے رکھ دیا گیا۔اس طرح شان نزول کا عقیدہ فہم قرآن کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔جو کسی بھی آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی طرف آنے ہی نہیں دیتا اور حالت یہ ہوتی ہے کہ آیت تو لے لی قرآن سے اور شان نزول تفسیروں سے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔اورصورت یہ ہے کہ ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول ہیں۔پھر ہر فرقے کے الگ الگ شان نزدل اور ہر شان نزول بانداز تشکیک مندرج ہے تا کہ کوئی یقینی بات مل ہی نہ سکے۔قرآن کریم کی آیات قطعی اور یقینی ہیں لیکن شان نزول اور روایات سب ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ان کے سہارے سے قرآن کریم کی تفسیر کرنے سے قرآن کریم کی ساری تعلیم مشکوک ظنی اور غیر قطعی ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے قرآن فہمی کے طریقے خود ہی مقرر فرمائے ہیں جن سے ہمارے مفسرین نے قطعاً استفادہ نہیں کیا۔سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ عربوں کی روزمرہ کی گفتگو کے مطابق ہے فو رب السماء والارض انه لحق مثل ما انكم

تـنطقون (۵۱/۲۳)۔آسمان اور زمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔ اس کا انداز کلام اس طرح کا ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو۔قرآن کریم عربی مبین میں نازل ہوا(۲۶/۱۹۲)۔غیـــر ذی عــوج (۳۹/۲۸) ہے اس میں کوئی کجی نہیں۔لہٰذا قرآن فہمی کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر مقام پر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھا جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ کے وہ Original معنی لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت مروج تھے۔مرور ایام سے زبانوں کے الفاظ اپنے اصل معنی چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے معانی اختیار کر لیتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ ذکر' تذکیر' وسیلہ' تہجد' وحی' مغفرۃ' شفاعت' امام' تسبیح' عبادت' الہٰ' وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جن کے معنی مرور ایام سے بدل گئے ہیں۔درست طریقہ یہ ہے کہ ان الفاظ کے وہی معنی لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت ان کے معنی تھے لیکن ہمارے مفسرین نے قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی نہیں لئے جو نزول قرآن کے دوران تھے اور روایات کے زیر اثر وہ معانی اختیار کئے جو نزول قرآن کے وقت نہیں تھے۔اس سے قرآن کریم کی صحیح تعلیم مخفی ہوگئی اور غیر قرآنی نظریات رواج پاگئے۔

دوسرا طریقہ قرآن کریم نے اپنے سمجھنے کا تصریف لآیات قرار دیا ہے اور یہ طریقہ بہت اہم اور ضروری ہے۔قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم کے ساتھ ولا یاتونک بمثل الا جئنک بالحق واحسن تفسیرا (۲۵/۳۳)۔(مفہوم) اے رسول لوگ آپ کے پاس قرآن کی مثل نہیں لائیں گے مگر ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس حق (قرآن) اور اس کی تفسیر لاتے ہیں۔اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کردی ہے۔قـد فـصـلـنـا الایات لقوم یفقھون (۶/۹۸)۔نیز فرمایا کہ انـظر کیف نصرف الایات لعلھم یفقھون۔ دیکھو ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ لوگ ان میں غور کریں۔حضور علیہ السلام کا طریقہ تفسیر بھی تصریف آیات

کے ساتھ تفسیر کرنے کا تھا۔ کذالک نصرف الایات ولیقولوا درست ولنبینه' لقوم یعلمون (۶/۱۰۵)۔ہم آیات پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیں تا نکہ لوگ کہہ دیں کہ آپ نے خوب خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تا کہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دی۔ حضور ﷺ کی سنت یہی ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کریں۔قرآن کریم میں جو آیات بار بار پھیر پھیر کر لائی جاتی ہیں تو ان کا کوئی مقصد ہے' یونہی بلا مقصد بار بار نہیں دہرائی جاتیں۔

تصریف آیات کا طریقہ اختیار کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ خارج از قرآن نظریات کی جڑ کٹ جاتی ہے اور خارج از قرآن نظریات قرآن میں داخل نہیں ہو سکتے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے قرآن کریم کے مقرر کردہ ان دونوں اصولوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ جس کی وجہ سے خارج از قرآن نظریات داخلِ تفاسیر ہو گئے۔قرآن حکیم نے زانی کی سزا سو کوڑے مقرر فرمائی ہے لیکن مبنی بر روایات تفاسیر میں زانی کی سزا رجم ہے اس طرح رجم کرنے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ ان مفسرین کرام کی اطاعت ہوتی ہے جنہوں نے یہ نظریہ شاملِ قرآن کیا ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ۱/۵ حصہ اسلامی حکومت کے لئے مختص کر کے' باقی ۴ حصص یتامیٰ' مساکین' ابن سبیل اور مجاہدین کے رشتہ داروں کے لئے مخصوص کئے ہیں جو بہت واضح احکام ہیں لیکن حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون میں اسی رسالہ کے صفحہ ۱۵۸ پر رقم فرمایا ہے''قرآن کریم میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مال غنیمت حاصل کریں' اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں' مسکینوں اور حاجت مندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے' سوال یہ ہے کہ باقی ۴ حصے کیا کئے جائیں۔تمام مجاہدین پر برابر بانٹ دیئے جائیں یا فرق کے ساتھ۔'' (اقتباس ختم ہوا)۔یہ تقسیم قرآن کریم کے واضح احکامات کے خلاف ہے۔لیکن یہ تفسیر روایات پر مبنی ہے۔اسی طرح جو حضرات ہر سال کروڑوں روپوں کا خمس ذوی القربیٰ کی مد

میں ساداتِ عالی درجات کو دیتے ہیں وہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔ اور اس کی بڑی بڑی رقوم' مذہب کے نام پر رائیگاں جاتی ہیں۔ سادات کو خمس کی رقوم دے کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ بلکہ مفسرین کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ قرآن کریم میں ولذی القربیٰ سے مجاہدین اور شہداء کے رشتہ دار مراد ہیں۔ نہ کہ حضور ﷺ کے رشتہ دار' کیونکہ اس آیت کریمہ سے ماقبل و مابعد کی آیات میں جہاد کا تذکرہ ہے' سادات کا کوئی ذکر نہیں چل رہا ہے' اسی طرح غلام' لونڈی' نکاحِ نابالغاں' ملکیتِ زمین' پیشوائیت' ملوکیت' قرآن کریم کے برخلاف' ان سب کا جواز موجودہ تفاسیر کی بنا پر ہے اور بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم مسلمان زیادہ تر اطاعت خودساختہ انسانی نظریات کی کرتے ہیں اور تقریباً ۱۰ فیصد اطاعت اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں جس کی پاداش میں قرآن کریم کی آیت کریمہ کے مطابق خزی والحیوۃ الدنیا والاخرۃ میں مبتلا ہیں۔ جب تک خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کی جائے گی مسلمانوں کی حالت کبھی درست نہیں ہوسکتی۔ اور یہی طلوع اسلام کا مقصد ہے اور یہی اس کا دعویٰ ہے کہ مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد' مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ اس کے نزدیک ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ کیونکہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ازبسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول ﷺ کے باغی اور نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کس قدر بھی نماز اور روزہ کے پابند ہوں۔

اس سلسلہ میں مزید چند نقاط پیش خدمت کئے جاتے ہیں اور علماء کرام اور مفکرین قرآن کی خدمت میں درخواست ہے کہ ان نقاط کو دل جمعی سے مطالعہ فرمائیں اور اس کی ایک ایک شق پر غور فرمائیں اور اپنے غور وفکر کو دینی جرائد میں پیش فرمائیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جتنی تفاسیر ہیں' سب ایک دوسرے کے چربے ہیں اور ایک ہی اصول یعنی تفسیر بالروایات کے طریقے پر تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی تعداد کی کثرت' اسلاف سے اخلاف تک کا امتداد ان کی صحت کے لئے کوئی دلیل فراہم نہیں کرسکتی۔ ان سب کی طرف سے صرف نظر کرنا' صرف ایک اصول یا صرف ایک تفسیر سے صرف نظر کرنے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس انداز پر تفسیر لکھنے سے فرقہ بندی کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا۔ چونکہ ہر فرقہ خواہش مند تھا کہ اپنے عقائد کی سند قرآن کریم سے مہیا کرے' لیکن آیات کے الفاظ ان عقائد کی سند مہیا کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے موضوع روایات کا سہارا لیا گیا اور ہر غیر قرآنی عقیدہ کی سند تفسیر بالروایات سے حاصل کی گئی۔ چونکہ موضوع روایات کی کوئی کمی نہیں تھی اس لئے اس طرح کی تائیدات فراہم کرنے میں کوئی وقت پیش نہیں آئی اور اس سے فرقہ بندی میں اضافہ ہوا۔ ہر فرقہ کی تفسیر الگ ہونے لگی۔ ہر فرقہ کی مختلف تفسیر ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک ذخیرہ تفسیر درست ہے اور باقی سب فرقوں کی تفاسیر غلط ہیں اور غلط روایات سے ان کی تائید حاصل کی گئی ہے۔

۳۔ ساری تفاسیر جس دور میں لکھی جانی شروع ہوئی ہیں اس وقت تک اسلام اپنی اصل اور درست شکل میں نہیں رہا تھا۔ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے اور ایک دین ہے جس دین کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے مترادف ہے۔ حضورﷺ نے اس دین کو جاری فرمایا اور خلافت راشدہ کا نظام اسی دین پر مبنی تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت غالب آ گئی اور دین اور ضابطۂ حیات کا تصور آنکھوں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ ہماری تفاسیر ملوکیت کے دور کی تصنیف کردہ ہیں

اورقرآن کریم کو دین کے بجائے مذہب کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔آج جب کہ انسانی ذہن کے تراشیدہ نظامہائے زندگی ناکام ہورہے ہیں' اسلام بحیثیت ضابطہ حیات اور دین کے سامنے آرہا ہے لیکن وہ تفاسیر جو قرآن کو بطور مذہب پیش کررہی ہیں' اسلام کو بہ حیثیت دین پیش کرنے سے مانع ہورہی ہیں اور اسلام کو بحیثیت نظام جاری کرنے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

۴۔ ان تفاسیر میں شان نزول کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور شان نزول کو پیش نگاہ رکھ کر ہی آیات کی تفسیر کی گئی ہے۔اس لئے آیات کو مقید اور محدود کردیا گیا ہے۔قرآن کریم ایک آفاقی دین پیش کرتا ہے۔اس کو کسی ملک' خطہ' قوم' یا دور سے مختص نہیں کرسکتے اس کی آفاقیت ہمہ گیر ہے۔ شان نزول کی وجہ سے ان آیات کی آفاقیت ختم ہوجاتی ہے اور آیت کا صرف ایک واقعہ کے ساتھ اختصاص ہوجاتا ہے۔عقلاً بھی شان نزول کا عقیدہ درست معلوم نہیں ہوتا۔قرآن کریم اللہ تعالٰی کی منشاء وتدبیر کے مطابق نازل ہوا ہے۔اگر بالفرض وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہیں ہوتی۔یا اگر واقعات زیادہ تعداد میں پیش آجاتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ہوتا۔یہ نظریہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔

۵۔ آخری بات قابل غور یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو تصریف آیات پر اس قدر زور دیا ہے اور قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے خود بطور ایک اصول متعین فرمایا ہے' اس اصول سے ان تفاسیر میں کوئی مدد نہیں لی گئی اور اس اصول کو بالکل نظرانداز کردیا گیا۔آپ ایک ہزار سال کی تحریر کردہ تفاسیر کو کھنگال ڈالیں' اس اصول کی کوئی رمق آپ کو کہیں نہیں دکھائی دے گی اور اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس طرح تفسیر کرنے سے غیر قرآنی نظریات کی سند بالکل نہیں مل سکتی جن کی سند روایات سے بآسانی مل جاتی ہے اور عملاً یہ صورت ہوئی کہ قرآن کریم بالکل مخفی ہوگیا اور آج جو ہمارے پیش نظر ہے وہ صرف روایات کی تعلیم ہے اور بس۔

مسلمان قوم کو زندگی صرف اس صورت میں مل سکتی ہے کہ اس کے سامنے خالص قرآن ہو اور بحیثیت نظام' دین اور ضابطہ حیات کے اس پر عمل کیا جائے۔

وما ارید ان اخالفکم الی ما انھکم عنہ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت O وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب (۱۱/۸۸)۔

وھہنا تم منا الکلام
علی مصطفٰنا الوف سلام

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امتِ مسلمہ کی نشأۃِ ثانیہ کا قرآنی طریقہ

جس طرح ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے قوانین جاری و ساری ہیں' اور پوری کائنات احکاماتِ خداوندی کے تابع چل رہی ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع چلنا چاہئے۔ طبعی زندگی میں تو انسان خود بخود قوانین خداوندی کے اتباع پر مجبور ہے۔ ہوا میں سانس لینا۔ تشنگی دور کرنے کے لئے پانی پینا' بھوک رفع کرنے کے لئے کھانا کھانا۔ ان امور کی سرانجام دہی پر انسان مجبور ہے۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی تمدنی' معاشرتی' سیاسی اور معاشی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کا ہی اتباع کرے اور اسی کو ہی حاکم اعلیٰ تسلیم کرے۔ فرعون اور حضرت موسیٰ کے مابین کشمکش کے دوران فرعون نے حضرت موسیٰ کو دھمکی دی تھی کہ ولئن اتخذت الٰھا غیری لا جعلنک من المسجونین ۲۶/۲۹' اگر تم میرے علاوہ کوئی اور حاکم تجویز کرو گے تو میں تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔ یہاں قرآن کریم نے الٰہ کا لفظ ٹھیک حاکم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی معنی یہاں بنتا ہی نہیں۔ تمام انبیائے کرام نے یہی تعلیم دی کہ حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ کسی کو حاکمیت زیب نہیں دیتی چنانچہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ فقال یقوی اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ ۷/۵۹' اے میری قوم تم صرف اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے علاوہ کوئی تمہارا حاکم ہونے کے لائق نہیں۔ بالکل یہی الفاظ حضرت ھودؑ نے اپنی قوم قوم عاد سے کہے' والی عاد اخاھم ھودا' قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ ۷/۶۵' اے میری قوم تم اللہ کی اطاعت کرو اس کے علاوہ کوئی

تمہارا حاکم نہیں' دیگر انبیائے کرام کی بھی یہی دعوت تھی کہ اللہ کے علاوہ کسی کی بھی اطاعت درست نہیں ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے وھو الذی فی السماء الٰه وفی الارض الٰه ۸۴/۴۳' جیسے اللہ تعالیٰ آسمانوں میں حاکم ہے اسی طرح زمین میں بھی وہی حاکم ہے۔ وھو اللّٰه فی السمٰوٰت والارض ۶/۳' اور وہی حاکم ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی' مزید ارشاد ہوا' ھو ربی لا الٰه الا ھو ۳۰/۱۳' (کیونکہ) وہ میرا رب ہے (اس لئے) اس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ یہاں باری تعالیٰ کی حاکمیت کے لئے ربوبیت کو وجہ جواز بیان کیا گیا ہے چونکہ وہی رب ہے' اس لئے اسی کو حکومت اور حاکمیت بھی زیب دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا' لا یشرك فی حکمه احدا' انبیائے کرام کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہی ہوتا تھا کہ انسانوں کو انسانوں کی دست برد' ظلم و تعدی سے نجات دلا کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی محکومیت میں لے آئیں اور اس طرح انسان کی حکومت انسان پر حرام قرار دے کر سب انسانوں کو ایک صف اور درجہ میں لے آئیں اور ان کو شرف و مجد' عزت و تکریم عنایت فرمائیں' قرآن کریم نے آسمانوں پر اللہ کی حکومت اور زمین پر انسانوں کی حکومت تسلیم کرنے سے بالکل منع فرمادیا ہے۔ لا تتخذوا الٰهین اثنین انما ھو الٰه واحد ۱۶/۵' دو حاکم مت بناؤ' بس ایک حاکم وہی ہے۔ ولا تجعل مع اللّٰه الٰها آخر فتقعد مذموما مخذولا ۲۲/۱۷' اللہ کے ساتھ اور کوئی حاکم مت ٹھہراؤ ورنہ تم بدحال بے مددگار ہو کر بیٹھ رہو گے۔ قرآن کریم کے نزدیک دنیا میں فساد برپا ہونے کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ آسمان اور زمین کے الگ الگ دو الٰہ تسلیم کر لئے گئے ہیں اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی اور حکومت کے بجائے انسانوں کی حکومت تسلیم کر لی گئی ہے۔

حضرت ھودؑ جب قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے تو انہوں نے اپنی قوم عاد کو اللہ تعالیٰ کی حکمرانی اور اس کے الٰہ یعنی حاکم ہونے کی طرف دعوت دی۔ قوم کو استغفار و توبہ کرنے کی فہمائش فرمائی۔ اس کے علاوہ انہیں اور بھی تبلیغ فرمائی۔ لیکن قوم نے روگردانی کی۔ جس کے بعد

قوم پر عذاب آیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ھود اور ان کے ساتھ مومنین کی جماعت کو عذاب سے بچا لیا۔ سورۂ ھود میں یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے قوم عاد کا نقشہ ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ وتلک عاد جحدوا بآیات ربھم وعصوا رسله واتبعوا امر کل جبار عنید ۵۹/۱۱ اور یہ (جن کا ذکر ہوا ہے) قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے بعد رسولوں کی نافرمانی کی اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے' یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قوانین سے انکار کیا' انبیائے کرام کے احکامات سے بغاوت کی' لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کے بجائے ہر جبار اور ضدی حاکم کی اطاعت کرتے چلے گئے اور اسی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوا۔ آج ہم بالکل اسی مقام پر کھڑے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے قوانین کو صرف کائنات کے قوانین تک محدود کر دیا ہے اور اپنے معاشروں میں اپنے خود ساختہ قوانین کا اجراء کرتے ہیں اور اپنے خود مقرر کردہ حکام اور امراء کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ حالانکہ بحیثیت مسلمان ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنے معاشروں میں قرآنی قوانین کا اجراء کریں اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بھی حکومت تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیں۔ اس لئے کہ مسلمان کی تو قرآن کریم نے تعریف Definition ہی یہ کی ہے کہ جو قرآن کریم کے مطابق فیصلے کرے وہ مسلمان ہے اور جو قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر ہیں۔ ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون۔ جو بما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہ کریں وہ کافر ہیں۔

قرآن حکیم نے دین کا لفظ ٹھیٹھ ضابطہ حیات' نظریۂ زندگی' آئین' مملکت اور حکومت کے معانی میں استعمال کیا ہے۔ سورۂ یوسف میں دین الملک ۷۶/۱۲ شاہ مصر کے قانون کے معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح سورۂ نور میں لا تاخذکم فیھا رافة فی دین الله ۲/۲۴' کے الفاظ استعمال کر کے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں تمہیں ان پر رحم نہیں آنا چاہئے' خود واضح کر دیا کہ دین کے معنی قانون و آئین کے ہیں۔ اسی طرح سورہ توبہ میں ہے ولا یدینون دین

الحق ۹/۲۹' وہ اللہ تعالیٰ کے ضابطہ حیات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح سورہ توبہ میں حرمت والے مہینوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ذلک الدین القیم ۹/۳۶' اس میں بھی دین کے معنی ضابطہٗ قانون کے ہیں۔ دین کے معنی واضح کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اور صرف الاسلام ہی بطور دین کے مقبول ہے اور کوئی شخص اسلام کے علاوہ کوئی بھی ضابطہٗ حیات اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقبول نہیں ہوگا۔ ان الدین عند اللہ الاسلام ۳/۱۹' اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے و من یتبغ غیر اللا سلام دینا فلن یقبل منہ ۳/۱۸۵' جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کسی بھی ضابطہٗ حیات کو اختیار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوگا۔ ایک جگہ ارشاد ہوا' الا للہ الدین الخالص ۳۹/۳' یاد رکھو ضابطہٗ حیات (مقرر کرنا) صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی سزاوار ہے۔ اور اسی کی اطاعت ہر شخص پر واجب ہے۔ لہٰذا دین سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام زندگی ہے جسے ہمارے معاشروں کی اساس و بنیاد ہونا چاہئے۔ اور جس نظام زندگی کو ہمارے معاشروں میں جاری و نافذ ہونا چاہئے۔ اگر ہم اپنے معاشروں میں اس نظام زندگی کو جاری نہیں کرتے تو ہم نہ تو صحیح معنوں میں مسلمان ہیں اور نہ ہی ہمارا خود ساختہ آئین زندگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور نہ ہی ہم کسی بھی جہت سے اللہ تعالیٰ کی مدد کے مستحق ہوں گے اور جو وعدے اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام پر عمل کرنے سے وابستہ فرمائے ہیں وہ وعدے بھی پورے نہیں ہوں گے۔ فلہٰذا بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے خود ساختہ قوانین حیات اور ضوابط ہائے زندگی کو یک قلم ترک کر دیں اور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دین کے ماتحت زندگی بسر کرنی شروع کریں۔

قرآن حکیم نے جگہ بہ جگہ عدل کا حکم دیا ہے اور عدل کی تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذاقربی ۶/۱۵۲' اور جب تم بات کرو تو انصاف رکھا کرو اگرچہ وہ شخص آپ کا تو قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اسی طرح دشمن کے متعلق بھی فرمایا کہ ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ ۵/۸'

لوگوں کی عداوت تم کو اس کا باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کو بھی حکم ہوا کہ وامرت لاعدل بینکم ۴۲/۱۵' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کیا کروں۔ اسی طرح اور متعدد مقامات پر عدل کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ لیکن قرآن کریم کے نزدیک عدل کا مفہوم بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ عام صُور پر اگر کسی ملک کے قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے تو اسے عدل شمار کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ قانون خود کسی بھی قسم کا ہو اور یہ بات پیش نظر نہیں ہوگی کہ وہ فیصلہ عدل پر مبنی بھی ہے یا نہیں لیکن قرآن کریم کے مطابق عدل اسی فیصلہ کو شمار کیا جائے گا جو اس قانون کے مطابق ہے جو الحق یعنی وحی خداوندی کے مطابق ہے' اس کے نزدیک عدل وظلم' حق وباطل' صحت وسقم کا یہی معیار ہے فرمایا کہ وممن خلقنا امة یھدون بالحق و به یعدلون ۱۸۱/۷' اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے اور اسی کے مطابق عدل بھی کرتی ہے۔ قرآن کریم انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو نہ صرف یہ کہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ ان کو درست تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن کریم اگر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو سند (Recognize) کر لے تو اس کی اپنی فوقیت اور اہمیت اور ترجیح باقی نہیں رہتی ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور ان قوانین پر مبنی عدالتوں سے رجوع کرنا' قرآن کریم کے مطابق بالکل حرام ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی عدالتوں سے رجوع کرتا ہے جن میں انسانی خود ساختہ قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے ہوں' تو وہ شخص اللہ و رسول کے ہاں گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے کسی طرح بھی ان قوانین کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بھا ۶۰/۴' وہ چاہتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کا بالکل انکار کر دیں۔ اس آیۂ کریمہ میں غیر خدائی قوانین سے فیصلہ کرانے کو بالکل منع کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ جس ملک میں بھی ہو' قرآن کریم کے قوانین کے اجراء و نافذ کرنے کی کوشش کرے۔

لفظ زندگی یا حیات اور اس کے مرادفات عموماً ہر زبان میں ہی وسیع معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ زندگی سے مراد صرف طبعی زندگی یعنی سانس لینا' چلنا پھرنا' کھانا پینا' وغیرہ اور موت سے مراد صرف مر جانا' یعنی سانس اور حرکت کا ختم ہو جانا ہی نہیں ہے' بلکہ اس سے وسیع تر معانی مراد ہوتے ہیں مثلاً جب کسی قوم کے لئے یہ کہا جائے کہ وہ مردہ قوم ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اس قوم کے تمام افراد قبروں میں دفن ہو گئے ہیں یا اگر کسی قوم کو زندہ قوم کہا جائے تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ قوم سانس لے رہی ہے۔ زندہ یا مردہ قوم کا مفہوم واضح ہے۔ قرآن کریم نے بعض مقامات پر حیات و ممات کے یہی وسیع تر مفاہیم بھی اختیار کئے ہیں۔ جو نفس مضمون کے تسلسل سے واضح ہو جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کے متعلق سورہ یٰسین میں ارشاد ہوا لینذر من کان حیاً ۳۶/۷۱' تا کہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جو زندہ ہیں۔ یہاں حیا یعنی زندہ کا لفظ قرآن کریم نے ٹھیک ان ہی لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے جن میں زندگی کے آثار اور حرارت موجود تھی ورنہ ظاہر ہے کہ حضور قبروں میں دفن شدہ مردوں کے انذار کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح سورہ انعام میں ارشاد ہوا۔ او من کان میتا فاحیناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ الناس ۶/۱۲۳' اور کیا وہ شخص جو مردہ ہو اور اسے ہم پھر زندہ کر دیں اور اسے ایسی روشنی عطا کر دیں جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلے پھرے''۔ یہاں بھی بالکل واضح ہو رہا ہے کہ یہاں موت و حیات سے مراد طبعی زندگی اور موت نہیں ہے۔ بلکہ گمراہی اور ہدایت ہے۔ انبیاء کرام کا مقصد ہی مردہ اقوام کو زندہ کرنا' اور انہیں نئی زندگی عطا کرنا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اسی مفہوم کو واحی الموتیٰ باذن اللہ ۳/۴۹' کہہ کر بیان فرمایا تھا کہ وہ مردہ قوم کو قانون خداوندی کے ذریعے زندگی عطا کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس (وسیع المفہوم) زندگی کے حاصل کرنے کا طریقہ قرآن کریم نے بیان فرمایا کہ یاایھا الذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحیکم ۸/۲۴' ایمان والو' اگر تم اللہ و رسول کی پکار کا جواب دو گے تو وہ تمہیں زندگی عطا کر دے گا اور اس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام' جس کو حضورؐ

نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا' اس کی اطاعت زندگی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں تو اتنی قوت ہے کہ وہ مردہ قوم کو زندہ کر دے۔ اس لئے اگر مسلمانوں کو دوبارہ زندگی حاصل کرنی ہے تو ان پر واجب ہے کہ قرآن کریم کا عطا کردہ نظام قائم کریں۔ اس کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ انہیں قرآن کریم کے وعدہ کے مطابق یقیناً زندگی حاصل ہوگی اور وہ لازماً زندگی کی سرفرازیوں سے متمتع ہوں گے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ اور یقیناً تم ہی سب سے اعلیٰ ہو گے اگر تم مومن ہو۔

چونکہ انبیائے کرام پر اپنی وحی کے مطابق معاشرہ قائم کرنا فرض ہوتا تھا اس لئے سابقہ انبیائے کرام نے اپنے اپنے دور میں اپنی وحی کے مطابق حکومتیں قائم فرمائیں۔ حضورﷺ کو بھی اسی غرض سے مبعوث فرمایا گیا تھا کہ وہ نہ صرف دین کا قیام عمل میں لائیں بلکہ اس دین کو تمام دیگر ادیان باطلہ پر غالب فرمادیں ھو الذی ارسل رسولہ باالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ۲۸/ ۴۸' وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دی اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ حضورﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے سارے جزیرۃ العرب میں اس دین کو جاری فرمایا۔ آپ کے بعد آپ کے جانشینوں نے اسی دین کو بلا کم و کاست جاری رکھا' تا آنکہ مسلمانوں کی بدقسمتی بلکہ ساری انسانیت کی بدبختی اور حرماں نصیبی کہ اس نظام پر ملوکیت غالب آ گئی اور وہ نظام جاری نہ رہ سکا۔ ہر نظام کے قیام و اجراء اور اس کے برقرار رہنے کے لئے ایک مضبوط اساس کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو اس نظام کے جذبۂ محرکہ اور Incentive کے طور پر اس نظام کو قائم رکھتا ہے۔ حضور کے قائم کردہ دین یعنی اسلامی نظام کی اساس متین اور بنیان مرصوص یہ تھی کہ اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین جس کو حضورﷺ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا' اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت کے مرادف تھی۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں جب تک وہ دین قائم رہا' اس دین (نظام) کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اللہ و رسول کی اطاعت کا واحد

ذریعہ اس کے نظام کی اطاعت تھی۔ قرآن کریم نے جہاں جہاں اللہ ورسول کے الفاظ استعمال کئے ہیں' اس سے مراد اسلامی نظام ہے۔ جہاں جہاں اللہ ورسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے' وہاں اس سے مراد اسلامی نظام کی اطاعت مقصود ہے۔ (اس سلسلہ میں اس ادارہ کا مضمون' اساس محکم' ملاحظہ فرمائیں) اس نقطہٴ نگاہ کی تائید میں قرآن کریم سے متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن بوجہ اختصار صرف تین آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کو مزید آیات درکار ہوں وہ ''اساس محکم'' ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) جنگ احد جب مسلمانوں کی فوج پراگندہ ہوگئی اور چند مجاہدین کی غلطی سے فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی اور حضورﷺ بالکل تن تنہا رہ گئے تو آپ نے مجاہدین کو حوصلہ دیا اور ان کو آواز دی جس پر وہ دوبارہ جمع ہو گئے حالانکہ یہ حضورﷺ کی آواز تھی۔ لیکن چونکہ یہ حضورﷺ کا ذاتی بلاوا نہیں تھا بلکہ آپ نے بحیثیت سربراہ مملکت آواز دی تھی اس لئے اس آواز کو اللہ ورسول کی آواز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابتهم القرح' للذین احسنوا منهم واتقوا اجر عظیم ۳/۱۷۲۔

جن لوگوں نے اس کے بعد کہ ان کو زخم لگا' اللہ اور رسول کے کہنے کو قبول کر لیا۔ ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں' ان کے لئے ثواب عظیم ہے۔

(۲) یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا' جو انہوں نے حضورﷺ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو اللہ اور رسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے' کیونکہ یہ مخالفت اسلامی نظام کی مخالفت تھی۔

ذلک بانهم شاقوا اللہ و رسوله ومن یشاقق اللہ و رسوله فان اللہ شدید العقاب ۸/۱۳' (ترجمہ) یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ اور رسول کی مخالفت کرتا ہے سو اللہ تعالیٰ اس کو سخت سزا دیتا ہے۔

(۳) ایک آیہٴ کریمہ اس بارے میں اس مفہوم کو ثابت کرنے کے لئے بہت ہی واضح اور

بین ہے اور حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔

ومن یخرج من بیتہ مہاجرا الی اللہ و رسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ مکان اللہ غفوراً رحیماً ۴/۱۰۰۔

اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ و رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ جائے تب بھی اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت اور رحمت کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں اس آیت میں اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کر کے جانے سے سوائے اسلامی حکومت (مدینہ منورہ) کی طرف ہجرت کرنے کے اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا۔

ان آیات کریمات سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ قرآن کریم نے اللہ و رسول کے الفاظ اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ جس سے مراد اسلامی حکومت کے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت سے مقصوداً اسلامی حکومت کے سربراہ کی اطاعت مراد ہوتی ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس نظام کی اطاعت ہے۔ لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت در آئی تو یہ قرآنی نظریہ بھی تبدیل ہو گیا اور اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے اس نظام کی اطاعت کے بجائے قرآن و حدیث کی انفرادی اطاعت تصور کر لی گئی۔ یہ مسلمانوں کے زوال کی پہلی اور بنیادی وجہ تھی اور اس سے وہ جذبہ محرکہ اور Incentive باقی نہیں رہا جس کی بنیاد پر وہ نظام قائم تھا کیونکہ اس نظریہ کی تبدیلی سے نظام کے قیام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اجتماعی اطاعت کی بجائے انفرادی اطاعت کا جواز مہیا ہو گیا۔ اب ہر شخص فرداً فرداً قرآن و حدیث کی اطاعت کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مراد قرآن کریم کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا ذریعہ احادیث کی اطاعت قرار پایا۔ اس سے اسلامی نظام کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ آج تک دوبارہ اسلامی نظام کسی جگہ بھی قائم نہیں ہو سکا۔ اور ملوکیت نے ایسا استقلال پکڑا کہ آج تک مسلمان ممالک اس چنگل

سے نہیں نکل سکے اور یہی ملوکیت کا مقصود بھی تھا۔ اگر مسلمانوں میں ملوکیت آ بھی گئی تھی تاہم اگر یہ قرآنی نظریہ تبدیل نہ ہوتا تو اس بات کا امکان تھا کہ کچھ عرصہ بعد پھر اسلامی نظام قائم ہو جاتا۔ لیکن غضب تو یہ ہوا کہ وہ تو سرے سے یہ قرآنی نظریہ ہی بالکل بدل دیا گیا اور اس طرح اسلامی نظام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ فکری طور پر اس نظریہ کو عام کیا جائے۔ جب ہم مسلمان اس بات کے قائل ہوں گے کہ اللہ و رسول کی اطاعت اس کے دیئے ہوئے نظام کی اطاعت سے ہوتی ہے تو خود بخود اس نظام کو جاری کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہ نظریہ کہ اللہ و رسول کے الفاظ قرآن کریم نے بطور ایک اصطلاح کے استعمال کئے ہیں اور جس سے مراد اسلامی حکومت کے سربراہ اور حاکم اعلیٰ ہیں' اس کی تائید مزید قرآن کریم کی متعدد آیات کریمات سے ہوتی ہے' جن پر قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے الفاظ لا کر ان کے لئے ضمائر واحد کی استعمال کی ہیں۔ حالانکہ عربی قواعد کے مطابق ان کے لئے تثنیہ کی ضمیر لانی لازمی تھی ان آیات میں سے صرف دو آیات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ و رسولہ احق ان یرضوہ' ان کانوا مومنین ۹/۶۲۔

(ترجمہ) مومنو یہ لوگ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش کر دیں۔ حالانکہ اگر یہ (دل سے) مومن ہوتے تو خدا اور اس کا رسول خوش کرنے کے زیادہ مستحق ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بات واضح ہے کہ اللہ اور رسول کے لئے ضمیر واحد لائی گئی ہے لیکن اللہ اور رسول ایک تو نہیں ہو سکتے۔ پیغام دینے والا اور پیغام وصول کرنے والا ایک نہیں ہو سکتے عابد و معبود ایک نہیں ہو سکتے۔ پس اللہ اور رسول کے لئے واحد ضمیر لا کر یہ بات ثابت کرنی مقصود ہے کہ یہ اطاعت صرف ایک اطاعت ہے' اور اس سے مراد اسلامی حکومت کے سربراہ کی

ذات ہے۔

(۲) اغنٰھم اللہ و رسولہ من فضلہ ۹/۷۴۔

انہیں اللہ اوراس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کردیا۔ یہاں بھی واحد ضمیر لا کر واضح کردیا کہ اس سے مراد وہ مرکزی نظام ہے جو اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کردیا اور جس میں قوانین خداوندی ہی جاری وساری ہیں اوراسی وجہ سے اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اللہ ورسول کی اطاعت ایک ہی اطاعت ہے اوراس سے عملاً مراد اسلامی حکومت کا سربراہ ہے' فی الوقت ان دو آیات کریمات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

آج ساری دنیا میں فساد ہی فساد نظر آرہا ہے۔ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون ۳۰/۴۱' (ترجمہ) خود لوگوں ہی کے اپنے ہاتھوں کی کارستانیوں کی بدولت خشک وتر میں فساد پھیل گیا ہے تا کہ جو کچھ یہ لوگ کر چکے ہیں خدا ان کو ان میں سے بعض کرتوتوں کا مزا چکھا دے تا کہ یہ لوگ (اب بھی) باز آ جائیں۔قرآن کریم کے نزدیک صرف بدامنی' لاقانونیت' قتل و غارت' سلب ونہب ہی فساد نہیں ہے' بلکہ قرآن کریم کی نظر میں ہر وہ نظام جو قرآن کریم کے نظام کے خلاف ہو' جس میں رزق کے سرچشموں پر قابو کر کے' دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر' معاشرہ کا توازن بگاڑ دیا جائے' وہ فساد پر مبنی نظام ہے۔اسی لئے قرآن کریم میں آیت بالا میں فرمایا کہ جب لوگوں نے غیر خدائی نظریات وتصورات کو قانون خداوندی کا ہمسر بنا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں۔ یہ ناہمواریاں خود لوگوں کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔ ان کی خود پیدا کردہ ناہمواریوں کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آ چکے ہیں۔اگر یہ غور سے دیکھیں تو یہی نتائج اس بات کے لئے کافی محرک ہو سکتے ہیں کہ یہ اپنے خود ساختہ نظام زندگی سے منہ موڑ کر' نظام خداوندی' کی طرف رجوع کریں۔

انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے حیات نے انسانیت کو سکون واطمینان فراہم نہیں

کیا۔ آج سارے عالم اسلام میں شدید بحران واضطراب کی کیفیت ہے اور مسلمان مختلف ممالک میں اس طرح منقسم ہو گئے ہیں کہ اجتماعی قوت کا کوئی تصور بھی ان میں باقی نہیں رہا ہے اور خود مسلم ممالک بھی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں اور اگر کسی مسئلہ پر ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی چاہتے ہیں تو بین الاقوامی حالات' مدد کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے۔ ان مایوس کن حالات میں مسلمانوں کو زندہ کرنے کی واحد صورت' قرآن کریم کے نظام کو قائم کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ قرآن کریم کا اپنا دعویٰ ہے کہ اللہ و رسول کی پکار پر جواب دینے والوں کو وہ زندگی عطا کرتا ہے (۲۴/۱۸) آج مسلمان اگر اللہ و رسول کی پکار پر جواب دیں تو انہیں یقیناً زندگی مل سکتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا اٹل وعدہ ہے' جو کسی حال میں جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ صرف پکار کے مفہوم کو صحیح سمجھنا ہے۔ اللہ و رسول کی پکار صرف و صرف ایک پکار ہے' جو اس کے نظام کی پکار ہے اور اسی پکار کے جواب میں مسلمانوں کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ لیکن جب تک ہم مسلمان اللہ اور رسول کی پکار کو قرآن و حدیث کی الگ الگ' دو پکاریں سمجھ کر جواب دیتے رہیں گے اور انفرادی طور پر ان پر عمل کرتے رہیں گے' مسلمان کبھی بھی زندگی حاصل نہیں کر سکیں گے۔

رب اعوذبک من همزت الشیطین واعوذبک رب ان
یحضرون ۹۷۔۹۸/۲۳۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت امام مہدی کی آمد کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے

انسانیت کو جو علوم وحی کے ذریعے ملے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ ہوتے ہیں۔ لیکن بشری عقل سے جو علوم حاصل ہوتے ہیں وہ غلطی وسہو سے مبرا نہیں ہوتے۔ وحی خداوندی اور علم انسانی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اللہ نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ وہ تجربے' مشاہدے' غور وفکر اور تفحص وتعقل سے علوم حاصل کرتا ہے یہ علوم اس کو اس کے حواس کے ذریعے ملتے ہیں اس لئے اس علم کو ادراک بالحواس کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں دو آیات کریمات میں اس علم کو خود Define کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ولا تقف مالیس لک به علم ان السمع والبصر و الفؤاد کل اولئک کان عنه مسئولاً (17:36)۔

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ جاؤ' تمہاری سماعت' بصارت اور عقل ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لهم قلوب لاّ یفقهون بها ولهم اعین لا یبصرون بها ولهم اذان لا یسمعون بها (7:179)

ان کے دل ہیں مگر وہ غور نہیں کرتے' ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ نہیں دیکھتے' ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے نہیں سنتے۔

ان دونوں آیات کریمات میں قرآن کریم نے علم کو Define کر دیا ہے کہ علم حاصل کرنے کے ذرائع حواس انسانی ہیں' اسی وجہ سے اس علم کو علم بالحواس کہا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف ایک علم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا تھا' جس میں علم حاصل کرنے والوں کے خیالات واحساسات کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس علم کو وحی خداوندی کہا جاتا ہے اور جسے یہ علم عطا کیا جاتا تھا وہ رسول یا نبی کے نام سے موسوم ہرتا ہے۔ وحی خداوندی کا نزول اس اہتمام کے ساتھ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے آگے اور پیچھے محافظ لگا دیتا تھا تا کہ وحی میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے اور اس لئے بھی کہ وہ (اللہ تعالیٰ) جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے (26:28)۔ اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ وحی الٰہی میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو جائے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود ہی اپنے ذمہ لے لی۔

قرآن کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم حاصل ہونے کے صرف دو ہی ذریعے تھے' ایک عقل انسانی اور دوسرا وحی الٰہی۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم حاصل کرنے کا نہیں تھا اور چونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اس لئے اب علم حاصل کرنے کے دو ذریعے عقل انسانی اور قرآن کریم ہیں۔ وحی صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتی تھی جس کی وضاحت ان دو آیات کریمات میں کر دی گئی ہے۔

عالم الغیب فلا یظھر علی غیبه احداہ الا من ارتضی من رسول (72:26)۔

وہی غیب دان ہے اور اپنی غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا' مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔

نیز ارشاد ہوا:

وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء(3:179)۔

خدا ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی باتیں بتا دے مگر وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب بتانے کے لئے چن لیتا ہے۔

انبیاء کرام کے علاوہ نہ تو کوئی شخص وحی میں شامل ہو سکتا تھا اور نہ ہی یہ بات جان سکتا تھا کہ وحی کے نزول کے وقت انبیاء کرام کی کیا کیفیت ہوتی تھی' وہ کیفیت صرف انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی۔ نیز ان آیات سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسانیت کو علم خداوندی حاصل ہونے کا واحد ذریعہ وحی الٰہی تھا۔ اس کے علاوہ کوئی ذریعہ علم خداوندی حاصل ہونے کا نہیں تھا۔ انبیاء کرام کو بھی گذشتہ واقعات یا آئندہ امور کے متعلق جن باتوں کا علم دیا گیا وہ صرف وحی کے ذریعے دیا گیا۔

ذلک من انبآء الغیب نوحیہ الیک 3:43 نیز 12:102, 11:49۔

انبیاء کرام کے پاس بھی علم حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہوتے تھے' ایک تو ان کی عقل سلیم اور دوسرے' وحی الٰہی' کوئی تیسرا ذریعہ ان کے پاس بھی علم حاصل کرنے کا نہیں ہوتا تھا' اس بات کو قرآن کریم نے باصرار واضح کیا ہے اور اس بات کو اہمیت دی ہے کہ انبیاء کرام کے پاس ان دو ذرائع کے علاوہ کوئی اور ذریعہ اکتساب علم کا نہیں ہوتا تھا۔

سنت اللہ یہی ہے کہ دیگر انبیاء کرام کی طرح' حضور اکرم ﷺ کے پاس بھی علم حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے تھے' ایک تو ان کی عقل سلیم و بصیرت انسانی اور دوسرے وحی الٰہی جو صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم حاصل ہوا وہ صرف قرآن کریم ہی حاصل ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ' ان ھو الا ذکر و قران مبین (36:69)۔

اور نہیں سکھایا ہم نے اس کو شعر اور نہیں لائق اس کے وہ' نہیں وہ بجز ایک نصیحت اور روشن کتاب (موضح القرآن)۔

اس آیت کریمہ میں نفی و اثبات کے حصر کے ساتھ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضور ﷺ کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن کریم ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کی نفی کر دی گئی ہے۔ کیونکہ یہاں جو ضمیر کا مرجع تعلیم ہے اور جو بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف ذکر یعنی قرآن ہے۔ ذکر کی وضاحت خود قرآن نے سورہ حمٰ سجدہ میں یوں فرمائی کہ:

ان الذین کفرو بالذکر لما جاء ھم وانه لکتب عزیز ٥ لا یاتیه الباطل من بین یدھه ولا من خلفه تنزیل من حکم حمید٥(41:41-42)-

تحقیق وہ لوگ کہ کافر ہوئے ساتھ ذکر کے جب آیا ان کے پاس اور تحقیق وہ اللہ کی ایک کتاب ہے عزت والی۔ جھوٹ اس کے پاس نہیں آتا نہ آگے سے نہ پیچھے سے' اتاری گئی ہے حمید وحکیم کی طرف سے۔

اس آیت کریمہ نے ذکر کی خود وضاحت فرمادی کہ ذکر قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ البتہ ایک اشکال یہاں ذکر اور قرآن کے درمیان والی واؤ کا بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے۔ اس لئے قرآن اور ذکر دو مختلف چیزیں ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ واؤ عاطفہ نہیں ہے بلکہ یہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ھو الذی ارسل رسوله بالھدی و دین الحق (9:33)-

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دین حق کے ساتھ بھیجا۔

اگر اس آیت میں واؤ کو عاطفہ سمجھا جائے جو مغائرت کی متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور چیز ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے جو بالبداہت غلط ہے لہٰذا یہاں واؤ' واؤ بیانیہ ہی لی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ بیانیہ تفسیر یہ ہے

جس کے معنے ہیں کہ حضورﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم صرف ذکر یعنی قرآن کہا گیا ہے اور حضورﷺ کو کوئی چیز الہام یا القاء نہیں کی گئی ہے۔

دیسے بھی جو حضرات الہام یا القاء کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی وحی اور الہام کی مثال ایسی ہے جیسی بجلی اور موم بتی کی۔ بجلی کی موجودگی میں موم بتی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے' اسی طرح جس مبارک ہستی کو وحی جیسی روشن و منور ہدایت ملتی ہو' اسے الہام و القاء کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ کے سلسلہ میں یہ اضافہ کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو' تو حرف استثناء حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں بھی حرف استثناء **الا** حصر کا کام دے رہا ہے' جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنے نبی کو صرف قرآن کی تعلیم دی ہے اور اس کے علاوہ کوئی تعلیم نہیں دی۔

اس طویل تمہید کے بعد اب اصل عنوان کی طرف مراجعت کی جاتی ہے یہ بات ثابت کی جا رہی ہے کہ حضورﷺ کے پاس معلومات حاصل کرنے کے دو ہی ذرائع تھے ایک ان کی بصیرت انسانی اور دوسرے قرآن کریم۔ گذشتہ و آئندہ کے واقعات جن کا علم حضور کو دیا گیا' وہ بھی صرف وحی سے دیا گیا' جو صرف قرآن میں محفوظ ہے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں آ گیا ہے۔ وحی الٰہی یعنی قرآن کریم کے علاوہ آپ کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے آپ کو آئندہ کے واقعات کا علم ہوتا۔ رسول اللہﷺ قرآن کے علاوہ اور کوئی غیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔

72/26,3/ 179, 12/102, 11/49, 3/44, 7/188, 6/50۔

لہٰذا چونکہ حضرت امام مہدی کی آمد کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے' لہٰذا یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے' اور اس سلسلہ میں علماء کرام بھی کوئی آیت پیش نہیں فرماتے۔ اس مضمون کے رقم کرنے کی غایت ہی صرف یہ ہے کہ جبکہ حضورﷺ کو آئندہ کے واقعات کا علم صرف وحی کے ذریعے دیا جاتا تھا اور وحی صرف قرآن میں محفوظ ہے' اس لئے وہ تمام باتیں جن کا ذکر قرآن

میں نہیں ہے اور جو آئندہ کے واقعات کے متعلق حضورﷺ کی طرف منسوب کی جائیں وہ وضعی اور قرآن کے خلاف ہیں۔

اس لئے آمدِ مہدی وغیرہ نظریات سب قرآن کے خلاف ہیں اور ہم مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ خلافِ قرآن عقائد جس قدر جلدی ترک کریں وہ ہمارے لئے بہتر ہے۔

☆☆☆

مختلف ٹی۔وی چینلز پر اس قسم کے پروگرام آرہے ہیں جو بالکل قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ان میں استخارہ' بولتے ستارے قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ARY Digital پر کئی مرتبہ ڈاکٹر شاہد مسعود صاحب نے آمد مہدی کے متعلق پروگرام کئے جس میں ڈاکٹر اسرار صاحب اور ایک شیعہ عالم نے گفتگو کی۔گفتگو مجموعی طور پر سطحی ہے اور اس کا سارا دارومدار وضعی احادیث پر تھا۔قرآن کریم سے مطلقاً استناد نہیں کیا گیا۔چونکہ قرآن کریم سے کوئی استناد نہیں کیا گیا' اس لئے اس مسئلہ کے متعلق محترم خواجہ ازہر عباس صاحب کا موقف پیش کیا جاتا ہے جو کہ انہوں نے قرآن کریم کی روشنی میں تیار کیا ہے۔

(ایڈیٹر ماہنامہ طلوع اسلام)

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی حقوقِ انسانی

جس دن سے شعور انسانی نے آنکھ کھولی ہے انسان اپنے لئے بہترین ضابطہ حیات بنانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اس کوشش و جدو جہد کا سلسلۂ دراز نوع انسانی کی پوری تاریخ پر محیط ہے۔ اس دنیا میں سینکڑوں اقوام آئیں اور چلی گئیں' سینکڑوں نظام نمودار ہوئے اور ختم ہو گئے۔ متعدد تہاذیب کے چراغ جلے اور بجھ گئے' عقل انسانی برابر ترقی کرتی رہی۔ علوم عقلی کو فروغ حاصل ہوتا چلا گیا لیکن یہ مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا۔ ہمارے اپنے دور میں جمہوریت اور کمیونزم دونوں نظام جاری رہے' لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے کمیونزم کا نظام منقرض ہوگیا اور جمہوریت جس کا نظام آج بھی جاری ہے اس کے لئے بھی خود مفکرین و مدبرین یورپ کا اعتراف ہے کہ یہ مسائل حیات کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

انسانی نظام حیات میں جو بنیادی چیز قابل غور اور مختلف فیہ رہی ہے وہ فرد اور معاشرہ کے باہمی حقوق کا تعین تھا۔ ابتدائی دور قبائلیت اور دور ملوکیت میں فرد کا کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کے کوئی حقوق اس کو حاصل تھے۔ بادشاہ ہی قانون کا واحد منبع و مصدر شمار ہوتا تھا کہ جو بھی قانون اس کی ذات یا مملکت کو فائدہ دیتا تھا وہ اُسے جاری کر دیتا تھا۔ انسان کے حقوق یا اس کی ضروریات کا کوئی خیال کبھی پیش نگاہ نہیں رہا۔ اور نہ ہی عوام میں اپنے حقوق کا کوئی تصور تھا۔ ہمارے ہاں مسلمانوں میں یہ تاریک ترین دور تھا۔ عوام تو ایک طرف اس زمانہ کے مفکرین بھی بادشاہ کی مطلق العنانی اور عوام کو اس کی اطاعت کی تعلیم دیتے تھے۔ سعدی شیرازی کا مشہور شعر ہے:

اگر شاہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں

(ترجمہ) اگر بادشاہ دن کے لئے کہدے کہ یہ رات ہے تو یہ ہی کہنا چاہئے کہ ہاں یہ رہے ماہ و پریں۔

ضمناً مسلمانوں کی مزید بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ یہی تاریک ترین دور وہ دور تھا جب مسلمانوں میں مزعومہ اسلامی علوم کی تدوین ہوئی۔ اس دور کے خلاف عقل نظریات' نیز بادشاہوں کی مطلق العنانی اور اس کا منطقی نتیجہ تقدیر کا عقیدہ' ان سارے علوم میں سرایت کر گئے جس کے نتیجہ میں جو قوم سراپا عمل اور ساری انسانیت کے لئے نگراں مقرر ہوئی تھی وہ ساری اقوام میں پست ترین ہوئی۔ بالآخر حقوق انسانی کا تصور بھی مغرب سے شروع ہوا جس کی نہایت مختصر تاریخ پیش کی جاتی ہے جس سے مقصود قارئین کرام کو یہ اندازہ کرانا ہے کہ یہ حقوق اس دور کے بادشاہوں نے بخوشی نہیں دیئے بلکہ مجبوراً دباؤ میں آ کر (Under Pressure) دیئے ہیں۔ جس قدر دباؤ ان پر بڑھتا رہا اسی قدر حقوق وہ دیتے رہے۔ انسانی حقوق کا جاری کرنا ان کی اپنی خواہش نہیں تھی اور یہی حالت اب بھی ہے جہاں ملوکیت مضبوط ہے وہ حقوق کم دیتی ہے۔ جہاں عوام کا زور زیادہ ہے وہاں حقوق زیادہ دیئے گئے ہیں۔

ولیم (William the Conqueror) نے 1066 عیسوی میں Hastings کے مقام پر جنگ لڑی اور انگلستان کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہاں مقامی حکومتیں قائم رہیں اور (Feudal System) جاگیردارانہ نظام جاری رہا۔ یہاں تک کہ John the Lacland کا زمانہ آ گیا۔ اس بادشاہ کے زیر قبضہ بہت سا علاقہ فرانس میں بھی تھا۔ جس کی وجہ سے یہ برابر فرانس سے لڑتا رہا۔ ایک اہم مقام اس کے ہاتھ سے جاتا رہا جس کا نام Cailwy تھا۔ اس وجہ سے اس کو John the Lackland کہنے لگے۔ فرانس سے مسلسل لڑائی کی وجہ سے یہ بادشاہ اپنے Barons سے برابر رقوم اور سپاہیوں کا مطالبہ کرتا رہا اور

Barns اس کو یہ دونوں چیزیں مہیا کرتے رہے۔لیکن اس کولڑائی میں برابر شکست ہوتی رہی۔ اس سے اس کے Barns دل برداشتہ ہوگئے اور بادشاہ اور Barons کے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے اور بادشاہ بھی برابر پارلیمنٹ کونظر انداز کرتا رہا۔آخرایک مرتبہ جب کہ بادشاہ سیر کے لئے Riennymede گیا ہوا تھا اور اس کے امراء (Barns) اس کے ساتھ تھے انہوں نے بادشاہ کو مجبور کر کے Magna Carta پر دستخط کرائے۔ یہ Magna Carta 15 جون 1215ء کوضبط تحریر میں آیا تھا۔اس Magna Carta کے تحریر کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کا پوپ بھی بادشاہ کے خلاف تھا اور اس نے بادشاہ کو Ex-Communicate (ایمان سے خارج) کر دیا تھا جس کے معنے یہ تھے کہ بادشاہ اور ملک کی پوری رعایا بخشش سے محروم ہوگئی تھی۔اس معاہدہ کی 63 شقیں تھیں لیکن اس معاہدہ کا لب لباب یہ تھا۔

(1) بادشاہ کسی کو پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ملک بدر نہیں کرسکتا۔

(2) بادشاہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی Tax نہیں لگا سکتا۔

(3) بادشاہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کسی کو قید نہیں کرسکتا۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں شقیں baron's کے متعلق ہی تھیں۔عوام کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس کے بعد رعایا اور بادشاہوں کے تعلقات اچھے رہے یہاں تک کہ ٹوڈرز (Tudors) آ گئے۔ یہ پہلا خاندان تھا جس نے جم کے حکومت کی۔اور اس خاندان میں بھی الزبیتھ (Elizabeth) بہت کامیاب رہی۔ وہ بہت زیرک تھی اور اس نے متاہل زندگی اختیار نہیں کی بلکہ اپنی شادی کے مسئلے کو سیاسی بنا کر اس کو Exploit کیا۔ یہ اکبراعظم کی ہمعصر تھی۔ چونکہ اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لئے اس نے اپنے قریب ترین عزیز William کو اپنا جانشین بنایا۔ یہ بادشاہ بہت Pedantic تھا اور اس کے دور میں بائبل کا Authorised Version طبع ہوا۔اس کے زمانہ تک بادشاہ مطلق العنان ہی ہوتے تھے اور عوام کا کوئی دباؤ

حکومت پر نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ بھی عموماً رعایا کا خیال رکھتے تھے' صرف Barons کا بادشاہ پر اثر ہوتا تھا۔ ولیم کے بعد اس کا بیٹا چارلس اول حکمران ہوا اور اس کے دور کے شروع سے ہی لڑائی اور تنازعات شروع ہو گئے۔ اس کے دور میں تین پارٹیاں تھیں اور تینوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں تھا۔ چنانچہ اس بادشاہ کے دور میں Bill of Rights اور Petitior of Rights پاس ہوئے۔ لیکن بادشاہ برابر وعدہ خلافی کرتا رہا یہاں تک کہ اس کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ Bill of Rights اور Petition of rights انسانی حقوق کے تسلیم شدہ Documents تھے اور اس طرح حقوق انسانی تحریری شکل میں آئے۔ یہ دور سترھویں صدی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد 1789 میں فرانس کا انقلاب برپا ہوا اور Decleration of Rights عالم وجود میں آیا۔

اصل بات جو بہت ہی اہم اور انقلابی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا نظریہ انسانی حقوق کے سلسلہ میں موجودہ مغربی حقوق کے نظریہ سے بالکل منفرد ہے۔ اس کے نزدیک یہ انسانی حقوق ہی نہیں ہیں' زیادہ سے زیادہ یہ قانونی حقوق (Legal Rights) ہیں۔ وہ بھی صرف وہاں جاری ہو سکتے ہیں جہاں حکومت کی اپنے عوام پر گرفت کمزور ہو' اور عوام کا حکومت پر کافی دباؤ ہو۔ لیکن قرآنِ کریم کے نزدیک ان حقوق کی بھی اہمیت ہے۔ قرآنِ کریم کا انسانی حقوق سے متعلق نظریہ معلوم کرنے سے پیشتر قرآن کے تصور زندگی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جب تک قرآنِ کریم کا تصور حیات سامنے نہیں آتا' اس کے حقوق و فرائض کا تصور بھی واضح نہیں ہو سکتا۔

انسانی زندگی سے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ عام حیوانی بچوں کی طرح پیدا ہوتا ہے وہ طبعی قوانین کے تابع زندگی گزارتا ہے۔ افزائش نسل کرتا ہے اور ان ہی طبعی قوانین کے مطابق اپنی پوری زندگی گزار کر مر جاتا ہے اور اس طرح اس انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان متمدن واقع ہوا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی سوسائٹی میں زندگی بسر کرے اس لئے وہ کوئی نہ کوئی سوسائٹی یا معاشرہ بناتا ہے۔ سوسائٹی یا معاشرہ میں رہنے کے لئے

ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد وضع کرتے ہیں جو حالات و مصالح کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

یہ ایک نظریۂ زندگی تھا جو تحریر کیا گیا ہے۔ زندگی کا دوسرا نظریہ جو قرآن حکیم کا پیش کردہ ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں لیکن انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہے۔ اس کی طبعی زندگی' حیات (The Life) کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ یہ اس کی آخری کڑی نہیں ہے۔ اسی سلسلہ کو آگے جاری رہنا ہے۔ طبعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے طبعی قوانین کافی ہیں لیکن ارتقا کی اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے طبعی قوانین کے علاوہ ایک اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت ہے' جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں اور نہ ہی کسی سوسائٹی کی۔ یہ ازلی و ابدی ہیں۔ مطلق (Absolute) ہیں۔ یہ اقدار انسانیت کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے عنایت فرمائی ہیں جو انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں کو ملتی رہی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے اعمال وحی الٰہی یعنی مستقل اقدار کے مطابق ہوئے تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے' لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا' اور اس فرد کے بیشتر اعمال مستقل اقدار کے خلاف ہوئے تو وہ زندگی کی پست سطح پر رہے گا۔ اعمال کے اثرات مرتب ہونے میں کسی پولیس' یا عدالت' یا حکومت کی کسی ایجنسی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قانون مکافات عمل کی رو سے خود مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور کائنات کی قوتیں جنہیں قرآنِ کریم نے ملائکہ کہا ہے وہ یہ اثرات مرتب کرتی ہیں لیکن ہم شعور کی موجودہ حالت میں یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کس طرح یہ اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ یہ دونوں نظریات زندگی' ایک دوسرے سے بالکل الگ منفرد' متخالف اور متناقض ہیں۔ ان دونوں نظریات زندگی میں باہم آمیزش نہیں ہو سکتی۔

چونکہ اس مضمون کا سارا دارومدار اسی نکتہ پر منحصر ہے' اس لئے اس کی دوبارہ وضاحت دوسرے پیرائے میں کی جاتی ہے تاکہ معزز قارئین کرام پر یہ مضمون اچھی طرح واضح ہو جائے۔

علمی دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے نظریات جاری ہیں۔ایک تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف طبعی زندگی Physical Life پر مشتمل ہے۔ ہر انسان طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور ان ہی طبعی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور ان ہی قوانین کی رد سے وہ فوت ہو جاتا ہے۔ جب اس کا سانس بند ہو جاتا ہے تو فوری اس شخص کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس تصور حیات کو مادی نظریۂ حیات سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس کے بالکل برخلاف دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی کا نام نہیں ہے بلکہ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات ''میں'' Self یا زندگی کہتے ہیں۔یہ طبعی قوانین کے ماتحت نہیں ہوتی اور نہ ہی انسانی جسم کی موت سے اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔اگر اس کی مناسب نشوونما کر لی جائے تو موت کے بعد بھی وہ زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کے ماتحت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرامؑ کی معرفت بذریعہ وحی ملتے تھے۔زندگی ایک مسلسل جاری رہنے والی ندی ہے جو اس دنیا کے صحراؤں سے گذر کر آخرت کے باغوں اور چمنستانوں میں داخل ہو جاتی ہے اور موت اس باڑ یا Curtain کا نام ہے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہے جس کی وجہ سے ہم اس لق و دق صحرا میں کھڑے ہونے کی وجہ سے زندگی کی اس ندی کو اس باڑ (Curtain) سے آگے نہیں دیکھ سکتے ورنہ تو بقول احسان دانش مرحوم

موت کے صدمہ سے کم ہوتی نہیں تابندگی
اس طرف بھی زندگی ہے اس طرف بھی زندگی

زندگی سے متعلق قرآنی نظریہ کی وضاحت کے بعد ہم اب اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

یہ بات تو درست ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک اصل مقصد ذات کی نشوونما اور اس کا مابعد موت کا ارتقاء ہے اور اسے ہی وہ زندگی بھی کہتا ہے وان الدار الآخرۃ لھی

الحیوان (29/64) اور آخرت کا گھر جو ہے تو وہی زندگی ہے۔ تاہم اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اس دنیا کی طبعی زندگی کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اس دنیا کی طبعی زندگی کو بھی بہت اہمیت دیتا ہے اور اس دنیا میں زندگی گذارنے کی ہدایات عنایت فرماتا ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ چونکہ عقل انسانی اپنے مسائل حیات خود طے کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے وہ ان کا حل پیش کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے انسانیت پر فرض ہے کہ وہ اپنی حیات اجتماعیہ اس کے پیش کردہ نظام کے مطابق بنائیں۔ قرآنِ کریم جو نظام پیش کرتا ہے اس میں بھی اس نے حقوق انسانی کی نشاندہی کر دی ہے۔ جن کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔ لیکن ان کی اہمیت اس تناسب سے ہے جس قدر اہمیت جسم کی ذات کے مقابلہ میں ہے۔ قرآنی تصور حیات کے مطابق ان کا نام انسانی حقوق نہیں ہوسکتا بلکہ انہیں قانونی حقوق (Legal Right) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انسانی حقوق تو صرف وہ حقوق ہیں جو انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق ہوں۔ لیکن چونکہ عام طور پر حقوق انسانی کی اصطلاح ہی ان طبعی قوانین کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے' اس لئے پیش نظر مضمون میں بھی سہولت کے پیش نظر وہی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔ فی الحال' اس طبعی دنیا کے انسانی حقوق کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

مضمون کے بالکل ابتدائی حصہ میں انسانی حقوق کی تاریخ مجمل طور پر تحریر کر دی گئی ہے جس سے قارئینِ کرام کو بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ انسانی حقوق بتدریج Develop ہوئے ہیں اور اس میں عوام اور بادشاہوں یا مقتدر اداروں کی مسلسل کشمکش رہی ہے۔ جہاں حکومت کمزور ہوتی گئی اور عوام زور پکڑتے گئے وہاں ان حقوق پر اضافہ ہوتا چلا گیا اور عوام نے کچھ حقوق حاصل کر لئے۔ لیکن قرآنِ کریم کا تصور اس بارے میں بہت بلند وارفع ہے۔ قرآنِ کریم تو حکومت کے قیام کا جواز ہی یہ دیتا ہے کہ وہ حکومت اس لئے قائم ہوتی ہے کہ اس میں انسانی حقوق جاری کئے جائیں۔ ارشاد حضرت باری عز اسمہ ہوتا ہے' الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر

ولـلـه عاقبة الامور (22:41) وہ یہ کہ اگر ہم ان کو اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں' معروف کا حکم دیں' منکر سے منع کریں اور ہر کام کا آخر اللہ کے اختیار میں ہے۔ معروف اور منکر قرآنِ کریم کی جامع اصطلاحات ہیں۔ معروف کے معنے ہی اسلامی حکومت کے احکامات اور انسانی حقوق ہیں۔ اسی طرح مناھی وہ امور ہیں جن سے اسلامی حکومت وقتاً فوقتاً منع کرتی رہتی ہے۔ یہ معروف و منکر حالات' خطے ازمنہ کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور اسلامی حکومت ان کا اجراء کرتی رہتی ہے اور اسی بات کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ تمام حقوقِ انسانی جاری ہو رہے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے جو حکومت انسانی حقوق جاری نہیں کرتی اسے حکومت کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔

حقوقِ انسانی کے سلسلہ میں عقلِ انسانی نے جہاں تک ترقی کی وہ قابلِ ستائش ہے۔ لیکن ان حقوق سے انسانیت کو مکمل فلاح و اطمینان حاصل نہیں ہو سکا۔ قرآنِ کریم موجودہ دور تک حاصل کردہ حقوق میں سے اکثر کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ اس کا امر ان کے اجراء پر ہے لیکن وہ حقوق جن کی وہ نشاندہی کرتا ہے عقلِ انسانی ان تک ابھی نہیں پہنچی اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ عقلِ انسانی کی گرفت سے باہر ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مختلف اقوام کا تصادم ان کو جاری نہیں کرنے دیتا۔ قرآنِ کریم کے منفرد حقوقِ انسانی درج ذیل ہیں۔

(1) بدلہ صرف محنت کا ہے لیس للانسان الا ماسعیٰ۔

(2) ساری انسانیت ایک ہے۔ ممالک' اوطان کی تقسیم انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔

(3) احسان۔

(4) انفاق فی سبیل اللہ۔

(5) ملکیت زمین بالکل حرام ہے۔ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہر شخص اس سے برابر کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(6) حق کو چھپانا اور اس میں التباس کرنا سخت جرم ہے۔

(7) وسائل رزق سب انسانوں کے لئے کھلے ہیں اور سب کا ان پر حق ہے۔

(8) ایفائے عہد۔

(9) مدارج بہ اعتبارِ عمل۔

(10) نیکی میں تعاون۔

(11) دشمن سے نیک سلوک کرنا۔

(12) نسل پرستی، وطن پرستی، انسانیت کو تقسیم کرتی ہے۔

اور اسی طرح متعدد حقوق جو منفرد ہیں اور جن کا شمار کرنا بیک وقت مشکل ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تحریر کردہ حقوقِ انسانیت وہ ہیں جن کے متعلق رسالہ طلوع اسلام اور ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب میں اس قدر مواد فراہم کیا گیا ہے کہ اسے دوبارہ تحریر کرنا، قارئینِ کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ وہ ان حقوقِ انسانی کے متعلق کسی بھی وقت ادارہ طلوع اسلام کے فراہم کردہ لٹریچر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ وہ حقوق ہیں جو قرآنِ کریم کے منفرد عطا کردہ ہیں۔ ابھی انسانیت اس معیار پر نہیں آئی کہ ان کو اب تک کے تسلیم کردہ حقوقِ انسانیت کی فہرست میں شامل کرے۔ لیکن یہ قرآنِ کریم کے داعین کا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا کو قرآنِ کریم کے عطا کردہ ان حقوق سے متعارف کرائیں۔ جس دن انسانیت نے یہ حقوق بہ رضا و رغبت تسلیم کر لئے، اس دن بنی نوع انسان کی بیشتر مشکلات خود بخود دور ہو جائیں گی۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اقدار (Values) کو نہایت خلوص اور حکمت کے ساتھ دنیا میں متعارف کرایا جائے۔ آج ساری دنیا کی حالت یہ ہے کہ ہر جگہ ایک اضطراب ہے جس کی وجہ سے کسی خطۂ زمین میں سکون و اطمینان نہیں ہے۔ جو ممالک نہایت مہذب و متمدن شمار ہوتے ہیں، ان کی تہذیب و تمدن بھی اندر سے بالکل کھوکھلی ہے اور ہر آدمی دوسرے آدمی سے خوفزدہ بھی ہے اور ہر شخص دوسرے کو Exploit بھی کر رہا ہے۔ ان ہی معاشروں میں انسانیت کا درد رکھنے والے مسلمان ان حقوق کی اشاعت کریں تو ملاحظہ کریں کہ کس طرح ان کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

اب اصل موضوع قرآنی انسانی حقوق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان حقوق سے دلچسپی صرف ان حضرات کو ہوسکتی ہے جو انسانی ذات، مکافاتِ عمل، آخرت اور آخرت میں زندگی اور ذات کے ارتقاء پر یقین رکھتے ہوں، کیونکہ اصل میں انسانی حقوق وہی ہیں جو نسانی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

حقوقِ انسانی کا متعین کرنا عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ حقوق وحی کے ذریعے عطا ہوئے ہیں۔ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات، ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ یہ مستقل اقدار کہلاتی ہیں اور ان ہی کا نام انسانی حقوق ہے۔ ان مستقل اقدار یا انسانی حقوق پر عمل کرنے سے انسانی ذات کی تربیت و پرورش ہوتی ہے۔ اگر ان انسانی حقوق کو کسی بھی معاشرے میں جاری کر دیا جائے تو یہ وہ معاشرہ ہے جس کو قرآنِ کریم نے جنت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حضورﷺ کے مخالفین آپ سے کہتے تھے کہ اگر آپ واقعاً اللہ کے رسول ہیں تو تکون لک جنۃ من نخیل و عنب فتفجر الانھر خللھا تفجیرا (17:91)، تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک ایسا باغ (جنت) ہونا چاہئے جس میں پانی کی ندیاں بہہ رہی ہوں۔ اس کے جواب میں فوری طور پر قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا کہ یہ ایک جنت (باغ) کہتے ہیں خدا تمہیں جنتیں (باغات) عطا کرے گا اور ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ جعل لک خیرا من ذلک تجری من تحتھا الانھر ویجعل لک قصورا (25:10)، جنت کے علاوہ تمہارے لئے محلات بھی ہوں گے۔ یہ وہ جنت ہے جو مستقل اقدار یا حقوق انسانی پر عمل کرنے کے نتیجے میں اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے، اور جو حضورﷺ اور آپ کے رفقاء کو اس دنیا میں حاصل ہوئی۔

انسانی حقوق میں سرفہرست جو حق آتا ہے اور جسے آج سے چودہ سو سال پیشتر قرآنِ کریم نے عطا فرمایا وہ ایک ایسا انقلابی نعرہ ہے کہ جس کی جس قدر تعریف و تحسین کی جائے وہ کم ہے اور انسانیت اپنے بلوغ کے باوجود آج تک اس نعرہ تک نہیں پہنچ سکی۔ جو سب سے بنیادی اور

اول حق پوری انسانیت کا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پر انسان کی حکومت حرام ہے اور باعثِ تذلیلِ انسانیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حقِ حکومت صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے مختص ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے ان الحکم الا للہ (12:40) حقِ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ لا یشرك فی حکمه احداً (18:26) اللہ تعالیٰ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اگر کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کو حقِ حکومت دے دیا جائے خواہ اس کو کسی نام سے بھی موسوم کریں تو یہ کھلا ہوا شرک ہوگا اور کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ قرآنِ کریم نے الہ کا لفظ حاکم صاحب اقتدار کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ لئن اتخذت الهاً غیری لا جعلنک من المسجونین (26:29) اگر تو نے میرے سوا کسی کو بھی حاکم تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دوں گا۔ یہاں الہ کے معنے حاکم کے ہیں۔ وھو الذی فی السماء اله و فی الارض اله (43:84) وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی حاکم ہے اور پستیوں میں بھی۔ ہم مسلمان ہر روز پانچ وقت اذان میں یہی نعرہ بلند کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی حاکم نہیں ہے۔ اسلامی مملکت میں تمام کاروبار خدا کی کتاب کی حدود۔ کے اندر رہتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ چونکہ انسانی ذات کی بنیادی صفات وہی ہیں جو صفات خداوندی ہیں اس فرق کے ساتھ کہ انسانی ذات کی یہ صفات محدود شکل میں ہوتی ہیں نیز قابل نشوونما۔ ان کی نشوونما اس طرح ہوتی ہے کہ انسان صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار قرار دے۔ یہ انسان اور خدا کا بنیادی تعلق ہے جس چیز کو اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کہا جاتا ہے وہ ان ہدایات کا اتباع ہوتا ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت چونکہ مستقل اقدار نافذ کرتی ہے وہی انسانی حقوق ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر متفرع ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلامی حکومت کی اطاعت سے انسانی ذات میں ازخود صفات خداوندی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہونے کے ساتھ ساتھ اس ذات کے تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی ہے۔

جس طرح پانی پینے سے کسی غیر کی اطاعت مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کا مقصد پیاس بجھا کر اپنی ہی تسکین کرنا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں Rights اور Duties' حقوق و فرائض ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو ایک شخص کا فرض ہوتا ہے وہ دوسرے کا حق بنتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآنِ کریم کی رو سے ہر ماں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو دو سال تک دودھ پلائے۔ مولین کاملین (2:233)' اس لئے ہر بچہ کا حق ہے کہ وہ اپنی ماں سے دو سال تک دودھ پیئے۔ اسی طرح قرآنِ کریم میں آتا ہے۔ یاایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا (24:27)' اے ایمان والو بغیر اجازت حاصل کئے دوسرے کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو چنانچہ یہ پڑوس پر فرض ہے کہ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہوں۔ اسی طرح ہر شخص کا حق ہے کہ کوئی شخص اس کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہو۔ اس طرح حقوق وفرائض ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو ایک شخص پر فرض ہوگا وہی دوسرے کا حق ہوگا۔ اس تمیز کے بعد عرض ہے کہ قرآنِ کریم نے عہد و پیان کی پابندی کرنا ضروری قرار دیا ہے' یاایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود (5:1)' تم اپنے عہد و پیمان پورے کیا کرو تم سے عہد و پیمان کے لئے پوچھا جائے گا۔ عہد کا پورا کرنا فرض ہے تو اسی طرح دوسروں کا حق ہے کہ کوئی آدمی ان سے بدعہدی نہ کرے' بدعہدی کرنے سے انسانی ذات پر برا اثر مرتب ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے جسم کو طبعی قوانین (Govern) کرتے ہیں لیکن ذات' نفس یا زندگی کو وحی کی مستقل اقدار (Govern) کرتی ہیں اور جب ذاتی مفاد یا مستقل قدر میں Tie (مقابلہ) پڑتی ہے تو اس وقت ذات کی ترقی و اضمحلال کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اپنا ذاتی مفاد ترک کر دیا اور مستقل قدر پر عمل کیا تو آپ کی نفس میں ترقی ونشوونما ہوگی۔ لیکن اگر آپ نے اس کے برعکس اپنے مفاد کو ترجیح دی تو آپ کے نفس کو اضمحلال ہوگا۔ فرض کیجئے آپ کو اپنے لئے مکان خرید کرنا ہے' لیکن آپ کے پاس اتنی رقم نہیں ہے مگر آپ حرام کی کمائی حاصل کر کے مکان خرید سکتے ہیں۔ یہاں آپ کے ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں Tie آ پڑتی ہے۔ اگر آپ

نے مستقل قدر کو اختیار کیا اور حرام کی کمائی سے اجتناب کیا اور آپ مکان نہیں خرید سکے' تو اس سے آپ کی نفس میں پختگی پیدا ہوگی اگر آپ نے حرام کی کمائی قبول کر لی اور مستقل قدر کی پر ادہ کئے بغیر مکان خرید لیا تو آپ کے نفس' ذات میں اضمحلال واقع ہوگا۔

عہد و پیمان کا پورا کرنا مستقل قدر ہے۔ اس سے ذات میں بردمندی ہوتی ہے اور یہ ہر انسان کا حق ہے کہ دوسرا آدمی اس سے عہد پورا کرے انفرادی بھی اور قومی سطح پر بھی۔ آج ساری دنیا میں خصوصاً سیاسی معاہدات میں جو عہد شکنی ہوتی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ معاہدہ تحریر کرنے سے پیشتر ہی Loopholes' چور دروازے رکھوائے جاتے ہیں جن سے عہد شکنی ہو سکے۔ سیاسی زبان میں جس زبان کو Diplomatic Languge کہتے ہیں وہ یہی انگریزی زبان ہوتی ہے جسے ہم رات دن استعمال کرتے ہیں Diplomatic Languge کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن سے ہر دوسرے فقرے میں دو دو تین تین مفاہیم نکالے جا سکیں اور پہلے سے ہی ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ اس معاہدے سے انکار کیا جا سکے اور جو شخص جس قدر اس زبان کا ماہر ہوگا اس کی اسی قدر عزت ہوگی اور ہر اہم دستاویز اس سے ہی تحریر کرائی جاتی ہے۔ اس زبان کی بہت اہمیت ہے درصرف اس وجہ سے کہ بدعہدی ہو سکے۔

موجودہ دور میں بدعہدی اور سیرت کی خامی کو واضح کرنے کے لئے ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ 1962ء میں جب چین اور ہندوستان کے مابین لڑائی ہو رہی تھی تو پنڈت نہرو نے پیشکش کی کہ جنگ کے بجائے کسی معروف بین الاقوامی شخصیت کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ دونوں ممالک کے مابین فیصلہ کرا دے اس پر مسٹر چو این لائی نے جواب میں کہا تھا کہ آج ساری دنیا میں ایک شخص ایسا نہیں جو قابل بھروسہ ہو اور دیانتداری سے بات کرے۔ سیاسی شخصیات کے لئے مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ واقعاً ساری دنیا میں سے کسی نے یہ للکار کر نہیں کہا کہ میں دیانتدار اور دوٹوک بات کرنے والا ہوں اور یہ میری سابقہ زندگی میرے دعویٰ کی شہادت ہے۔ یہ

مقام صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ہی مخصوص ہے کہ وہ چاروں طرف سے مخالفین و معاندین کے نرغہ میں آنے کے باوجود علی اعلان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میری سابقہ زندگی میری پختہ سیرت کی دلیل ہے۔فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعلقون (10:16)' اور مخالفین کو اس بات کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ حضور ﷺ کے اس دعویٰ کی تردید کر دیں۔

انسانیت کے لئے نفع بخش ہونا

مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام انسانیت کے لئے نفع بخش ہوں اور خود مسلمانوں کا ایک دوسرے پر' اور غیر مسلموں کا تمام مسلمانوں پر یہ حق کہ انہیں مسلمانوں سے فائدہ ہی ملتا رہے۔نفع بخش کاموں کو' گروہوں' اوطان' اقوام کے دائروں میں محدود کر دینا قرآنِ کریم کی عطا کردہ مستقل اقدارر کے خلاف ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (13:17)' زمیں میں دوام صرف اس کو حاصل ہوگا جو تمام انسانیت کے لئے نفع بخش ہو۔حج بیت اللہ شریف کا Institution اسلام میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس کا واحد مقصد قرآنِ کریم نے یہی بیان فرمایا ہے کہ حج اس لئے ہے کہ اس میں ساری انسانیت کو نفع پہنچانے کے طریقے اور اسباب سوچے جائیں اور ساری انسانیت خود وہاں آ کر اس بات کا مشاہدہ کرے کہ مسلمان ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کیا طریقے اختیار کر رہے ہیں' لیشھدوا منافع لھم (22:28)' قرآنِ کریم کی رو سے یہ ان کا حق Right ہے کہ وہ مسلمانوں سے منافع حاصل کریں۔

قرآنِ کریم کی رو سے عصمت کی حفاظت بھی ایک مستقل قدر ہے۔قرآنِ کریم نے جنسی تعلق کا صرف ایک ہی طریقہ بتایا ہے اور وہ نکاح ہے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا' ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحاً حتی یغنیھم اللہ من فضلہ (24:33)' بس چاہئے کہ عفت کی زندگی بسر کرو یہاں تک کے اللہ غنی کر دے اپنے فضل سے اور

نکاح ہو جائے۔ اس سے واضح ہے کہ جس شخص کے لئے نکاح کی صورت نہ ہو سکتی ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ عصمت کے بارے میں ایک نکتہ اور بھی قابل تحریر یہ ہے کہ Sex کے لئے اضطراری حالت نہیں ہے۔ بھوک' پیاس میں اضطراری کیفیت ہو جاتی ہے اور اس میں حرام مال بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص سخت بھوکا ہے اور مرنے سے بچنے کے لئے حرام مال یا حرام چیز یا غیر مذبوحہ کھالے' تو اس کی کوئی گرفت نہیں ہے۔ ہاں یہ گنجائش Sex میں نہیں ہے کیونکہ قرآنِ کریم اس میں اضطراری حالت کو تسلیم نہیں کرتا۔ حفاظتِ عصمت ہر حال میں لازم ہے۔

قرآنِ کریم کی ایک قدر یہ بھی ہے کہ نوعِ انسانی امت واحدہ ہے اور تمام انسان نفسِ واحدہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اصل کے اعتبار سے تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ اسی لئے تمام نوعِ انساں کا ایک عالمگیر برادری اور ایک قوم بن کر زندگی گذارنا مقصودِ حیات ہے' کان الناس امة واحدةً۔ تمام انسانیت ایک امت واحدہ ہے۔ اقوام اوطان کی تقسیم نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جس قدر نقصان پہنچایا ہے' اس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ کریم کی رو سے ہر فرد کا حق ہے کہ وہ کسی بھی ملک میں چلا جائے اور اپنے آپ کو کسی بھی قوم میں شامل کر لے' یہ ہر فرد انسانیت کا حق ہے۔

اصل مقصود اس مضمون کا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے انسانی حقوق وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق انسان کی ذات سے ہوتا ہے اور انسانی ذات سے متعلق قوانین صرف وحی کے ذریعے مل سکتے تھے۔ عقل انسانی کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ وہ انسانی ذات سے متعلق حقوق بنائیں۔ فلہذا جو اقوام وحی یا ذات کی قائل ہی نہیں ہیں وہ انسانی حقوق کا تعین نہیں کر سکتی وہ صرف Legal Rights بنا سکتی ہیں اور بس۔

فستذکرون ما اقول لکم (40:44)

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشن خیالی کے اندھیرے

کاروانِ انسانیت اول دن سے آج تک برابر آہستہ آہستہ ترقی کرتا چلا جا رہا ہے آپ اس کا اندازہ اس طرح لگایئے کہ حضرت نوحؑ کے دور میں کشتی بنانی نہیں آتی تھی۔ کشتی بنانے میں وحی الٰہی نے ان کی مدد کی **واصنع الفلک باعیننا و وحینا** (11/37)۔ اس کے برخلاف آج ہر طرح کے جہاز بآسانی بنائے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک بات چونکہ قرآن میں مذکور ہوگئی ہے اس لئے اس کا علم ہمیں ہوگیا ہے ورنہ معلوم نہیں کون کون سی چیزیں ایسی ہوں گی جن کی ساخت و بناوٹ میں وحی نے مدد کی ہوگی۔ کئی ہزار سال کی محنت میں عقل انسانی نے ٹیکنالوجی میں جو ترقی کی ہے وہ ہر شخص کو محو حیرت کررہی ہے۔ اسی طرح کائنات کی تسخیر میں انسان نے بڑی ترقی کی ہے۔ ابتداء میں انسان ہر چیز کو دیوی دیوتاؤں کی کرشمہ سازی خیال کرتا تھا۔ بارش، دھوپ، فصلوں کا پکنا، بیماری، صحت، گرج، چمک، سب میں توہم پرستی شامل تھی۔ آج انسان نے ان سب پر قابو پالیا ہے۔ اسی طرح معاشرہ کی تعمیر میں بھی انسان نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ پہلے معاشروں میں ظلم و جور، سلب و نہب، قتل و غارت اور استحصال پر مبنی قوانین جاری ہوتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ معاشرے ترقی کرتے چلے گئے اور آج زیادہ تر ممالک میں تہذیب یافتہ معاشرے قائم ہیں۔ انسان نے یہ ترقی رفتہ رفتہ کی ہے۔ بالکل ابتدائی معاشروں اور ان کے علوم کا تو پتہ نہیں البتہ یونانی فلاسفرز اور رومن ایمپائر کے دور سے تاریخی حالات تحریری طور پر موجود ہیں۔ یونانیوں نے فلسفہ میں اور رومنز (Romans) نے قانون میں اس درجہ کاوشیں کی ہیں کہ آج تک ذہن انسانی ان سے متاثر چلا آرہا ہے۔ موجودہ دور میں مغربی ممالک نے تقریباً پندرھویں صدی عیسوی

سے ترقی کرنی شروع کی ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یورپ کے تمام ممالک بیک وقت اس ترقی میں شامل ہوئے اور پورا یورپ بیک وقت بیدار ہوا ہے۔ ان ممالک کی Contribution میں کمی بیشی تو ضرور ہوئی ہے لیکن اس میں شامل سب تھے۔ یورپ میں روشن فکری اور روشن خیالی Renaissance (رینے سانس) یعنی نشاۃ ثانیہ کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نشاۃ ثانیہ اٹلی سے شروع ہوئی اور پندرھویں اور سولھویں صدی تک جاری رہی۔ اس میں بھی یورپ کے تمام ممالک نے حصہ لیا اور بے شمار مفکرین نے مختلف علوم وفنون میں نایاب کتابیں تحریر کیں۔ اس دور کے انگریزی مفکرین میں رسکن، پیٹر اور سیمنڈز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ وہ کثیر تعداد میں تھے، لیکن جس شخص کے فکر نے پورے یورپ کو متاثر کیا وہ Desiderus Erasmus (1466-1536) تھا۔ وہ پیدا تو Rottedam میں ہوا، لیکن سارے یورپ میں گھوما اور انگلینڈ بھی متعدد بار گیا۔ یہاں تحریک نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کے احصاء مطلوب نہیں ہے۔ یہ چند باتیں صرف حوالہ کے طور پر تحریر کی گئی ہیں۔ مقصد تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں تقریباً 500 سال سے روشن خیالی اور فکری آزادی کا دور دورہ ہے۔ روشن خیالی اور آزادفکری سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہاں فکر میں کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ اور عقل انسانی جس نتیجہ پر بھی پہنچے وہ اس کا اظہار کرسکتی ہے۔ عقل انسانی جب آزاد ہوتی ہے تو وہ کسی بھی نظریہ کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ جو بھی قانون بنانا چاہے بنا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ Free sex اور اس سے بھی بڑھ کر Homosexuality تک جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ ان معاشروں میں مستقل اقدار Permanent Values کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اقدار (Values) تو وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ جب کوئی معاشرہ وحی کو مانتا ہی نہیں، تو وہ مادر پدر آزاد ہے، اس کو کسی قدر کی پابندی ہی نہیں ہوتی۔ البتہ معاشرہ کے انتظام کے لئے وہ جو بھی قانون بنائیں وہ ان کی پابندی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تاہم عقل انسانی نے آہستہ آہستہ تجربہ سے فائدہ اٹھا کر فلاحی معاشرے بنا ہی لئے ہیں۔ اگرچہ ان کو اس کے لئے بہت Cost دینی

پڑی ہے۔ لیکن اس کے باد جود بھی دنیا میں امن وسکون قائم نہیں ہے۔ ہر شخص دوسرے شخص سے خائف بھی ہے اور انسان ہی انسان کا استحصال بھی کر رہا ہے۔ اسی طرح اقوام کی حالت ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کو Exploit کر رہی ہے۔ یورپ کی دو عظیم جنگوں نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ ان کے سامنے مذہب غلط شکل میں تھا' کاش اگر ان کے سامنے وحی اپنی منزہ شکل میں ہوتی تو آج دنیا کی حالت ہی دوسری ہوتی۔ آج دنیا میں جو اندھیرے ہیں وہ نہ ہوتے۔ اس قدر روشن فکری کے بعد بھی جو اندھیرے ہیں وہ صرف وحی سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔ اگر وہ معاشرے وحی کے نور سے مستفید ہوتے تو وہ اندھیرے ان میں نہ ہوتے اور آج دنیا جو جانوروں کا بھٹ بنی ہوئی ہے' یہ حالت نہ ہوتی۔ اس وقت سب سے بڑا اندھیرا' یا انسانیت کو درپیش مسئلہ' جس کا حل تنہا عقل انسانی پیش نہیں کر سکتی' یہ ہے کہ دنیا میں امن کس طرح سے قائم کیا جائے اور افراد اقوام کو سلب ونہب اور جرائم کے ارتکاب سے کس طرح روکا جائے۔

سلسلۂ ارتقاء میں حیوانات کی اگلی منزل انسانیت کی ہے۔ انسان کی طبعی زندگی کے وہی تقاضے ہیں جو حیوانات کی طبعی زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں' کھانا' پینا' بچے پیدا کرنا۔ بیمار وصحت مند ہونا' تحفظ خویش' خطرات سے مقابلہ کرنے کے لئے تدابیر سوچنا' اپنی نسل کو برقرار رکھنا' جنسی خواہش کی تکمیل کرنا۔ یہ تقاضے حیوانات اور انسان میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی جبلت ایسی بنائی ہے کہ اس پر فطرت کا کنٹرول از خود جاری رہتا ہے۔ گائے کتنی ہی بھوکی کیوں نہ ہو' وہ گوشت کبھی نہیں کھائے گی۔ Mating Season کے علاوہ جانوروں کی جنسی خواہش کبھی بیدار نہیں ہوتی۔ جانوروں کی جبلت کے اس کنٹرول کا یہ نتیجہ ہے کہ حیوانات کبھی ''جرائم'' کے مرتکب نہیں ہوتے یعنی وہ اپنی حد سے آگے نہیں جاسکتے۔ لیکن انسان پر فطری۔ جبلی طور پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کی صورتِ حال یہ ہے کہ انسان کے فطری تقاضے تو وہی ہیں جو حیوانات کے ہیں لیکن ان پر فطرت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ اسے ان پر خود پابندی عائد کرنی ہوتی ہے۔ اگر وہ ان پر پابندی عائد کرے تو جرائم کا

ارتکاب نہیں کرے گا لیکن اگر وہ پابندی عائد نہ کرے تو ظاہر ہے کہ جرائم کا ارتکاب ہوگا۔ بلکہ ان کے جرائم کی شدت بھی زیادہ ہوگی۔ کیونکہ جانور کے پاس تو صرف اپنی ہی محدود قوت ہوتی ہے لیکن انسان کے پاس تو ایٹم بم کی قوت بھی مہیا ہوتی ہے۔ اگر انسان کے جذباتی تقاضوں پر پابندی نہ ہو تو اس کے فساد و ہلاکت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ یہی وہ عالم گیر جرائم ہیں جو آج افراد و اقوام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب بنیادی و اساسی سوال یہ ہے کہ نوع انسانی پر پابندیاں کس طرح عائد کی جائیں۔

ہمارے اس دور میں زندگی کا تصور سیکولر ہے جس سے یہ مراد ہے کہ زندگی صرف حیوانی سطح تک ہی ہے اور صرف طبعی زندگی ہے۔ اب جبکہ زندگی صرف حیوانی سطح تک ہو اور فطرت کی قوتیں مسخر کر لینے سے قوتیں بے اندازہ حاصل ہو گئی ہوں اور فطری و جبلی طور پر کوئی پابندی نہ ہو تو پھر دنیا کی تباہی و بربادی کی وہی صورت ہوگی جو آج دنیا میں موجود ہے۔ کسی جگہ بھی انسانیت کو سکون و آرام نہیں ہے۔ امن عالم قائم کرنے والے ادارے اور دنیا کی با اثر ہستیاں انسان پر خارج سے پابندیاں عائد کرنے کی اسکیمیں سوچتی رہتی ہیں۔ لیگ آف نیشنز، یو۔این۔او کے ادارے اور اسی قسم کے بے شمار ادارے آئے دن بنتے اور ختم ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ قوانین بناتے ہیں اور پھر خود ہی ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ خارج سے پابندیاں عائد کرنے کا طریق کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کامیاب علاج وہ ہے کہ جس میں انسان خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کرے۔

جب تک انسان کی زندگی حیوانی و طبعی زندگی تک رہے گی، انسان اپنے اوپر از خود پابندیاں بھی عائد نہیں کرے گا۔ ہاں اگر انسان کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ زندگی صرف طبعی زندگی ہی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی بھی ہے جو حیوانی زندگی سے ارفع و اعلیٰ ہے اور اس زندگی کا سنوارنا اس کا مقصدِ حیات ہے تو پھر انسان پر از خود پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔

انسان کو اگر اس بات کا پورا پورا یقین ہو کہ اگرچہ اس کی طبعی زندگی کا قیام بھی ضروری

ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کی اہمیت اس کی طبعی زندگی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے جب کبھی اس کی طبعی زندگی اور انسانی زندگی میں Tie آ پڑے گی تو وہ انسانی زندگی کے تقاضے پورے کرے گا۔

انسانی زندگی کی پرورش اور اس کا استحکام مستقل اقدار کے ذریعے ہوتا ہے اور مستقل اقدار کے تصور سے ہی اخلاقیات کا تصور پیدا ہوتا ہے اور اسی سے کیریکٹر بنتا ہے۔ اگر مستقل اقدار کا تصور نہ ہو تو نہ تو اخلاقیات کا تصور بن سکتا ہے اور نہ ہی کیریکٹر پیدا ہوتا ہے۔ مستقل اقدار کو پیش نظر رکھنا اور ان پر عمل کرنے سے ہی اچھا کیریکٹر اور پختہ سیرت بنتی ہے۔ زندگی، نفس یا خودی کی پرورش یا بالیدگی کی وجہ سے انسان نہ تو کسی جرم کا ارتکاب کرے گا اور نہ ہی دوسروں پر غلبہ و تسلط حاصل کرے گا۔ یہ پابندیاں انسان خود اپنے اوپر عائد کرے گا اور ان پابندیوں پر عمل کرنے سے دنیا میں امن قائم ہو گا۔ پھر نہ کسی ادارے کی ضرورت ہو گی اور نہ کسی یو۔این۔او کی۔ شرط صرف انسانی زندگی پر یقین اور اس کی پرورش کو مقصد حیات قرار دینا ہے۔

بدچلنی و بدکرداری کی روک تھام کے لئے معاشروں میں قوانین وضع کئے جاتے ہیں لیکن جن لوگوں تک قانون کی گرفت نہیں ہوتی یا جن معاشروں میں قوانین کا درست اطلاق نہیں ہوتا اور وہاں بدچلنی کی روش عام ہو جائے تو آپ قوانین کے ذریعے بدچلنی کو نہیں روک سکتے۔ ہاں اگر خود ہی کسی انسان کو اس بات کا احساس ہے کہ بدچلنی کی وجہ سے اس کی خودی یا اس کی زندگی کو اضمحلال و ضعف حاصل ہو گا، وہ کبھی بدچلنی نہیں کرے گا۔ حضرت یوسفؑ کو ہر چند کہ عزیز مصر کی بیوی نے بدچلنی کی طرف دعوت دی بلکہ زبردستی پر بھی اتر آئی لیکن حضرت یوسفؑ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے اور یہی ارشاد فرمایا کہ: **السجن احب الی مما ید عوننی الیه** (12/33)۔ جس بات کی طرف یہ دعوت دیتی ہیں اس کے مقابلے میں مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے۔

عجب درماندہ ام درکار اینان
مرا زندان بہ از دیدارِ اینان

اوراس کی وجہ وہی تھی جوکہ قرآن کریم نے خود یہاں بیان فرمادی کہ **ولقد همت به وهم بها لولا ان را برهان ربه** (12/27)۔اگران کے سامنے اپنے رب کی برہان نہ ہوتی تو وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتے۔ یہاں برہان کا لفظ وحی کے لئے استعمال ہوا ہے کہ اگر وحیِ الٰہی کی تعلیم حضرت یوسفؑ کے سامنے نہ ہوتی تو وہ بھی برائی کا ارادہ کر لیتے۔ حضرت یوسفؑ نے برائی کا ارادہ جونہیں کیا تو کوئی خارج کی پابندیاں ان پرنہیں تھیں بلکہ ان کی اپنی داخلی پابندی تھی جس نے انہیں برائی سے روکے رکھا۔ اسی طرح جب ساحرین دربار فرعون حضرت موسیٰ کی تعلیم پر ایمان لے آئے اور حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ کا نبی تسلیم کر لیا تو فرعون نے انہیں بڑی تہدید وتوبیخ کی کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا۔**فلا قطعن ایدیکم و ارجلکم من خلاف** (20/71)۔اور میں تمہیں صلیب پر لٹکا دوں گا (20/71) تو انہوں نے بھی موت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور علی الاعلان کہا کہ **والله خير و ابقىٰ** (20/73) تمہاری فرماں پذیری کے مقابلہ میں اطاعتِ خداوندی بہت بہتر ہے۔ فرعون کی موت کی دھمکیوں سے بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوئے۔ یہ سب کچھ کیا تھا۔ یہ ان کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں تھیں بلکہ اپنی رضا ورغبت سے اختیار کی ہوئی پابندیاں تھیں۔

اسی طرح ایک موقعہ پر جب فرعون اس درجہ غضبناک ہوا کہ اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور میں دیکھوں کہ وہ اپنے پروردگار کو اپنی مدد کے لئے بلائے تو اس کے اس غصہ وغضب کے باوجود مومنِ آل فرعون نے اسے ٹوکا اور پورے بھرے دربار میں' اس کے علی الرغم' ایک پرزور تقریر کی جوکہ سورۃ مومن کی آیت 27 سے 44 تک پر مشتمل ہے۔ ان خطرناک حالات میں جو اس قدر موثر تقریر مومن آل فرعون نے کی' یہ اس کی داخلی تحریک L rge تھی۔ اس میں خارج سے کوئی دباؤ اس پرنہیں تھا۔

قرآن کریم کی تعلیم کا ملخص اور اہم ترین بات یہ ہے کہ طبعی زندگی اور انسانی زندگی کا واضح تصور ہمیشہ پیش نگاہ رکھنا چاہئے۔ زندگی کا انسانی تصور اور اس کے استحکام کو مقصد حیات سمجھنا

ہی وہ اساس محکم ہے جو افراد واقوام کو جرائم کے ارتکاب اور دوسری اقوام کے استحصال وسلب و نہب سے روکتی ہے۔ اور امن عالم کے قیام کا باعث بنتی ہے۔ انسانی زندگی کے تصور کا انکار ہی وہ اندھیرا ہے جس کی وجہ سے دنیا ایک باطنی اضطراب میں مبتلا ہے۔

یورپ میں نشاۃِ ثانیہ Renaissance کے بعد علوم کی خوب ترویج ہوئی۔ بائبل کی تعلیم اور ان کے مذہبی حلقہ یعنی Priests اور Friars کی سیرت اتنی بری اور داغدار تھی کہ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے متنفر ہو گیا مگر ان میں ایک کافی بڑا طبقہ طبعاً مذہبی واقع ہوا تھا۔ ایک طرف تو ان لوگوں کی طبیعت مذہب کی طرف راغب تھی اور وہ مذہب کو ترک نہیں کر سکتے تھے لیکن دوسری طرف بائبل کی تعلیم انہیں اپیل نہیں کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کو مانتے رہے اور خارجی کائنات میں بھی اس کا اقتدار تسلیم کرتے رہے۔ لیکن بائبل سے بھی انکار جاری رکھا۔ وہ وجود باری کے منکر نہیں تھے صرف بائبل کے منکر تھے۔ یہ طبقہ Theist یا Deist کہلاتا تھا۔ یہ وجود باری کے قائل لیکن وحی یا وحی کی تعلیم کو عملاً متشکل کرنے کے منکر تھے۔

نزول قرآن کے وقت بھی اس دور کے دانشوروں کی یہ ہی کیفیت تھی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور چاند اور سورج کو کام میں لگایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پھر وہ کہاں بھٹکے چلے جا رہے ہیں نیز 43/9, 39/38۔

ان کے اس اقرار کے بعد قرآن کریم نے ان کفار سے کہا تھا کہ جب تم اس بات کے قائل ہو کہ خارجی کائنات میں اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ ہے تو تم اپنی تمدنی ومعاشرتی زندگی میں اس کے قوانین کو کیوں رائج نہیں کرتے۔ حالانکہ جس قدر خارجی کائنات کے قوانین صحیح نتائج برآمد کر رہے ہیں اسی طرح تمہاری تمدنی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کے قوانین درست نتائج برآمد کریں گے۔ یہی سوال یورپ کے Deists یا Theists سے قرآن کرتا ہے کہ جب تم خدا کے منکر نہیں ہو سکتے اور اسی کا اقتدار خارجی کائنات میں بھی مانتے چلے آ رہے ہو تو اپنی اخلی دنیاوی

زندگی میں وحی کی تعلیم کو کیوں رائج نہیں کرتے۔لیکن ان کی دقت یہ تھی کہ ان کے یعنی یورپ کے دانشوروں کے سامنے قرآن نہیں تھا اور ہم نے ان تک قرآن پہنچایا نہیں تھا۔اس لئے عمداً یا مجبوراً وہ وحی الٰہی سے مستفید نہیں ہو سکے اور اپنا معاشرہ وحی کے مطابق متشکل نہیں کر سکے۔یہ موجودہ دور کی روشن خیالی کا دوسرا اندھیرا ہے جس کی زیادہ تر ذمہ داری ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ اس دور میں امریکہ میں اسلام پر کام کرنے کا بہت وسیع میدان ہے۔اس کا تذکرہ مضمون کے آخر میں پیش خدمت کیا جائے گا تاکہ جو حضرات اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں ان کے لئے اس میں ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں گی۔

اس دور کا ایک ایسا اندھیرا جس نے نہ صرف عالمگیر حقیقت اختیار کر رکھی ہے بلکہ جس نے انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ انسانیت کو وطن کی حدود میں تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔قرآن کریم نے فرمایا تھا کہ **وما کان الناس الا امةً واحدةً** (10/9)۔ساری نوع انسانی ایک امت واحدہ تھی۔ایک ہی جماعت ایک ہی قوم تھی۔آہستہ آہستہ باہمی اختلافات کر کے خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ گئے۔اور اس طرح نوع انسانی کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔چونکہ یہ تقسیم ذاتی یا قبائلی مفادات کے پیش نظر ہوتی تھی اس لئے اس تقسیم کو دور کر کے دوبارہ وحدت پیدا کرنا بھی فکر انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔اس کے لئے انبیاء کرام تشریف لائے **وانزل معهم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفو فیه** (2/213)۔انبیاء کرام کے ساتھ ان کی کتاب آئی تاکہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کر کے ان کے اختلافات دور کریں۔اس آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کا دور ہونا صرف وحی کی رو سے ہی ہو سکتا تھا۔یہ انبیاء کرامؑ کا کام تھا کہ وہ اختلافات کا فیصلہ کتاب کے ذریعے فرمائیں۔ورنہ انسانیت کے باہمی مفادات انسانیت میں وحدت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ وحی کا مقصد نوع انسانی کی عالمگیر تشکیل ہی تھا۔جب انسانیت بالغ ہوگئی اور ایک عالمگیر وحدت کا امکان نظر آنے لگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ضابطۂ حیات بھیجا گیا جس میں ہدایت سب

"**الناس**" کے لئے ہے۔ یہ ضابطۂ حیات اللہ تبارک وتعالیٰ کو بطور **رب الناس' ملک الناس' الہ الناس** کے متعارف کراتا ہے خود حضورﷺ کو بھی **کافۃ للناس** کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اس ضابطۂ حیات کو بھی **لبصائر للناس** (45/20) کہا گیا ہے۔ یہ ضابطہ کسی خاص قوم یا خطہ کے لئے نہیں ہے۔ کعبہ کو انسانیت کا مرکز قرار دیا یہ **قیاماً للناس'** وہ مقام ہے جہاں انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے۔ اگرچہ ہر فرد یا ہر قوم اپنے ہی نفع و نقصان کو پیش نظر رکھتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے مستقل اقدار کے پیمانوں کے مطابق فرمایا **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (13/17)۔ اسی مسلک' اسی نظریہ' اسی قوم کو بقا حاصل ہو سکتی ہے جو ساری دنیا کے لئے نفع بخش ہو۔ لیکن افسوس کہ آج کی تاریکی اور سخت اندھیرے نے اس نصب العین کو پس پشت ڈال دیا۔ انسانیت انسانیت کی دشمن ہو گئی۔ یورپ کی دو جنگیں اس اندھیرے کے باعث برپا ہوئیں اور آج بھی انسان اسی اندھیرے کے سبب دوسرے انسان کا دشمن ہے۔

قرآن کریم نے نور کا لفظ واحد استعمال کیا ہے۔ کیونکہ نور ایک ہی ہوتا ہے اور اندھیروں کے لئے جمع کا صیغہ ظلمات استعمال کیا ہے کیونکہ اندھیرے بہت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔ لیکن نور کی آمد سے سب اندھیرے دور ہو جاتے ہیں' اندھیروں میں سے ایک عالمگیر اندھیرا ملکیت زمین کا بھی ہے۔ اس کے بھی عالمگیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ابتداء سے ہی تباہی کا باعث رہا ہے۔ آپ خود غور فرمائیں کہ زمین کسی کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اس لئے کہ اس سے ہر شخص فائدہ اٹھائے **سواء للسائلین** (41/10) جس طرح دھوپ' ہوا' پانی' روشنی' اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ نعماء میں سے ہیں۔ اسی طرح زمین بھی ایک نعمت ہے اس کی ملکیت صرف اس وجہ سے کر لی ہے کہ آج سے کئی ہزار پیشتر جو شخص سب سے زیادہ طاقتور تھا' اس نے اس کے ایک وسیع وعریض حصہ پر قبضہ کر لیا اور یہ قبضہ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا گیا اور یہ طویل قبضہ ہی ملکیت کا جواز بن گیا۔ ورنہ حق

ملکیت تو کسی کا بھی نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے فرمایا **والارض وضعھا للانام** (55/10)۔ ساری زمین لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا **وجعلنا لکم فیھا معایش ومن لستم له برزقین** (15/20)۔ اور ہم ہی نے انہیں تمہارے واسطے زندگی کے ساز وسامان بنا دیئے اور ان جانوروں کے لئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔ ان آیات کریمات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وسائل پیداوار اللہ تعالیٰ کی بخشائش ہیں جن کا مقصود تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔ لیکن آج کل اس سے زیادہ کسی اور ذریعہ کو Exploit نہیں کیا جاتا۔ سارے سال غریب کسان محنت کرتا ہے۔ دھوپ اور بارش میں خود بھی محنت شاقہ کرتا ہے اور اس کے بیوی بچے بھی اس کی اس محنت میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا ماحصل وہ جاگیردار یا مالک زمین لے جاتا ہے۔ جس کا قطعاً کوئی حصہ اس محنت میں شامل نہیں ہوتا اور زمین کی ہی اس آمدنی سے وہ پورے ملک میں سیاست یا بدکرداری کے ذریعے فساد پھیلاتا پھرتا ہے۔

اندھیروں میں ایک اندھیرا سودی نظام یا Capitalistic System بھی ہے۔ اس کے لئے جس قدر کم کہا جائے' اس قدر اچھا ہے۔ قرآن کریم نے تو اس کو مذموم قرار دیا ہی تھا لیکن اب عام انسانی فکر بھی اس کی مذمت کرتا ہے۔ سارے اشتراکی ممالک اس کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے سبب اب بھی ساری دنیا میں اس ظلم کا اندھیرا ہے۔ سودی معاشرہ میں باہمی محبت' ہمدردی اور ایک دوسرے کی مصیبت کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے اور انسان مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآنی معاشرہ کے ابتدائی مراحل میں ہی غرباء کی ضرورتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں سود کے ذریعے مزید غریب بنانے کے نظام کو ختم کر کے' صدقات کا نظام جاری فرمایا تھا۔ جو معاشرہ بھی سودی نظام کی بنیاد پر استوار ہوگا' اس میں ہمیشہ عدم اطمینان کی حالت رہے گی۔

اس کے علاوہ بھی آج کل جو معاشرتی عیوب ہیں اور جن کو قرآن کریم نے بالکل حرام قرار دیا ہے جیسے شراب نوشی' جوا' سٹہ' بدچلنی وغیرہ یہ سب ان معاشروں کے اندھیرے ہیں۔ ان

میں سے ہر موضوع پر طلوع اسلام کے لٹریچر میں اس قدر تحریر کیا گیا ہے کہ یہاں ان کا اعادہ' قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔

روشن خیالی کے اندھیروں کا ذکر آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا۔ امریکہ کو آج تمام اقوام عالم کی امامت کا درجہ حاصل ہے اور اس کو یہ امامت صرف اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس نے ٹیکنالوجی پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ورنہ جس قوم میں Free sex اور ہم جنس پرستی Homosexuality جیسے شنیع وقبیح افعال کی اجازت ہو اس کی کیا تہذیب۔ وہاں Violence اور بدسیرتی کا رواج عام ہے۔ ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے Terror شروع کر کے' اپنے کو بدنام اور سب کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔ ورنہ ہماری اقدار اس درجہ اچھی ہیں کہ اگر ان کو علمی واستدلالی طریقہ پر پیش کیا جائے تو ہر سنجیدہ اور نیک دل آدمی ان کو قبول کرے گا۔ کوئی شخص کتنا ہی بدچلن ہو لیکن وہ عفت وعصمت Chastity کو پسند کرے گا۔ ہر شراب خور' شراب خوری کو برا سمجھتا ہے۔ اگر امریکہ کے عوام کو اسلام کی مضبوط مستقل اقدار سے روشناس کرایا جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس کو پسند کریں۔ اسلام کا تعارف بطور ایک movement کے کرانا زیادہ سودمند ہے۔

اس سلسلہ میں امریکہ کا جو تذکرہ شروع کیا گیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ بلکہ اس مضمون کی تحریک بھی اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ ان موجودہ اندھیروں کے درمیان امریکہ میں ایک روشنی کی کرن نظر آتی ہے جس کا نوٹس لینا نہایت درجہ ضروری ہے۔ اس لئے اس روشنی کی کرن کا مختصر سا تعارف پیش خدمت عالی ہے جس کے لئے راقم سطور کی درخواست ہے کہ اس کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

امریکہ میں ایک شخص فرد محمد نام کا 1930ء میں کہیں سے آیا اور وہ 1934ء میں امریکہ سے واپس کہیں چلا گیا۔ اس شخص کے متعلق عام طور پر معلومات بہت کم ہیں۔[۲] ہم اس شخص نے امریکہ میں 1930ء میں اسلام کی بنیاد رکھ دی اور کچھ کالے حبشی Negros جنہیں اب

African American کہتے ہیں' کومسلمان کرلیا۔ یہ مسلمان ہونے والے لوگ زیادہ تر جرائم پیشہ Criminals تھے کیونکہ فرد محمد نے جیل میں ہی جا کر تبلیغ کی تھی۔ ان مسلمان ہونے والوں میں ایک شخص Elijah Muhammad بھی تھا۔ یہ شخص بہت صلاحیتوں کا مالک اور بہت Potentialities والا تھا۔ اس نے امریکہ میں اسلام کی ترویج شروع کی چونکہ یہ شخص Born Administrator تھا اس لئے اس نے ایک جماعت Nation of Islam نام کی قائم کر دی۔ اس نے اس جماعت کے نام سے بہت بڑی جائیداد بھی خرید لی۔ یہ شخص 1975ء میں فوت ہوا۔ ایوب خاں کے دور میں پاکستان آیا اور ایوب خاں سے ملاقات بھی کی۔ Elijah کی زندگی میں ہی ایک اور شخص Malcom بھی مسلمان ہوا اور یہ El.jah سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا اور اس کو Overshadow کر گیا۔ نیشن آف اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ فرد محمد خدا تھا اور علائی جاہ اس کا رسول تھا۔ یہ لوگ بائبل اور قرآن کریم دونوں کو حجت مانتے ہیں۔ ان کی تعداد اس وقت گیارہ ملین (ایک کروڑ دس لاکھ) ہے جبکہ امریکہ کی کل آبادی 28 کروڑ ہے۔ میلکم نے نیشن آف اسلام کے عقائد ترک کر دیئے۔ اس نے حج بھی کیا اور عام مسلمان عقائد اختیار کر لئے۔ اس کا تنازعہ علائی جاہ سے ہو گیا۔ کیونکہ علائی جاہ کے تعلقات اپنی پرائیویٹ سیکریٹری سے تھے' اس لئے Malcom X نے اس کو بہت بدنام کیا۔ بالآخر Malcom کو کسی نے قتل کر دیا۔ نیشن آف اسلام والے کہتے ہیں کہ حکومت نے قتل کرایا ہے مگر حکومت کہتی ہے کہ علائی جاہ نے اس کو قتل کرایا ہے۔ علائی جاہ کی لائف پر کافی کتابیں لندن میں دستیاب ہیں اور Malcom X پر بھی بہت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میلکم X پر فلمیں بھی بنی ہیں جو پاکستان میں بھی دستیاب ہیں اور راقم سطور نے وہ دیکھی ہیں۔ نیشن آف اسلام کا ایک Final Weekly Call- کے نام سے امریکہ سے نکلتا ہے اور لندن میں Piccdilly میں اتوار کی شام کو اس پارٹی کے نوجوان بچے یہ رسالہ فروخت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس رسالہ کی قیمت ایک پاؤنڈ ہے اور اس سے اس جماعت کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا ویب سائٹ ایڈریس

www.finalcall.com ہے۔ جو صاحبان اس میں دلچسپی رکھتے ہوں کمپیوٹر سے یہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔لندن میں Brixton مشہور علاقہ ہے جہاں کالے رہتے ہیں اس علاقہ میں ان کی دو مساجد ہیں۔ایک مسجد میں مجھ ناچیز نے بھی ایک تقریب میں شرکت کی۔امریکہ سے ان کے ایک عالم Dennis Muhal نام کے آئے ہوئے تھے۔ وہ تقریر کر رہے تھے' عورتوں مردوں کا مشترکہ مجمع تھا۔ موضوع عصمت وعفت کی اہمیت اور کنبہ کی اہمیت تھا۔ یہ لوگ اگر چہ خود کو مسلمان کہتے ہیں۔تاہم قرآن کریم کی رو سے یہ مسلمان نہیں ہیں۔ان کا ان نظریات پر قائم ہونا اوران کا پس منظر ایک طویل موضوع ہے جو اس مختصر مضمون میں نہیں آ سکتا۔کمترین کو موقعہ ملا ور قارئین کی خواہش معلوم ہوئی تو اس جماعت پر مفصل مضمون تحریر کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال صرف ضروری معلومات ضبط تحریر میں لائی جارہی ہیں۔

نیشن آف اسلام کا ایک Splinter Group بھی ہے جو ان کے نظریات کا قائل نہیں ہے بلکہ ان کے نظریات عام مسلمانوں جیسے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کسی حد تک تحریک طلوع اسلام کے خیالات کے حامی ہیں۔ یہ فرقہ صرف قرآن کو حجت جانتا ہے۔روایات کا قائل نہیں ہے۔عرب تمدن کو اسلام کا جز نہیں سمجھتا۔اس فرقہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

یہ لوگ مولوی یا مولانا کی جگہ امام کا لقب لکھتے ہیں۔ علائی جاہ محمد کے بیٹے امام W.W.Deen (جواب تقریباً 70 سال کے ہوں گے)۔علائی جاہ کے بعد نیشن آف اسلام کے صدر مقرر ہوئے لیکن ان کو نیشن آف اسلام اور اپنے والد کے نظریات قطعاً پسند نہیں آئے اور وہ ہمارے جیسے مسلمان ہو گئے چونکہ ان کے نظریات نیشن آف اسلام سے مختلف ہو گئے اس لئے انہوں نے اس جماعت کی صدارت چھوڑ دی اوران کی جگہ فراخان نے لے لی۔آج کل اس کے صدر وہی Farrakhan ہیں۔امام Deen کے ساتھ اور بھی کافی علماء ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں امام علاءالدین شہباز ہیں۔ یہ شکاگو میں رہتے ہیں اوراس پارٹی کا مرکز بھی شکاگو میں ہے۔ان کی کتب New Jersy۔New Mind Publication سے مل سکتی ہیں اور

اوران کی ویب سائٹ

www.newmindpublication.com

راقم سطور نے امام علاء الدین شہباز کی چند کتب پڑھی ہیں جو بہت عمدہ ہیں۔ان لوگوں نے تفسیر بھی لکھی ہے لیکن وہ مجھے حاصل نہیں ہوسکی۔ میں عرصہ دراز سے اس جماعت کی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر 1995ء میں میری لندن میں ہی کسی کے ذریعے Leeroy Mohd سے ملاقات ہوئی۔ یہ جوان آدمی ہے اور بہت مخلص' اس نے مجھے امام شہباز کی کچھ کتب دیں۔ یہ خود نیشن آف اسلام کا ہے۔ میں نے لندن سے ہی امام موصوف کو خط لکھا اور چند روز میں ان کے اپنے ہاتھ کا تحریر کردہ خط مجھے مل گیا۔ یہ بھی تقریباً 75 سال کے بزرگ ہیں مگر صاحب تصنیف اور بہت باخبر۔ یہاں تک کہ انہیں تحریک طلوع اسلام کا علم تھا کیونکہ انہوں نے ڈاکٹر عبدالودود مرحوم کی کتاب Conspiracies Against Quran پڑھی ہوئی تھی۔ کمترین راقم سطور جب واپس پاکستان آیا تو فوراً ایک عریضہ امام موصوف کو ارسال کیا۔ جو دفتر طلوع اسلام میں ہی عزیز محترم حسین قیصرانی کی ہدایت کے مطابق اوران کی نگرانی میں تحریر کیا گیا۔ اس میں ادارہ طلوع اسلام کا مفصل تعارف تحریر کیا گیا اور انہیں پیش کش کی گئی تھی کہ اگر انہیں کوئی اعتراض یا سوال اسلام کے متعلق موصول ہو اور وہ اس کے جواب میں مشکل محسوس کرتے ہوں تو ادارہ ہذا کو Refer کردیں ہم انشاءاللہ مفصل جواب ارسال کریں گے۔اس خط کے ساتھ انہیں طاہرہ کے نام خطوط انگلش اور دو اور کتب ارسال کی گئیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے Monogamy اور Homosexuality نام کی اپنی تحریر کردہ دو کتابیں ارسال کیں۔عورتوں کے حقوق کے بارے میں ان کے اور طلوع اسلام کے ایک سے نظریات تھے۔ اس لئے انہوں نے ان صفحات کی نشاندہی خود کردی تھی اور یہ اجازت دی تھی کہ ان کی ان کتب کو جو بھی چاہے طبع کرادے ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ امام موصوف نے ہمارے خط اور کتابوں سے بہت اچھا تاثر لیا اور یہ تحریر فرمایا کہ انہیں تحریک طلوع اسلام کا ہی ایک ممبر شمار کیا جائے اور یہ

مطالبہ کیا کہ ادارہ جس قدر لٹریچر انہیں ارسال کرے گا' اسی قدر افراد وہ مسلمان کر لیں گے۔

اس ساری تفصیل کو اس لئے تحریر کیا گیا ہے کہ امریکہ کے پورے ملک جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے وہاں یہ ایک روشنی کی کرن موجود ہے۔ کمترین راقم سطور کی ہر قاری سے درخواست ہے کہ وہ نیشن آف اسلام یا شکاگو کی مسلم جماعت سے رابطہ کریں۔ ان کے خیالات سے آگاہی حاصل کریں۔ ان کے موجودہ حالات سے بھی آگاہ ہوں۔ ان کا پورا لٹریچر حاصل کریں اور اس کا مطالعہ کریں۔ خصوصاً ''نیشن آف اسلام کو اپنا Target بنائیں۔ ان کو صحیح اسلام سے آگاہ کریں۔ کمپیوٹر سے پورا فائدہ اٹھائیں اور نیشن آف اسلام کو صحیح اسلام پر لے آئیں ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ امریکہ حکومت سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو ایک الگ State دے دی جائے۔ Final Call میں ان کے مقاصد اور عقائد پہلے ہی صفحہ پر نمایاں لکھے ہوتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں سے ضرور رابطہ کریں اور ان کو فکری تقویت دیں۔ کیا عجب کہ

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

والی صورت پیدا ہو جائے۔ ختم نبوت کے بعد ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قرآن کی تبلیغ کرے۔ حضور ﷺ کا حکم بھی ہے کہ بلغوا عنی القرآن ولو كانت آية مجھ سے قرآن حاصل کر کے لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی ہو۔

اگر اس سلسلہ میں مزید معلومات درکار ہوں تو اس ای میل پر کمترین سے رابطہ فرمائیں۔

azureabbas@hotmail.com

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الانتقاد السدّاد فی اصول الاجتہاد

ارشاد حضرت باری تعالیٰ عز اسمہٗ ہے کہ لا تتخذوا الٰھین اثنین انما ھو اللہ واحد (16/51)۔تم دو الٰہ نہ بنالینا' الٰہ وہی ایک ہے۔ یہ آیت کریمہ بہت عظیم و جلیل ہے جس کا تعلق منکرین خدا سے نہیں ہے بلکہ خدا کے ماننے والوں' ہم مسلمانوں سے ہے۔ یہ کفرو اسلام' شرک و توحید کے درمیان حد تفریق اور خط امتیاز ہے' لیکن اس آیت کریمہ کا مالہٗ و ماعلیہ' اس کی عظمت و جلالت' رفعت و شوکت' اس کی تابندگی اور درخشندگی اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب الٰہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے اور یہ سمجھ میں آجائے کہ قرآن کریم نے الٰہ کا لفظ حاکم کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے علی الرغم بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کی کوشش جاری رکھی تو فرعون نے حضرت موسیٰ کو سخت زجر و توبیخ کی اور اعلان کیا کہ وان اتخذت الٰھاً غیری لا جعلنک من المسجونین (26/29)۔اگر تم نے میرے سوا اور کسی کو اپنا حاکم بنایا تو میں ضرور تمہیں قیدی بناؤں گا (موضح القرآن) یہاں قرآن کریم نے الٰہ کا لفظ ٹھیک حاکم کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہی ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا ہے۔ مقصد محولہ بالا آیت کریمہ کا یہ ہے کہ اطاعت خالص اللہ تعالیٰ کی کی جائے کیوں کہ اس کا حکم ہے کہ ولا یشرك فی حکمه احداً (18/26)۔وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا دخیل نہیں بناتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی مجرد ہے اور ہم سب کی آنکھوں سے اوجھل ہے اور ہمارا اس سے براہِ راست کوئی تعلق قائم نہیں ہوسکتا' اس لئے اس کی اطاعت کا عملی طریقہ اسی کی کتاب کی اطاعت اور اس کتاب کے مطابق نظام خداوندی جاری کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے۔ چنانچہ

صدر اول میں یہی کچھ ہوا۔ حضورﷺ نے کتاب خداوندی کے عطا کردہ نظام کو عملاً متشکل کیا کیونکہ ہر نظام کی اطاعت کے لئے ایک مرئی مرکز کی صورت لابدی اور ضروری ہے اور حضورﷺ نے ہی اس نظام کو جاری فرمایا تھا۔ اس لئے ان کی اطاعت بطور نظام کے مرکز کی اطاعت کے ہوتی تھی۔ اس کی عملاً صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام یا دین جس کو حضورﷺ نے اس دنیا میں متشکل کر کے دیا' اس کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔ وہ نظام ہی واحد' تنہا اور اکیلا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تھا۔ یہی واحد ذریعہ ہے جس سے انسان اور اللہ تعالیٰ کا تعلق قائم رہتا ہے اور اس نظام کی ہر کڑی اور Hierarchy کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوتی ہے' سڑک کے چوراہے پر کھڑا ہوا سپاہی جب آپ کو غلط روی سے روکتا ہے اور آپ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں تو آپ اس سپاہی کی ذاتی اطاعت نہیں کرتے بلکہ اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں جس کی طرف سے وہ متعین کردہ ہے اور جس نظام کا وہ نمائندہ ہے۔ اس مثال کو اوپر تک آئی۔ جی۔ پولیس اور گورنر تک لے جایئے۔ جو شخص گورنر کی اطاعت کرتا ہے وہ اصل میں اس مرکز حکومت اور اس نظام کی اطاعت کرتا ہے۔ اس مثال سے اس آیت کریمہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی (4/80)' اس آیت کریمہ اور Hierarchy کی وضاحت حضورﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمادی کہ من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی۔ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرانے کے لئے زندہ اتھارٹی اور ایک جاری شدہ متمکن نظام لازمی ولابدی چیز ہے اور یہ اطاعت کے لئے ایک Pre-requisite ہے۔ اس کے بغیر اطاعت خداوندی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ''سمع وطاعت'' کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ یعنی پہلے براہِ راست حکم کا سننا' اور پھر اس کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ ارشاد ہوا'

اذقلتم سمعنا و اطعنا 5/7' جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اس کے بعد سورۂ نور میں ہے کہ جماعت مومنین کا یہ طریقہ ہے کہ جب انہیں ان کے کسی معاملہ میں حکم دینے کے لئے بلایا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ سمعنا و اطعنا 24/5' اس کے علاوہ ارشاد ہوا' یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون 8/20۔ اے ایمان والو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔ یہاں بھی اطاعت خداوندی کے لئے احکامات کا براہِ راست سننا شرط قرار دیا گیا ہے۔

یہ وہ نظام تھا جس کے ذریعے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی تھی اور جو صدر اول میں حضور ﷺ نے اور آپ کے اولالعزم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اپنی ان تھک محنتوں اور کوششوں سے قائم کیا تھا اور اس کے درخشندہ نتائج بھی برآمد ہوئے۔ لیکن انسانیت کی بدقسمتی کہ یہ نظام زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکا اور ملوکیت اور شہنشاہیت کے غلبہ کی وجہ سے یہ نظام جلد ہی منقرض ہو گیا اور اس کے بعد ملوکیت و بادشاہت پوری پوری طرح غالب آ گئی اور دین کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ نظام تو ملوکیت کا قائم ہو گیا لیکن انسانیت کی بدنصیبی یہ ہوئی کہ اس پر ٹھپہ اور لیبل اسلام کا ہی لگتا رہا۔ ملوکیت کے غلبہ کے بعد دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور اللہ و رسول کی اطاعت کا طریقہ بھی بدل گیا۔ دین میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے زندہ اتھارٹی کی موجودگی شرط تھی اور یہ اطاعت بھی ایک ہی اطاعت تھی' اور اس کے لئے قرآن کریم نے بھی ہر جگہ واحد کا صیغہ ہی استعمال کیا ہے لیکن جب دین مذہب میں بدل گیا اور زندہ اتھارٹی قائم نہیں رہی تو اللہ و رسول کی اطاعت کا طریقہ بھی تبدیل ہو گیا اور اب اللہ کی اطاعت قرآن کے ذریعے اور رسول کی اطاعت احادیث کے ذریعے کی جانے لگی اور اطاعت رسول کا عملی مفہوم احادیث پر عمل کرنا قرار دیا جانے لگا۔

ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے اعمال و افکار کو مسلمانوں کے

بجائے اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ہم جسے تاریخ اسلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں اصل میں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہے اور یہ تاریخیں اڑھائی سو سال بعد تحریر میں آئیں جب کہ ان کے لئے پہلے سے تحریر کردہ کوئی مواد (Material) موجود نہیں تھا۔ یہ سقیفہ بنی ساعدہ سے لے کر پورے بنی عباس کے دور تک خالص ملوکیت کے نکتہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہیں کیونکہ ہر آنے والی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار حاصل کرتی ہے' وہ سابقہ حکومت کی خامیوں اور کوتاہیوں کو خوب خوب اچھالتی ہے۔اس لئے ہمارے ہاں بھی چونکہ بنی امیہ کے بعد بنی عباس آئے جنہوں نے بنی امیہ سے بزور حکومت چھینی تھی اور ہمارا سارا لٹریچر بنی عباس کے دور کا تحریر کردہ ہے' اس لئے اس لٹریچر میں لازمی اور فطری بات تھی کہ بنی امیہ کو بری طرح Depict کیا جاتا۔ چنانچہ امیر معاویہ کا Role نہایت درجہ کا پست اور گھٹیا پیش کیا گیا ہے' اسی طرح جنگ صفین' جنگ نہروان' جنگ جمل کے واقعات اختراع کئے۔ حالانکہ قرآن کریم نے واضح طور پر ارشاد فرما دیا تھا کہ صحابہؓ آپس میں نہیں لڑیں گے 19/96 ,48/29۔لیکن اس کے باوجود ہماری تاریخ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کو اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کو برسر پیکار دکھاتی ہے۔جس میں ستر ہزار صحابہ قتل ہوئے اور حضرت زبیرؓ جو حضرت علیؓ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے وہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں ہی قتل ہوئے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں یا للعجب ۔ یہ سارے واقعات مسلمانوں کی تاریخ میں ہو سکتے ہیں' اسلامی تاریخ میں نہیں ہو سکتے کیونکہ قرآن کا واضح اعلان ہے کہ صحابہ کرامؓ آپس میں جدال وقتال نہیں کر سکتے۔

ملوکیت کے عہد میں یہی کچھ ہمارے عقائد کے ساتھ ہوا۔ چونکہ ملوکیت کو انسان کے مجبور محض ہونے اور تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہونے کا عقیدہ فائدہ دیتا تھا اس لئے اس عقیدہ کو خوب خوب فروغ دیا گیا۔ یہاں تک کہ دین کا اور کلمہ شریف کا جز بنا دیا گیا اور قرآن کریم کے بنیادی تصورات' صلوٰۃ' زکوٰۃ' تسبیح' سجدہ' تہجد' ملائکہ' شیطان' ابلیس' سب کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کے وہ معانی و مفاہیم اختیار کئے گئے جو ملوکیت کے حق میں تھے۔ چونکہ اس مضمون کا تعلق صرف

اسلامی قانون اور اجتہاد سے ہے، اس لئے عقائد کی بحث سے تعارض نہیں کیا جاتا، ور اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔صرف یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ملوکیت نے نہ صرف قانون اسلامی کو متاثر کیا بلکہ اسلام کے بنیادی عقائد و تاریخ کو بھی متاثر کیا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے سلطنت و بادشاہی کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ یہ قطعاً اور مطلقاً حرام ہے۔قرآن کریم کی رو سے خلافت کا حق کسی فرد واحد کو نہیں ہے۔ بلکہ پوری کی پوری امت اس میں شامل ہوتی ہے (3/110,22/78,24/55)۔لیکن قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے باوجود ظالم، جابر، فاسق، بدچلن، بادشاہ تلوار کے زور پر امت مسلمہ کی گردنوں پر سوار ہو گئے، ان ظالم بادشاہوں نے، کہ جن کے حرم میں بیک وقت کئی کئی سو کنیزیں ہوتی تھیں، خلافت کی بجائے اپنی بادشاہی اور ملوکیت قائم کر لی۔اور جمہور مسلمانوں کا حق غصب کر کے اپنی بادشاہت کو مستقل طور پر قائم کر دیا۔اس دور کے آئمہ کرام امام جعفر صادقؒ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ نے ملوکیت کی سخت مخالفت کی اور شدید مذمت کی۔اگرچہ ملوکیت نے ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان حضرات باوقار، کوہ تمثال نے تمام مصائب و آلام برداشت کیے لیکن ملوکیت وشہنشاہی کا ساتھ نہیں دیا۔البتہ ان سے کم تر درجہ کے فقہا جو ان کے ہی شاگردوں میں شامل تھے انہوں نے ملوکیت کا ساتھ دیا اور اس طرح یہ قوانین، جنہیں اسلامی قوانین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مدون کیے گئے۔لیکن حق یہ ہے کہ ان قوانین کا اسلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے تدوین کردہ قوانین ہیں اور بس۔اور ان کا فقہ ملوکیت یا فقہ شاہی زیادہ مناسب نام ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام قوانین اور فقہا سے حاصل کردہ فتاویٰ، بادشاہوں نے اپنی حکومت چلانے کے لئے بنوائے تھے۔اس دور میں جتنی بھی فقہ تیار ہوئی وہ سب بادشاہوں کو سپریم اتھارٹی تسلیم کرتے ہوئے مرتب ہوئی، جو کہ اسلام میں قطعاً حرام ہے فلہٰذا اس سارے قانون وفقہ کی بنیاد ہی خلاف قرآن ہے۔امام ابوحنیفہؒ اور اس دور کے فقہا زمین کی ملکیت کو بالکل حرام قرار دیتے تھے۔لیکن ان بادشاہوں نے زمین کی ملکیت جائز قرار دی اور

دوسرے درجہ کے فقہا سے اس کی تصویب حاصل کر لی۔ قرآن کریم کی رو سے اوقاف کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن ان قوانین میں اوقاف کے ادارے قائم کرنے کو جائز شمار کیا گیا۔ چنانچہ آج تمام مسلم ممالک میں اوقاف بھی ہیں اور وزارت ہائے اوقاف بھی قائم ہیں۔ ان قوانین میں عورتوں' بچوں' مزدوروں' کسانوں' اقلیتوں اور بین الاقوامی حقوق کی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی۔

اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی حکومت اور مسلم حکومت میں فرق ہوتا ہے۔ جس ملک میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہ مسلم ملک کہلاتا ہے' لیکن اس کا یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ وہ ملک اسلامی بھی ہو۔ مثال کے طور پر آج ترکی مسلم ملک ضرور ہے کیونکہ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ لیکن وہ اسلامی ملک نہیں ہے۔ اسی طرح آج کل تمام مسلم ممالک کی کیفیت ہے۔ یہی صورت حال بنو عباس کے دور کی تھی کہ اس وقت وہ ممالک مسلم ممالک تھے لیکن ان کی حکومت اسلامی حکومت ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ ان کی حکومت بالکل اسی طرح غیر اسلامی تھی جس طرح آج ترکی کی حکومت ہے۔ غیر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین اسلامی قوانین نہیں ہو سکتے۔ اسلامی قوانین صرف اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین ہوتے ہیں۔ اگر آج بھارت کی حکومت یا فرانس کی حکومت کسی وجہ سے شراب پر پابندی جاری کر دے' تو اگرچہ شراب کی حرمت قرآن کریم کے نزدیک مسلم ہے لیکن یہ قانون اسلامی قانون نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر آج انگلش حکومت Homosexuality کو جرم قرار دے دے' اور اس کی ممانعت کا قانون جاری کر دے' تو وہ قانون اسلامی نہیں ہوگا۔ اگر آج ترکی حکومت جواء سٹہ کو ممنوع کر دے تو یہ قانون اسلامی نہیں ہوگا۔ اگر امریکہ میں یا کسی دوسرے ملک میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا' یا زانی کی سزا سو کوڑے مقرر کر دی جائے تو یہ قوانین اگرچہ قرآن کریم کے تجویز کردہ ہیں' لیکن یہ اسلامی قوانین نہیں ہوں گے۔ غیر اسلامی حکومت کا جاری کردہ قانون اسلامی نہیں ہو سکتا۔ صرف اور صرف اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین اسلامی ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ سماجی ادارے ہوں یا عقاید و افکار ان کا مطالعہ تاریخی پس منظر

میں کرنا چاہیے تا کہ ان عوامل ومحرکات کا سراغ مل سکے جو ان حقیقتوں کے ظہور کا سبب ہے۔اسی وجہ سے یہ سارا پس منظر قارئین کرام کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔اس پس منظر کے ملاحظہ فرمانے کے بعد اس تناظر میں مسئلہ اجتہاد پر غور فرمائیں کہ جو قوانین ہی غیر اسلامی حکومتوں کے مدون شدہ غیر اسلامی ہیں' اور جن کا زیادہ مناسب نام فقہ شاہی ہے ان میں اجتہاد کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟ یہ تو سارے کا سارا فقہ ہی ملوکیت' جو کہ قطعاً حرام ہے' اس کے سائے میں تدوین کیا گیا ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔اس کے ماخذ ہی غیر قرآنی ہیں۔جس قانون کے ماخذ ہی غیر قرآنی ہوں اس میں اجتہاد کا کیا مرتبہ ہو سکتا ہے؟ اس فقہ میں اجتہاد کرنے اور اس کو جاری کرنے کا لازمی نتیجہ بادشاہی اور ملوکیت کو دوبارہ ہمارے سروں پر مسلط کرنا ہے (Restore کرنا ہے)۔عوام کو سارے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کرنا ہے۔عورتوں کو خصوصاً Sub-human conditions میں رکھنا ہے اسی لئے جو قوانین ہی قرآن کے خلاف ہیں ان میں اجتہاد کیسا؟

ہم جن قوانین یعنی موجودہ فقہ میں اجتہاد کرنا چاہتے ہیں ان کی ساخت ہی یہ ہے کہ یہ سب دور ملوکیت کے تراشیدہ ہیں اور ملوکیت اور شاہنشاہیت کو ابدی حقیقت خیال کرتے ہیں۔ان قوانین کی ساری جدوجہد یہ ہے کہ کسی طرح شاہی طرز حکومت کو اسلامی تعلیمات سے مخلوط کر دیا جائے تا کہ عام مسلمانوں کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ حکومت اسلامی اصولوں کے مطابق چلائی جا رہی ہے۔چنانچہ اس دھوکے اور فریب میں نہ صرف عوام مبتلا تھے بلکہ اس زمانہ کے علماء ودانشور بھی اس سے متاثر تھے۔حجت الاسلام' امام غزالی کا جو درجہ ہمارے ہاں مسلم ہے اس کے مطابق وہ نہ صرف سرخیل علماء ہی تھے بلکہ سرتاج اہل عرفان بھی شمار ہوتے ہیں' یہاں ان کے مراتب پر تبصرہ کرنے کا کوئی محل نہیں ہے لیکن اظہار حقیقت کے لئے اتنا تحریر کرنا ضروری ہے کہ یہ بات صرف اہل علم ہی جانتے ہیں کہ امام غزالی نے اپنی ابتدائی نصف عمر جن نظریات کی اشاعت وترویج میں گزاری باقی نصف عمر ان ہی نظریات کی تردید وتغلیط میں صرف کر دی۔اس بات کا ثبوت اور کسی سے لینے کی

ضرورت نہیں۔ان کی کتاب ''مقاصد الفلاسفہ'' اور ''تہافت'' خود اس کا بولتا ثبوت ہیں۔ یہ بات تو صرف ضمناً بطور جملہ معترضہ درمیان میں آ گئی تھی۔ امام غزالی تحریر فرماتے ہیں۔'' سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ سلطانی سلطانوں کو خدا نے مرحمت کی ہے۔ لہٰذا ان کی اطاعت کرنی چاہئے' ان سے محبت کرنی چاہئے اور ان کا حکم ماننا چاہئے۔ سلاطین سے جھگڑا کرنا درست نہیں اور ان سے نفرت کرنا غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم'' نصیحت الملوک از امام غزالی صفحہ 44 مطبوعہ لندن 1964ء۔ اور یہ بات امام غزالی کے دور سے مخصوص نہیں ہے' آج تک ہم مسلمان اسی پندار میں گرفتار ہیں اور ان ہی مردہ لاشوں کو کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔

جو قوانین بنو عباس کے دور میں بنائے گئے تھے وہ اس وقت کے معاشرتی حالات کے مطابق تھے مگر موجودہ دور کے معاشرتی حالات ان حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا اس دور کے قوانین موجودہ دور کا ساتھ نہیں دے سکتے ہم مسلمانوں کی زندگی میں بے شمار تبدیلیاں آئیں۔ ہمارے معاشرتی رشتے بدلے' پیداوار کے طریقے بدلے' سماجی قدریں بدلیں' رسم و رواج بدلے' رہن سہن کے طریقے بدلے' سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز بدلا۔ قانون و ضابطے بدلے' علوم و فنون بدلے۔ نئی ٹیکنالوجی کی بے شمار ایجادات آئیں۔ ٹیلی فون' ٹی۔وی' ریڈیو' فرج' ایئر کنڈیشنر' کاریں' ریل' ہوائی جہاز' بجلی' سب چیزوں نے پوری زندگی بدل کے رکھ دی۔ ان تبدیلیوں کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور معاشرے کی تنظیم ان خطوط پر نہیں کی جا سکتی جو بنو عباس کے دور میں تھی۔ اس زمانہ کے بنائے ہوئے قوانین میں اتنی وسعت اور گنجائش ہی نہیں ہے کہ ان میں اجتہاد کیا جائے اور اگر ان خشک' جامد' بے جان' بنجر قوانین میں اجتہاد کیا بھی جائے تب بھی وہ اجتہاد کے باوجود اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اجتہاد کا مروجہ مفہوم' اس پر تبصرہ اور انتقاد پیش کرنے کے بعد اب اجتہاد کا قرآنی طریقہ پیش خدمتِ عالی کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی حکومت حضور ﷺ نے خود مدینہ شریف میں قائم فرمائی اور

(1) جو احکام قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ آئے تھے اور جن کی جزئیات بھی قرآن نے بتا دی تھیں وہ حضور ﷺ نے بجنسہٖ نافذ فرما دیئے۔

(2) البتہ جو اصول وقوانین قرآن کریم میں ایسے آئے کہ جن کی جزئیات کا تعین نہیں کیا گیا تھا ان کی جزئیات کا تعین حضور ﷺ نے خود فرمایا۔ جن اصول اور قوانین کی جزئیات قرآن کریم نے مقرر نہیں فرمائی ان کی صورت یہ ہے کہ وہ کوئی نادانستہ طور پر نہیں چھوڑی گئیں بلکہ ان کو عمداً بیان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان جزئیات کو زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونا تھا۔ ہر اسلامی حکومت کے لئے اپنے دور کے مطابق ان جزئیات کا متعین کرنا لازمی وضروری ہے۔ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے مطابق جزئیات کا تعین کرنا' اور حالات کے مطابق قوانین کا اطلاق کرنا' حکومت اسلامی کے دیگر امور طے کرنا' اس کی داخلی اور خارجی پالیسی بنانا' قرآنی اجتہاد کہلاتا ہے۔ حضور ﷺ کا دور تمدن ومعاشرتی اعتبار سے سیدھا سادھا دور تھا اس لئے حضور ﷺ کے دور کی متعین کردہ جزئیات بھی بہت تھوڑی تھیں۔ قرآن کریم کے اصول اور اس دور کے مطابق طے کردہ جزئیات' ان دونوں کے مجموعے کا نام شریعت اسلامی یا ضابطۂ قوانین خداوندی تھا۔ اور اس ضابطہ کی اطاعت' حکومت اسلامی کی اطاعت یعنی اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ ہر اسلامی حکومت کی طے کردہ جزئیات اس حکومت کی شریعت ہوتی ہے۔

حضور ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ حضرت ابو بکرؓ کا دور نہایت مختصر اور حضور ﷺ کے دور سے بالکل متصل تھا۔ اس لئے ان کے دور میں جزئیات میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ البتہ حضرت عمرؓ کا دور نسبتاً طویل بھی تھا اور فتوحات کی وجہ سے اس میں نئے نئے حالات بھی درپیش آرہے تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ کے دور مبارک میں زیادہ جزئیات کا تعین کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں ایک خلیفہ کے فیصلے کے خلاف دوسرے خلیفہ نے فیصلہ دیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں کافی

فیصلے اسی طرح کے ہوئے۔ وہ اولیات عمرؓ کے نام سے مشہور ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے اولیات عمرؓ کی تعداد 40 شمار کی ہے۔ جو اتنے قلیل عرصہ میں کی گئیں۔ اور ان کو انہوں نے مندرج بھی کیا ہے۔ ہم بھی ان میں سے چند کو درج ذیل کرتے ہیں تا کہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ جزئیات کا تعین اپنے اپنے دور کے مطابق ہوتا تھا اور یہی اس دور کا اجتہاد تھا۔

(1) قرآن کریم نے صدقات میں سے ایک حصہ مولفتہ القلوب کا بھی رکھا ہے لیکن اس حصہ کا تعین نہیں کیا۔ حضور ﷺ نے افرع بن جابس کو ایک مرتبہ تالیفِ قلب کے لئے سو اونٹ دیئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں انہوں نے کچھ اراضی بھی مانگی وہ بھی حضرت ابوبکرؓ نے ان کو دی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں اس زمین کو واپس لے لیا اور یہ فرمایا کہ اب اسلام کا نظام مضبوط ہو گیا ہے اور اب اس کو تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے وہ زمین حضرت عمرؓ نے واپس لے کر دیگر مستحقین کو دے دی۔

(2) جس حاملہ عورت کا شوہر فوت ہو جائے حضرت عمرؓ نے اس کی عدت کا عرصہ وضع حمل رکھا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کا حکم تھا کہ وضع حمل یا چار مہینے دس دن کی مدت میں سے جو مدت لمبی ہوگی وہی اس کی عدت ہوگی۔

(3) دادا کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ بھائیوں کو وراثت نہیں دیتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ایسی حالت میں بھائیوں کو وراثت دلوائی۔

(4) حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ آزاد عورت غلام کی بیوی ہو کر صرف دو طلاقوں سے دائمی طور پر حرام ہو جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ وہ تین طلاق سے کم میں حرام نہیں ہوگی۔

(5) حضرت ابوبکرؓ لوگوں پر برابر مال تقسیم کراتے تھے اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ترجیحی حقوق قائم کئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے حضور ﷺ کے خلاف جنگ کی ہے وہ ان لوگوں کے برابر

نہیں ہو سکتے جو حضور ﷺ کے ساتھ شریک جہاد ہوئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے پھر اس امتیاز کو ختم کر دیا۔

اس قسم کے اور بہت واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ کی متعین کردہ جزئیات کو نا قابل تغیر و تبدل نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ ہر خلیفہ کا فیصلہ اس کے اپنے زمانے کے لئے شریعت ہوتا تھا۔ اس کے بعد آنے والے کا فیصلہ اس کے زمانے والوں کے لئے شریعت ہوتا تھا۔ اور یہی اس کا اجتہاد ہوتا تھا۔

جیسا کہ قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہے اجتہاد کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ اجتہاد اسلامی حکومت کرتی ہے۔ فرداً فرداً اجتہاد نہیں ہوتا۔ قوانین میں انفرادی طور پر جو ترمیم و تنسیخ کی جاتی ہے وہ اجتہاد نہیں ہوتا بلکہ شاہی قوانین یا ملکی قوانین میں تبدیلی ہوتی ہے' اس کا اجتہاد سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

اجتہاد کی دوسری شرط یہ ہے کہ اسلامی قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے۔ ہمارے ہاں جو مسلمہ طور پر اسلامی قانون کے چار ماخذ' یعنی قرآن' حدیث' اجماع و قیاس شمار کئے جاتے ہیں تو یہ قرآن کے خلاف ہیں اور ان تین ماخذ کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (5/44)۔ دوسری آیت میں ہے کہ وہ فاسق ہیں (5/47)۔ اور ایک آیت میں ہے کہ وہ ظالم ہیں (5/45) ان آیات کریمات سے واضح ہے کہ قانون ما انزل اللہ کے مطابق بنایا جائے گا اور اگر کوئی قانون خالص ما انزل اللہ کے مطابق نہیں ہوگا تو وہ کفر' فسق اور ظلم پر مبنی ہوگا۔ ما انزل اللہ کے ساتھ نہ تو اپنی خواہشات کو شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی دوسری چیز کو۔ جو شخص بھی ما انزل اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شامل کرے گا' وہ قرآن کریم کی خلاف ورزی کرے گا' یہ آیات کریمات' اور اسی قبیل کی متعدد آیات اس موضوع پر اتنی واضح اور بولتی ہوئی ہیں کہ علماء کرام کو اس بات کے تسلیم کرنے میں جائے مفر نہیں رہا اور وہ ہم سے اس بارے میں متفق

الرائے ہیں کہ حکومتی فیصلہ صرف منزل من اللہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ ہم منزل من اللہ صرف قرآن کریم کو شمار کرتے ہیں جب کہ علماء کرام حدیث شریف کو بھی منزل من اللہ خیال فرماتے ہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حدیث منزل من اللہ نہیں ہے تو پھر کوئی شخص بھی اس کو ماخذ قانون بنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ''وحی صرف قرآن میں ہے اور خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے'' کے موضوع پر طلوع اسلام کے لٹریچر میں بے شمار مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔ کمترین راقم سطور کے بھی چھ مضامین' اسی عنوان سے' اس موضوع پر رسالہ طلوع اسلام میں طبع ہو چکے ہیں' ان سب کا احصاء تو یہاں ممکن نہیں ہے جن حضرات کو احقاق حق کی جستجو ہو' اور اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ان مضامین کی طرف مراجعت فرما سکتے ہیں۔ البتہ صرف دو آیات کریمات مقصد پیش نظر کے سلسلہ میں تحریر کی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ منزل من اللہ صرف قرآن کریم ہے۔

(1) وانزلنا الیک الکتٰب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ من الکتٰب ومھیمناً علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللہ (5/48)۔ ہم نے تم پر برحق کتاب نازل کی' جو کتاب اس وقت موجود ہے' یہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان بھی ہے۔ تو جو کچھ تم پر خدا نے نازل کیا ہے اس کے مطابق تم بھی حکم دو۔ اس آیت کریمہ میں ما انزل اللہ کی وضاحت کتاب سے کر دی ہے کہ ما انزل اللہ کتاب ہے اور صرف اس کے مطابق فیصلے کرو۔

(2) والذین اتینھم الکتاب یفرحون بما انزل الیک (13/36)۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ تمہارے پاس نازل کئے گئے سے خوش ہوتے ہیں' اس جگہ پھر انزل الیک کی وضاحت کتاب سے کی ہے۔ کیونکہ یہ ترکیب میں ایک دوسرے کا بدل اور مبدل منہٗ واقع ہوئے ہیں۔ ما انزل اللہ اور کتاب ایک ہی چیز ہے اور ما انزل اللہ میں حدیث شریف شامل نہیں ہے فلہٰذا کیونکہ صرف ما انزل اللہ ہی قانون کا ماخذ ہے' اس لئے حدیث بحیثیت

ماخذ قانون کے اس سے خارج ہوگئی اور قانون اسلامی کا ماخذ صرف قرآن کریم ٹھہرا۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ حضورﷺ نے اپنے دور سعید میں قرآن کریم کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق، صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلے کئے اور اپنے حالات کے مطابق جزئیات کا تعین فرمایا۔ یہ حضورﷺ کا اجتہاد تھا۔ حضورﷺ کے انتقال کے بعد یہی حکومت آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کوئی Vacuum میں قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا تسلسل حضورﷺ کی حکومت سے تھا۔ اس لئے جب حضرت ابوبکرؓ کوئی فیصلہ فرماتے تو سابقہ حکومت کے طرز عمل (سنت) سے مستغنی نہیں ہو سکتے تھے۔ جب بھی کوئی حکومت تسلسل قائم رکھتی ہے تو سابقہ حکومتوں کے فیصلے آنے والی حکومتوں میں مسلسل جاری رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ نئی حکومت، سابقہ حکومت کے فیصلوں کو رد کردے۔ یہی صورتِ حال خلافت راشدہ میں ہوئی۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہی فرمایا کہ میں قرآن وسنت کا اتباع کروں گا۔ اس سے ان کی یہی مراد تھی کہ کوئی نئی حکومت قائم نہیں کروں گا بلکہ حکومت کا تسلسل قائم رکھوں گا۔ اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ میں سنتِ رسول اللہ اور سنت ابی بکر پر عمل کروں گا۔ اس طرح سنت قانون سازی کے سلسلہ کا ایک Process تھی۔ وہ بذاتِ خود ماخذ نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح قیاس سے کام لیا گیا اور خلافت راشدہ میں بہت سے امور پر اجماع ہوا۔ سنت کی طرح قیاس اور اجماع سے بھی قانون سازی میں مدد لی گئی۔ یہ خود قانون کے ماخذ نہیں تھے۔ ماخذ تو قانون بنانے کا صرف قرآن کریم تھا جو کہ منزل من اللہ ہے۔ باقی تینوں چیزیں قانون کی تدوین یا تنفیذ کے طریقے ہیں۔ قرآن کریم کے مطابق کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو علی حالہ جاری کرنا اتباع سنت ہے۔ نئے معاملات پر تدبر و تعقل کرنا اجتہاد یا قیاس ہوگا اور امت کے مشورے سے نتائج اخذ کرنا، اور انہیں جاری کرنا، اجماع ہے، ماخذ شریعت کا صرف قرآن کریم ہے۔

لیکن اب جبکہ ہمارا دور انحطاط ہے اور غور وفکر کا دروازہ بالکل بند ہے، تو یہی چاروں شقیں شریعت کا ماخذ قرار پا گئیں اور یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا کہ گذشتہ علماء کرام و فقہائے عظام نے

اپنے قیاس واجتہاد سے جو مسائل مستنبط کر لئے وہ آنے والے ہر دور کے لئے غیر متبدل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی ان آئمہ کرام کی تدوین کردہ کتب فقہ' قوانین شریعت کا ماخذ بن گئیں اور علماء کرام کے نزدیک جس طرح قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔اسی طرح ان کتابوں میں درج شدہ فقہ' قرآن کی آخری تعبیر ہے۔جس طرح قرآن کریم میں رد وبدل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح فقہ میں بھی کوئی رد وبدل نہیں ہوسکتا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان,اس فقہ سے جان نہیں چھڑائیں گے کبھی اس زوال وادبار سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

یاد رہے کہ اگر امت مسلمہ تباہی کے اس بھنور سے نکلنا چاہتی ہے تو اسے دو اقدام ضرور لینے ہوں گے خواہ وہ کتنے ہی جرأت آزما کیوں نہ ہوں اس کے بغیر وہ جاہی سے نہیں نکل سکتے۔ اولاً تو اس فقہ کو فوری طور پر ترک کرنا ہوگا اور دوسرے ہمارے ہاں جو تفاسیر' تفسیر القرآن بالروایات کے طریقہ پر تحریر کی گئی ہیں' اور جن میں زیادہ تر نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں' ان کو چھوڑ کر تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر تفسیر تحریر کر کے' خالص قرآن کی تعلیم کو اختیار کرنا ہو گا۔چونکہ تفسیر القرآن' اس مضمون کا موضوع نہیں ہے نیز یہ کہ اس سلسلہ میں بہت کثیر مواد تحریر شدہ موجود ہے' اس لئے صرف اس اشارہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

اصل بات جو تلخ بھی ہے اور ناگوار بھی وہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کی عزت' شہرت' مفادات' تکریم وتعظیم' حصول رزق کے ذرائع سب قدیم فقہ میں مہارت سے وابستہ ہیں اس لئے وہ اس قدیم فقہ میں تبدیلی کے قائل نہیں ہیں۔اگرچہ ان کے اس رویہ سے قوم تباہ ہورہی ہے' جس کی ذمہ داری ان علماء کرام پر ہی ہے اور اس طرح وہ پوری امتِ مسلمہ کو جہنم کی طرف لے جارہے ہیں لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ

(قل) نار جهنم اشد حرا لو كانوا يفقهون (9/81)

(اے رسول کہدو کہ) جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے اگر وہ کچھ سمجھیں تو۔

وهـذا مـنـا تـم الـكـلام

عـلـى مـصـطـفـنـا الـوف سـلام

(مفہوم) اور یہ وہ مقام ہے کہ یہاں ہمارا کلام ختم ہوا اور ہمارے
حضور ﷺ پر ہزاروں سلام۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہوسکتی

ہمارے ہاں جب تفاسیر تحریر کرنے کی ابتداء ہوئی تو نہ صرف یہ کہ ملوکیت کا دور دورہ تھا بلکہ ملوکیت کے علاوہ کوئی اور نظام اس زمانہ کے مفکرین کے خیال میں آتا ہی نہیں تھا۔ بادشاہ کے لئے ظل اللہ کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ ان کے اذہان پر ملوکیت کا غلبہ اس درجہ چھایا ہوا تھا کہ عرصہ دراز سے نہ صرف اسلامی نظام منقرض ہو چکا تھا بلکہ اس کا تصور بھی بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کریم میں جو آیات کریمات بطور اسلامی نظام اور دین کے' نہایت واضح اور صاف ہیں''مذہب'' میں آ کر وہ بالکل گورکھ دھندا بن گئی ہیں اور ان کا صحیح مفہوم کسی طرح سامنے نہیں آتا۔ جب وہ آیات ہیں ہی ''دین'' سے متعلق تو وہ ''مذہب'' کی سطح پر کس طرح حل ہوسکتی ہیں؟ ہمارے مفسرین کرام نیک دل' مخلص بھی تھے اور عالم و دانشمند بھی۔ انہوں نے نہایت درجہ محنت و جانفشانی سے یہ تفاسیر تحریر فرمائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ان سب نے' بغیر کسی استثناء واحد کے' یہ تمام تفاسیر ''مذہب'' کی سطح پر ہی تحریر کی ہیں۔ ''دین'' سے ان کا دور دور کا بھی علاقہ نہیں۔ اس وقت سے آج تک چونکہ مسلمانوں میں زبوں حالی برابر چلی آ رہی ہے اور مغربی قوتوں کی Colonization کی وجہ سے اکثر ممالک میں مسلمان محکوم و مغلوب تھے' اس لئے وہ تفاسیر چلتی آ رہی تھیں اور یہ خامی و سقم کہ یہ تفاسیر مذہب کی سطح کی تحریر کردہ ہیں' کسی تشویش کا موجب نہیں تھیں۔ لیکن اب جبکہ مسلمانوں کے پاس آزاد ممالک ہیں اور ان میں قرآن کریم کو بطور دین جاری کرنے کا موقع بھی میسر آ رہا ہے اور مسلمان اس کو بطور دین قائم کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں تو یہ تفاسیر ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ اگر آپ کے سامنے خالص دین کا تصور ہے اور اس

کے بعد آپ ان تفاسیر سے ہدایت و راہنمائی کے خواہاں ہیں' تو یہ تفاسیر آپ کی نہ صرف کوئی راہنمائی نہیں کریں گی بلکہ یہ قرآن فہمی میں ایک سدراہ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور پھر مجبوراً آپ کو مذہب کی سطح تک ہی رہنا پڑتا ہے۔

ہمارے ہاں برصغیر ہند و پاک میں قرآن کریم پر بہت کام ہوا۔ سرسید احمد خاں کے بعد علماء اہل قرآن نے اس پر کام کیا لیکن افسوس کہ یہ علماء کرام بھی مذہب کی سطح تک ہی رہے اور دین ان کے سامنے بھی نہیں آیا نیز یہ کہ وہ ''الصلوٰۃ'' کا ایک نزاعی مسئلہ پیدا کر کے خود ایک فرقہ بن گئے۔ ان کے اس رویہ سے مسلمانوں کو بجائے فائدہ ہونے کے نقصان ہوا۔ کیونکہ جب طلوع اسلام کی تحریک شروع ہوئی تو لوگ چونکہ اہل قرآن سے بدظن تھے' اور تحریک طلوع اسلام کو اس سے Confuse کرتے تھے' اس لئے اس کا نقصان تحریک طلوع اسلام کو برداشت کرنا پڑا اور اسی وجہ سے کئی ایک مضمون ان کے خلاف ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع کئے گئے۔

برصغیر ہند و پاک میں علامہ اقبال پہلی شخصیت تھے جنہوں نے اسلام کو حیثیت دین کے پیش کیا۔ انہوں نے اس نظریہ کو اس قوت و اعتماد سے پیش کیا کہ مسلمانوں کا معتدبہ حصہ اس سے متاثر ہو گیا اور حصول پاکستان کی کشمکش میں اس نظریہ کو ہی اساس بنا کر پیش کیا گیا۔ علامہ موصوف نے اپنے بے شمار اشعار اور متفرق تحاریر میں اس منفرد نظریہ کو نمایاں کیا۔ لیکن ان کا اس موضوع پر کوئی جامع و مبسوط مضمون' جس میں اس موضوع کو آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ سے ثابت کیا گیا ہو' کمترین راقم سطور کے علم میں نہیں ہے۔ اس اہم و منفرد موضوع پر ہماری پوری تاریخ میں سب سے پہلا مضمون علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے ''اسلامی نظام'' کے نام سے تحریر کیا جو ماہنامہ طلوع اسلام میں تقسیم ملک سے پیشتر طبع ہوا تھا۔ اس مضمون کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ اس مضمون سے ''قرآن فہمی کی مسدود راہیں کشادہ ہونے لگیں اور جو آیات اس سے پیشتر مبہم و مغلق معلوم ہوتی تھیں وہ سہل الفہم ہو گئیں۔ موضوع چونکہ غایت درجہ اہم اور نہایت درجہ ضروری ہے اور بہت طویل عرصہ سے اس موضوع پر کوئی تحریر بھی نہیں آتی ہے'

اس لئے زیرِ نظر مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ اس موضوع کو پھر سے سامنے لایا جائے اور اپنے مقدور کے مطابق اس موضوع کو واضح کیا جائے۔ نیز اس مضمون کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ آج کل ہمارے چند دانشور ملک میں سیکولرازم کے حامی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر پاکستان سیکولر سٹیٹ ہی رہے اور مذہب ذاتی معاملہ رہے تو اس سے مسلمانوں کو اختلاف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے' لیکن اس مضمون کے مطالعہ سے آپ پر یہ بات خودبخود واضح ہو جائے گی کہ مذہب تو ذاتی ہوسکتا ہے لیکن دین ذاتی نہیں ہوسکتا۔

نزولِ قرآن کے وقت اطاعتِ خداوندی کا طریقہ انفرادی تھا' کسی زاویہ یا کسی گوشہ میں عبادت کی رسوم ادا کر دی جاتی تھیں اور اس طرح انسان اور خدا کا براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا تھا۔ اطاعت خداوندی کا یہ طریقہ اب بھی تمام مذاہب ہیں مروج ہے۔ یہ صرف پرائیویٹ عقیدہ ہوتا ہے اور چونکہ مذہب کا کوئی علاقہ عملی زندگی سے نہیں ہوتا' اس لئے انہیں بھی زندگی گذارنے کے لئے کوئی نہ کوئی ضابطۂ حیات اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال ہمارے پڑوسی ملک بھارت کی ہے۔ وہاں کی ہندو آبادی اپنے مندروں میں جا کر مذہبی رسوم ادا کر لیتی ہے۔ لیکن دنیا میں عملی زندگی گذارنے کے لئے انہوں نے جمہوریت کا نظام اختیار کیا ہوا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے نزدیک اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر اختلافات رونما ہوں ان کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کرایا جائے۔ قرآن کریم کی رو سے فیصلہ کرانے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی ایک ایسا مقام ہو کہ جہاں سے نہ صرف اس کی رو سے فیصلہ کرایا جاسکے بلکہ وہاں سے وہ فیصلہ Implement بھی کرایا جاسکے۔ اس صورت حال میں مذہب میں تو ہر شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے' لیکن دین میں اس کی اطاعت اجتماعی طور پر کی جاتی ہے۔ مذہب میں اطاعت کے لئے' صرف خدا کی کتاب کافی ہوتی ہے۔ جبکہ دین میں خدا کی اطاعت کے لئے کتاب کے علاوہ کسی زندہ اتھارٹی' حاکم اعلیٰ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ اسلام دین ہے ایک ضابطۂ حیات ہے' مذہب نہیں ہے'

اس لئے اس میں صرف اکیلی کتاب کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے۔ رسول چونکہ وہ قوانین واحکامات جاری کرتا تھا' اس۔ لئے رسول کی اطاعت ضروری ہوتی تھی۔ جو لوگ رسول کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتے اور اطاعت کے لئے صرف قرآن کافی سمجھتے ہیں وہ اسلام کو دین کی بجائے مذہب کی سطح پر لے آتے ہیں کیونکہ اسلام کا نظام وقتی یا ہنگامی نہیں تھا اس لئے یہ اصول رسول کے بعد ان کے جانشینوں پر بھی خود بخود منطبق ہو جاتا ہے کہ چونکہ رسول کے جانشین رسول کے بعد اللہ کے احکام وقوانین جاری کرتے ہیں' اس لئے رسول کے بعد ان کی اطاعت' اللہ در سول کی اطاعت ہو جاتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیماً (۴/۶۴).

پس اے رسول تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوشی خوشی اس کو مان لیں۔

اس بات پر اصرار کرنے کے لئے کہ اللہ کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی اطاعت صرف نظام کی معرفت ہوتی ہے اور چونکہ رسول اس نظام کے سربراہ ہوتے ہیں اس لئے ہر فیصلہ کا تصفیہ ان سے کرانا لازمی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول رایت المنافقین یصدون عنک صدوداً (۴/۶۱).

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو کتاب نازل کی ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف رجوع کرو تو منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کس طرح منہ پھیر لیتے ہیں۔

اگر دین کا تصور صحیح طور پر سامنے ہو تو آیات کا مفہوم واضح ہے۔ دو سابقہ آیات کا مفہوم بطور دین

پیش کیا گیا ہے اور دو آیات کا مفہوم بطور دین اور مذہب (صرف اسی موضوع سے متعلق) ملاحظہ فرمائیں۔ تا کہ آپ کو خود بھی مذہب اور دین کا فرق معلوم ہو جائے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جائوك فاستغفروالله و استغفرلهم الرسول لوجدوا الله تواباً رحيما (۴/۶۴)۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ:

اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا تیرے پاس آتے پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو اللہ کو معاف کرنے والا پاتے۔

اس کی مروجہ تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) تفسیر القرآن مصنفہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی میں تحریر ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ جس رسول کو اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے سو اسی غرض کے لئے بھیجتا ہے کہ اللہ کے حکم کے موافق بندے ان کے کہنے کو مانیں تو اب ضرور تھا کہ یہ لوگ رسول کے ارشاد کو بلا تامل پہلے ہی دل و جان سے تسلیم کرتے اور اگر گناہ اور برا کرنے کے بعد بھی متنبہ ہو جاتے اور اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کی معافی کی دعا کرتا تو پھر بھی حق تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالیتا مگر انہوں نے تو غضب یہ کیا کہ اول تو رسول اللہ کے حکم سے جو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا ہٹے اور بچے پھر جب اس کا وبال ان پر پڑا تو اب بھی متنبہ اور تائب نہ ہوئے بلکہ لگے جھوٹی قسمیں کھانے اور تاویلیں گھڑنے پھر ایسوں کی مغفرت ہو تو کیونکر ہو؟ صفحہ ۱۱۵۔

(۲) فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ان کے لئے اس کی اصلاح اور اس کے عواقب سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ وہ رسول کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے' خدا سے مغفرت کے طالب ہوتے اور رسول بھی ان کے لئے دعائے مغفرت کے ذریعہ سے ان کی سفارش کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا اور ان پر رحم فرماتا۔ اس کے سوا اس کی تلافی کی کوئی اور شکل نہیں۔ (تدبر قرآن' جلد ۲' صفحہ ۳۲۹)۔

(۳) یہ آیت توسل کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔استغفار ایک دعا ہی ہے اس کے لئے براہ راست اللہ سے دعا کافی ہونا چاہئے مگر اس کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ پیغمبر کے پاس آ کے استغفار کریں اور پیغمبران کے لئے خدا کی بارگاہ میں دعائے مغفرت کریں۔بس یہی ہے ہر اس دعا کا مطلب جو کسی مقرب الٰہی کے روضہ پر جا کر کی جاتی ہے۔دعا کو قبول کرنے والا اصل میں خداوند عالم ہی ہے مگر اس شخص کا جو کوئی دینی اہمیت رکھتا ہے وسیلہ اختیار کرنا اس دعا کو قبولیت کی منزل سے قریب کرنے کا باعث ہوتا ہے۔(فصل الخطاب' جلد دوم' صفحہ ۲۳۰)۔

(۴) اور جب انہوں نے خود اپنا نقصان کر لیا تھا۔آپ کے پاس آ جاتے۔یعنی یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آپ کے پاس آئے ہیں اور اللہ سے معافی کے طالب ہوتے اور رسول بھی ان کے لئے معافی کے طلب گار ہوتے۔تو جان لیجئے کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔(تفسیر مظہری' جلد ۳' صفحہ ۱۰۱)۔

(۵) واگر این منافقان آن ہنگام کہ ستم کردندبر نفسہائے خود باانکار حکم تو یابہ تحاکم الی الطاغوت بیامدندی بحضرت تو بس طلب آمرزش کردندی از خدا و طلب آمرزش خواستی برائی ایشاں رسول یعنی شفاعت کروی ایشاں را ہر آئینہ یا فتندی یعنی دانستندی خدارا قبول کنندۂ توبۂ گناہگاران مہربان بآمرزش تائبان۔ (۴ تفسیر حسینی صفحہ ۱۸۹)۔

اب آپ اس آیۂ کریمہ کا دینی تصور ملاحظہ فرمائیں' پہلے الفاظ کی وضاحت پیش خدمت ہے۔

اذظلموا انفسھم۔ جب وہ آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کریں۔

فاستغفروا اللہ۔ اللہ کے قانون سے بچاؤ طلب کریں۔فاستغفرو اللہ کے یہ معنی غلط ہیں کہ وہ لوگ رسول کے پاس آ کر تسبیح لے کر بیٹھ جائیں اور استغفار کی تسبیح پڑھنے

لگیں۔

استغفر لهم الرسول۔ کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ کا رسول مطاع (حکم) کی حیثیت سے تنازعہ کا فیصلہ کر کے ان کے لئے بچاؤ طلب کرے' یہ معنی ہرگز نہیں کہ جن پر زیادتی ہوئی وہ اور رسول استغفار کا وظیفہ شروع کر دیں۔

لو جدوا الله تواباً رحيما۔ جب قرآنی حکومت اللہ کے قانون کے مطابق زیادتی کرنے والے کو سزا دیدے' تو قرآنی حکومت اس جرم کو معاف کر دے گی۔

اگر کوئی شخص کسی آدمی کا حق چھین لے یعنی اگر وہ کسی کے سو روپے دبا کر بیٹھ جائے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا شروع کر دے تو وہ خواہ ساری رات استغفار پڑھتا رہے' اس کا جرم اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح اگر ایسے شخص کے لئے اللہ کے رسول بھی استغفار کرتے رہے ہوں' تو پھر بھی اس کا جرم اللہ کی طرف سے معاف نہیں ہوگا۔ جب تک کہ وہ مال واپس نہ کر دے۔ چنانچہ آیۂ کریمہ میں باہم ظلم و زیادتیوں کا ایک ہی حل بتایا گیا ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور اللہ کے قانون کے مطابق انصاف کا طلب گار ہو۔ اللہ کا رسول قانون خداوندی کے مطابق ظالم کو بھی بلائے گا اور الگ الگ ان کے بیان سن کر حق دار کو اس کا حق دلا دے گا' تو اس کے بعد ہوگا اللہ معاف کرنے والا مہربان۔ نیز اس مجرم پر اس جرم کے سلسلہ میں دنیا کے علاوہ قیامت کی عدالتِ عالیہ میں بھی کوئی بوجھ باقی نہیں ہوگا۔ (اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے ذہن کے مطابق خدا کی اطاعت' اطاعت خداوندی نہیں کہلا سکتی اس۔ لئے) اگر کوئی شخص' خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی سے اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے اور اس کے بعد اس پر نادم ہو تو (خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق کے نظریہ کے ماتحت) وہ اپنے گھر میں بیٹھا توبہ کرے گا اور خدا سے معافی مانگ لے گا۔ لیکن دین کے نظام میں اس کی شکل مختلف ہوگی اس میں اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ (اے رسول) تمہارے پاس آئے اور اپنی لغزش کی سزا سے بچنے کے لئے قانون خداوندی سے حفاظت طلب کرے (اسے معافی مانگنا کہتے ہیں)۔

یہ معافی تم (اے رسول) ذاتی طور پر نہیں دے سکتے۔اس کی معافی قانونِ خداوندی کی رو سے ہوگی۔اس کے لئے تم دیکھو کہ قانون خداوندی میں اس معافی کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر گنجائش ہو تو تم اسے معافی دے دو۔

اس معافی کا حکم اگرچہ تمہاری طرف سے صادر ہوگا' لیکن درحقیقت خدا کی طرف سے معافی ہوگی۔ کیونکہ قانون خداوندی میں اس کی گنجائش نہ ہوتی تو تم معافی نہیں دے سکتے تھے۔

تم نے دیکھا کہ دین کے نظام میں مجرم' رسول اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔ نہ مجرم براہ راست خدا سے معافی طلب کر سکتا ہے نہ خدا اسے براہ راست معافی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے نظام کی وساطت سے ہوتا ہے جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے۔اور جب یہ نظام اسے معافی دیتا ہے تو یہ معافی اس نظام کی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ یہ اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔(مفہوم القرآن۔مصنفہ پرویز' صفحہ ۱۹۹)۔

آیات کی مذہبی اور دینی تفسیر آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ سارا تفسیری لٹریچر اسی باہمی تفاوت سے بھرا پڑا ہے۔ جو گروہ بھی اقامتِ دین کے لئے کوشش کناں ہوگا اسے اس دقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حیرت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں پاکستان میں' وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جو جماعتیں اقامتِ دین کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہیں وہ بھی ان آیات کی سابقہ تشریح کو' جو مذہب کی رو سے کی گئی ہے' من وعن تسلیم کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ایران میں جہاں کہ بزعم خویش اسلامی نظام قائم کر دیا گیا ہے' وہاں بھی ان آیات کا سابقہ مفہوم قبول کیا گیا ہے۔ایران کا زمانۂ حال کا تحریر کردہ لٹریچر' جتنا کچھ بھی یہاں آیا ہے' اسکے مطالعہ سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سب کا سب مذہب کی ترجمانی کر رہا ہے نہ کہ دین کی۔

نیز ارشاد ہوتا ہے۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شی فردوہ الی اللہ و الرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم

الاخر (۴/۵۹)۔

خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اطاعت کرو اور جو تم میں سے صاحبانِ اختیار ہوں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم میں کسی بات میں جھگڑا ہو پس اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہو تو اس میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

اس آیۂ کریمہ میں پھر اس بات پر اصرار ہے کہ نظام کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ و یوم آخرت پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اپنے سارے فیصلے اللہ و رسول سے کرائے جائیں۔

اس آیۂ کریمہ میں جو بات نہایت غور کی متقاضی ہے وہ ردّوہ الی اللہ و الرسول کا طریقہ ہے اور یہاں سے ہی وہ لغزش لگتی ہے جس سے دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں اسلامی نظام کا پورا نقشہ دے دیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ کے دیئے ہوئے قوانین کو رسول جاری کرتا ہے' اس لئے ان قوانین کی اطاعت' اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ کا دیا ہوا نظام جس کو حضور ﷺ نے عملاً جاری فرمایا تھا اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضور ﷺ نے یہ نظام شروع شروع میں مدینہ شریف میں جاری فرمایا اور چند سال کے اندر اندر یہ نظام سارے عرب شریف میں وسیع ہو گیا۔ اس نظام میں تمام جھگڑوں کے فیصلے کے لئے حضور ﷺ کے پاس آنا ضروری تھا۔ لیکن جب وہ نظام تمام عرب شریف میں پھیل گیا تو لوگوں کے لئے مدینہ شریف آنا مشکل ہو گیا۔ فلہٰذا حضور ﷺ نے ہر علاقہ کے لئے مقامی حکام مقرر فرما دیئے۔ ان مقامی افسران کی اطاعت بھی اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ لیکن اس میں ایک اہم فرق یہ تھا کہ مقامی افسران کا فیصلہ حتمی' قطعی (Final) نہیں ہوتا تھا بلکہ ان فیصلوں کی اپیل مرکز میں حضور ﷺ کے سامنے کی جا سکتی تھی۔ ان ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف مرکز میں اپیل ہو سکتی تھی یہ ہے مطلب فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ و الرسول کا۔ اور چونکہ یہ نظام وقتی نہیں تھا' اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہنا تھا اس لئے

حضورﷺ کے بعد ردوہ الی اللہ و الرسول سے مراد حضورﷺ کے جانشینوں کی طرف فیصلوں کے لئے رجوع کرنے کا حکم تھا جو کہ ایک زندہ اتھارٹی کی حیثیت سے اس تنازع کا فیصلے کرے اور اس کو نافذ کر دے۔ آیہ کریمہ کا یہ مفہوم دین کی حیثیت سے ہے' اب اس کا روایتی مذہبی مفہوم ملاحظہ کریں۔

(۱) فردوہ الی اللہ و الرسول ۔ تو اس مسئلہ کو اللہ کی طرف یعنی اللہ کی کتاب کی طرف موڑ و اور رسول کی طرف پھیرو جب تک وہ زندہ ہے اور وفات کے بعد ان کی سنت کی طرف رجوع کرو۔ (اور یہاں سے ہی دین مذہب میں بدل جاتا ہے۔ یعنی جانشین جو کہ زندہ ہے اتھارٹی ہے۔ اس کی بجائے سنت یعنی کتب روایات کی طرف رجوع کرو۔ قوسین راقم سطور کی طرف سے ہیں)۔ (تفسیر مظہری' جلد ۳' صفحہ ۹۷)۔

(۲) اور اگر تم میں اور اولوالامر میں باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ و رسول کے حکم کے مطابق ہے یا مخالف تو اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف رجوع کر کے طے کر لیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ و رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف۔ (تفسیر قرآن' از حضرت العلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی)۔

(۳) رد الی اللہ و الرسول کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی امر شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔ (تدبر قرآن' جلد ۲' صفحہ ۳۲۵)۔

(۴) فردہ الی اللہ پس باز گرد انید آنرابہ کتاب خدا و الرسول و رجوع کنید بارسول درزمان حیات او و سنت انحضرت بعد از وفات او۔ (تفسیر حسنی' صفحہ ۱۸۷)۔

ان اقتباسات کو آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ان میں اللہ سے مراد قرآن کریم اور رسول

سے مراد سنت رسول اور عملاً کتب روایات ہیں۔ یعنی اطاعت رسول کا یہ طریقہ ہے کہ حضورﷺ کے بعد جو کوئی بھی ان کے نام سے کچھ کہہ دے اس کی اطاعت کر دی جائے۔ اب آپ اس آیہ کریمہ کا مفہوم بطور دین ملاحظہ فرمائیں اور اس کے بعد قرآنی مفاہیم کی تائید میں قرآنی دلائل پیش کئے جائیں گے۔

''نیز یہ بھی ضروری ہے کہ تم اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے رسول نے قائم کیا ہے اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگان حکومت (افسرانِ ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور افسران ماتحت میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس کے لئے مرکز کی طرف رجوع کرو۔ یعنی افسران ماتحت کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو۔ جو اس معاملہ کا قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کر دے گی (۴۲/۱۰)۔ مرکزی اتھارٹی کے فیصلہ کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی اس کا فیصلہ آخری ہو گا اور چونکہ وہ فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہو گا جس پر تم ایمان رکھتے ہو اس لئے اس فیصلہ کو بطیب خاطر تسلیم کرو۔ اس کے خلاف دل میں کوئی گرانی محسوس نہ کرو (۴/۶۵)۔ یہ شہادت ہو گی اس بات کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطۂ حیات اور قانونِ مکافات عمل اور حیات اخروی پر یقین رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ اور انجام کار معاشرہ کا صحیح صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہو گی۔ (مفہوم القرآن مصنفہ پرویز صفحہ ۱۹۷)۔

جو بات اسلام کو دین کے بجائے مذہب میں تبدیل کر دیتی ہے وہ صرف یہی ایک بات ہے کہ آیا اللہ و رسول کی اطاعت انفرادی طور پر صرف مجرد قرآن و حدیث سے کی جاسکتی ہے یا اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم کا یہی حکم ہے کہ ان احکامات کی اطاعت کرانے والا ضرور موجود ہونا چاہئے۔ کتابوں کی ازخود اطاعت مذہب میں ہوتی ہے۔ دین میں ممکن نہیں۔ دین میں تو ایک اتھارٹی ان احکامات کو نافذ کرتی ہے۔ مومنین ان کو سنتے ہیں اور پھر ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ احکامات خداوندی کی اطاعت سے پہلے ان کی

سماعت لازمی و لابدی چیز ہے۔ جب قرآن کریم نے اطاعت کے لئے سماعت کو اس کا Pre-requisite قرار دیا ہے تو پھر بغیر ایک ناطق اتھارٹی یا ایک حاکم اعلیٰ کی موجودگی کے سماعت واطاعت کیسے ہوسکتی ہے۔ سماعت کی شرط کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا و الیک المصیر (۲/۲۸۵)۔

اور کہنے لگے (اے ہمارے پروردگار) ہم نے سنا اور مان لیا۔ پروردگار ہمیں تیری مغفرت کی خواہش ہے۔

(۲) یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون (۸/۲۰)۔

اے ایمان والو۔ خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔

(۳) انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا و اطعنا و اولٰئک ھم المفلحون (۲۴/۵۱)۔

ایمان داروں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو خدا اور اس کے رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کر دیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم) سنا اور مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(۴) فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا و اطیعوا و انفقوا خیراً لانفسکم ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون (۶۴/۱۶)۔

تو جہاں تک تم سے بن پڑے خدا سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو۔ اور جو شخص اپنے نفس کی حرص سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مرادیں پانے والے ہیں۔

(۵) اذ قلتم سمعنا و اطعنا و اتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور (۵/۷)۔

جب تم نے یہ کہا تھا کہ ہم نے (احکامِ خدا کو) سنا اور مان لیا اور خدا سے ڈرتے رہو' کیونکہ خدا دلوں کے اسرار سے باخبر ہے۔

ایک بات یہ بھی حیرانی کی ہے کہ آیہ کریمہ (۴/۵۹) میں ہمارے علماء کرام اولی الامر کو تو زندہ قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر وہ زندہ نہ ہوں تو پھر ان سے تنازعہ کیسا اور اللہ و رسول کی جگہ زندہ شخصیت کی بجائے کتابوں کو ان کا قائم مقام بنا دیتے ہیں۔ یہ نہایت ہی تعجب انگیز بات ہے یا للعجب۔

جہاں تک اطاعت کی اس شکل کا تعلق ہے جو ہم عبادت و رسوم کی صورت میں انفرادی طور پر ادا کرتے ہیں جیسے نماز' روزہ' زکوٰۃ وغیرہ تو یہ بھی آج کل مذہب کی شکل میں ہی ادا کی جاتی ہیں۔ دین میں یہ سب بھی نظام کے ماتحت ادا ہوتی ہیں۔ چونکہ نظام کے ماتحت ہی اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ صلوٰۃ' زکوٰۃ' روزہ' حج' جہاد' اجتہاد' یہ سب نظام کے ماتحت ہوتے ہیں جن میں سب سے پہلے صلوٰۃ و زکوٰۃ آتی ہیں۔ ان کے متعلق سورہ حج میں ارشاد ہوتا ہے۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و آتو الزکوٰۃ (۲۲/۲۴)۔

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ۔

اس آیہ کریمہ کی رو سے ان دونوں چیزوں کے لئے تمکن نظام' شرط قرار دی گئی ہے۔ اس آیہ کریمہ کے دو ترجمے ہو ہی نہیں سکتے۔ اس میں انْ صرف شرط ہے جو تمکن نظام کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اس سے مفر ہو ہی نہیں سکتا۔ آیت اس درجہ واضح ہے کہ تاویل کی کوئی راہ نہیں چھوڑتی۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے فتح الرحمٰن میں تحریر فرمایا ہے۔

آنانان را کہ اگر دست رس دہم ایشانرا درزمین برپاد ارند نماز را و

بدہند زکوٰۃ را۔

اس آیت کے ذیل میں تفسیر حسینی میں مرقوم ہے۔

اگر جائے دہیم ایشان را در زمین و دستگاہ و اختیار یابند' بپائے دارند نماز را بحیثیت تعظیم من وبدہند زکوۃ مال را بحیثیت مساعدت بندگان من۔

آپ اس آیہ کریمہ کی تشریح وتفسیر میں ۵۰ مزید تفاسیر ملاحظہ فرمالیں کوئی مفسر اس سے نہیں سرک سکتا کہ صلوٰۃ وزکوٰۃ کے لئے تمکنِ نظام لازمی ہے۔ مفسرین خواہ اس شرط سے نکلنے کے لئے کتنے ہی ہاتھ پاؤں کیوں نہ ماریں' یہ شرط' تمکنِ نظام کی' وہ نظرانداز Ignore نہیں کر سکتے۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ نظام کے ماتحت ہی ادا ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی' انہیں اقتدار حاصل ہوگیا' یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور یہ تمام نوع انسانی کو سامانِ نشوونما پہنچائیں گے۔

نیز یہ کہ حضورﷺ کو حکم تھا کہ جب وہ خود موجود ہوں تو صلوٰۃ کی امامت وہ خود فرمائیں۔

واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ (۴/۱۰۲)۔

جب تم مسلمانوں میں موجود ہو تو تم ان میں صلوٰۃ قائم کرو۔

اس آیہ کریمہ کے اگلے حصہ میں صلوٰۃ کی وہ شکل بیان کی گئی ہے جو میدان جنگ میں اختیار کی جاتی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کی یہ تدبیر بتائی گئی ہے کہ ایک گروہ اسلحہ کے ساتھ حضورﷺ کی اقتداء میں نماز ادا کرے' دوسرا گروہ حفاظت کا فریضہ ادا کرتا رہے جب فوج کا پہلا حصہ سجدہ کر چکے تو وہ پیچھے ہٹ کر حفاظت ونگرانی کا کام شروع کر دے اور دوسرا گروہ جس نے اب تک نماز نہیں پڑھی تھی وہ حضورﷺ کے پیچھے اسی مسلح حالت میں نماز ادا کر دے۔ نماز دونوں گروہ حضورﷺ کے پیچھے ادا کریں گے کوئی شخص حضورﷺ کی اقتداء کے بغیر نماز ادا نہیں کر سکے گا۔ اس آیہ کریمہ میں ''معک''

کا لفظ دو بار استعمال کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کی موجودگی میں نہ کوئی امیرِ صلوٰۃ ہوسکتا تھا نہ کوئی انفرادی نماز براہ راست پڑھ سکتا تھا اور نہ کوئی براہ راست اللہ کی اطاعت کرسکتا تھا۔

آج ہمارے دور میں تو جنگ کی صورت ہی بالکل مختلف ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے حالات کے تقاضے کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ کی جو شکل اختیار کی جائے وہ جائز ہوگی۔ اس آیہ کریمہ میں صرف اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ صلوٰۃ کے لئے شرط ہے کہ جب آپؐ موجود ہوں تو آپ کی موجودگی میں اور کوئی شخص امیرِ صلوٰۃ نہیں ہوسکتا اور آپؐ کے بعد امیرِ جنگ یا سپہ سالار فوج جسے خود آپؐ نے مقرر کیا ہو وہ امیرِ صلوٰۃ ہو کر صلوٰۃ ادا کرائے۔ ہمارے ہاں جو آج کل محلّہ کے نمازیوں کے مقرر کردہ امام نماز ادا کرتے ہیں تو یہ مذہب کی نماز ہے۔ یہ دین کی صلوٰۃ نہیں ہے جس میں امامت کرنا عمال حکومت کا فریضہ ہوگا۔

سورۂ حج کی مندرجہ بالا آیہ کریمہ کی روشنی میں جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے تو اسلامی حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ۔۔ زکوٰۃ دینا ہے۔ یعنی افراد معاشرہ کو سامانِ نشو ونماء عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی Revenue کو زکوٰۃ کہا جاسکتا ہے جسے وہ افراد معاشرہ اور اس کے بعد پوری نوع انسانی کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی اور لوگوں کی آمدنی میں سے کس قدر لے گی اور کس قدر لوگوں کو دے گی' اس کا تعین حکومتِ اسلامی وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق متعین کرے گی۔ زکوٰۃ کسی خاص ٹیکس کا نام نہیں ہے۔ اس پر انفرادی طور پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا پورا Process نظام کی تحویل میں ہوتا ہے۔

یہ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں منکرین زکوٰۃ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے تو اس کی بھی اصل یہ نہیں تھی جو بیان کی جاتی ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے۔ بلکہ اس واقعہ کی اصل حقیقت یہ تھی کہ ان لوگوں (اہل یمن) کا موقف یہ تھا کہ وہ اپنی ساری آمدنی (زکوٰۃ) صرف اپنے صوبہ یمن میں خرچ کریں' یمن کے علاوہ اور کسی جگہ یہ خرچ نہ ہو' جبکہ حضرت ابوبکرؓ کا اصرار تھا

کہ Revenues پہلے مرکز میں مدینہ شریف آئیں اور پھر مرکز اپنی صوابدید کے مطابق اس رقم (زکوٰۃ) کو خرچ کرے' خواہ ان کی پوری کی پوری رقم واپس یمن چلی جائے لیکن ایک مرتبہ اس کا مرکز میں داخل کرنا ضروری تھا۔ اسی وجہ سے ہماری کتب روایات و تواریخ میں ان کو منکرین زکوٰۃ کے بجائے مانعین زکوٰۃ کہا گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ مرکز کو مضبوط رکھنا چاہتے تھے۔

اجتماعات حج کے انعقاد اور نظم و نسق کا فریضہ بھی مسلم ممالک کی حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ یہ عالم اسلامی کا وہ عالم گیر اجتماع ہے جو امت مسلمہ کے مرکز کعبہ شریف میں اس غرض سے منعقد کیا جاتا ہے کہ امت کے مسائل کا حل قرآن کریم کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔ جو تجاویز متفقہ طور پر طے ہوئی ہوں گی۔ حج کے آخر میں امام کعبہ ان کا سال بہ سال اعلان کرے گا۔ اور سال بھر مسلم ممالک کی حکومتیں ان پر عمل درآمد کریں گی۔ حج کے وفود حکومت کی سرکردگی میں جائیں گے' جیسا کہ ۹ ہجری کا حج حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امارت میں ادا ہوا تھا۔ باقی رہا جہاد' تو جہاد تو حکومت اسلامی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ جہاد کے لئے اولیں شرط ہے کہ پہلے اسلامی حکومت اس کا برملا اعلان کرے' چوری چھپے' خفیہ طور پر' فرداً فرداً جہاد نہیں ہوسکتا۔

سورۃ توبہ میں ان اللہ یحب المتقین (۹/۴) کی تفسیر کے سلسلہ میں' تدبر قرآن' میں مرقوم ہے۔

''(اس آیت) میں جس تقویٰ کا ذکر ہے' یہ انفرادی تقویٰ نہیں بلکہ اجتماعی و سیاسی تقویٰ ہے۔ اسلام جس طرح ہر شخص سے انفرادی تقویٰ کا مطالبہ بھی کرتا ہے اسی طرح مسلمانوں سے من حیث الجماعت اجتماعی اور سیاسی تقویٰ کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ یعنی مسلمان دوسری قوموں سے جو معاملات اور معاہدات کریں ان میں راست باز' صداقت شعار اور وفادار رہیں' کسی عہد اور قول و قرار کی کوئی ادنیٰ خلاف ورزی نہ کریں۔ خدا ایسے ہی متقیوں کو دوست رکھتا ہے اور خدا جن کو دوست رکھتا ہے وہی دنیا و آخرت میں برومند اور فائز المرام ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن' جلد ۳' صفحہ ۵۳۹)۔

تقویٰ تو پیدا ہی اسلامی حکومت کی اطاعت وفرمانبرداری سے ہوتا ہے۔ جو شخص جس قدر اسلامی حکومت کے احکامات کی بجا آوری کرے گا' اسی درجہ اس کا تقویٰ بڑھتا چلا جائے گا۔

دعا کی بھی یہی صورت ہے۔ دعا میں ایک پہلو تو دعا کرنے والے کی ذاتی تسکین وتسلی سے متعلق ہوتا ہے لیکن حقیقی معنے اس کے قانون خداوندی سے مدد مانگنا اور اس کے احکام وقوانین کی اطاعت کرنا ہے۔ اسی دعا کا حکم حضور علیہ السلام کو دیا گیا تھا کہ قل انما ادعوا ربی ولا اشرك به احداً (۲۰/۷۲)۔ ان سے کہہ دو کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ یعنی اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ کیونکہ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی زیب دیتی ہے اور اسکی عملی شکل وہ ہے جو حضرت عمرؓ نے بیان فرمائی تھی کہ میں یہاں اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اس لئے بیٹھا ہوں کہ تمہاری دعاؤں کو اللہ تک جانے سے روک دوں' یعنی ان کو پورا کر دوں۔ اسلامی حکومت کا سربراہ' مملکت کے باشندوں کی دعائیں پوری کرتا ہے اور ان کی دعاؤں کا پورا کرنا اسلامی نظام کا فریضہ ہے اور اس طرح مومنین کی دعائیں پوری ہوتی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں عملاً یہ کچھ ہو بھی رہا تھا۔ افسوس کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کی وجہ سے یہ دور جلدی منقرض ہو گیا۔ اگر حضرت عمرؓ کو شہید نہ کیا جاتا اور انہیں دس پندرہ سال حکومت کرنے کے مل جاتے تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ عاش سعیداً ومات شہیداً رضی اللہ عنہ۔

مضمون آپ نے ملاحظہ فرمایا' ملخص اس کا صرف اتنا ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں کی جا سکتی' اس کی اطاعت اس نظام کی معرفت ہوتی ہے جو اس کا رسول قائم کرتا ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی خدا کی اطاعت صرف اور صرف اس نظام کے ماتحت ہو سکتی ہے جو حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا وہ نظام کوئی وقتی یا ہنگامی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے کے لئے تھا۔ اگر وہ نظام قائم نہیں ہے تو ہم اطاعت خداوندی جیسے فریضہ سے محروم ہیں۔ اس لئے ہم

سب پر اس نظام کا قائم کرنا ضروری ہے۔

(۳) نظام کے قیام میں یہ رکاوٹ ہے کہ جو آیات نظام کی متقاضی ہیں اور جن سے ایک جیتی جاگتی شخصیت اور ایک زندہ' ناطق' مرکز کے وجود پر دلالت ہوتی ہے' ان کی غلط تعبیر و توجیہہ کر کے' ان سے مراد کتب و روایات لے لی جاتی ہیں۔ جس کی عملی تعبیر یہ ہے کہ حضورﷺ کے بعد جو کوئی بھی ان کے نام سے کچھ کہہ دے ہم اس کی اطاعت کرنے لگیں۔ قرآن کریم حضورﷺ کا جانشین زندہ شخصیت' ایک ناطق مرکز قرار دیتا ہے۔ لیکن علماء کرام حضورﷺ کا جانشین کتب و روایات اور ایک صامت ذریعہ کو قرار دیتے ہیں۔

(۴) وہ انفرادی اطاعت جسے ہم 'عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ بھی نظام کے ماتحت ادا ہوتی ہیں بغیر نظام کے قیام کے ان کے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ غیر خداوندی نظام میں زندگی بسر کرنا حرام ہے کیونکہ قرآن کریم کے نزدیک تو مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد' مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو' وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور اس کے نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ازبسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر بخوشی رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے' باغی' نافرمان اور مجرم ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز روزوں کے پابند ہوں۔

و آخر دعواھم ان الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موقر ماہنامہ 'محدث' کی خدمتِ عالیہ میں

کمترین راقم سطور کے مضمون کے جواب میں پروفیسر (مولوی) محمد دین قاسمی صاحب کا ایک علمی اور سنجیدہ مقالہ '''محدث'' بابت اگست ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔ میں پروفیسر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے مضمون کو درخور اعتنا سمجھا اور اس پر تبصرہ تحریر فرمایا۔

مجھے اپنی اس خامی کے اعتراف کرنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی کہ میں بنیادی طور پر طبعاً مناظر واقع نہیں ہوا ہوں۔ میری طبیعت مناظرے سے ابا کرتی ہے۔ مناظرہ حق و باطل کا معیار نہیں ہوتا۔ یہ محض Mental Gymnastic ہوتا ہے اور اس سے مناظر کی انا (Ego) کو تسکین ہوتی ہے کہ میں نے مقابل کو ہرا دیا ہے۔ اس لئے اس مضمون میں پیش نظر مناظرہ ہے نہ خدانخواستہ اپنے بزرگ بھائی پروفیسر (مولوی) محمد دین قاسمی صاحب کو شکست دینے کا خیال۔ مقصد صرف احقاق حق اور ابطال باطل ہے جس کا طریقہ بھی پیش خدمت عالی کر دیا گیا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ پروفیسر صاحب عالم ہیں۔ ان کے مضامین سے یہ بات عیاں ہے۔ نظریات کا اختلاف اور ان کو کھل کے تحریر کرنا' علمی اعتبار سے ایک بڑی خوش آئند بات ہے۔ ہماری بدقسمتی کہ پاکستان میں ابھی اس درجہ رواداری کا ماحول پیدا نہیں ہو سکا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر یورپین ممالک' جنہیں ہم ہر وقت برا کہتے ہیں' ان میں اسی طرح کی رواداری برتی جاتی ہے اور یقیناً پروفیسر صاحب بھی اس سے واقف ہوں گے اور آپس میں عناد کیسا؟ ہم سب قرآن کے خادم و عاشق ہیں' مسلمانوں کے زوال و ادبار پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی ترقی و خوشحالی کے خواہاں ہیں۔ سب پاکستانی ہیں۔ صرف نظریات کے

اختلاف سے کیسی دشمنی اور کیسی مغائرت؟ ہم سب ایک ہیں اور امتِ واحدہ ہیں۔

راقم سطور بصد معذرت اپنے سابقہ مضامین کے دو اقتباسات تحریر کر رہا ہے۔ انہیں ملاحظہ فرمائیں۔ چونکہ ان کو پیش نظر لانے سے کوئی مفر نہیں' اس لئے مجبوراً ان کو تحریر کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔

''حدیث شریف کے سلسلہ میں اصل نقطۂ ماسکہ اس کی اہمیت وعظمت' اس کی شرعی و آئینی حیثیت' اس کی حفاظت اور صحت وسقم نہیں ہے بلکہ اصل مبحث اس کا وحی الٰہی قرار دینا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً علماء کرام وفقہائے عظام احادیث پر برابر مضامین تحریر کرتے چلے آرہے ہیں اور کتابوں پر کتابیں شائع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن کوئی صاحب تصنیف عالم تھوڑی دیر رک کر یہ نہیں سوچتا کہ اصل مبحث ہے کیا اور اس کا جواب کیا ہے؟ متذکرہ صدر موقر جریدہ میں بھی اس مسئلہ کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا اور صرف ایک مقام پر حضرت مولانا قاری محمد موسیٰ صاحب مدظلہ نے اس کا تذکرہ صفحہ ۲۱۸ پر فرمایا کہ: ''یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن کی طرح سنت وحدیث بھی منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو' مولانا روم کا شعر بھی تحریر فرمایا:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

جبکہ حضرت اقدس نے سنت نبوی کو حکمت اور وحی خفی قرار دیا ہے۔ (صفحہ ۲۱۹) حکمت کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی حضرت سے تسامح ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ علماء کرام اس نقطہ نگاہ سے واقف نہیں ہیں بلکہ حدیث کی ساری بحث میں یہ موضوع ایسا ہے کہ علماء کرام خوب واقف ہیں کہ ان کا یہ موقف نہایت کمزور اور انتہائی ضعیف ہے اور کسی طریقہ سے بھی احادیث جو عرصہ کے بعد جمع ومدون کی گئیں وحی ثابت

نہیں کی جاسکتیں اور وحی ثابت نہ ہونے کی صورت میں حدیث شریف کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل رسالہ میں حدیث پر جامع مضامین تحریر کئے گئے، عربوں کے حافظے کو سراہا گیا، جو بالکل غیر متعلقہ عنوان ہے، مگر اس مسئلہ کو صرف ایک جملہ بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ ساری بحث کا مرکز ومحور یہی ایک نقطہ ہے اور امت مسلمہ کو جس قدر نقصان اس غلط نظریہ سے ہوا اور کسی نظریہ سے نہیں ہوا۔ جبکہ حقیقتاً حدیث شریف کے وحی الٰہی نہ ہونے سے علماء کرام کی تیار کردہ ساری عمارت خاک کے تودہ کی طرح زمین بوس ہو جاتی ہے"۔ (مقتبس از "ماہنامہ محدث کے شمارہ انکار حدیث پر تبصرہ"۔ طبع شدہ "طلوع اسلام۔ اپریل ۲۰۰۳ء)

دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"وحی خفی کا عقیدہ ہمارے علمائے کرام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ صدر اول میں اس عقیدہ کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ تقریباً دوسو سال کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا۔ ہمارے علمائے کرام، پاکستان میں جس جس طبقۂ فکر کو استحقاراً و استخفافاً "منکرین حدیث" کے نام سے موسوم کرتے ہیں وحی خفی کا انکار ان سب میں مشترک ہے۔ اس طبقہ کا بیشتر حصہ حدیث کا منکر نہیں ہے۔ بلکہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو، اس کو سر آنکھوں پر جگہ دیتا ہے انکار حدیث کا الزام ان کے ذمہ غلط ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ حدیث کو وحی تسلیم کرنے پر کسی طرح بھی آمادہ نظر نہیں آتے۔ ہمارے علماء کرام نے ان نام نہاد "منکرین حدیث" کے خلاف تقریباً تین سو سے زیادہ کتب تصنیف فرمائی ہیں اور تقریباً ہر فرقہ نے ہی تصنیف کی ہیں۔ جن میں نام نہاد 'منکرین حدیث' کے ایک ایک نظریہ کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے۔ حدیث کی حمایت میں بہت تفصیل سے صحاح ستہ کے مصنفین کے حالات رقم کئے ہیں۔ عربوں کے حافظوں کی بڑی تعریف کی کہ ان کے حافظے اس قدر مضبوط تھے کہ انہوں نے احادیث کو نقل کرنے میں بہت کم غلطیاں کی

ہیں۔ اسماء الرجال کے متعلق بہت مواد مہیا کیا۔ لیکن اصل موضوع جو سب (نام نہاد) 'منکرین حدیث' کا اصل الاصول اور عروۃ الوثقیٰ ہے کہ حدیث وحی نہیں ہے اور 'وحی صرف قرآن میں ہے' اس موضوع پر کچھ تحریر کرنے سے ہمارے علماء کرام ہمیشہ بچتے رہے اور اجتناب کرتے رہے ہیں' کمترین راقم سطور نے اس موضوع پر ۶ مفصل مضامین تحریر کئے جو عرصہ دراز پیشتر 'طلوع اسلام' میں طبع ہوئے تھے' پھر گزشتہ دو سال قبل 'محدث' کے 'انکار حدیث نمبر' پر تبصرہ رسالہ ہذا میں طبع ہوا تھا۔ اس مضمون میں بھی راقم سطور نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہمارے علماء کرام حدیث کو وحی ثابت کرنے کے لئے مضمون تحریر کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ لیکن تاحال کسی رسالہ یا کتاب یا ''محدث'' میں ایسا مضمون تحریر نہیں کیا گیا جس میں حدیث کو وحی خفی ثابت کیا گیا ہو' اس مضمون میں پھر اسی درخواست کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام حدیث کے وحی ہونے پر کوئی ایسا جامع و مبسوط مضمون تحریر فرمائیں تاکہ نام نہاد 'منکرین حدیث' کو اپنے موقف پر دوبارہ غور کرنے کا موقع فراہم ہو''۔ (طلوع اسلام' مئی ۲۰۰۵ء' صفحہ ۲۹' ۳۰)۔

دونوں اقتباسات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ آپ نے خود ملاحظہ کیا کہ ان دونوں مضامین میں راقم سطور نے اس بات پر کس درجہ اصرار کیا ہے کہ حدیث شریف کو وحی ثابت کرنے کے لئے علماء کرام مضمون تحریر فرمائیں۔ لیکن اس تمام عرصہ میں ایک مضمون بھی اس موضوع پر کہیں نہیں آیا۔ یہ دونوں اقتباسات یقیناً پروفیسر صاحب کی نگاہ سے گذرے ہوں گے۔ پروفیسر صاحب کا موجودہ مضمون ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے میرے ایک ایک نظریہ اور خیال کی تردید بہت محنت سے فرمائی ہے۔ خصوصاً نسخ اور اطاعت رسول کے موضوع پر طویل بحث ہے۔ لیکن یہ دونوں عنوانات تو میرے مضمون کے موضوع ہی نہیں تھے۔ ان دونوں عنوانات پر طلوع اسلام میں الگ الگ بارہا مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اصل موضوع روایات کو وحی

ثابت کرنا ہے جس کے لئے محترم پروفیسر صاحب نے صرف دو پیراگراف چوبیس سطروں پر مشتمل تحریر فرمائے ہیں' ان میں بھی حضرت نے اپنی طرف سے ایک سطر کا بھی اضافہ نہیں کیا صرف حوالہ جات تحریر فرمائے ہیں۔

''وحی صرف قرآن میں ہے'' کوئی نیا موضوع نہیں ہے سابقہ دور میں معتزلہ اور امام ابو داؤد ظاہری کا فرقہ ظاہریہ اس نظریہ کے قائل تھے۔ موجودہ دور میں اس نظریہ پر سب سے پہلے مولوی محمد عبداللہ صاحب نے تحریری مواد فراہم کیا۔ ان کی تفسیر بنام ترجمۃ القرآن بآیات الفرقان ۱۹۰۶ء میں اسلامیہ حمیدیہ سٹیم پریس' لاہور سے طبع ہوئی۔ علماء اہل قرآن میں سے مشہور عالم' خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری کی تفسیر ''بیان للناس'' ۱۹۱۵ء میں طبع ہوئی۔ ان ہی اہل قرآن حضرات کی جماعت امت مسلمہ اہل الذکر و القرآن' ۱۹۲۶ء میں امرتسر میں قائم ہوئی۔ ڈاکٹر برکت علی قریشی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اس کے صدر اور مشہور و معروف علمی شخصیت پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم' اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ میاں مولا بخش' حکیم شہاب الدین اور علامہ حکیم محمد حسین عرشی مرحوم نے مل کر مشہور رسالہ ''بلاغ'' ۱۹۲۴ء سے امرتسر میں جاری کیا۔

ادھر لاہور میں 'اشاعت القرآن' نام کا رسالہ مولوی حشمت علی صاحب ایڈٹ کرتے رہے۔ حکیم فیروز الدین لغرائی کے شدید اصرار پر مولوی ثناء اللہ صاحب اور خواجہ احمد الدین امرتسری صاحب کے مابین قلمی مباحثہ ہوا جس کا موضوع 'وحی صرف قرآن میں ہے' تھا۔ اس مباحثہ کی شرائط میں طے ہوا تھا کہ دونوں حضرات کی طرف سے چار چار پرچے ارسال ہوں گے اور ان کے اندر اندر موضوع کا فیصلہ کرنا ہے۔ مگر افسوس کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے صرف دو پرچے ارسال فرمائے اور اس کے بعد پرچہ ارسال کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کی کیا وجوہات ہوں گی' یہ راقم سطور کو معلوم نہیں کیونکہ یہ واقعہ راقم سطور اور اس کے بھائی محمد دین قاسم' صاحب کی پیدائش سے پیشتر کا ہے۔

یہاں اس نظریہ کی تاریخ Trace کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف مختصر طور پر یہ تحریر کرنا

مناسب سمجھا گیا ہے کہ یہ نظریہ کوئی دو چار سال کا نہیں ہے' بلکہ تقریباً ایک سو سال سے یہ نظریہ فروغ پا رہا ہے۔ اگر چہ اس نقطۂ نظر کے خلاف چاروں طرف سے یلغار ہے اور کوئی باقاعدہ جماعت یا تحریک اس کی ترویج میں حصہ نہیں لے رہی ہے' لیکن یہ نظریہ اپنی صداقت وحقانیت کی وجہ سے اپنے Momentum (حرکتِ درونی) کے زور پر خود بخود اشاعت پذیر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس نظریہ کی موافقت میں ہزاروں ہزار مضامین تحریر کئے جا چکے ہیں' تفاسیر تحریر کی جا چکی ہیں' لیکن اس کا جواب دینے میں علماء اہل روایات کی طرف سے ہمیشہ گریز کیا جاتا رہا ہے۔ ایک سو سال کے عرصہ پر محیط لٹریچر کے جواب میں' میرے بزرگ دوست جناب پروفیسر قاسمی صاحب نے ایک تو جناب مولانا مودودی صاحب اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے قلمی مباحثہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اس وقت وہ رسالہ میرے پاس موجود نہیں ہے' عرصہ ہوا پڑھا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اس مباحثہ کا موضوع 'سنت کی آئینی حیثیت' تھا۔ اس سارے مباحثہ میں ایک لفظ بھی 'حدیث وحی ہے' کے موضوع پر نہیں تھا۔ جہاں تک جناب قاسمی صاحب نے انکار حدیث نمبر میں 'اس موضوع پر شائع ہونے والے ۷۰۰ کے لگ بھگ مقالات کی فہرست کے متعلق تحریر فرمایا ہے تو نہایت حیرت واستعجاب کی بات ہے کہ ان ۷۰۰ مقالات میں ایک مقالہ بھی 'حدیث وحی ہے' کے موضوع پر نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ قاسمی صاحب جیسے لوگ کیسے اس درجہ علمی بددیانتی کا ارتکاب کر دیتے ہیں اور کس طرح قارئین کو مغالطہ دیتے ہیں۔ وہ فہرست طبع شدہ ہے ہر شخص وہ پڑھ کے اس علمی بددیانتی Intellectual Dishonesty کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اس فہرست میں وہی مضامین۔ 'انکار حدیث'۔ 'مرکز ملت'۔ 'قرآن واطاعت رسول'۔ 'حفاظت حدیث کا اہتمام'۔ 'علم اصول حدیث اور اس کا ارتقاء'۔ 'نقد حدیث کے لئے روایت کے اصول'۔ 'منکرین حدیث کے جمعہ کا جواب'۔ 'منکرین حدیث کے اوچھے حملے'۔ وغیرہ عنوانات پر مضامین میں بہت بلند وپراثر نام ہیں۔

اسماء سمیتموھا انتم و آباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان

(۵۳/۲۳)۔

الفاظ بلند اور معانی میں ہو پستی
فائز اسے اردوئے معلّٰی نہیں کہتے

یہ تمام مضامین نہایت محنت وخلوص سے تحریر کردہ ہیں۔لیکن پھر وہی افسوس کی بات ہے کہ اصل موضوع ان ۷۰۰ مضامین میں کسی ایک مضمون میں بھی زیر بحث نہیں آیا۔آپ اسے 'یا کہیں گے کہ یہ اتفاق کی بات ہے یا عمداً گریز ہے؟

البتہ جہاں تک مبارک پوری صاحب کے مضمون کا تعلق ہے' یہ میری کمزوری ہے کہ وہ میری نگاہ سے نہیں گزرا۔یقیناً یہ رسالہ میرے لئے نہایت گرانقدر ہے۔کمترین اس کو محدث کے دفتر سے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

راقم سطور پورے تیس سال ایسے محکمہ سے منسلک رہا جس میں علمائے کرام کی ریل پیل تھی۔علمائے کرام کی دل بھر کے خدمت کی اور دل بھر کے ان سے محبت کی۔کیونکہ میری بھی ساری عمر دینی مدارس کے ساتھ ہی گزری ہے اور شیخ الکل فی الکل' امام القراء' قاری اظہار احمد صاحب تھانوی سے تلمذ کی سعادت رہی۔مولانا عبدالقادر آزاد' مولانا روپڑی' مولانا عرفانی وغیرھم سے برادرانہ مراسم رہے۔چونکہ ان بزرگوں سے قرآنی نظریات کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی تھی اس لئے ان بزرگوں نے سخت اصرار کیا کہ میں قرآنی نظریہ کے متعلق ایک مضمون تحریر کروں۔ان کے اصرار شدید پر میں نے 'وحی صرف قرآن میں ہے' کا پہلا حصہ تحریر کیا جو بعد میں طبع بھی کیا گیا۔اس کا طبع کرنا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا کیونکہ بڑا بڑا چغادری مولوی پھنکارے مارتا ہوا آیا۔وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اور میرے مزید مضامین کی طباعت کیوجہ سے ان کے پھنکاروں میں تو اضافہ ہوتا رہا لیکن حرام ہے کہ ان میں سے کسی صاحب نے ان مضامین کی تردید میں کوئی ایک سطر بھی تحریر کی ہو۔میری بار بار کی تحدی کے باوجود انہوں نے ایک سطر بھی تحریر نہیں کی۔ذاتی نوعیت کی یہ چند سطور تحریر کرنے کے لئے سخت معذرت خواہ ہوں لیکن یہ ذاتی نوعیت کی

چند سطور اپنی طبع کے خلاف مجبوراً صرف اس وجہ سے تحریر کی گئی ہیں کہ راقم سطور کو اپنی کم علمی کا خوب خوب اندازہ ہے' لیکن علمائے کرام کا اس موضوع (وحی خفی) سے گریز مجھے اپنے موقف کی صداقت پر مزید مستحکم کر دیتا ہے۔ فللہ الحمد۔

میں نے اپنے بھائی قاسمی صاحب کے مضمون سے عمداً اعتناء نہیں کیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ خدانخواستہ یہ علمی مضمون نہیں ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ اگر مضمون کی دیگر معنویات سے تعرض کیا گیا تو حضرت ان کے جوابات تحریر کرنے میں ہی الجھے رہیں گے۔ حد درجہ کوشش یہ ہے کہ صرف اس مضمون (وحی خفی) کو مرکز گفتگو بنایا جائے اور بس۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو راقم سطور تو اپنے نقطہ نگاہ کو چند الفاظ میں پیش کر دیتا ہے کہ جن احادیث کو خارج از قرآن وحی کہا جاتا ہے تو یہ احادیث حضور ﷺ کی احادیث ہیں ہی نہیں بلکہ ذخیرۂ روایات ہیں۔ کیونکہ ڈھائی سو سال تک جو الفاظ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلاً ایک زبان سے دوسری' دوسری سے تیسری' چوتھی' پانچویں' چھٹی زبان تک منتقل ہوتے آرہے ہوں ان کا اپنی اصل شکل میں موجود رہنا بالکل ناممکن ہے اور ہمارے علمائے کرام بھی روایت بالمعنی کے قائل ہیں' اسی وجہ سے 'روایت شریف' کے آخر میں اوکما قال علیہ السلام تحریر کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ روایات تو احادیث رسول ہیں ہی نہیں۔ روایت شریف کے یہ الفاظ تو خود رواۃ کے الفاظ ہیں جو ان کے منہ سے نکلے ہیں۔ رواۃ کرام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کسی طرح وحی الٰہی ہو سکتے ہیں؟ ہمارا دیرینہ مطالبہ جناب کے حضور یہ ہے کہ آپ رواۃ کے منہ سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو وحی ثابت کریں۔

میں اپنی تمام تر عاجزی' تواضع' انکساری اور فروتنی کے باوجود اپنے بزرگ بھائی جناب پروفیسر (مولوی) محمد دین صاحب قاسمی اور ان کی معرفت تمام علمائے اسلام کو تحدی (Challange) کرتا ہوں' کہ وہ اس موضوع پر کوئی جامع و مبسوط مضمون تحریر فرمائیں۔ وان لم تفعلوا ولن تفعلوا (۲/۲۴)۔

آخر میں میں پروفیسر قاسمی صاحب کو اپنا بھائی سمجھ کر یہ درخواست کروں گا کہ انہوں نے جو (۱) خدا پرستی کا مسلک چھوڑنے والا (۲) ہوا پرست (۳) خود غرض (۴) پرکار (۵) ضدی اور ہٹ دھرم کے الفاظ میرے متعلق تحریر فرمائے ہیں بہتر ہوگا کہ آئندہ ان سے اجتناب فرمائیں۔ کیونکہ مسلمان کا کیا کام کہ کسی دوسرے کا دل دکھائے۔

وھٰھنا منا تم الکلام. علی مُصطفٰناً الوف سلام

محمدٍ عربی کہ آبروئے ہر دوسرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بِر سرِ او

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفسرینِ کرام کی ایک لغزش کے انسانیت سوز نتائج

پاکستان اور بیرون پاکستان' آج کل مختاراں مائی کے کیس کی بہت شہرت ہو رہی ہے اور اردو' انگریزی' پریس میں اس کا عام چرچا ہے۔ اہم انگریزی اخبارات میں اس بارے میں اداریے شائع ہو رہے ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ امریکہ میں House of Representative میں مورخہ 10 مارچ کو California کی نمائندہ قانون Woolsey نے ہاؤس کو اس کیس کی پوری تفصیلات سنائیں اور اپنی حکومت سے درخواست کی کہ وہ پاکستان میں خواتین کی تعلیم پر زیادہ رقم صرف کرے تاکہ خواتین میں عام بیداری پیدا ہو اور اس طرح اس قسم کے جرائم کا انسداد ہو' ہمارے ہاں پاکستان میں بھی حدود آرڈیننس کی وجہ سے کئی ہزار عورتیں بغیر کسی قصور کے اس وقت جیلوں میں زندگی گزار رہی ہیں کیونکہ وہ عدالتی کاروائی کے دوران چار گواہ حاضر کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اس لئے وہ خود ہی قذف کے الزام میں قید کر دی جاتی ہیں۔ یہ خواتین کے خلاف بڑا ہی افسوسناک اور پردرد سلوک ہے' جس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

موقر ماہنامہ رسالہ ''طلوع اسلام'' کو وقتی حادثات و واقعات' یا سیاسی و قانونی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ایک علمی و فکری تحریک ہے۔ البتہ اگر کسی قانون یا واقعہ کی بنیاد یا وجہ قرآن کریم کی غلط توجیہہ و تفسیر ہو' جس سے خلاف قرآن نظریات کی اشاعت ہو رہی ہو' تو طلوع اسلام اس کا فوری نوٹس لینا ضروری سمجھتا ہے اور چونکہ طلوع اسلام قرآن کریم کا داعی ہے' اس لئے وہ اس بارے میں قرآن کریم کا صحیح موقف پیش کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ لیکن اس کو

ان معاملات میں افراد یا اداروں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ زنا کے سلسلہ میں مختاراں مائی کا کیس ہو یا ان سینکڑوں عورتوں کا معاملہ ہو جو بے قصور جیلوں میں زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کی بنیاد صرف ہمارے مفسرین کی ایک لغزش ہے جس کی وجہ سے یہ ساری تباہی عورتوں پر آرہی ہے اور جس آیت کریمہ کی غلط تعبیر کی وجہ سے زنا کے کیس میں چار گواہوں کا عینی شاہد ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ عدالتی کارروائی کے لئے چونکہ چار عینی گواہ دستیاب نہیں ہو سکتے' اس لئے کیس عورتوں کے خلاف چلا جاتا ہے۔ اس مضمون میں اس آیت کریمہ کا صحیح مفہوم پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے جس کے مطالعہ کے بعد قارئین کرام خود اندازہ فرمالیں گے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

ہمارے روایتی مفسرین کا سب سے بڑا تسامح یہ ہے کہ وہ خود آیات پر غور نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ سلف سے چلا آرہا ہے' اس کو اسی طرح منتقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگر شروع کی تفاسیر میں کسی آیت کی غلط تفسیر ہو گئی تو بعد کے مفسرین اس کو بغیر غور و فکر کئے اسی طرح نقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ زیر غور آیۃ کریمہ کی بھی یہی صورت حال ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے مفسرین جب بھی قرآن کے خلاف جاتے ہیں اور لغزش کھاتے ہیں' تو اس لغزش میں تمام فرقے متفق ہوتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ جب بھی مفسرین نے کسی بات پر اتفاق کیا ہے وہ ہمیشہ قرآن کے خلاف ہی ہوتی ہے۔ اس تمہید کے بعد آپ کے غور و فکر کے لئے دو آیات کریمات پیش کی جاتی ہیں جن کی بناء پر چار عینی گواہوں کا ہونا لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ آیات کریمات خود بھی واضح ہیں اور اس مضمون میں ان کو اس قدر واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر قاری خود ہی اس کو بسہولت سمجھ سکے۔ یہ سورہ نساء کی آیات ۱۵ و ۱۶ ہیں۔ پہلے ان کا ترجمہ اور دو تین مختلف تفاسیر کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے تاکہ قارئین کرام کو سابقہ مفسرین کا نظریہ بخوبی معلوم ہو سکے۔ پھر آیات کا صحیح مفہوم اور سابقہ مفسرین کرام کی لغزش کی نشاندہی کی جائے گی۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاللہ ہوتا ہے:

والّٰتی یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیهن اربعة

منكم فان شهدوا فامسكوهن فى البيوت حتى يتوفهن لموت او يجعل الله لهن سبيلا ० والذن ياتينها منكم فاذوهما فان تابا و اصلحا فاعرضوا عنهما ان الله كان توابا رحيما० (۴/۱۶'۱۵).

(ترجمہ) اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدکاری کریں تو ان کی بدکاری پر اپنے لوگوں میں سے چار کی گواہی لو۔ پھر اگر چاروں گواہ اس کی تصدیق کریں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا خدا ان کی کوئی (دوسری) راہ نکالے۔ اور تم لوگوں میں جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہوان کو مارو پیٹو' پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان کو چھوڑ دو بے شک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دیوبندی رقمطراز ہیں:

''اگر کسی کی زوجہ کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو تو اس کے لئے چار گواہ مسلمانوں میں سے عاقل بالغ آراء قائم ہونے چاہئیں۔ اگر چار آدمی گواہی دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہئے۔ گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا انتظاماً بالکل روک دیا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مر جائے یا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی حکم یا سزا مقرر فرمائے۔ اس وقت تک زانیہ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ اس کا وعدہ کیا چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد سورۂ نور میں اس کی حد نازل فرما دی کہ باکرہ کے لئے سو کوڑے اور ثیبہ (جو عورت کنواری نہ ہو' خواہ اس کا شوہر زندہ ہو یا وفات پا گیا ہو) کے واسطے سنگسار کرنا ہے۔''

(۲) مشہور و معروف تفسیر فصل الخطاب میں اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں تحریر ہے کہ:

''ہر دعوے کا ثبوت دو گواہوں سے ہوتا ہے۔ مگر یہ ناموس کا معاملہ ہے اور بدچلنی کا الزام اتنا سخت ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ثابت نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس عورت کی بدچلنی اور بے باکی کی حد ہی نہیں اور وہ سماج کے لئے کیسی زہر قاتل ہے جو ایسے جرم کا ارتکاب اتنے

آدمیوں کے سامنے کرے کہ چار چشم دید گواہ اور وہ بھی عادل اس کے جرم کے ثبوت میں پیش ہوسکیں۔ پھر ایسی عورت کو بداخلاقی سے روکنے یا کم سے کم سماج کو اس کے اثرات سے بچانے کے لئے اگر یہ سختی کی جائے تو کیا وہ بے محل سمجھی جاسکتی ہے۔'' (جلد دوئم' صفحہ ۱۶۵)۔

(۳) اہل حدیث حضرات کی مشہور و مستند تفسیر ''تفسیر ثنائی'' میں اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں رقم ہے:

''پس جو تمہاری عورتوں میں سے زنا کریں' ان پر اپنے لوگوں (مسلمانوں) میں سے بدکاری دیکھنے والے چار گواہ مقرر کرلو پھر اگر وہ قاضی کے سامنے گواہی دے دیں تو بالفصل ان کی یہ سزا ہے کہ ان کو اپنے گھروں میں بند رکھو بالکل کہیں بھی جانے نہ دو یہاں تک کہ مر جائیں یا اللہ ان کے لئے کوئی حکم بتلادے جو متعلق سزا ہو جسے بھگت کر وہ چھوٹ جائیں۔ چونکہ صرف عورتوں کے رکنے سے زنا بند نہیں ہوسکتا بلکہ ایک اور ذریعہ بھی زانیوں کے لئے موجود ہے کہ لڑکوں سے زنا کریں سو اس کی بابت بھی سنو کہ جو دو مرد تم میں سے وہی لوطیوں کا کام کریں اور زنا بالشہادت بھی ثابت ہوجائے تو ان کو تکلیف پہنچاؤ اور زبانی بھی لعن طعن کرو کہ تم نے بہت بے جا کیا جس سے تمہارے اعتبار اور نیک بختی میں فرق آ گیا ہے۔ جب ہر طرف سے ان کو برا سننا ہوگا تو خود ہی اس فعل شنیع سے باز آجائیں گے۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنے اعمال کو درست کریں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو خدا بھی ان کو معاف کرے گا اس لئے کہ خدا توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔'' (جلد اول' صفحہ ۲۸۸)۔

(۴) ملت جعفریہ ''خیر البریہ'' کی مشہور تفسیر رقم کردہ حضرت العلماء' ادیب اعظم جناب مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی میں تحریر ہے:

''بدکار عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا کہ انہیں کہیں نہ نکلنے دو یہاں تک کہ وہ مر جائیں۔ لیکن کچھ دن بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا اور یہ حکم نازل ہوا کہ اگر کوئی بے شوہر والی عورت زنا کرائے تو عورت و مرد دونوں کو سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر شوہر دار

عورت زنا کرائے تو سنگسار کی جائے۔“

(۵) تفسیر شہیر ”تدبر قرآن“ میں مرقوم ہے:

”اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کردو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کرے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکالے اور جو دونوں تم میں سے بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذاء پہنچاؤ بس اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو' بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔“

آپ نے مختلف فرقوں کی پانچ مستند تفاسیر کے اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ سب نے اس آیت کریمہ میں فاحشہ سے مراد زنا لیا ہے اور اس کے لئے چار عادل گواہ شرط قرار دیئے ہیں۔ اسی آیۂ کریمہ کو بنیاد بنا کر ہماری فقہ میں بھی یہی قانون بنایا گیا ہے اور اسی آیت کو اساس قرار دے کر' حدود آرڈیننس میں بھی سزا کے لئے چار گواہوں کی گواہی شرط رکھی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیۂ کریمہ کا ارتکابِ زنا سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے فقہ کا قانون ہی غلط ہے۔ اس آیت کریمہ کو زنا کی سزا اور چار گواہوں کی شرط کی بنیاد بنانا غلط ہے' اس آیت کا کوئی تعلق زنا کے فعل سے نہیں ہے' اس کے لئے مندرجہ ذیل نکات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کسی بھی ایک جرم کی ایک ہی سزا ہو سکتی ہے۔ ایک جرم کی دو مختلف سزائیں نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کریم نے سورۂ نور میں زنا کی سزا سو کوڑے مقرر فرما دی ہے لیکن یہاں فاحشہ کی سزا ”پابند مسکن“ کرنا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ زنا کا جرم نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک جرم (زنا) کی دو مختلف سزائیں یعنی کہیں کوڑے اور کہیں پابند مسکن کرنا نہیں ہو سکتیں۔ بعض مفسرین۔ نے اس آیت کو سورہ نور کی آیت سے منسوخ قرار دیا ہے۔ لیکن نسخ کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ اس کے لئے رسالہ طلوع اسلام' میں بہت مواد موجود ہے' اس میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ موضوع اس مضمون کی حدود سے باہر ہے اور اس قدر طویل ہے یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن حیرانی اس

بات کی ہے کہ جو حضرات اس آیت کو سورہ نور کی آیت سے منسوخ قرار دیتے ہیں وہ صرف سزا کو منسوخ کرتے ہیں لیکن چار گواہوں کی شرط کو منسوخ نہیں کرتے۔ چنانچہ "تدبر قرآن" میں مرقوم ہے "اگرچہ یہ تعزیرات سورہ نور میں نازل شدہ حدود کے بعد منسوخ ہو گئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا"۔ (جلد۲ صفحہ ۲۶۵)۔

اسی طرح تفسیر حسینی میں بھی تحریر ہے کہ "پس بحکم ایں حدیث امساک بیوت منسوخ شد واشہاد واستشہاد باقی ماند"۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اول تو نسخ کا عقیدہ ہی خلاف قرآن ہے لیکن یہ کون سی تک ہے کہ آیت تو منسوخ ہو گئی لیکن اس کا ایک حصہ یعنی سزا کو تو منسوخ کر دیا اور گواہوں کی شرط کو قائم رکھا یعنی شہادت کا ضابطہ منسوخ نہیں ہوا۔ یا للعجب۔

(۲) زنا کے ارتکاب کے لئے مرد اور عورت دونوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس آیہ کریمہ میں صرف عورتوں کا ہی ذکر ہے۔ مرد کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ یہ کیسا زنا ہے کہ جس میں مرد موجود ہی نہیں ہو۔ اس کی وضاحت صرف ہمارے علماء کرام ہی فرما سکتے ہیں۔ حالانکہ اس سے بخوبی واضح ہے کہ یہ فعل زنا کا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ بغیر مرد کے زنا کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

(۳) او یجعل اللہ لھن سبیلا سے جو یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ یہ وعدہ ہے کہ جس وعدہ کے مطابق سورہ نور میں زنا کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ تو یہ بات بھی درست نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ سزا کا ذکر نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر سزا کا ذکر ہوتا تو لھن کی جگہ علیھن آنا چاہئے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سبیل بنا دے سے مراد یہ ہے کہ ان کا اعتبار قائم ہو جائے اور پھر ان کے باہر آنے جانے میں کوئی حرج باقی نہ رہے۔ یہی بات ان کے فائدے کی ہے۔

(۴) اصل یہ ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے الفاحشہ کے لفظ سے لغزش کھائی ہے۔ اس آیہ کریمہ میں الفاحشہ کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے علماء کرام نے زبردستی اس کا مفہوم زنا لے لیا ہے۔ فاحشہ کے معنے صرف زنا کے نہیں ہوتے۔ ہر بے حیائی کی بات اور ہر گناہ کو فاحشہ کہتے ہیں۔ چنانچہ والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا

لـذنوبهم (۳/۱۳۵)۔(ترجمہ) وہ لوگ کہ جب ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے یا وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد رکھ لیتے ہیں اور اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔ فاحشہ کے معنے یہاں زنا کے نہیں ہیں بلکہ محض گناہ کے ہیں جس کی تفسیر خود ذنـوبهـم کے لفظ سے کر دی گئی ہے' اسی طرح آیت نمبر ۸۰/ ۷ اور ۵۴/ ۲۷ میں یہ لفظ لواطت کے لئے آیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

انـكـم لتـاتـون الـرجـال شهـوة من دون النسـاء بل انتم قوم مسـرفون (۸۰/ ۷)۔تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت پرستی میں مردوں کی طرف مائل ہوتے ہو' مگر تم لوگ (نطفہ کو) سرف کرنے والے ہو۔

اس آیت کریمہ کے الفاظ مـن دون الـنسـاء نے خود وضاحت کر دی کہ یہاں اس کے معنے لواطت (Homosexuality) کے ہیں' زنا کے ہو ہی نہیں سکتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے فتح الرحمان میں اس کا ترجمہ تحریر فرمایا ہے۔ ہر آئینہ شما میدوید بشہوت بسوی مردمان بجز زنان' بلکہ شما گروہ مسرفانند (صفحہ ۳۳۹)۔ نیز ارشاد ہوتا ہے انـنـكـم لتـاتـون الرجال شهوة مـن دون الـنسـاء (۵۴/ ۲۷)۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت سے مردوں کے پاس آتے ہو۔ ان دو آیات مبارکات میں فاحشہ کا ترجمہ لواطت (Homosexuality) کیا ہے۔ ان دو آیات سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ فاحشہ کا اطلاق صرف زنا پر نہیں ہوتا بلکہ فاحشہ کے معنے عام بے حیائی' اور لواطت کے بھی ہیں۔

قرآن کریم میں فواحش کا لفظ بطور جمع بھی آیا ہے جو خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشہ صرف ایک زنا ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے بے حیائی کے کام فاحشہ کے ذیل میں آ سکتے ہیں' جب ہی تو اس کی جمع فواحش استعمال کی گئی ہے۔

اگر آپ اس زیر غور آیہ کریمہ نمبر ۱۵ کو اس سے بالکل متصل اگلی آیت نمبر ۱۶ سے ملا کر ملاحظہ فرمائیں تو بات سورج کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہاں الفاحشہ سے مراد سحاقت (Female Homosexuality) ہے کیونکہ اس متصلہ آیت نمبر ۱۶ میں لواطت (Male

(Homosexuality) کا بیان ہورہا ہے اور اس کی سزا کا تذکرہ ہے۔ یہ دونوں متصلہ آیات نمبر ۱۵'۱۶ ہم جنس پرستی کے متعلق ہیں۔ پہلی آیت ۱۵ میں سحاقت کا بیان ہے اور دوسری آیت ۱۶ میں لواطت کا بیان ہے۔ دونوں آیات کا تعلق ہم جنس پرستی سے ہے' متصلہ آیت کریمہ یہ ہے والذن یاتینھا منکم فاذو ھما فان تاباو اصلحا فاعرضوا عنھما ان اللہ کان توابا رحیما (۴/۱۶)۔اورتم لوگوں میں سے جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہو ان کو مارو پیٹو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اصلاح کرلیں تو ان کو چھوڑ دو بے شک خدا تواب ورحیم ہے۔اس آیت کا یہ بامحاورہ ترجمہ نقل کیا گیا ہے لیکن شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ جو مستندترین اورتحت اللفظ ترجمہ ہے وہ اس بارے میں بڑا معنی خیز اور فیصلہ کن ہے۔ وہ ترجمہ فرماتے ہیں۔ ''اور جو دو کرنے والے کریں تم میں وہی کام تو ان کو ستاؤ' پھر اگر توبہ کریں اور سنوار پکڑیں تو انکا خیال چھوڑ دو' اللہ توبہ قبول کرتا ہے مہربان''۔ اس آیت کریمہ میں شاہ صاحب محترم نے جو یاتینھا کا ترجمہ ''وہی کام'' فرمایا ہے اس نے بات بالکل واضح کردی۔ کیونکہ آپ نے ھا کا مرجع الفاحشہ قرار دیا ہے۔ چونکہ اس آیت کریمہ(۱۶) میں ذکر ہم جنس پرستی کا ہورہا ہے۔ اس لئے ''وہی کام'' کا مطلب زیرغور آیت(۱۵) میں بھی ہم جنس پرستی ہی ہوگا' زنا نہیں ہوسکتا۔اس آیت میں بیان مردوں کی ہم جنس پرستی کا ہے اور سابقہ آیت میں عورتوں کی ہم جنس پرستی کا ہے۔ ان دونوں آیات میں کام کی نوعیت کا ایک جیسا ہونا لازمی ہے جب ہی تو ''وہی کام'' کی شرط پوری ہو گی اور وہ ایک ہی نوعیت کا کام ہم جنس پرستی ہے۔ یہ دونوں آیات لواطت وسحاقت سے متعلق ہیں' ان کا زنا سے' یا اس کی سزا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آیات کا مفہوم آپ نے خود ملاحظہ فرمالیا حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ہر قاری کو بآسانی ان آیات کا مفہوم سمجھ میں آجائے کیونکہ آیات نہ تو کچھ پیچیدہ ہیں اور نہ ہی عربی کے قواعد اس میں Involve ہوتے ہیں۔ وہ تمام اعتراضات جو علماء کرام کی تفسیر میں واقع ہوئے ہیں وہ اس مفہوم میں ازخود رفع ہوجاتے ہیں اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہیں رہتا ہے۔اس کے بعد اب آپ

خود غور فرمائیں کہ ہمارے فقہائے کرام نے صرف ایک لفظ کی غلط تعبیر سے کس طرح کی لغزش کھائی ہے اور لطف یہ ہے کہ سب فرقوں کا اس پر اتفاق ہے اور سب فرقوں کی فقہ میں یہی قوانین رائج ہیں۔ اس ایک کیس سے آپ خود اندازہ فرمالیں کہ ہماری فقہ کا کتنا حصہ قرآن کریم کے خلاف ہوگا۔

اسی طرح اس بات کا بھی خیال فرمائیں کہ ہمارے علماء کرام کی ایک لغزش کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ کس طرح بے انصافی ہو رہی ہے۔ چند سال پیشتر بی۔بی۔سی لندن نے ایک پروگرام کئی مرتبہ دکھایا۔ راقم سطور نے بھی وہ پروگرام لندن میں کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ معلوم نہیں یہاں پاکستان میں بھی وہ دکھایا گیا یا نہیں۔ اس پروگرام میں دکھایا گیا تھا کہ ایک نابینا عورت سے Rape کیا گیا اور گواہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اسی نابینا عورت کو سزا ہوئی اور وہ عورت جیل میں زندگی گزار رہی تھی۔ اس فلم کو دیکھ کر لندن میں مسلمان بہت شرمندہ ہوتے تھے لیکن وہ بی۔بی۔سی والوں کو روک نہیں سکتے تھے البتہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ قرآن کریم میں اس طرح کا قانون کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر سمجھدار آدمی یہ بات محسوس کرتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس قدر شنیع فعل لوگوں کی موجودگی میں نہیں کرسکتا۔ تو بھلا اس کے لئے چار عینی گواہ کس طرح مل سکتے ہیں اس قسم کے احکامات کو قرآن کریم کی طرف منسوب کرنے سے قرآن کریم کی توہین ہوتی ہے اور ہمیں حد درجہ اس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت' بہ منبر نتواں گفت

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے

قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق انسانی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہوتی بلکہ انسان کے اندر ایک اور شے بھی ہوتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات ان طبعی قوانین کے ماتحت نہیں ہوتی جن کے مطابق انسان کے جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش تو قوانین فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات کی پرورش اور بالیدگی جن قوانین کے مطابق ہوتی ہے' انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار مستقل' غیر متبدل اور ابدی ہوتی ہیں۔ ان مستقل اقدار کی پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے ترقی کر کے' انسانیت کی سطح پر آتا ہے اور جب کبھی بھی مستقل قدر اور طبعی زندگی کے تقاضوں میں تصادم واقع ہوتا ہے تو طبعی زندگی کے مفاد کو نظر انداز کر کے' مستقل اقدار پر عمل کرنے سے زندگی مزید ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ بعض مرتبہ جان تک مستقل قدر کے تحفظ میں قربان کر دینی ہوتی ہے۔ ان مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا خود ایک مستقل قدر ہے۔ اہم ترین شے وہ معاشرہ ہے جسے انسان ان مستقل اقدار کے مطابق قائم کرتا ہے اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر نظام درست ہے اور مستقل اقدار پر قائم ہے تو اس کے اندر انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج برآمد کرتی ہیں اور اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر قائم ہو تو اس میں افراد کی نیکیاں باطل پر قائم کردہ نظام کے جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھوٹنے کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ انسانیت پر ظلم

کرنے والے غلط نظام کے اندر انفرادی نیکیاں موجب ثواب بھی نہیں ہوسکتیں کفر درحقیقت نظام خداوندی یا دوسرے الفاظ میں مستقل اقدار پر قائم شدہ نظام کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔

قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ مومن کا فریضہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ مشکل حالات میں انفرادی طور پر ان اقدار پر عمل کرتا رہے اور نقصان برداشت کرتا رہے بلکہ مومن کا فرض اولیں یہ ہے کہ ان حالات کے خلاف جدوجہد کر کے' ان مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرے کیونکہ اس کا قائم کرنا خود ایک ایسی قدر ہے کہ جس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ ان افراد کو تلاش کیا جائے جو مستقل اقدار پر ایمان رکھتے ہوں۔ ان رفقاء کی مدد سے قوت میں اضافہ ہوگا اسی لئے قرآن کریم کا حکم ہے کہ کونوا مع الصادقین (۹/۱۱۹)۔ اور وارکعو مع الراکین (۲/۴۳)۔ سچوں کے ساتھ رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں حضورﷺ نے اپنے ساتھ تمام سعید روحوں کو جمع کر لیا اور ان کی اور مدینہ منورہ کے انصار کی مدد سے حضورﷺ نے وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کیا۔ انسان نہ تو اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی براہ راست اطاعت کر سکتا ہے۔ یہ دونوں مہتم بالشان امور انبیاء کرام کی معرفت سرانجام پا سکتے ہیں۔ انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم بھی رسول کی معرفت حاصل ہوتا تھا اور اس کی اطاعت بھی رسول کی معرفت ہی ہو سکتی تھی۔ اللہ کے دیئے ہوئے نظام کو جب رسول نافذ کرتا تھا تو اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی تھی۔ وہ احکامات اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہوتے تھے اور چونکہ ان کا نفاذ رسول کرتا تھا' اس لئے اس نظام کی اطاعت سے اللہ و رسول دونوں کی اطاعتیں بیک وقت ہو جاتی تھیں۔ رسول کے تشریف لے جانے کے بعد بھی اس نظام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ رسول کے بعد بھی اللہ و رسول کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی۔

قرآن کریم کا یہ ایک ایسا نظریہ ہے کہ اس پر صدر اول کے مسلمانوں نے عمل کر کے

دنیا میں ترقی وعروج اور آخرت میں سرخروئی حاصل کی۔ لیکن افسوس کہ ملوکیت نے غلبہ حاصل کر لیا اور یہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ لیکن اللہ و رسول کی اطاعت تو مسلمانوں کا ایک ایسا نظریہ تھا کہ اس سے تو مسلمانوں کو کسی طرح بھی نہ تو بدظن کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس سے روکا جا سکتا تھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ تو بہت آسان تھا کہ قرآن کریم سامنے موجود تھا اور اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت تھی۔ لیکن رسول کی اطاعت کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا حل سوائے اس کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کے لئے حضورﷺ کی احادیث جمع کر کے اس کے ذخیرے مہیا کئے جائیں اور ان ذخیرہ ہائے احادیث و روایات کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دیا جائے جس کسی نے بھی حضورﷺ کی طرف منسوب کر کے کوئی روایت بیان کر دی اس روایت کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے دیا گیا اور عملاً رسول کی اطاعت احادیث کی اطاعت ٹھہرا دی گئی اور رسول کا ترجمہ عملاً حدیث ہو گیا۔ اسی طرح ملوکیت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ نظام کا تصور اور اس کی اہمیت وضرورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ اور اس طرح ملوکیت نے اپنے آپ کو نہ صرف محفوظ کر لیا بلکہ وضعی احادیث کے ذریعے اپنا جواز بھی فراہم کر دیا۔

آج مسلمان جس حالت میں ہیں اور اس غرقاب سے نکلنا چاہتے ہیں اس کے لئے صرف وہی نسخہ کام آ سکتا ہے جو صدر اول میں کام آیا تھا اور جس پر عمل کر کے ان کو یہ عروج و اقتدار حاصل ہوا تھا۔ یعنی وہ مستقل اقتدار پر قائم شدہ نظام اور اس کی دل و جان سے اطاعت۔

انسانوں کے باہمی تنازعات و مناقشات کو وحی الٰہی (قرآن) کے ذریعے طے کرنے کا نام دین ہے اور ہر وہ دنیاوی کام جس کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے طے کر دیا جائے وہ دینی کام ہو جاتا ہے۔ وما اختلفتم فیه من شئ فحکمه الی الله (۴۲/۱۰)۔ اور تم جس معاملہ میں بھی اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔ یہ صورت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کوئی ایسی اتھارٹی موجود ہو جو یہ فیصلے فوری طور پر کر سکے اس لئے اس کے واسطے وحی (قرآن) کے

علاوہ کسی زندہ شخصیت کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اس میں اکیلی کتاب کافی نہیں ہوتی اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے۔ یہ مرکزی شخصیت اللہ کا رسول ہوتا تھا اور اس کے بعد اس کا جانشین ہوتا ہے' اور اسی جانشین (خلیفہ) کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ آج جب کہ وہ نظام باقی ہے اور نہ ہی رسول کا جانشین' تو ہم اللہ کی اطاعت سے بالکل محروم ہیں اور آج جو لوگ قرآن اور روایات پر عمل کر کے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہیں تو یہ بھی ایک' حدیث بے خبراں' ہی ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس نظام کی معرفت ہوتی ہے' وہاں اس کے وعدے بھی اس نظام کی معرفت ہی پورے ہوتے ہیں۔ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داری' انسانی نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ دو آیات خداوندی اور دو احادیث نبوی اس مضمون کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) ارشاد ہوتا ہے: واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ قال الذین کفرو للذین آمنوا انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ ان انتم الا فی ضلل مبین (۳۶/۴۷)۔ جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو یہ کفار ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ بھلا ہم اس شخص کو کھلائیں جسے خدا چاہتا تو اس کو خود کھلاتا' تم لوگ بس صریح گمراہی میں ہو۔

کفار مسلمانوں سے کہتے تھے ہم ایسے لوگوں کے رزق کا انتظام کیوں کریں کہ اگر خدا چاہتا تو ان کے رزق کا انتظام خود کر دیتا۔ اس کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ تم کھلی گمراہی میں ہو۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے اس قسم کا عقیدہ کہ خدا براہ راست رزق دیتا ہے کفار کا پیدا کردہ اور سخت گمراہ کن ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا رزق کا انتظام اپنے نظام کی معرفت کرتا ہے۔ یہ تمام انتظام خود انسانوں کے ہاتھوں ہوا کرتا ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لیتا ہے جو خدا کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور اس کے

عوض میں افرادِ معاشرہ وہ تمام فرائض ادا کرتے ہیں جن کا عہد انہوں نے اپنے خدا سے کیا ہوا ہوتا ہے۔ افرادِ معاشرہ اس نظام کی اطاعت کے اس وقت تک پابند ہوتے ہیں جب تک یہ نظام ان کی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔

(۲) نحن نرزقهم و اياكم (۱۷/۳۲)۔ ہم تمہارے اور تمہاری اولاد دونوں کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ یہ آیہ کریمہ ہر وقت ہمارے پیش نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کے رزق کا ذمہ دار ہے لیکن ہمارا سب کا روز کا مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں آدمی بھوکے مر رہے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو رزق نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ ایک ایک قحط میں ہزاروں آدمی مر جاتے ہیں۔ اس سے لوگوں کو شک ہوتا ہے (اور بجا ہوتا ہے) کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کس طرح کا ہے کہ جو ہمارے سامنے ہی پورا نہیں ہوتا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے ہی نہیں کہ اللہ اس ذمہ داری کو براہ راست پوری کر کے، ہر شخص کو براہ راست رزق مہیا کرے۔ یہ ذمہ داری اور اس طرح کی تمام ذمہ داریاں اس کے نظام کی معرفت پوری ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ آیۂ کریمہ وما من دابة فى الارض الا على الله رزقها (۱۱/۶)۔ زمین میں کوئی چلنے والا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں ہوتی۔ یہ ذمہ داری اس نظام کے سر ہوگی جو خدا کے قانون کے مطابق مستقل اقدار کی اساس پر قائم ہوگا۔

یہ بات کہ انسانوں کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے وعدے انسانوں کے ہاتھوں ہی اسلامی نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں، اس کے لئے متعدد آیات کریمات قرآن کریم میں موجود ہیں اور سلسلہ وار پیش بھی کی جا سکتی ہیں اور جن سے اسلامی نظام کے لازمی و لابدی ہونے پر دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں مزید ایک ہی آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مکہ شریف سے جب بیشتر مسلمان ہجرت کر کے مدینہ شریف آ گئے تو وہاں مکہ میں چند معذور، مجبور، بے کس و ناتواں مسلمان رہ گئے تھے جو مجبوری کے باعث ہجرت نہیں کر سکے۔ کفار ان مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم توڑ رہے تھے۔ مکہ کے وہ مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ اللہ

تعالیٰ انہیں وہاں سے نکال لے کیونکہ وہاں کے رہنے والے بڑے ظالم تھے۔ان مسلمانوں کی دعا کے جواب میں ارشاد ہوا کہ وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ الخ (۴/۷۵)۔تم کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں اوران کمزور اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے کے واسطے جہاد نہیں کرتے جو خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی (مکہ) سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا اور تو خود ہی کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار بنا دے۔غور فرمائیں کہ مکہ کے مسلمان تو اللہ سے دعا کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ مدینہ شریف کے مسلمانوں کو یہ کہہ رہا تھا کہ تم مکہ کے مسلمانوں کی مدد کو فوری پہنچو' چنانچہ مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ کے مسلمانوں کی مدد کر کے ان کو وہاں سے نکالا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو اس طرح اپنے نظام کی معرفت پورا کیا۔ براہ راست ان کی مدد کر کے' نظام کو نظرانداز نہیں کیا۔اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے معاملات میں مداخلت (Intervene) کرتا ہی نہیں۔

اسی سلسلہ میں حضورﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات کو بھوکا رہا اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھالیتا ہے' نیز حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمرؓ سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اس طرح حضورﷺ نے اور حضرت عمرؓ نے واضح کیا کہ اللہ کے رزق پہنچانے کی ذمہ داری اسلامی نظام کے سر ہوتی ہے۔ورنہ وہ دجلہ کے کنارے بھوک سے مر جانے والے کتے کے متعلق نہایت آسانی سے کہہ دیتے کہ جب تک وہ کتا زندہ رہا اللہ نے اس کو رزق دیا۔جب اس کی موت آ گئی تو اللہ نے اس کا رزق بند کر دیا۔

انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس کی کتاب' اور اس کے نظام کے ذریعے ہی قائم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا کوئی اور تصور ذہن انسانی میں آ ہی نہیں سکتا Legal Parlance میں بات ذرا زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ہم انسانوں کی Duty ہے کہ ہم

اللہ تعالیٰ کے نظام کی اطاعت کریں اور یہ ہمارا Right ہے کہ وہ نظام اللہ تعالیٰ کے کئے ہوئے تمام وعدے پورے کرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا Right ہے کہ ہم اس کی اطاعت کریں۔ وہ ہمارا خالق و آقا ہے۔ وہ ذات بزرگ و برتر ہے لیکن اس نے خود ہی اپنے اوپر ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں۔ و کتب علی نفسه رحمة (٦/١٢)۔ اس نے اپنی ذات پر مہربانی لازم کر لی ہے' نیز ارشاد ہوتا ہے و کتب ربکم علی نفسه رحمة (٦/٥٤)۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے۔ اس لئے اس کی یا اس کے نظام کی Duty ہے کہ وہ اپنے وعدے پورے کرے۔ حضورﷺ کی حدیث کہ جس بستی میں کوئی بھوکا مر گیا' اس سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت مرفوع ہو گئی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا نظام اپنی Duty پوری نہ کرے تو اس کا Right بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت صرف اس کے عطا کردہ نظام کی معرفت ہوتی ہے یہ نظام کوئی تصوراتی یا تخیلاتی (Utopia) نہیں ہوتا۔ یہ اس دنیا میں قائم شدہ اور متشکل کردہ ہوتا ہے۔ ایک زندہ اتھارٹی اس کے احکامات نافذ کرتی ہے مومنین پہلے ان کے احکامات کو سنتے ہیں در پھر اس کے بعد ان احکامات کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس نظام میں اطاعت سے پیشتر 'سماعت' شرط ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا و الیک المصیر۔ (٢/٢٨٥)۔

اور کہنے لگے اے پروردگار ہم نے سنا اور ہم نے اس کی اطاعت کی۔

(۲) یاایها الذین آمنوا اطیعوا الله و رسوله' ولا تولوا عنه وانتم تسمعون۔ (٨/٢٠)۔

اے ایمان والو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو۔

نیز آیات نمبر ۵۱/۱۵، ۲۴/۱۶، ۶۴/۷، ۵/اس بارے میں ملاحظہ ہوں۔

اس زندہ نظام کے ارکان وہی تھے جن پر ہم آج بھی عمل کرتے ہیں۔ وہ ارکان اس وقت نتیجہ مرتب کر رہے تھے۔ لیکن آج وہی ارکان محض رسوم بن کے رہ گئے ہیں اور کوئی نتیجہ ان کا برآمد نہیں ہو رہا ہے اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم ان سے اللہ کی اطاعت کر رہے ہیں لیکن چونکہ ہم ان کو قرآن کریم کے مطابق اجتماعی طور پر نظام کے ماتحت ادا نہیں کر رہے ہیں' اس لئے ان کے نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں۔

الصلوٰۃ کے لئے قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر (۲۹/۴۵)۔ صلوٰۃ فحشا و منکر سے روکتی ہے۔ یعنی بے شک نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے۔ صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اول تو تمام مسلمان معاشرہ ورنہ کم سے کم نمازی صاحبان ہر قسم کی برائیوں' بے حیائیوں سے دور رہیں اور ان سے اس قسم کی حرکات سرزد نہ ہوں۔ یہ تو ایک سلبی پہلو تھا اس کا ایجابی پہلو یہ ہے کہ جب اذان میں بانگ دہل کہا جاتا ہے کہ حی علی الصلوٰۃ' صلوٰۃ کی طرف آؤ' اور فوری طور پر اس کی تشریح کر دی جاتی ہے کہ حی علی الفلاح' آؤ کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف۔ یعنی یہ کہ مومنین جو صلوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ برائیوں سے تو دور رہتے ہی ہیں۔ انہیں کامیابیاں اور کامرانیاں بھی حاصل ہوتی ہیں جب کہ خود قرآن نے قد افلح المومنون ۲۳/۱ بھی فرمایا ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ الصلوٰۃ کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ ہر طرح کی برائیوں سے محفوظ ہوگا اور کامیابی و کامرانی ہر نمازی کا مقدر ہوگا۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ یہ رکن بغیر نظام کے قیام کے ادا کیا جا رہا ہے۔ قرآن نے تو صلوٰۃ کے لئے شرط قرار دی ہے کہ صلوٰۃ حضور ﷺ کی موجودگی میں صرف ان کے پیچھے ادا کی جائے گی۔ حضور کی موجودگی میں اگر کوئی شخص انفرادی صلوٰۃ ادا کرے گا تو اس کی صلوٰۃ قرآنی صلوٰۃ نہیں ہو سکتی (۴/۱۰۲)۔ صلوٰۃ خوف کے ضمن میں واضح طور پر اس بات کی تشریح کر دی گئی ہے کہ فوج کے

مختلف حصے حضور کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے۔فوج کے دستوں کے افراد صرف ایک مرتبہ صلوٰۃ ادا کریں گے، لیکن حضور دو مرتبہ صلوٰۃ ادا کریں گے تا کہ دونوں دستے ان کے پیچھے صلوٰۃ ادا کریں۔حضور کی اقتداء کے بغیر اقامت صلوٰۃ کا کوئی تصور نہیں تھا حضور کی وفات کے بعد اسلامی نظام کے سربراہ کے پیچھے یا اس نظام کے مقامی منتظم کے پیچھے صلوٰۃ کا قیام ممکن ہے۔سربراہ مملکتِ قرآنی کے مقرر کردہ امام کی اقتداء کے بغیر صلوٰۃ کا قیام درست نہیں ہے۔یہ جو ہم نمازیں ''پڑھتے'' ہیں یہ تو مذہب کی نماز ہے۔دین کی اقامتِ صلوٰۃ نہیں ہے دین کی اقامتِ صلوٰۃ کے نتائج برآمد ہونے لازمی و لابدی ہیں۔قرآنی صلوٰۃ کا واضح معیار اس کی محک و میزان (Criteria) یہ ہے کہ وہ تمکن فی الارض اور اقتدار مطلق ہونے کے بعد قائم ہوسکتی ہے، مغلوب و محکوم تو اقامتِ صلوٰۃ کر ہی نہیں سکتا' (۲۲/۴۱) نیز ارشاد ہوتا ہے کہ اقیم الصلوٰۃ لذکری (۲۰/۱۴)۔نظام صلوٰۃ قائم کرو تا کہ اس میں میرا قانون نافذ ہو۔

ارکانِ اسلام میں دوسرا رکن صوم ہے۔قرآن کریم نے اس کی جو غرض بتائی ہے وہ لتکبروا اللہ علی ماھداکم (۲/۱۸۵) ہے' تا کہ تم دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کرسکو۔ کبریائی کے معنے حکومت و اقتدار کے ہیں۔سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ وحضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو فرعون نے ان سے کہا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو تو میں اس کا مدعا و مقصد خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں یعنی یہ کہ تکون لکما الکبریاء فی الارض (۱۰/۷۸)۔تمہارا مطمحِ نگاہ یہ ہے کہ اس ملک میں تمہاری حکومت قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے۔قرآن کریم نے یہاں کبریائی کا مفہوم خود واضح کر دیا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل و کبرہ تکبیرا (۱۱۱/ ۷)۔نہ سلطنت میں اس کا کوئی ساجھی ہے نہ اسے کسی طرح کی کمزوری ہے کہ کوئی اس کا سرپرست ہے' لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو۔اس آیت کریمہ میں کبرہ کی توضیح لم یکن لہ شریک فی الملک سے خود کرائی ہے۔لیکن خدا کی یہ

کبریائی یونہی آسانی سے' وعظ وارشاد تقاریر و مواعظہ حسنہ سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو اکھیڑ کر اس کی جگہ نظام خداوندی قائم کرنا ہے' تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت اس کی سخت مخالفت کرے گی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا ان تمام مخالفتوں اور مقابلوں کے لئے میدان جنگ میں بھی جانا ہوگا چنانچہ قرآن کریم نے ان جنگوں کی غایت یہ بتائی ہے وجعل کلمة الذين كفروا السفلى و كلمة الله هى العلياء (۹/۴۰)۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام عملاً غالب ہو جائے۔ اس زمانے میں مستقل فوج Standing Army کا دستور شروع نہیں ہوا تھا۔ قرآن کریم نے تمام مومنین کو مجاہدین قرار دیا تھا۔ خدا کی کبریائی کا تمکن ہر مومن مجاہد کا فریضہ تھا۔ رمضان شریف کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ روزوں سے ضبطِ نفس اور سختی برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت میں صلابت آتی ہے۔ مشکلات و تکالیف برداشت کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔

لیکن جب دین مذہب میں بدل گیا اور نظام باقی نہیں رہا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ لتكبروا الله على ماهداكم' تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے' تو باقی رہے لیکن ان کا مفہوم بدل گیا۔ اب ہمارے ہاں قرآن کریم کے تراجم میں اس کا ترجمہ ''تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو'' کیا جاتا ہے۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا مذہب میں اس کا مفہوم خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا ہے۔ ''کبریائی قائم کرنے'' اور ''بڑائی بیان کرنے'' میں جو فرق ہے وہ آپ سب کے پیش نظر ہے اور اس کی تعمیل نماز عید میں چھ (۶) زائد تکبیریں کہنے سے کی جاتی ہے۔ کبریائی کا قیام ایک حقیقت تھی اور زائد تکبیریں ادا کرنا ایک رسم ہے۔

حج کا اجتماع بھی دین کے مقاصد کے حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہی ایک اہم رکن ہے اور یہ دین کے نظام کا ایک بنیادی ستون ہے۔ فتح مکہ سے پیشتر کعبہ شریف کیونکہ مشرکین کے قبضہ میں تھا۔ اس لئے وہاں قرآنی حج کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ فتح مکہ کے بعد ۸ ہجری کا حج تو سابقہ

دستور کے مطابق ہی ہوا۔ ہاں البتہ ۹ ہجری میں حج کو قرآنی شکل دے دی گئی۔ حضورﷺ خود مصروفیات کی بناء پر اس حج کے لئے تشریف نہیں لے جا سکے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کو اسلامی مملکت کے نمائندے کی حیثیت سے حجاج کا سربراہ مقرر فرما کر بھیجا۔ اس حج میں بیشتر سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا گیا' لیکن حج کے اجتماع کو خلاف قرآن اور مشرکانہ رسوم سے پاک وصاف کر دیا گیا۔ ۱۰ ہجری کے حج میں حضورﷺ خود بنفس نفیس تشریف لے گئے اور اس حج کے موقع پر حضور نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے صحیفۂ آزادی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خطبہ کا ملخص یہ تھا کہ انسانوں کے خودساختہ رنگ' نسل' خون' زبان' وطن' قومیت' ذات پات' برادری' قبائل' ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر انسانوں کی عالم گیر برادری تشکیل دی جائے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بھی یہ اجتماع ان ہی مقاصد عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن کریم نے خود متعین فرما دیا تھا۔ مملکت کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بھی آتے تھے جو حکومت کے احکام کے خلاف شکایات پیش کرنا چاہتے تھے چونکہ دور دراز کے عمال حکومت آتے تھے' اس لئے عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اس کے بعد منیٰ میں ۳ روز قیام کر کے باہمی مشورہ جات ہوتے تھے اور آئندہ سال کے پروگرام طے کئے جاتے تھے۔ سربراہ مملکت یا اس کا نمائندہ ان فیصلہ جات اور دیگر امور کا اعلان کرتا۔ شکایات کا ازالہ بھی اسی روز کیا جاتا اور یہ سب کچھ دلائل و براہین کی رو سے کیا جاتا۔ ان فیصلوں اور تجاویز کو ساتھ لے کر' یہ نمائندگان' اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس آ جاتے۔

ان مذکورہ بالا ارکان کے علاوہ بھی جو بنیادی تصورات اور اعمال ہمارے ہاں دین میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے' ان کو مذہب کی سطح پر لا کر بالکل بے معنی و بے مقصد کر دیا گیا ہے۔ ان کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

ہمارے ہاں مذہب میں تعلق باللہ پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور اس سے مراد نمازیں' روزے' نفلی نمازیں اور روزمرہ کی عبادات خیال کی جاتی ہیں کہ ان عبادات کے ذریعے انسان کا

اللہ سے انفرادی طور پر تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اور اسی کو مقصدِ حیات بھی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن دین میں اس طرح کا تعلق خدا سے قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ دین میں تو اللہ سے تعلق صرف قرآن کے نظام کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ جب ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے مخاطب ہم ہی ہیں۔ خدا سے ہمکلام ہونے کی کسی کی خصوصیت نہیں ہے۔ اس میں مومن اور غیر مومن سب ہی شامل ہو سکتے ہیں کیونکہ اس میں 'الناس' سے تخاطب کیا گیا ہے۔ البتہ جب ہم اس نظام پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں تو ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ کھلے بندوں قائم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی سر مکتوم نہیں ہے۔ ہر فرد خود یہ تعلق قائم کرتا ہے۔ دوسروں کو کرا سکتا ہے۔ خود اس پر عمل کرتا ہے دوسروں سے اس پر عمل کراتا ہے۔ اس طرح تعلق باللہ کے نتائج دنیا کے سامنے آتے ہیں اور صدر اول میں اسی طرح یہ نتائج دنیا کے سامنے آئے۔ یہ نظام ہے، ذریعے تعلق باللہ کی صورت ہے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی تعلق کا پتہ قرآن کریم سے نہیں ملتا۔

تہجد کا لفظ بھی ہمارے ہاں خوب mis-use کیا جاتا ہے۔ تہجد کے لغوی معنے سونا اور جاگنا دونوں ہوتے ہیں۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ یہ قرآن کریم میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے جہاں کہا گیا ہے ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک (۱۷/۷۹)۔ رات کے کچھ حصہ میں اس قرآن کے ساتھ (بہ) جاگو یہ صرف تمہارے لئے خاص ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ قم اللیل الا قلیلاً (۷۳/۲)۔ رات کو قیام کر مگر تھوڑے حصہ کو چھوڑ کر۔ قرآنی انقلاب کے اولیں مراحل میں پروگرام اس قدر سخت' جانکاہ اور مشقت طلب ہوتا ہے کہ اس میں دن کے علاوہ راتوں کو بھی کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رات کو جاگنے کا یہ حکم جیسا کہ آیۂ کریمہ میں نافلۃ لک کے الفاظ سے ظاہر کر دیا گیا ہے صرف حضور ﷺ کے لئے تھا۔ امتی اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ حضور کو دن میں بہت کام ہوتا تھا۔ ان لک فی النھار سبحاً ۷۳/۷ دن میں تمہارے لئے اور بہت کام ہیں اس بناء پر حضور کو حکم تھا کہ آپ رات کو

قرآن کے ساتھ (یہ) جاگیں۔اس میں غور وفکر کر کے سکیمیں بنائیں اوردن میں ان کو عملی جامہ پہنائیں ان کو (Implement) کردیں لیکن مذہب میں اس کا ترجمہ نماز پڑھنا کیا گیا ہے ''اور رات کے ایک خاص حصہ میں نماز تہجد پڑھا کرو'' (ترجمہ حضرت مولانا فرمان علی صاحب)۔ تفسیر شہیر تدبر قرآن میں مرقوم ہے ''اور شب میں بھی تہجد پڑھو یہ تمہارے لئے مزید برآں ہے''۔ غرض دین کے قیام کے لئے غور وفکر اور عملی کوشش کو 'مذہب'' میں نماز میں منتقل کر دیا گیا۔

''نذر اللہ اور نیاز حسین''۔ عام طور پر مستعمل ہے۔ نیاز فارسی لفظ ہے اور اس اعتبار سے اس کا قرآن کریم یا دینی تصورات سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔البتہ نذر عربی لفظ ہے۔اس کی جمع نذور آتی ہے۔ یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔یوفون بالنذر ۷/۷۶ یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں جو نذریں پوری کرتے ہیں یعنی واجبات۔ یہ وہ امور ہیں جو مومنین اپنے اوپر از خود واجب قرار دے لیں (اور پھر ان کو پورا کریں)۔مثلاً آپ کے گاؤں میں لڑکوں کا سکول تو موجود ہے لیکن لڑکیوں کا کوئی سکول نہیں۔اور وہاں لڑکیوں کے سکول کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے' لیکن حکومت کے پاس اس کے لئے پورے فنڈز نہیں ہیں تو گاؤں کے لوگ اس کے لئے ۶۰ فیصد رقم Offer کرتے ہیں اور ۴۰ فیصد رقم حکومت کو مہیا کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ یہ ۶۰ فیصد رقم کا ادا کرنا دینی اور قرآنی اصطلاح میں نذر ہے۔لیکن مذہب میں اس سے شبرات اور بائیس رجب کے کونڈے مراد ہوتی ہے جو جگہ جگہ لوگ کھاتے پھرتے ہیں۔جن لوگوں کے پاس بچوں کے لئے کپڑے سلوانے یا ان کی فیس ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے لیکن وہ یہ نذر کے کونڈے یا بیوی کی صحنک بڑے اہتمام سے کرتے ہیں اور جس قدر روپیہ اس میں خرچ ہوتا ہے وہ مذہب کے نام پر ضائع ہوتا ہے۔

صدقہ' ہر وہ چیز جو خدا کی راہ میں دی جائے صدقہ ہے۔زکوٰۃ کا دینا واجب ہوتا ہے۔ لیکن صدقہ دینا واجب نہیں ہوتا' بلکہ تطوعاً دیا جاتا ہے۔جب قرآنی نظام اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں جو کچھ افراد کی ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے' سب معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے صرف

ہوتا ہے۔لیکن عبوری دور میں اسلامی معاشرہ ایک معیّن رقم افراد پر واجب کرتا ہے' جو عام حالات میں وصول کی جاتی ہے' اس کے لئے زکوٰۃ کا لفظ بطور اصطلاح آیا ہے۔لیکن ہنگامی حالات میں جو کچھ مومنین دیتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔لیکن یہ بھی اجتماعی طور پر وصول اور اجتماعی طور پر خرچ کیا جاتا ہے۔اس کے لئے حکم یہی ہے کہ صدقات (عطیات) کو اپنے اپنے طور پر خرچ نہ کرو بلکہ اسے اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کرو۔ پھر اس مرکز نظام یعنی حضورﷺ سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو ۹/۱۰۳۔اور اس رقم کو معاشرہ کے فلاحی کاموں کے لئے ان مدات پر صرف کرو جن کا ذکر سورہ توبہ میں آیۂ کریمہ ۹/۶۰ میں آیا ہے یہ صدقات کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں غلطی سے زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے اور بار بار انتباہ کے باوجود ہمارے علماء کرام ان کو زکوٰۃ کے مصارف ہی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ شروع میں جو مفسرین نے ان کو زکوٰۃ کے مصارف بیان کر دیا ہے۔

''مذہب'' میں صدقہ کسی مصیبت کو ٹالنے یا اس سے محفوظ ہونے کو کہتے ہیں۔سفر پر جب جہاز میں جانا ہوتا ہے تو اہل خانہ تھوڑی سی دال' کچھ آٹا اور تیل کا صدقہ اتارتے ہیں تا کہ جہاز بمع مسافروں کے بخیریت پہنچ جائے۔ نیا مکان تعمیر کرنے سے پیشتر کئی بکروں کو صدقہ کے طور پہ ذبح کرتے ہیں۔ یہ دستور اس درجہ رواج پذیر ہوا کہ اب تو صدقے کے بکرے الگ فروخت ہونے لگے ہیں۔ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بجاست۔

کسی مجرد حقیقت یا نظریہ کی محسوس علامات Symbols 'شعائرُاللہ ہوتے ہیں۔مثلاً مملکت کا جھنڈا' شعائر کی حیثیت سے وہ بڑا واجب الاحترام ہوتا ہے' لیکن اس کے کپڑے یا بانس کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ وہ کپڑا پرانا ہو جائے یا وہ بانس گل سڑ جائے' تو ان کی دوسرے کپڑوں یا دوسرے بانسوں سے کوئی تمیز نہیں۔شعائرُاللہ سے مراد اس مملکت کی محسوس علامات ہیں جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے دنیا میں قائم ہوتی ہے' اسلامی حکومت کی کرنسی Currency' جوڈیشل پیپرز' پاسپورٹ' ویزا Stamps Visa' یہ سب شعائرُاللہ ہیں۔ان

کوصرف Recognise کیا جائے گا وہ بھی اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ شعائر فی ذاتہٖ کوئی تقدس نہیں رکھتے۔ ان کا احترام قوانین خداوندی کے احترام کا ایک محسوس طریقہ ہے۔ لیکن ''مذہب'' میں مزعومہ نذر و نیاز علَم' تعزیہ' ذوالجناح یہ سب شعائر اللہ ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے بیعت ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ خدا مومنین سے ان کے جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ یہ معاہدہ صرف ذہنی یا اعتقادی نہیں ہوتا کہ آپ نے دل میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا مال و جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا اور خدا نے آپ کو جنت دے دی۔ یہ معاہدہ محسوس شکل میں نظام خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے حضور ﷺ نے متشکل فرمایا تھا اور جسے حضور کے بعد آپ کے جانشینوں کے ہاتھوں قائم اور ہمیشہ مستحکم رہنا تھا' اس دنیا میں جنتی زندگی کا وعدہ بھی اسی نظام کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے اور اخروی زندگی میں بھی یہی وعدہ پورا کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد مومنین اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگی کی ضروریات کی طرف سے بے فکر ہو جاتے ہیں اور نظام خداوندی کے استحکام کی خاطر عندالضرورت جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو دشمن کو قتل کر کے فاتح و منصور واپس آ جاتے ہیں اور یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں اور مرنے کے بعد جنت کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں ۹/۱۱۱۔ یہی وہ بیعت تھی جو جماعت مومنین نے حدیبیہ کے مقام پر کی تھی اور جس کا ذکر سورہ فتح میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ ان الذین یبا یعونک انما یبایعون اللہ یداللہ فوق ایدیھم ۴۸/۱۰۔ جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے معاہدہ کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پر (بظاہر تمہارا ہاتھ لیکن درحقیقت) اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو معاہدہ خدا کے ساتھ ہوتا ہے اس کی عملی شکل کیا ہوتی ہے۔ یعنی وہ معاہدہ اس نظام کے مرکز کے ساتھ کیا جاتا ہے جو قوانین خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ بیعت جو جان و مال یعنی سب کچھ دے کر جنت لینے کے لئے کی جاتی ہے۔ لیکن جب مرکز ہی نہیں رہا اور دین مذہب میں بدل گیا تو اس وقت بیعت' جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے' پیر کی

بیعت کرنا مراد لی جانے لگی۔

اسی طرح قرآن کریم کے بیسیوں الفاظ ہیں جن کا مفہوم دین میں کچھ اور تھا اور دین کے منقرض ہونے کے بعد مذہب میں ان کا مفہوم بالکل مختلف ہو گیا۔ ان میں سے' توبہ' استغفار' تسبیح' ملائکہ' روح' وسیلہ' اسی طرح اور بے شمار الفاظ ہیں۔

سنت الٰہی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی' ولن تجد لسنة الله تبديلا (۳۳/۶۲)۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا علم ہوتا ہے جس کی وضاحت اس نے سورۃ حج کی اس آیت کریمہ میں فرمائی ہے۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنى التى الشيطان فى امنيته فينسخ الله ما يلقى الشيطن ثم يحكم الله آيته (۲۲/۵۲) اور ہم نے تجھ سے پیشتر جس نبی اور رسول کو بھیجا تو اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کے جانے کے بعد شیطان (دین سے منحرف لوگ) اس کی کتاب میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے' اس کے لئے اللہ پھر ایک رسول بھیجتا جو ان تبدیلیوں اور اضافوں کو مٹاتا اور اس طرح وحی کو پھر اس کی اصلی اور منزہ شکل میں پیش کر دیتا۔

آیہ مبارکہ کے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف رسول مبعوث فرمائے۔ ایک رسول آتا وہ اپنی مردہ قوم کو زندہ کرتا۔ دین کے زندگی بخش نظریات ان کو دیتا اور ان پر عمل پیرا ہونے سے اس کی قوم زندگی کی خوشگواریاں حاصل کر لیتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہوتا تھا' جو ان کو یہ خوشگواریاں عنایت فرماتا۔ اس میں نہ انسانوں کی حکمرانی ہوتی اور نہ ہی لوگوں کی کسی طرح کی بھی Exploitation۔ اس میں نہ سرمایہ داری ہوتی نہ اس میں پیشوائیت' اس معزز نبی کے چلے جانے کے بعد یہ قوم کچھ عرصہ اس پر مسلسل عمل کرتی رہتی' یہاں تک کہ امتداد زمانہ سے اس نبی کی تعلیم میں آمیزش ہو جاتی اور اس کی قوم اس کے دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتی۔ اور وہ قوم پستی و زوال کے گڑھے میں جا گرتی۔ پھر رحمت الٰہی اپنی تدبیر کے مطابق ایک دوسرا (نیا) نبی مبعوث فرماتی جو لوگوں کو صحیح دین کی تعلیم دیتا۔

معاشرہ کے پست ترین لوگ' اوراس معاشرہ کی سعید روحیں اس نبی کا ساتھ دیتیں اور مفاد پرست لوگ اس نبی کی مخالفت کرتے اور کہتے کہ آپ کونسی ایسی چیز لائے ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم بھی خدا کو مانتے ہیں اوراس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ نیا رسول سخت محنت و جانفشانی کے بعد منزہ وحی کے مطابق پھر معاشرہ کو مستقل اقدار کے مطابق قائم کرتا۔ اور یہ قوم پھر مردہ سے زندہ ہو جاتی۔ وحی کی حیات آور تعلیم اوراس کی عطا کردہ مستقل اقدار' اس کو بلندیوں کی معراج پر پہنچا دیتیں' پھر کچھ عرصہ بعد اس قوم کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوتا جو گذشتہ اقوام کے ساتھ ہوا تھا۔ یعنی وحی میں آمیزش ہوتی' اس کی قوم دین کو مذہب میں تبدیل کر کے' غیر خداوندی نظام قائم کر لیتی۔ اس تبدل وتحول میں عمدہ ترین مثال حضور ﷺ کی دعوت کی ہے۔ اعلان نبوت کے بعد آپ کی شدید ترین مخالفت ہوئی۔ چھوٹی بڑی بیاسی (۸۲) لڑائیاں مخالفین کے ساتھ ہوئیں اور بالآخر حضور نے دین کو عملی طور پر مستقل اقدار کے مطابق متشکل فرما دیا۔ صدر اول کے مسلمانوں نے نہایت عروج واقتدار حاصل کیا۔ دین کا اتباع کرنے کی وجہ سے حضور ﷺ' اس جماعت مومنین کو' بہترین قوم بنا کے' تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے دین پھر مذہب میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ چونکہ سرمایہ داری اور پیشوائیت ملوکیت کے ساتھ تھی اس وجہ سے مذہب کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی' اور مستقل اقدار اور دین کا تصور آہستہ آہستہ بالکل ختم کر دیا گیا۔

آج مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ صورت ہیں حالم میرس۔ تعلیم یافتہ طبقہ جو Intellegentia کہلاتا ہے۔ وہ کم و بیش اسلام کے مستقبل سے بالکل مایوس ہے۔ یہ موجودہ حالات کے تقاضے ہیں۔ مسلمان خود بھی اپنے خود ساختہ نظامہائے باطل سے مایوس ہو کر' اسلامی نظام کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی غیر مترقبہ Opportunity ہے کہ اس کو کسی بھی حال میں Miss نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن افسوس کہ جو سبب ہمارے زوال وادبار کا ہے۔ ہم پھر اسی سبب کو اپنا علاج سمجھ کے اختیار کر رہے ہیں۔ تمام

مسلم ممالک میں پھر دین کے بجائے مذہب کا احیاء ہو رہا ہے۔ ایران و افغانستان میں مذہب کا احیاء کیا گیا' جو دونوں جگہ ناکام رہا۔ ہمارے ہاں بھی گورنمنٹ کی طرف سے بڑے بڑے ادارے بنائے گئے ہیں' بے شمار روپیہ ان پر صرف ہو رہا ہے۔ مذہبی عدالتیں بنائی گئیں۔ زکوٰۃ' عشر' اوقاف' وزارت مذہبی امور' ٹی وی کے ہر چینل پر مذہب کی تبلیغ میں مسابقت' یہ سب مذہب کا احیاء ہے اور مزید زوال و ادبار کا باعث' اس کا دین سے کوئی علاقہ نہیں۔ ہائے افسوس' صد ہزار افسوس کہ آج پوری اسلامی دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو دین و مذہب کے فرق کو نمایاں و واضح کر کے' دین کی قیام کی تحریک کو لے کر اٹھے اور کسی خطۂ ارض پر دین (مستقل اقدار) کو قائم کر کے مسلمانوں کو اس گرداب سے نکال لے' کیونکہ مسلمانوں کا عروج و زوال تو صرف ان کے دین کے عروج و زوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ خوب یاد رکھیں کہ اگر آج کہیں مذہب کی اساس پر اسلامی حکومت قائم بھی ہو جائے تو وہ صرف کچھ عرصہ ہی چل سکے گی اور لازماً کچھ مدت بعد منقرض ہو جائے گی۔ مذہب میں وہ اساس محکم ہے ہی نہیں جس پر حکومت قائم ہو سکے۔ مذہب نہ اس کا داعی ہے اور نہ ہی اس کا متقاضی۔ مذہب کے نام پر قائم کردہ اسلامی حکومت کے ناکام ہو جانے کے بعد' یاد رکھیں' کہ پھر مسلمانوں کو کم سے کم ہزار سال تک اسلامی حکومت قائم کرنے کی ہمت نہیں ہوگی اور یہ مسلمانوں کے لئے بڑی ہی تباہی و بربادی کی بات ہوگی۔

خدا کی کتاب محفوظ شکل میں موجود ہے۔ یہ تمام اقوام عالم کے لئے یکساں آئین حیات ہے۔ اگر مسلمان مذہب کو بدل کے دین اختیار نہیں کریں گے تو کوئی اور قوم قرآن کے نظام کو اختیار کر لے گی یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ دین خداوندی ہر حال میں غالب آ کر رہے گا۔ (۹/۳۳) مگر افسوس کے: تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے۔

فستذکرون ما اقول لکم (۴۰/۴۴)

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

’’قرآن فہمی وحدیث نبوی‘‘

(موقر ماہنامہ ’’محدث‘‘ سے چند گذارشات)

معروف وموقر جریدہ ’’محدث‘‘ ملت اسلامیہ کا علمی واصلاحی مجلّہ ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ جناب حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب اور مدیر جناب حافظ حسن مدنی صاحب قابل احترام شخصیات ہیں۔ یہ مجلّہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اہل حدیث حضرات کے نظریات وخیالات کا ترجمان ہے۔ اس ماہنامہ کے مارچ کے ایشو میں مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہٗ کا ایک مضمون ’’قرآن فہمی اور حدیثِ نبوی‘‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن صاحب مضمون نے اپنا پورا مدعا اس میں بیان فرما دیا ہے۔ زبان بھی نہایت متین وسنجیدہ استعمال کی گئی ہے۔ مضمون ہذا میں رسالہ طلوع اسلام اور رسالہ اشراق کے قرآن فہمی کے اصولوں کی تنقیص کی گئی ہے۔ رسالہ ’محدث‘ ہو یا رسالہ جات ’’طلوع اسلام‘‘ و ’’اشراق‘‘ سب کا مطمح نظر قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس کی تعلیم کو عام کرنا ہے اس مطمح نگاہ اور مقصد میں سب متفق ہیں اور حتی الامکان اپنی اپنی جگہ قرآن کریم کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ البتہ سوچ کے طریقوں اور قرآن فہمی کے اصولوں میں اختلاف ہے۔ لیکن ہم سب مسلمان ہیں۔ قرآن کریم کے خادم ہیں۔ ہمیں ان اصولوں کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے مغائرت ومنافرت کرنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کی عزت کریں اور قرآن فہمی میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اور جن مصائب میں

گھرے ہوئے ہیں شاید چودہ سو سال میں مسلمانوں پر اس سے برا وقت کبھی نہیں آیا ہوگا ان موجودہ حالات کے پیش نظر آپس میں تعاون وتنافر وقت کی اور بھی زیادہ ضرورت بن گیا ہے۔

قرآن فہمی کے اصولوں اور قواعد کے سلسلہ میں محترم پرویز صاحب علیہ الرحمتہ اور محترم جاوید غامدی صاحب کے حوالے سے مضمون میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب خورشید ندیم صاحب پرویز صاحب کے قرآن فہمی کے اس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے جس کی رو سے وہ قرآن کریم کو صرف لغت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے برخلاف طلوع اسلام' جناب جاوید غامدی صاحب کے طریقہ کو کہ ''وہ قرآن کو جاہلی دور کے عربی ادب اور شعروشاعری کے ذخیرے کی بنیاد پر سمجھنا چاہتے ہیں'' درست خیال نہیں کرتا۔ مضمون کو مزید واضح کرنے کے لئے تحریر کیا جاتا ہے کہ (بقول راشدی صاحب) پرویز صاحب مرحوم قرآن کریم کو صرف لغت کے حوالے سے سمجھتے تھے اور جناب غامدی صاحب قرآن کریم کو جاہلی دور کے عربی ادب اور شعر شاعری کے ذخیرے سے سمجھنا چاہتے ہیں' جبکہ طلوع اسلام اور اشراق' دونوں ہی ایک دوسرے کے طریقہ کو درست قرار نہیں دیتے۔ ان دونوں حضرات کے قرآن فہمی کے طریقوں کے اختلاف سے صاحب مضمون فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ صاحب مضمون کا یہ نظریہ ہے کہ ان دونوں ہی حضرات کا قرآن فہمی کا طریقہ غلط ہے۔ وہ یعنی صاحب مضمون' لغت اور ادب جاہلی اور محاوروں کو اہمیت تو دیتے ہیں' ان کی اہمیت سے صرف نظر نہیں فرماتے' لیکن یہ خیال فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سہارے قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں ہیں۔

اس مضمون کو سمٹانے اور مختصر کرنے کی غرض سے 'محدث' میں طبع شدہ مضمون کا ملخص بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ورنہ طول طویل اقتباسات نقل کرنے سے مضمون بھی بہت لمبا ہوتا ہے اور ان کا مطالعہ بھی قارئین پر گراں گذرتا ہے۔ اب خود صاحب مضمون جناب راشدی صاحب کا نقطہ نظر تحریر کیا جاتا ہے اور اس پر تبصرہ بھی۔ نیز راشدی صاحب کا نام بھی مختصر تحریر کیا گیا ہے ورنہ حضرت اقدس کا پورا نام مولانا ابوعمار زاہد الراشدی تحریر کیا گیا ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں حضرت مولانا راشدی صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے متکلم کی منشاء تک رسائی ضروری ہے۔ اس کیس میں اللہ تعالیٰ متکلم ہے۔ لیکن اس تک براہ راست رسائی ممکن نہیں ہے کہ اس سے دریافت کیا جاسکے کہ آپ کی اس بارے میں کیا مراد ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نمائندے تک تو ہماری رسائی ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی اللہ تعالیٰ کی نمائندہ ہے جن کا مشن ہی یہ تھا کہ 'اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچائیں اور اس کی وضاحت کر کے ہمیں اللہ تعالیٰ کی منشاء سے آگاہ کریں'۔ اس کے بعد حضرت نہایت معصومانہ انداز میں اس حیرت واستعجاب کا اظہار فرماتے ہیں کہ 'جبکہ قرآن کریم امت تک جن ذرائع سے پہنچا ہے وہی ذرائع اس کی تشریح یعنی جناب نبی اکرم کے ارشادات وفرمودات کو ہم تک منتقل کررہے ہیں۔ اگر وہ ذرائع قرآن کریم کو امت تک منتقل کرنے میں قابل اعتماد ہیں تو حدیث وسنت کو امت تک پہنچانے میں کیوں قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اگر وہ حدیث وسنت کی روایت میں خدانخواستہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو قرآن کریم کی روایت میں کس طرح قابل اعتماد ہو جاتے ہیں'۔ (اقتباس ختم)۔ غرض کہ اصل نظریہ حضرت کا وہی روایت پرستی کا حامل ہے کہ قرآن کریم کو روایت کے ذریعے سمجھا جائے اور تفسیر القرآن بالروایات کا جو رواج طریقہ ہمارے ہاں چلا آرہا ہے' اسی طریقہ کو جاری رکھا جائے۔

جو اعتراض حضرت نے معصومانہ سوال کے پیرائے میں تحریر فرمایا ہے اس سلسلہ میں بنیادی بات جو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم پر ہم ایمان لاتے ہیں۔ امن الرسول بما انزل الیہ والمومنون (2/285)۔ (ہمارے) پیغمبر جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے' اسی پر ایمان لائے اور انکے ساتھ مومنین بھی۔ قرآن کریم کی ایک ایک آیت پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن احادیث کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ کس قدر ذخیرہ احادیث پر ایمان لانا ضروری ہے' اور کس قدر پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ قرآن کریم پر ایمان لانے کے بعد پھر سوال ہی باقی نہیں رہتا کہ یہ قرآن جو 6 ہزار سے زیادہ آیات پر مشتمل

ہے کن ذرائع سے ہمارے پاس آیا' اس کے برخلاف احادیث کا یہ مقام نہیں ہے۔ہم احادیث پر نہ تو ایمان لانے کے مکلف ہیں اور نہ ہی احادیث کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔احادیث کے قبول و تردید کے بارے میں ایک پورا علم ایجاد کیا گیا۔ایک ایک حدیث کی جرح وتعدیل کی گئی۔اسماء الرجال کا علم بنایا گیا۔ایک ایک راوی کے پورے پورے حالات جمع کیے گئے۔سینکڑوں ہزاروں کتابیں اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے بارے میں تصنیف کی گئیں۔اگر قرآن وحدیث کے ذرائع دونوں ایک جیسے باوثوق تھے تو یہ اس قدر تفاوت کیوں ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کو روایت ودرایت کی کسوٹی پر نہیں تولتے جبکہ ہر ہر حدیث کو روایت ودرایت کے Process سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ روایت و درایت کا علم نہ تو پرویز صاحب مرحوم نے ایجاد کیا اور نہ ہی محترم غامدی صاحب کی ایجاد ہے۔ ہمارے علماء کرام نے خود ہی ان ذرائع میں امتیاز پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ جب تک کہ ہر ہر حدیث پر تنازع عام اصول ہے۔قرآن کے ذرائع کو خود بخود تسلیم کرنا' اور احادیث کے ذرائع کو خود مشکوک سمجھ کر ان کی چھان بین کرنا' خود صاف ظاہر کر رہا ہے کہ ان دو ذرائع میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

تاکید مزید وتائید متین کے طور پر تحریر ہے کہ ہمارے نزدیک قرآن وحدیث کے صحیح و اصلی مقامات و باہم امتیازات یہ ہیں کہ قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن کریم جس رسول امین پر نازل ہوا' اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن کریم جس روح الامین کے ذریعے نازل ہوا' اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن کریم کو جس معبود نے اتارا' اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔لیکن اس کے برخلاف نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے' نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے' نہ حدیث کے رواۃ پر ہمارا ایمان ہے نہ ان پر ایمان لانے کا حکم ہم کو دیا گیا ہے۔نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں' ان پر ہمارا ایمان ہے نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے اس قدر افتراق وامتیاز کے باوجود یہ کس طرح مناسب ہے کہ

ایسی غیر یقینی اور غیر ایمانی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت قرار دے لیں۔

اس ساری گفتگو میں اصل نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے اصول وقواعد کیا ہیں اور اب تک جن اصولوں سے تفسیر قرآن کی جاتی رہی ہے یعنی تفسیر القرآن بالروایات' اور جس کی تائید وتاکید حضرت مولانا راشدی صاحب نے بھی فرمائی ہے اسی طریقہ کو جاری رکھا جائے یا یہ خیال کرتے ہوئے کہ ان اصولوں سے قرآن کی تفسیر کر کے' قرآن کریم کی صحیح تعلیم سامنے نہیں آتی' اور جو تعلیم آج تک سامنے آئی ہے' اس پر عمل کر کے' مسلمانوں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہی ہوتی جارہی ہے لہٰذا ان آزمودہ اصولوں کے بجائے خود قرآن کریم کے متعین شدہ اور مقرر کردہ اصولوں سے ہی کیوں نہ استفادہ کیا جائے' اور ان کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کر کے' خالص قرآنی تعلیم حاصل کی جائے۔

ہمارے ہاں قرآن کریم کی تفاسیر تصنیف کرنے سے پیشتر تفسیر کرنے کے اصول متعین نہیں کئے گئے تھے بلکہ اصول وقواعد مقرر ومتعین کئے بغیر ہی تفاسیر تحریر کرنے کا سلسلہ جاری کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلی تفسیر جو ہمارے دینی لٹریچر میں اس وقت موجود ہے وہ تفسیر طبری ہے جو تقریباً 300 ہجری کے قریب میں تحریر کی گئی ہے اور اس کے بعد جس قدر تفاسیر تحریر کی گئیں اکثر کا دارومدار اور انحصار اسی تفسیر پر رہا اور اسی اصول کے تحت تفاسیر تحریر کی گئیں۔

ابتداء سے ہی تفسیر کرنے کا یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ سب سے پہلے آیۂ کریمہ کا شان نزول تلاش کیا جاتا ہے۔ قرآن فہمی کی راہ میں شان نزول کو اس قدر اہمیت دینا ہی ہمارے نزدیک قرآن فہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ ہر آیت کے شان نزول میں یہ تلاش کیا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں یہودی کے حق میں اتری تھی اور یہ فلاں منافق کے بارے میں۔ یہ آیت فلاں صحابی کی شان میں نازل ہوئی اور یہ آیت اہل بیت کے فلاں محترم فرد کے لئے نازل ہوئی اور اس طرح قرآنی احکامات کی عمومیت' عالمگیریت اور ابدیت کو جو قیامت تک پوری نوع انسانی کے لئے تھیں' صرف چند افراد تک محدود کر کے رکھ دی گئی ہیں' شان نزول کا عقیدہ قرآن فہمی میں اس

طرح رکاوٹ بن کر سامنے آتا ہے کہ یہ کسی بھی آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی طرف آنے ہی نہیں دیتا اور صورت حال یہ ہوتی ہے کہ آیت تو لے لی قرآن سے' اور شان نزول روایات میں ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ ایک ہی آیت کے دو' تین' چار' پانچ شان نزول بیک وقت روایات میں مندرج ہیں اور وہ خود اس قدر شک وشبہ اور تضاد سے پرمملو ہوتے ہیں کہ یقینی بات کا علم ہی نہ ہو سکے۔

ہمارے مفسرین کرام نے شاید اس نکتہ پر غور نہیں فرمایا کہ بعض اوقات کئی سورتیں بیک وقت پوری پوری بھی نازل ہوتی ہیں' سورہ نور کے بالکل شروع میں ارشاد ہوا: سورۃ انزلنا.......... (21/1)۔ یہ ایک سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا اس کے احکام کو فرض کر دیا اور اس میں ہم نے واضح روشن آیتیں نازل کی ہیں۔

اس سورہ مبارکہ میں 64 آیات کریمات ہیں۔ اگر آیات کسی سبب یا واقعہ کے باعث نازل ہوتی تھیں تو یہ پوری سورۃ بیک وقت کیسے نازل ہوگئی۔ شان نزول کے عقیدہ کے مطابق تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مختلف اوقات میں مختلف 64 واقعات رونما ہوئے تو یہ سورہ سب واقعات کا احاطہ کر کے نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ صورت معاملہ بالکل عجیب وغریب سی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک تو قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی تدبیر امور کے مطابق نازل ہوا' وقتی حادثات و واقعات یا چند مخصوص افراد و شخصیات کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات کا نزول نہیں ہوتا تھا۔ غور کرنے کی یہ بات ہے کہ اگر وہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی۔ یا اگر زیادہ واقعات رونما ہو جاتے تو کیا آیات کریمات کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ اگر واقعہ افک' قصہ مباہلہ' قصہ زید' واقعہ غدیر وغیرہ رونما نہ ہوتے تو یہ آیات نازل نہ ہوتیں' قرآن کریم از اول تا آخر' سورۃ بقرہ سے لے کر سورہ والناس کے آخر تک یقینی ہے۔ اس کی جملہ آیات یقینی وحتمی ہیں۔ جب کہ شان نزول اور روایات بالکل ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ اس صورت میں آیات کی تفسیر کا مدار وانحصار روایات اور شان نزول پر رکھنا' بالکل غیر مناسب اور عقل کے خلاف ہے اور آیات کے مفہوم کو بھی

غیر یقینی اور ظنی بناتا ہے۔

قرآن کریم ایک مکمل ضابطۂ حیات اور اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ بے مثال دین ہے۔ جس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہر مسلمان کا فرض اولین ہے۔ یہ وہ ضابطۂ حیات یا نظام زندگی ہے جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے اور جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس نظام کو اختیار کرنے سے ہر مسلمان دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف اور صرف قوانین خداوندی کا محکوم ہو جاتا ہے۔ اس نظام کو حضور ﷺ نے اپنے دور ہمایوں میں جاری فرمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے والے نہ صرف تمام دیگر اقوام پر غالب آ گئے بلکہ ایک ایسا معاشرہ وجود پذیر ہوا کہ جس میں انسانیت نے اطمینان وسکون کا سانس لیا۔ انسان کے استحصال کرنے کے تمام ذرائع (Exploitation of man by man) بند کر دیئے گئے اور وہ نظام ربوبیت جاری ہوا' جس کا جاری کرنا انسانیت کا مقصد اعلیٰ ہے۔ لیکن انسانیت کی بدبختی کہ وہ نظام زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکا۔ جس کے دیگر اسباب کے علاوہ سب سے بڑا سبب ملوکیت کا غلبہ تھا۔ ملوکیت نے غلبہ پا کر اس نظام کو ختم کر دیا اور مستقلاً بادشاہت قائم کر دی جو کہ قرآن کریم کی رو سے قطعاً حرام ہے۔ لیکن قرآن کی اس واضح تعلیم کے باوجود کہ بادشاہی حرام ہے' ظالم' فاسق' بدچلن' آوارہ مزاج اور اوباش بادشاہ تلوار کے زور پر امت کی گردنوں پر سوار ہو گئے اور جمہور مسلمانوں کا حق غصب کر کے اپنی بادشاہت قائم رکھی۔ ملوکیت نے اس نظام کو تو ختم کر دیا لیکن نام اسلام کا ہی استعمال کرتے رہے۔ اس کو خلافت کے نام سے نامزد کرتے رہے' اور اپنے آپ کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے القاب سے موسوم کرتے رہے' یہ مسلمانوں کا تاریک ترین دور تھا' اور اس تاریک ترین دور میں ہمارا سارا دینی لٹریچر وجود میں آیا۔ عام اس سے کہ وہ فقہ واصول فقہ ہوں یا احادیث وتفاسیر کے مجموعے۔ اس دور میں چونکہ دین کا تصور ختم ہو چکا تھا اور اسلام صرف مذہب کی حیثیت سے رہ گیا تھا۔ اس لئے اس دور میں جس قدر تفاسیر تحریر کی گئیں وہ بطور مذہب کے تحریر کی گئیں' وہ قرآن کریم کو بحیثیت دین کے پیش

نہیں کرتیں۔ اب جبکہ انسانیت اپنے تجویز کردہ نظامہائے حیات سے تنگ آ کر اور خود مسلمان بھی دنیا کی ذلت وخواری کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہو کر قرآن کی طرف آ رہے ہیں تو یہ تفاسیر ان کے سامنے قرآن کریم کو بطور مذہب کے پیش کرتی ہیں' ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش نہیں کرتیں اور نہ ہی وہ ان کی موجودہ مشکلات ومصائب کا حل اپنے اندر لئے ہوئے ہیں جن کا حل خود قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ ان تفاسیر کی وجہ سے مسلمان پھر قرآن سے بدظن ہو رہے ہیں اور موجودہ نسل مزید دور ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ان ہی تفاسیر کے سبب تو مسلمان تباہ وبرباد ہوئے ہیں۔ ہمارا ایک ہزار سال کا لٹریچر مسلمانوں کے مجبور' مقہور' ذلیل وخوار ہونے کا ذمہ دار ہے۔ آج اس امر کی شدید ترین ضرورت ہے کہ وہ تفاسیر وشہ پارے مہیا کئے جائیں جن میں قرآن کریم کی خالص تعلیم ہو اور جن میں قرآن کریم کو بطور دین کے پیش کیا گیا ہو۔ لیکن یہ تفاسیر روایات کے ذریعے تحریر نہیں کی جاسکتیں مزید یہ کہ

نیست این کار فقیہاں اے پسر

یہ تفاسیر تو وہ ہی خوش قسمت لوگ تحریر کر سکتے ہیں کہ جن کے سامنے صرف قرآن خالص ہو اور اس کا نظام حیات اور موجودہ دور کے علوم ومسائل پر گہری نظر۔ نہ کہ ملوکیت وبادشاہت اور ایک ہزار سال کے دقیانوسی علوم پر اصرار واعتماد۔

تفسیر بالروایات کے طریقہ میں کہ جس کی تائید وتوصیف حضرت مولانا راشدی صاحب فرما رہے۔ ان عیوب واسقام کے علاوہ ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ یہ تفاسیر نسخ کے عقیدے کی حامل ہیں جس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل فرما دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ لیکن حیرت کی یہ بات ہے کہ اس نئی آیت میں یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس لئے اب قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ لیکن اللہ

تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ کون سی آیت کس آیت سے منسوخ اور کون سی آیت کس آیت کی ناسخ ہے۔ یہ ناسخ و منسوخ آیات کی نشاندہی روایات کے ذریعے ہمارے مفسرین کرام نے کی ہے۔ چنانچہ ناسخ و منسوخ آیات کی تعداد میں اضافہ و کمی ہوتی رہی ہے۔ جو حضرات عقیدہ نسخ کے قائل تھے ان کی تو کوشش یہی ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ آیات کو منسوخ دکھایا جائے۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحب محدثؒ دہلوی نے ان کی تعداد کم کرتے کرتے صرف 5 تک رہنے دی ہے۔ اس عقیدے کی رو سے آپ خود غور فرمالیں کہ اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم کے متعلق کس قسم کا تصور باقی رہ جاتا ہے۔

نسخ کے سلسلہ میں اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورہ النساء کی مشہور آیۂ کریمہ نمبر 15 کے مطابق زانی کی سزا کے لئے ۴ عینی گواہوں کا شہادت کے لئے ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس آیت میں تعزیر ''پابند مسکن'' کرنا ہے۔ یعنی اس عورت کو مکان سے باہر جانے سے روک دیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں فقہ میں زنا کی سزا سو کوڑے ہے جو قرآن کریم کے مطابق ہے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ''اگرچہ یہ تعزیرات سورہ نور میں نازل شدہ حدود کے ذریعے منسوخ ہوگئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا'' (تدبر قرآن)۔ یعنی آیۂ کریمہ کا ایک حصہ یعنی زنا کی سزا تو منسوخ ہوگیا' لیکن دوسرا حصۂ شہادت کا ضابطہ (یعنی 4 عینی گواہوں کی موجودگی) بعد میں بھی باقی رہا۔ یاللعجب۔

ہمارے ہاں جس قدر تفاسیر تحریر کی گئی ہیں اور جو بھی تفسیری لٹریچر وجود میں آیا' ان سب کی اساس' اس بے بنیاد عقیدے پر ہے کہ حضور علیہ السلام کو وحی جلی (قرآن کریم) کے ساتھ ساتھ وحی خفی (احادیث) بھی ہوتی تھی اور حضور ﷺ قرآن کریم کی آیات کی جو تفسیر فرماتے تھے وہ اسی وحی خفی کی بنیاد پر فرماتے تھے۔ اپنے غور و فکر' تدبر و تعقل سے نہیں فرماتے تھے۔ اسی وحی خفی کی بنیاد پر ان آیات کی تفسیر کی گئی جو حضور ﷺ سے عرصۂ دراز پیشتر سے متعلق تھیں' مثلاً حضرت آدمؑ کا قد' ان کا لنکا میں ہبوط' حضرت نوحؑ کی کشتی کی پیمائش' کشتی میں سوار جوڑوں کی تفاصیل'

حضرت نوح کا عبدالغفار نام ہونا' حضرت مریمؑ کے ہاں جو کھانے آتے تھے ان کے نام' ام موسیٰ سے متعلق صدہا روایات یا آئندہ سے متعلق بے شمار روایات' دجال' دابتہ الارض' نزول مسیحؑ' اس کی ساری تفاصیل کہ انہوں نے گیروی رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوگا' اس سے کچھ وقت پہلے غسل کیا ہوگا اور پانی کے قطرے ان کے بالوں سے ٹپک رہے ہوں گے۔ آمد مہدی سے منسوب روایات' ان سب کا تعلق و مدار وحی خفی کے عقیدے پر ہے۔ لیکن اگر یہ عقیدہ کہ حدیث بھی قرآن کی مثل وحی ہے' غلط قرار دے دیا جائے' تو ہماری تفاسیر کا بیشتر حصہ خود بخود ساقط اور مرفوع القلم ہو جاتا ہے اور اس بیشتر حصۂ تفاسیر کی اہمیت ایک پرکاہ کے برابر بھی نہیں رہتی۔

وحی خفی کا عقیدہ ہمارے علماء کرام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے صدر اول میں اس عقیدہ کا کوئی نام ونشان نہیں تھا' تقریباً دو سو سال کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا۔ ہمارے علماء کرام' پاکستان میں جس جس طبقہ فکر کو بھی استحقاراً و استخفافاً ''منکرین حدیث'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وحی خفی کا انکار ان سب میں مشترک ہے۔ اس طبقہ کا بیشتر حصہ حدیث کا منکر نہیں ہے' بلکہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو' اس کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں' انکار حدیث کا الزام ان کے ذمہ غلط ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ حدیث کو وحی تسلیم کرنے پر کسی طرح بھی آمادہ نظر نہیں آتے۔ ہمارے علماء کرام نے ان نام نہاد ''منکرین حدیث'' کے خلاف تقریباً تین سو سے زیادہ کتب تصنیف فرمائی ہیں۔ اور تقریباً ہر فرقہ نے ہی تصنیف کی ہیں۔ جن میں نام نہاد ''منکرین حدیث'' کے ایک ایک نظریہ کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے' حدیث کی حمایت میں بہت تفصیل سے صحاح ستہ کے مصنفین کے حالات رقم کئے۔ عربوں کے حافظوں کی بڑی تعریف کی کہ ان کے حافظے اس قدر مضبوط تھے کہ انہوں نے احادیث کو نقل کرنے میں بہت کم غلطیاں کی ہیں۔ السماء الرجال کے متعلق بہت مواد مہیا کیا لیکن جو اصل موضوع ہے اور جو سب ''منکرین حدیث'' کا اصل الاصول اور عروۃ الوثقیٰ ہے کہ حدیث وحی نہیں ہے اور ''وحی صرف قرآن میں ہے'' اس موضوع پر کچھ تحریر کرنے سے ہمارے علماء کرام ہمیشہ بچتے رہے اور اجتناب کرتے رہے ہیں۔ کمترین راقم سطور

نے اس موضوع پر ۶ مفصل مضامین تحریر کئے جو عرصہ دراز پیشتر طلوع اسلام میں طبع ہوئے تھے۔ پھر گزشتہ دو سال قبل 'محدث' کے ''انکار حدیث نمبر'' پر تبصرہ رسالہ ہذا میں طبع ہوا۔ اس مضمون میں بھی راقم سطور نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہمارے علمائے کرام حدیث کو وحی ثابت کرنے کے لئے مضمون تحریر کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ لیکن تا حال کسی رسالہ' یا کتاب' یا 'محدث' میں ایسا مضمون تحریر نہیں کیا گیا جس میں حدیث کو وحی خفی ثابت کیا گیا ہو۔ اس مضمون میں پھر اسی درخواست کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام حدیث کے وحی ہونے پر کوئی ایسا جامع و مبسوط مضمون تحریر فرمائیں تاکہ نام نہاد ''منکرین حدیث'' کو اپنے موقف پر دوبارہ غور کرنے کا موقع فراہم ہو۔

اس مضمون میں یہاں تک تفسیر بالروایات کے سُقم اور عیوب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اب حضرت مولانا راشدی صاحب کی توجہ اس طریقہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جس طریقہ سے قرآن کریم کی تفسیر کرنی چاہئے اور اس میں روایات کا سہارا لینے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ بات حضرت نے یقیناً درست فرمائی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے وہ متکلم کے منشا تک رسائی کی کوشش کی جائے''۔ لیکن ان کے خیال سے کیونکہ متکلم یعنی اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی نہیں ہے کہ اس سے اس کی مراد معلوم کر سکیں' اس لئے حضرت کا خیال ہے کہ اس نمائندے یعنی حضور ﷺ تک رسائی حاصل کی جائے' اور اسکا طریقہ یہ ہے کہ احادیث کے ذریعے قرآن کریم کو سمجھا جائے' اس سے متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کا منشاء معلوم ہو جائے گا۔ لیکن ہمارے نزدیک احادیث کے ذریعے متکلم (اللہ تعالیٰ) کا منشاء معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی سابقہ تفاسیر سے منشاء خداوندی معلوم ہو سکتا ہے۔ منشاء خداوندی معلوم کرنے کا واحد ذریعہ صرف قرآن خالص کو پیش نگاہ رکھ کر' ہر دور کی علمی سطح تک علوم حاصل کر کے' قرآن کریم میں غور و فکر کرنا ہے۔ موجودہ دور میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فکر انسانی مختلف علوم میں مجموعی طور پر کہاں تک پہنچا ہے اور قرآن کریم اس کو کہاں تک

لے جاتا ہے' اور جن مسائل کا حل فکرِ انسانی تلاش کرنے سے بالکل عاجز و قاصر ہے اور اب تک بالکل ناکام رہی ہے' قرآن کریم ان مسائل کے کیا حل (Solution) پیش کرتا ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

قرآن کریم نے قرآن فہمی کے جو اصول خود متعین فرمائے ہیں' مقام حیرت ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے ان کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا' قرآن فہمی کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے وہ Original معنے لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت ان کے معانی لئے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ قرآن عربوں کی اس زبان میں نازل ہوا ہے جو زبان وہ اس وقت بولتے تھے فو رب السماء والارض انہ' لحق' مثل انتم تنطقون (51/27)۔ ''پس زمین و آسمان کا رب گواہ ہے کہ بیشک یہ قرآن سچ ہے اور اس کے مانند و مثل ہے جو کچھ کہ تم بولتے ہو۔'' قرآن کریم کا انداز بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح تم گفتگو کرتے ہو۔ اس لئے قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے محاورہ عرب کا خیال رکھنا اور اس پر مہارت و ممارست' اور عبور ہونا ضروری شرط ہے۔ اسی کے الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھا جائے اور اس کے مطابق اس کا مفہوم اخذ کیا جائے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ مفید ہوتی ہے وہ اس دور کی زبان و ادب کا نہایت گہرا مطالعہ اور اس پر مضبوط گرفت ہوتی ہے۔ جس شخص کی گرفت اس دور کے ادب پر جس قدر زیادہ مضبوط ہوگی' اسی قدر وہ قرآن کریم کی صحیح تعبیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

(2) : قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ اس کا ایک اپنا منفرد انداز ہے' اس کا اپنا انداز عام انسانی تصانیف کا سا نہیں ہے کہ اس میں اپنے مدعا کو آسان بنانے کی خاطر کتاب کو مختلف موضوعات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جس موضوع کے متعلق جو کچھ کہنا ہو' اس کو متعلقہ باب میں پورا پورا بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس سے کتاب کے مشمولات و محتویات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم کا اپنا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ اس میں ایک حقیقت اگر ایک مقام پر بیان کی گئی ہے

تو اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام اور بعض اوقات دوسرے مقامات میں آئی ہے۔ان میں کسی جگہ اضافہ کیا گیا ہے اور کسی جگہ استثناء بعض اوقات بعض مشکل واہم حقائق کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے انہیں سیاق وسباق کی روشنی میں' مختلف مقامات پر دہرایا گیا ہے۔قرآن کریم کے اس اسلوب کو''تصریف آیات'' کہا جاتا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ کسی موضوع کو سمجھنے کے لئے' اس موضوع سے متعلق تمام آیات کو پیش نظر رکھا جائے اور اس طرح تصریف آیات' یعنی آیات کو بار بار سامنے لانے سے' قرآن کریم سمجھ میں آ جاتا ہے' قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تصریف آیات خود قرآن کا متعین کردہ طریقہ ہے جب کہ اس نے فرمایا کہ انظر کیف نصرف الآیات .... (6/46)۔''دیکھو کس طرح ہم آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں مگر وہ پھر بھی اعراض کرتے ہیں'' اس آیت سے واضح ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تصریف آیات لازمی چیز ہے۔اور جو قرآن فہمی میں تصریف آیات سے کام نہیں لیتا وہ قرآن کریم سے اعراض کرتا ہے۔یعنی قرآن کریم سمجھنے کے لئے تصریف آیات کے قرآنی اسلوب کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کو قرآن کریم فرار کی راہ قرار دیتا ہے۔خود قرآنی ہدایات کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر وتفہیم کا واحد ذریعہ تصریف آیات ہے۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ حضورﷺ خود قرآن کریم کی تفسیر کس طرح فرماتے تھے کیا آپ کا قرآن فہمی کا طریقہ تفسیر بالرائے پر مبنی تھا؟ اس کے متعلق خود قرآن کریم نے فرمایا کہ وکذلک نصرف الآیات و لیقولوا درست ...... (6/105)۔''اور اے رسول ہم اسی طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دیں۔'' پس یہ بات ثابت ہوئی کہ حضور اس قرآنی حکم کے مطابق تصریف آیات ہی کے ساتھ درس قرآن دیا کرتے تھے۔یعنی قرآن فہمی کا طریقہ آپ کا بھی تصریف آیات ہی تھا۔

(3) یہ کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور دونوں کے لئے فرمایا گیا کہ ان کو بالحق پیدا کیا گیا ہے۔ خلق السموٰت والارض بالحق (63/3)۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے نزل علیک الکتب بالحق (3/7)۔ اے رسول اللہ نے آپ پر اپنی کتاب بالحق نازل فرمائی ہے۔ جس طرح قرآن کے فقرات کو اللہ تعالیٰ نے آیات کہا ہے اسی طرح کائنات کی اشیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے آیات فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ کشتی کو آیت کہا ہے (36/41)۔ اسی طرح حضرت نوح کی کشتی کو ایۃً للعالمین کہا ہے 29/15۔ ایک جگہ ارشاد ہوا وجعلنا اللیل والنہار آیتین 17/12۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا قول اور کائنات اس کا فعل ہے۔ ان میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کی کوئی آیت' کتاب کائنات کی کسی آیت کے مخالف نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فاخرجنا آ ثمرٰت مختلفا الو انھا 35/27۔ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برساتا ہے پھر ہم (خدا) نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے پھل پیدا کئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ہم آسمان سے عملی طور پر پانی برستا اور مختلف رنگ کے میوہ جات پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور اس طرح اس کے قول وفعل میں مطابقت دیکھتے ہیں۔ اس طرح قرآن فہمی میں یہ بات بہت مددگار ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح کائنات میں غور وفکر کرنے کے لئے مختلف علوم کے ماہرین اپنی پوری پوری عمریں کھپا دیتے ہیں۔ اسی طرح قرآن فہمی کے لئے بھی ضروری ہے کہ مختلف علوم کے ماہرین قرآن کریم کی ان آیات پر غور کریں جو ان کے علوم سے متعلق ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص Giology کا ماہر ہے تو اس کو قرآن کریم کی ان آیات کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے جس میں زمین کی پیدائش' اس کا دوادوار میں پیدا ہونا' اور زمین کے متعلق ہی مختلف معلومات فراہم ہوتی ہوں۔ ایک Geologist' ان آیات میں غور وفکر کرنے کے بعد ان گہرے نتائج پر پہنچ سکتا ہے' جن پر ایک عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح قرآن کریم میں سائیکولوجی کے متعلق بہت کافی تعداد میں آیات ہیں' ایک ماہر نفسیات ان کے مفاہیم کو

بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ہم ان کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتے' ملائکہ کائنات کی قوتیں ہیں' ان پر ایک ماہر طبیعات ہی Research کر سکتا ہے۔ اور نہایت اعلیٰ معلومات ان آیات سے Physics کے متعلق حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے وحی الٰہی ہونے کے دلائل فراہم ہوتے ہیں کہ قرآن کریم کس طرح مختلف علوم کا حامل ہے اور جو کچھ قرآن نے اس وقت کہا تھا' آج چودہ سو سال بعد بھی موجودہ علوم اس کی تائید کر رہے ہیں اور دوسری طرف آیات کی صحیح تفسیر بھی ہو جاتی ہے۔ ہماری سابقہ تفاسیر میں اس طرح کا مواد موجود نہیں ہے۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے مفسرین نے قرآن کریم کی تفاسیر نہایت اخلاص' محنت اور عرق ریزی سے تحریر فرمائی ہیں۔ لیکن اس دور کی علمی سطح اتنی بلند نہیں تھی کہ اس دور کی تحریر کردہ تفاسیر' آج کے ذہن کو مطمئن کر سکیں۔

قرآن کریم اور کائنات میں مطابقت کی ایک اور مثال بھی قابل غور ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی چیزوں اور قدرت کی تخلیق کردہ چیزوں میں اس درجہ نمایاں فرق ہوتا ہے کہ ہر شخص ننگی آنکھ سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ کون سی چیز انسان کی بنائی ہوئی ہے اور کون سی قدرت کی تخلیق کردہ۔ پہاڑ' گھاس' میوہ جات' پھل اور دوسری بے شمار اشیاء کے متعلق ایک نگاہ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قدرت کی پیدا کردہ ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی آیات کو کسی اچھے سے اچھے کلام میں مزین کر دیں ایک نگاہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ احادیث کی مستند ترین کتب' صحاح کی احادیث کے درمیان میں جب بھی چھوٹی سے چھوٹی آیت آ جاتی ہے تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قرآنی آیات ہے۔ اسی طرح جو بڑے سے بڑے انجینئر سو سو منزلہ عمارتیں تعمیر کر سکتے ہیں وہ ایک پتہ گھاس کا نہیں بنا سکتے۔ بعینہٖ اسی طرح دنیا کا بڑے سے بڑا مصنف' جس نے ضخیم سے ضخیم کتب تحریر کی ہوں وہ قرآن کریم کی ایک آیت نہیں بنا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قول و فعل کی مطابقت کی بہترین مثال ہے۔

قرآن فہمی کے لئے خود قرآن نے ''تدبر قرآن'' کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

افلا یتدبرون القران ام علی قلوب اقفالھا (47/24)۔کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے کیا دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں' اس آیت کریمہ میں قابل غور بات یہ ہے جو عموماً ہمارے ہاں تراجم یا تفاسیر میں نظرانداز کردی جاتی ہے کہ یہاں ھا کی ضمیر لاکر' اس مفہوم کا اضافہ کیا گیا ہے کہ کیا ان کے دلوں پر ان کے اپنے ہی دلوں کے تالے پڑ گئے ہیں۔ ایک ھا کی ضمیر نے مفہوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ سلسلہ کلام یہ ہے کہ ہم سب کو قرآن کریم پر غور کرنا چاہئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھما خود قرآن کریم پر رات دن غور فرماتے تھے۔ وہ قرآن کا اتنا حصہ ہی پڑھتے تھے جس کو وہ سمجھ لیتے تھے۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ بھی یہی ہے کہ فاقرء واما تیسر من القران (73/20)۔ ''قرآن میں سے اتنا پڑھو جس کا مفہوم تمہارے لئے آسان ہو گیا ہو۔'' صحابہ کرامؓ جو قرآن کریم کی روشن قندیلیں تھیں وہ قرآن کو تدبر کے ساتھ ہی پڑھا کرتے تھے۔ ان میں بھی ان حضرات کا مرتبہ زیادہ بلند تھا جنہوں نے زیادہ محنت کر کے' قرآن کو زیادہ سمجھا تھا۔ وہ قرآن فہمی کے لئے حلقے بناتے تھے جو آج کی اصطلاح میں ایک طرح کے Study Circles تھے اور قرآن کے مطالعے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ حضورﷺ بھی ان کو Encourage کرتے تھے۔ آپ فکر کرنے والوں کو ذکر کرنے والوں پر ترجیح و فوقیت دیتے تھے۔ حضورﷺ کے بعد حضرت عمرؓ نے خصوصاً ان حلقوں میں زیادہ گہری دلچسپی لی۔ تفسیر بالروایات یعنی قرآن کریم کی تفسیر کو روایات کے ذریعہ کرنے سے قرآن میں غور و خوض کرنے کا شوق و جذبہ باقی نہیں رہتا۔ جو روایات میں آیا اس پر اکتفاء کیا۔ اس طریقہ پر سب سے بڑا عالم اور بہترین مفسر وہ ہے جس کو سب سے زیادہ احادیث یاد ہوں اور جو ہر آیۂ کریمہ کی تشریح میں زیادہ سے زیادہ احادیث کا احاطہ کر سکے اور احادیث کا Cataloguer یا شاہ ولی اللہ صاحب کے بقول وراق ہو۔

قرآن کریم نے خود اپنے لئے فرمایا کہ وہ تبیاناً لکل شی ہے (16/89)۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کذلک یبین اللہ آیتہ للناس لعلھم یتقون

(2/187)۔ یوں کھلم کھلا خدا اپنے احکام لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے تا کہ وہ متقی ہوں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے کو بیــان لـلـنـاس قرار دیتا ہے۔ مزید یہ کہ اس میں درست اور غلط چیزیں بالکل واضح ہوگئی ہیں۔ قـد تبیـن الـرشـد مـن الغبی (2/256)۔ یہ کتاب مبین ہے (5/15)' یہ آیت کریمہ تو حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے الـذیـن یـکتمون ما انزلنا من البیـنـات و الهـدیٰ مـن بـعـد مـا بیـنــه للنس فی الکتاب اولـئـک یـلـعنهم الله ویلعنهم اللعنون (2/159)۔ بے شک جو لوگ (ہماری) ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جنہیں ہم نے اتارا ہے اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں یہ آیۂ کریمہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ مــا بینه للناس فی الکتاب کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح خود باری تعالیٰ عزاسمہ نے کر دی ہے اور فـــی الـکـتــب کے لفظ سے یہ واضح ہے کہ وہ تشریح کتاب میں ہی ہے کتاب سے باہر احادیث میں نہیں ہے۔ اس مفہوم پر اس سے زیادہ واضح' صاف اور کون سے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں جو یہ مفہوم مضمون ادا کر سکیں۔ اس آیت کریمہ کے بعد کتاب کی توضیح کتاب کے اندر ہونے سے بظاہر انکار کی قطعاً کوئی راہ نہیں رہتی۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اپنی کتاب کی تبیین خود ہم نے کتاب کے اندر کر دی ہے تو پھر کتاب سے باہر مزید کسی تبیین کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تبیین کے بعد مزید تبئن کے کیا معنے؟

ہمارے ہاں گزشتہ چودہ سو سال سے تفسیر کرنے کا یہی ایک طریقہ تفسیر القرآن بالروایات چلا آ رہا ہے۔ اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ سابقہ طریقہ درست نہیں تھا۔ اس سے ایک ایک آیت کا مفہوم تو سامنے آ جاتا ہے' لیکن قرآن کریم کی مجموعی تعلیم سامنے نہیں آتی۔ اس طول طویل عرصہ میں سینکڑوں تفاسیر تحریر کی گئیں مگر طریقہ سب کا ایک ہی تھا۔ مختلف فرقوں نے تفاسیر لکھیں' لیکن سب فرقوں نے اسی انداز کو اختیار کیا۔ البتہ گزشتہ صدی

سے یہاں برصغیر ہندو پاک میں چند نامور مفکرین نے تفسیر القرآن بالقرآن کا سلسلہ جاری کیا ہے اس طریقہ سے تفسیر تحریر کرنے میں یہ بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ چونکہ آیات کی تفسیر خود آیات سے کی جاتی ہے' اس لئے خارج کے نظریات اس تفسیر میں سرایت نہیں کرتے اور خالص قرآنی تعلیم سامنے آجاتی ہے اور غیر قرآنی نظریات کٹ کے الگ ہو جاتے ہیں۔

راقم سطور کمترین' اگرچہ فارغ درسِ نظامی ہے' تاہم اس کو زمرۂ علماء میں شمار ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔اسی لئے راقم کمترین حد درجہ کسی کی تحریر پر انتقاد کرنے سے گریز کرتا ہے۔ تاہم یہ مختصر مضمون نہایت دل سوزی' دردمندی اور اخلاص سے اسی لئے تحریر کیا گیا ہے کہ حضرت مولانا ابو عمار زاہد الراشدی صاحب اس مضمون کو اپنے مطالعہ عالی سے نوازیں۔قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے یہ کمترین اپنا فرض سمجھتا تھا کہ حق بات کا اظہار کر دے' اس کے علاوہ اس خطا کے ارتکاب کا اور کوئی سبب (Motive) نہیں ہے۔

جوابِ خواجہ نظری نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشمِ آفرین دارم

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم کے خلاف فکری بحران کی نشاندہی

مملکتِ پاکستان، برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی تھی اس کے بنانے کے دوران بھی کئی لاکھ افراد کو جانی قربانی دینی پڑی اور آج بھی ہندوستان کے پندرہ کروڑ مسلمان اس کے عواقب کے شکار ہیں۔ تقسیم ہند سے پیشتر جو بڑے بڑے رؤسا اور تعلقہ دار ہندوستان میں رہ رہے تھے آج ان کی تیسری پشت یا رکشا و ٹیکسی چلاتی ہے یا بہت معمولی معمولی نوکریاں کرتی ہے۔ ہم پاکستان کے مسلمان ان کی Cost پر ان سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان کا قیام بے شک ایک بہت خوش آئند بات ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آج جبکہ پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ہوئے ۵۷ سال گزر چکے ہیں یہ بات زیر بحث ہے کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کیا ہے اور اس کو کس بنیاد پر حاصل کیا گیا تھا۔ ہماری ٹی۔وی چینلز جو عوام کو (Awareness) آگاہی دے رہی ہیں جن میں بہت عمدہ علمی مذاکرے ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے اور دانشوروں میں سخت فکری اختلاف، تضاد اور کنفیوژن ہے اور اس فکری ابتری کی وجہ سے اب تک ہمارا ملک اپنے لئے کوئی سمت مقرر نہیں کر سکا۔ آج کل پاکستان کے مسلمانوں میں چار قسم کے نظریات وخیالات گردش کر رہے ہیں۔

(۱) روایتی مذہبی طبقہ جو علماء کرام کے زیر اثر ہے۔

(۲) خلافت اسلامیہ کا داعی مذہبی طبقہ۔

(۳) دین کو متمکن کرنے والا طبقہ۔

(۴) سیکولر لبرل ذہن رکھنے والے حضرات۔

مجموعی وعمومی طور پر یہ چار فکر ہائے نقطۂ نظر آج کل ہمارے ہاں چل رہے ہیں مگر یہ چاروں اس درجہ قطعی نہیں ہیں کہ دوسروں کو متاثر کر کے اپنا ہم خیال بنالیں۔ ویسے بھی اتنی بڑی آبادی میں یہ ممکن بھی نہیں کہ سب ہم خیال ہو جائیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنا فکر اختیار کرنے اور اس کو فروغ دینے کا پورا پورا حق ہونا چاہئے۔ اب ان چاروں طبقوں کا مختصر تعارف پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔

پہلا طبقہ ان عامتہ المسلمین پر مشتمل ہے جو روایتی مذہبی رسومات کی پابندی کرتے ہیں۔ جو نہایت نیک نیتی وخلوص سے مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں۔ اسلام کو بطور مذہب کے خیال کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور بندے کا انفرادی تعلق قائم رکھتے ہیں۔ یہ اسلام یا مذہب کو ایک پرائیویٹ معاملہ شمار کرتے ہیں۔ بنوامیہ وبنوعباس کے دور سے جب خلافت راشدہ کا نظام ختم ہوا' ملوکیت قائم ہوئی' مذہب اور سٹیٹ کو الگ الگ کر دیا گیا۔ حکومت بادشاہوں کے سپرد ہوئی اور مذہبی معاملات علماء کرام کے ذمے ہوئے۔ اسلام بطور ایک کلچر وتہذیب کے باقی رہ گیا۔ اس سے دنیاوی معاملات کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ طبقہ صرف نماز' روزہ' زکوٰۃ ودیگر عبادات انجام دینا ہی مذہب کے سارے مطالبات پورے کرنے کے مرادف خیال کرنے لگا۔ نہایت خلوص سے عید میلادالنبی کی تقریبات قائم کرنا' اشک آلود ونیم گریاں آنکھوں سے نعتیں پڑھنا' بائیس رجب کو کونڈے' شب بارات پر آتش بازی چلانا' نذر نیاز تعویذ گنڈے' جنات کو قابو کرنا' مزارات کو غسل دینا۔ ان پر منتیں ماننا' عاشورہ کے دن قبرستان میں فاتحہ پڑھنے کے لئے جانا ضروری خیال کرتا ہے اور اسی طرح دیگر رسومات مذہب کا جزو بن گئیں۔ پیر' مرید' فقیر' علمائے کرام' فقہائے عظام ان ہی کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ مسجدیں بنوانا' ان کی آرائش کرنا' نیکی شمار ہونے لگی۔ بنی امیہ نے جب خلافت کا نظام ختم کیا اور خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر کے' ہر قسم کے ظلم وستم کو روا رکھا۔ رعایا کے تمام حقوق غصب کئے' ذرائع پیداوار پر پورا قبضہ کر کے عوام کو ان کے انتفاع سے محروم کر دیا تو انہوں نے اپنی عاقبت سنوارنے اور عوام میں ہر دل عزیز ہونے کے لئے بڑی بڑی مساجد

تعمیر کرنی شروع کر دیں۔ عبدالملک بن مروان کی تعمیر کردہ مسجد آج بھی دمشق میں قابل دید ہے
قرآن کریم نے

اجعلتم سقاية الحاج و عمارة المسجد الحرام كمن امن بالله
واليوم الاخر وجهد فى سبيل الله (۹/۱۹)۔

''کیا تم لوگوں نے حاجیوں کی سقائی اور مسجد الحرام کی آبادی کو اس شخص کے ہمسر بنا دیا
ہے جو خدا اور روز آخرت پر ایمان لایا اور خدا کی راہ میں جہاد کیا۔''

اس ہی قسم کے لوگوں کے لئے فرمایا تھا۔ اس نیک نیت' پرخلوص گروہ کے نزدیک اسلام پر عمل کرنے کے لئے الگ حکومت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے دوران ہمارا سارا مذہبی طبقہ' جس کا بیشتر حصہ علماء کرام پر مشتمل تھا وہ پاکستان کے خلاف تھا اور اسلام پر عمل کرنے کے لئے حکومت کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ جمعیت العلماء ہند' جو علماء کرام کی نمائندہ جماعت تھی' اس نے پاکستان کی ڈٹ کے مخالفت کی تھی۔ اور آخری دور میں جب پاکستان بالکل بننے کے قریب تھا چند علماء بے شک مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے' لیکن ان علماء کرام کے نزدیک بھی اسلامی حکومت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ علماء بھی ان ہی علماء کے گروہ سے الگ ہو کر اس طرف آ گئے تھے ورنہ نظریاتی طور پر یہ بھی ان میں سے ہی تھے۔ ان حضرات کی تحریر کردہ کتب موجود ہیں وہ خود اس بات پر دال ہیں کہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو پیدائشی طور پر مسلمانوں کی قوم سے متعلق ہیں اور ان ہی سے قرآن کریم ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يا ايها الذين امنوا امنوا بالله و رسوله و الكتب الذى نزل
على رسوله و الكتب الذى انزل من قبل (۴/۱۳۶)۔

اے ایمان والو خدا اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل
کی ہے اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل ہوئی ایمان لاؤ۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

یا ایھا الذین امنوا اتقوا للہ وامنوا برسولہ (۵۷/۲۸)۔

اے ایمان والو تم اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور ایمان لاؤ اس کے رسول پر۔

یہاں غور فرمائیں کہ قرآن کریم ان کے مسلمان ہونے کے باوجود بھی ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کر رہا ہے۔

تاہم اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ یہ اپنے اعمال میں مخلص طبقہ جو اپنی واز ت میں رات دن مذہبی امور کی سرانجام دہی میں منہمک رہتا ہے۔ بہرحال مسلمان ہی شمار ہونا چاہئے کیونکہ جن اعراب نے اسلامی حکومت کے غلبہ کے آگے فرماں پذیری کر کے خود کو مومن شمار کرنا شروع کر دیا تھا ان کے لئے اگرچہ قرآن کریم نے فرمایا کہ۔

ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔

ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

لیکن اس کے باوجود وہ امت مسلمہ میں شامل تھے اگرچہ قرآنی نظام حکومت کا عقیدہ ان کا جزو حیات نہیں بنا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے ان کو نہ تو امت سے الگ قرار دیا بلکہ انہیں باقی مسلمانوں کی طرح امت مسلمہ کے افراد ہی قرار دیا تھا۔

اس کے علاوہ ہمارے درمیان جو دوسرا طبقہ ہے وہ خلافت اسلامیہ کا داعی مذہبی طبقہ ہے۔ اس طبقہ میں نہ صرف اسلام سے بھرپور محبت ہے ان میں زندگی بھی ہے اور یہ اسلام کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کو بھی تیار ہیں۔ یہ وہ مذہبی طبقہ ہے جو اسلام کی اس تشریح و توضیح میں Beleive کرتا ہے جو بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار میں کی گئی تھی۔ یہ پورے کا پورا لٹریچر جو ہماری تفاسیر احادیث فقہ و اصول فقہ پر مشتمل ہے خالص ''مذہبی'' نقطہ نگاہ سے لکھا گیا تھا۔ کیونکہ جب یہ لٹریچر وجود میں آیا تھا اس وقت خلافت کے اسلامی نظام کو منقرض ہو کر دو صدیاں گزر چکی تھیں۔ ملوکیت پیشوائیت اور جاگیرداری جن کی اسلامی نظام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے پوری

مضبوطی سے اپنے پاؤں جما چکی تھیں' اس لئے اسلامی نظام کی کوئی رمق اس لٹریچر میں دکھائی نہیں دیتی یہ ایک ہزار سال کا پورے کا پورا لٹریچر "مذہب" پر مبنی ہے۔ لیکن دقت اور مصیبت یہ ہے کہ ہمارا یہ طبقہ اس مذہب کو بطور دین کے جاری کرنا چاہتا ہے اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں جس قدر بھی مذہبی جماعتیں خلافت کے قیام کی کوشش کر رہی ہیں' وہ اسی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ہمارے ہاں جس قدر کوششیں اسلام کے احیاء کی کی جا رہی ہیں وہ سب "مذہب" کے احیاء کی ہو رہی ہیں "دین" کے احیاء سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ایران کا انقلاب کس درجہ کوششوں کے بعد برپا ہوا' لیکن وہاں بھی یہی غلطی کی گئی کہ انہوں نے اسلامی حکومت کے نقشہ کا سارا دارومدار دین کے بجائے مذہب پر رکھا اور اسی وجہ سے وہ انقلاب کامیاب نہیں ہو سکا۔ مذہب اور دین میں واضح فرق نہ کرنا ہی ہماری بہت بڑی غلطی ہے۔ لیکن اس کی اصل وجہ ہمارے علماء کرام ہیں کیونکہ اول تو وہ دین کے داعی ہی نہیں ہیں' مذہب کے داعی ہیں اور جو جماعتیں خلافت یا دین کی داعی ہوتی ہیں ہمارے علماء کرام ان کے لئے روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سابقہ ایک ہزار سال کا لٹریچر چھوڑنا نہیں چاہتے اور اسی فقہ پر عمل کرنا چاہتے ہیں جو آج سے کم و بیش ایک ہزار سال پیشتر تحریر کیا گیا تھا۔

ہمارا موجودہ فقہ اسلام کے ابدی و آفاقی اصولوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس پر عربی و غیر عربی ملوکیتوں کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ دور ملوکیت کے جامد تصورات خاندانی سلطنتوں کے تقاضے پورے کرنے کے لئے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ بنو عباس کی حکومت مسلم حکومت یا مسلمانوں کی حکومت ضرور تھی۔ لیکن وہ اسلامی حکومت ہرگز نہیں تھی صرف اسلامی حکومت کے احکام اسلامی فقہ یا اسلامی شریعت ہوتے ہیں۔ یہ قوانین تو ملوکیتی قوانین ہیں ان کو اسلامی فقہ کا نام دینا ہی غلط ہے۔ ویسے بھی فقہ ہمیشہ اجتماعی ہوتا ہے۔ انفرادی نہیں ہو سکتا۔ یہ فقہ انفرادی تھا اس میں اجتماعیت بالکل نہیں تھی۔

سابقہ مذہبی لٹریچر اور فقہ کے اثر کی وجہ سے یہ طبقہ جس فاش غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے وہ

یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ ورسول کی اطاعت کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہٰذا عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں رسول کا لفظ آتا ہے' اس کا ترجمہ حدیث قرار پاتا ہے اور اس طرح اللہ ورسول کا عملاً مفہوم قرآن وحدیث ہو جاتا ہے۔ لیکن اس طرح قرآن وحدیث کی اطاعت کے لئے الگ ملک' حکومت یا خلافت اسلامیہ کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ مثلاً ہندوستان' برطانیہ وغیرہ کے مسلمان بھی انفرادی طور پر قرآن وحدیث پر عمل کر سکتے ہیں' یہ ہے وہ تضاد وتناقض جس کا سامنا اس طبقہ کو ہے اور جس سے یہ نہ نکل سکتے ہیں اور نہ نکلنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ سے نکلنے کے لئے حدیث اطاعت کا مرجع باقی نہیں رہتی۔ اور یہ طبقہ کسی حال میں بھی حدیث یا صحیح معنے میں روایات کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہزاروں خواہشوں اور تمناؤں کے باوجود' اسلامی نظامِ اطاعت کا مرجع حدیث (روایات) قرار نہیں پا سکتی' جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ہمارے ہاں تیسرا طبقہ وہ ہے جو خالص قرآن کریم کے نظریات کا حامل ہے۔ فلہٰذا دین کے متمکن کرنے کا داعی۔ اس طبقۂ عالیہ کے نزدیک مسلمانوں کا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر قرآن فہمی میں رکاوٹ کا کام دیتا ہے۔ کیونکہ یہ سارا لٹریچر تحریر ہی مذہبی زاویہ نگاہ سے کیا گیا تھا۔ اس کا دین سے کیا علاقہ۔ اس لئے جو لوگ بھی دین کے داعی بن کے اٹھیں ان کے پیش نظر ایک تو مذہب اور دین کا تصور بالکل واضح' بین اور صاف ہونا چاہئے دوسرے ان کے سامنے صرف قرآن کریم ہونا چاہئے' اس کی خالص تعلیم' نیز یہ کہ علوم حاضرہ کی موجودہ سطح تک رسائی اور حالات کے موجودہ تقاضوں کا گہرا علم۔

سورۂ شوریٰ میں ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ۔

وما اختلفتم فیه من شئیء فحکمه الی الله۔ (۴۲/۱۰)۔

اور تم لوگ جس چیز میں بھی باہم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ خدا کے حوالہ ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے انسانوں میں جس قدر بھی اختلافات ومتنازعہ امور واقع ہوں ان سب کا

فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق کیا جانا چاہئے اور ہر وہ کام جس کا فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے کیا جاتا ہے وہ دینی بن جاتا ہے اور اس طرح دین و دنیا کی تفریق جاتی رہتی ہے۔ لیکن یہ صورت صرف اس وقت ہی ہو سکتی ہے جب کہ کوئی ایسی زندہ اتھارٹی موجود ہو جہاں سے دو فریق اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرا سکیں۔ مذہب میں تو ہر شخص خدا کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے لیکن دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔ مذہب میں تو اطاعت کے لئے صرف قرآن کا ہونا ضروری ہے لیکن دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے قرآن کریم کے علاوہ ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ازحد ضروری ہے کیونکہ اسلام ایک دین ہے، مذہب نہیں ہے۔ اس لئے اس میں تنہا کتاب کافی نہیں ہے بلکہ اس کتاب کے مطابق اطاعت کرانے والی ایک اتھارٹی کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ اتھارٹی اپنے وقت میں حضور ﷺ خود تھے اور آپ ﷺ کے بعد آپؐ کے خلفاء راشدینؓ وہ زندہ اتھارٹی تھے جو اللہ کی اطاعت کراتے تھے۔

اب یہاں اس مقام پر ایک فیصلہ کن بات سامنے آتی ہے۔ جو لوگ اسلام کو دین کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت بھی تسلیم کریں لیکن جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے بعد زندہ اتھارٹی کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں اور اطاعت کے لئے صرف قرآن و حدیث کو کافی سمجھتے ہیں۔ وہ دین اسلام کو مذہب کی سطح پر لے جاتے ہیں اور پھر انفرادی اطاعت کے قائل و پابند ہو جاتے ہیں اور رسول کی اطاعت کو زندہ اتھارٹی کے بجائے حدیث کی اطاعت میں منتقل کر دیتے ہیں۔

مذہب اور دین کے فرق کو مزید نمایاں کرنے کے لئے چند آیات کریمات پیش خدمت ہیں۔ اگرچہ اس سلسلہ میں بے شمار آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

(۱) کیف تکفرون و انتم تتلیٰ علیکم آیٰت اللہ و فیکم رسولہ (۳/۱۰۱)۔

اور تم کیونکر کافر ہو جاؤ گے حالانکہ تمہارے سامنے خدا کی آیتیں (برابر) پڑھی جاتی ہیں

اوراس کے رسول بھی تم میں (موجود) ہیں۔

(۲) فلا وربک لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت و یسلمو تسلیما (۴/۶۵).

پس تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ نہ ہوں بلکہ خوش خوش اس کو بھی مان لیں۔

(۳) ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وك (۴/۶۴).

جب ان لوگوں نے اپنی جان پر ظلم کیا تھا اگر یہ تمہارے پاس چلے آتے۔

(۴) ویکون الرسول علیکم شهیدا (۲/۱۴۳).

اوررسول تمہارے پر نگران ہے۔

یہ اوراس قسم کی دیگر آیات کریمات میں حضورﷺ کو اسلامی نظام حکومت کی ایک جیتی جاگتی' زندہ اتھارٹی کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔اب ظاہر ہے کہ یہ نظام کوئی وقتی ہنگامی نظام نہیں تھا۔ بلکہ اس کو آگے بھی چلنا تھا۔اور یہ بات بھی قطعی وحتمی تھی کہ حضورﷺ کو فوت بھی ہونا تھا۔اس لئے بالکل ظاہری بات ہے کہ حضورﷺ کے بعد ان کے جانشین کو یہ مقام ازخود حاصل ہو جاتا تھا اور حضورﷺ کے جانشین کی اطاعت اسی طرح ضروری تھی جس طرح حضورﷺ کی اطاعت تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اطاعت اسی طرح اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔جس طرح کہ حضورﷺ کی اپنی اطاعت تھی۔دین کا تصور یہ تھا کہ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ' زندہ جانشین آتے رہتے اوران کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی رہتی۔لیکن بدقسمتی سے چونکہ یہ نظام منقرض ہوگیا۔ملوکیت نے غلبہ پالیا' دین کا نظام ہی درہم برہم ہوگیا۔بادشاہ وسلطان کی اطاعت رہ گئی دین کی اطاعت ہی نہیں رہی۔لیکن قرآن کریم میں حضورﷺ کی اطاعت کا بار بار ذکر چلا

آ رہا تھا اس لئے رسول اللہ کی اطاعت کے لئے بھی کوئی راستہ نکالنا ضروری تھا۔ اس لئے مجبوراً حدیث کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے دیا گیا۔ اور اس طرح زندہ شخصیت کی ضرورت سے بھی جان چھڑالی اور دین بھی مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ لیکن جب بھی مذہب کے بجائے دین اختیار کرنا ہوگا اس کے لئے لازمی ولابدی شرط ہے کہ پھر زندہ اتھارٹی تسلیم کرنی ہوگی اور حدیث کو صرف دین کی تاریخ کا درجہ دینا ہوگا اور بس۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارا دوسرا طبقہ جو خلافت اسلامیہ کا داعی ہے وہ اسلام کے نظام کو تو جاری کرنا چاہتا ہے لیکن اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے زندہ اتھارٹی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بلکہ مذہب اور علماء کے زیر اثر دین کے نظام میں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے صرف قرآن و حدیث پر اکتفا کرتا ہے کیونکہ زندہ اتھارٹی کو ضروری نہیں سمجھتا، لیکن اس طرح دین کا نظام قیامت تک بھی قائم نہیں ہوسکتا۔

البتہ ہمارا تیسرا طبقۂ عالیہ جو خالص قرآن کریم کے نظریات کا حامل ہے اور جو پاکستان میں برابر بڑھتا چلا جارہا ہے وہ اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے ایک ایسی زندہ اتھارٹی کو لازمی گردانتا ہے جو مرئی ہو Visible ہو اور جو قرآن کریم کے احکامات جاری کر کے دینی حکومت قائم کر رہی ہو۔ ان حضرات پر یہ بات بخوبی واضح ہے کہ کسی بھی جھگڑے کے تصفیہ کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ حدیثوں یا صحیح الفاظ میں روایات کی کتابوں سے کسی بھی جھگڑے کا تصفیہ نہیں کرایا جاسکتا اور ایک نہایت اہم اور مابہ الامتیاز خصوصیت جو اس قرآنی حلقہ کی ہے وہ یہ ہے کہ صرف اسلامی نظام کے ذریعے ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور صرف اس نظام کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اگر یہ نظام قائم نہیں ہے تو پھر نہ تو اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور نہ ہی اللہ سے انسان کا کوئی تعلق قائم ہوسکتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں سب مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بغیر نظام کے بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرآن و حدیث کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ عقیدہ اگرچہ ہماری بدقسمتی سے، اس وقت دنیا کے سارے مسلمانوں کا ہے کسی کی بھی اس میں استثناء نہیں ہے۔ تاہم یہ عقیدہ قرآن کریم کے بالکل خلاف

ہے اور اسی غلط عقیدہ کی بناء پر جو جمہور مسلمانوں میں رائج ہے' مسلمان ذلیل وخوار' مردود ومقہور ہو رہے ہیں اور جب تک اس عقیدہ کو ترک نہیں کریں گے' اس ذلت ورسوائی سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ۔

وان طائفتٰن من المومنین اقتتلوا فاصلحو بینهما فان بغت احدهما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتی تفیء الی امر الله (۴۹/۹)۔

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو جو (فریق) زیادتی کرے تم (بھی) اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔

آیت کریمہ آپ نے ملاحظہ فرمائی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم کس کو ہو رہا ہے کون صلح کرائے۔ صلح کرانے کی تاکید کس کو کی جا رہی ہے۔ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کی ایک زندہ مرکزی اتھارٹی ہو' جس میں اس درجہ قوت ہو کہ وہ دونوں پارٹیوں کو قوت کے زور سے آپس میں نہ لڑنے دے۔ وہ مرکز ان میں صلح بھی کرائے اور ان میں سے جو فریق بھی زیادتی کرے اس کی قوت کے ذریعے سرکوبی کرے۔ آیت کریمہ اپنی جگہ واضح ہے اور دینی نقطہ نگاہ سے اہمیت کی حامل ہے۔ دینی نقطہ نگاہ سے آیت بالکل واضح ہے۔ اب آپ اس آیت کا وہ مفہوم ملاحظہ فرمائیں جو ہماری روایتی تفاسیر میں مرقوم ہے' وہ تفاسیر جو ''مذہبی'' نقطہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہیں۔

ا۔ شیخین نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ گدھے پر سوار ہو کر عبداللہ بن ابی کی طرف تشریف لے گئے۔ عبداللہ نے کہا اپنے گدھے کو ادھر ہی رکھو مجھے آپ کے گدھے کی بدبو سے اذیت ہوتی ہے۔ اس پر ایک انصاری نے کہا خدا کی قسم' رسول اللہ کا

گدھا تجھ سے زیادہ خوشبودار ہے۔ یہ بات سن کر عبداللہ کا ایک طرف دار بھڑک اٹھا۔ دونوں باہم سخت سست بکنے لگے۔ ہر ایک کے ساتھی بھی اپنے آدمی کی طرف داری میں غضب آلود ہو گئے۔ یہاں تک کہ قمچیاں چل گئیں' ہاتھا پائی ہوئی اور جوتوں سے لڑائی ہونے لگی' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری' قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ جلد ۱۱' صفحہ ۲۲)۔

۲۔ ایک روز حضرتؐ خچر پر سوار ہو کر انصار کے مجمعے میں پہنچے اور وہاں کچھ دیر ٹھہرے رہے۔ آپ کے خچر نے پیشاب کر دیا۔ اس پر عبداللہ بن مسلول نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور گستاخانہ انداز میں کہنے لگا اس خچر کو یہاں سے ہٹاؤ اس کی بدبو نے دماغ خراب کر دیا ہے۔ عبداللہ بن رواحہ کو یہ بات ناگوار گذری۔ انہوں نے کہا اس کی بدبو تجھ سے اچھی ہے۔ حضرت تو وہاں سے چلے گئے۔ پھر دونوں میں بات بڑھی۔ آخر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ اس کے بعد دونوں قبیلے اوس و خزرج جن کی لڑائیاں مشہور ہیں چڑھ دوڑے اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ جب حضرت کو یہ خبر پہنچی تو آپ پھر تشریف لائے اور دونوں میں صلح کرا دی۔ یہ آیت اس کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ انتھٰی۔

☆☆☆

قرآن فہمی کے لئے یہ ایک بات پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ' زکوٰۃ' تقویٰ' تسبیح' رکوع' قرآن کریم کی اپنی اصطلات ہیں۔ بے شک یہ عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ لیکن عرب ان کو ان معانی میں استعمال نہیں کرتے تھے۔ قرآن کریم نے عربی کے ان ہی الفاظ کو لے کر اپنی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں قانون' حکومت' مملکت' آئین' دستور وغیرہ کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ لیکن ان تمام مفاہیم کو قرآن کریم نے اپنی اصطلاحات کے ذریعے بیان کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں ''اللہ و رسول'' کے الفاظ صدہا مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ ہمارے مفسرین نے ان الفاظ کا لفظی مفہوم لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان دو لفظوں کو اپنی ایک اصطلاح

کے طور پر استعمال کیا ہے۔قرآن کریم کو درست اور دینی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کے لئے ان الفاظ کا صرف اصطلاحی معنے لینا ضروری ہے۔قرآن کریم کو درست طور پر سمجھنے کے لئے یہ نکتہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے اور جس کو نظر انداز کرنے سے یہ تمام الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اللہ و رسول سے مراد مرکزِ نظام اسلامی ہے اور یہ حقیقت کہ اللہ و رسول سے مرکز ملت یا اسلامی مملکت کا اقتدار اعلیٰ مراد ہے قرآن کریم میں نہایت واضح الفاظ میں' تفصیل سے بیان فرما دی گئی ہے۔ان مقامات کو بغور پڑھ لینے سے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔اس کے لئے قرآن کریم سے بہت سی شہادات پیش کی جا سکتی ہیں' لیکن یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے' مثلاً جب جنگ احد میں مسلمانوں کی فوج پسپا ہو گئی اور نہایت افراتفری کا عالم ہو گیا تو حضورﷺ نے صحابہؓ مجاہدین کو آواز دی اور اس آواز پر وہ پھر جمع ہو گئے۔ بظاہر یہ آواز حضور کی تھی لیکن چونکہ یہ پکار حضور کی ذاتی نہیں تھی بلکہ آپ نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے دی تھی اس لئے اس آواز کو' اللہ و رسول' کی آواز قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح' للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم (۳/۱۷۲)۔

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا باوجودیکہ وہ زخم کھا چکے تھے' سو یاد رکھو ان میں جو لوگ متقی ہیں یقیناً ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے۔

۲۔ یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضورﷺ سے کیا تھا۔اس غداری کو' اللہ و رسول' کی مخالفت قرار دیا گیا ہے' کیونکہ یہ مخالفت اسلامی نظام کی مخالفت تھی ذلک بانھم شاقوا اللہ و رسولہ ومن یشاقق اللہ فان اللہ شدید العقاب (۵۹/۴)۔ یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

۳۔ ان الذین یؤذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا

والاخرۃ و اعدلھم عذابا مھینا (۳۳/۵۷)۔

جولوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں۔ان کے لئے دنیا وآخرت میں ذلت آمیز ب ہے اور اللہ کی لعنت۔

اس سلسلہ میں مزید آیات کا تحریر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔آپ اپنے نسخوں میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرما لیں۔ (۲۴/۶۳)، (۵۹/۴-۱)، (۸/۴۶)، (۹/۱۰۷)، (۸/۱۳)، (۵۸/۵)، (۵۸/۲۰)، (۳۳/۳۶)، (۵۹/۸)، (۹/۶۲)، (۹/۷۴)، (۸/۲۰)۔

ان تمام آیات کریمات کو بغور دیکھنے کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ 'اللہ و رسول' سے مراد اسلامی حکومت کی مرکزی زندہ اتھارٹی ہوتی ہے اور اس کی اطاعت سے 'اللہ و رسول' کی اطاعت ہوتی ہے اور اللہ و رسول کی اطاعت کا یہ ہی واحد ذریعہ ہے' اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ہاں چوتھا طبقہ وہ ہے جو ان مفکرین و دانشوروں پر مشتمل ہے جو لبرل' سیکولر اور Leftist کہلاتے ہیں۔ یہ حضرات ٹی۔وی چینلو پر مباحثوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔عام طور پر ان مباحثوں میں یہ حضرات Offensive Attitude لیتے ہیں' جبکہ ان کا Counter Part جو مذہب کے نمائندے ہوتے ہیں وہ Apologetic Attitude رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک کی بیشتر آبادی چونکہ مسلمان ہے۔اس لئے یہ حضرات ان علمی مباحثوں میں محتاط ہوتے ہیں اور جو ان کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر نہیں لاتے۔قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر (۳/۱۱۸)۔ دشمنی تو ان کے منہ سے ٹپکی پڑتی ہے اور جو (بغض وحسد) ان کے دلوں میں بھرا ہے وہ کہیں اس سے بڑھ کر ہے' اگرچہ وہ اس دوران True Colours میں نہیں آتے تاہم ان کی گفتگو میں استہزاء اور استخفاف نمایاں ہوتا ہے اور عموماً مسلمانوں کی تاریخ' روایات اور خلاف قرآن مولویانہ عقائد کو Exploit کرتے ہیں۔اور ہمارا مذہبی طبقہ عموماً پسپا اور معتذرانہ رہتا ہے۔تمام گفتگو کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اسلام

کو بطور مذہب نجی زندگی تک محدود رکھنا چاہئے' اپنی پرائیویٹ زندگی اس کے مطابق گذارنی چاہئے لیکن مذہب کا کوئی تعلق سٹیٹ سے نہیں ہونا چاہئے۔ مملکت سیکولر ہونی چاہئے۔ چرچ اور سٹیٹ' یا مسجد و مملکت الگ الگ ہونی چاہئے' ان کے دوائر ایک دوسرے سے بالکل متبائن ہونے چاہئیں۔

اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے یورپ کی تاریخ اور یورپ میں مذہب کا کردار (Role) ہوتا ہے۔ یورپ عیسائی مذہب کی وجہ سے تاریکی میں ڈوبا رہا اور جب اس نے مذہب سے جان چھڑا لی اور خالص سیکولر نظام قائم کر دیا تو اس نے ترقی حاصل کر لی جو ہمارے سامنے ہے۔ ہماری صورت یہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ عیسائی مذہب کا یہ دعویٰ ہی نہیں تھا کہ وہ ایک نظام حیات پیش کرتا ہے وہ تو خود اپنی تعلیم کو نجی' پرائیویٹ معاملہ قرار دیتا ہے جس پر انفرادی طور پر عمل کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے اس مضمون میں غور فرمایا ہوگا کہ اسلام تو ایک دین ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کے باہمی تنازعات اور جھگڑے قرآن کے احکامات کے مطابق طے کئے جانے چاہئیں۔ وما اختلفتم فیه من شئ فحکمه الی الله (۴۲/۱۰)۔ اور تم لوگ جس چیز میں بھی باہم اختلاف کرو' تو اس کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق ہے۔ اس میں اللہ و رسول کی اطاعت ہی اس نظام کی معرفت ہوتی ہے جو قرآن کریم قائم کرتا ہے۔ مذہب کو تو نجی معاملہ قرار دیا جا سکتا ہے' لیکن دین کو ذاتی نہیں بنایا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ان حضرات کے سامنے مذہب اور دین کا فرق واضح نہیں ہے اس لئے یہ حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ یورپ کی تاریخ اور اس میں عیسائیت کا کردار ان کو مزید Mis-Guide کرتا ہے۔ ورنہ ان حضرات کے خلوص' ایثار اور قوم سے محبت کرنے میں کوئی شک نہیں۔ آخر یہ ہمارے میں سے ہی ہیں۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے میں بھی یہ حضرات خود ذمہ دار نہیں ہیں۔ جب کہ ہمارا علماء کرام کا گروہ ہی مذہب اور دین کے فرق کو نہیں سمجھتا۔ تو یہ حضرات کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں غدر کے ہنگامہ کے بعد عیسائی پادری غول در غول اور فوج در فوج ہندوستان میں وارد ہوئے۔ وہ یہاں کی آبادی کے ساتھ

مناظرے کرتے تھے اور یہاں کے لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ کی نگرانی میں یہ مناظرے دیگر مقامات کے علاوہ دہلی میں فوارہ چوک پر ہوتے تھے۔ اس میں پادری فنڈ اور (غالبًا) پادری Sale وغیرہ حصہ لیتے تھے۔ ہنود کی جانب سے رامچند رشیور مناظر تھے۔ علماء کرام میں حضرت اقدس، زبدۃ العلماء مولانا نانوتوی اور خاص طور پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی پیش پیش ہوتے تھے۔ مناظروں میں کبھی فیصلہ نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی مناظرہ حق و باطل کا کوئی معیار ہے یہ تو صرف ایک طرح کی Mental Gymnastic ہے اور اس کے داؤ پیچ بھی ہیں جس پر عمل کرنے سے باطل مذہب کا نمائندہ بھی جیت سکتا ہے۔ ان مناظروں میں ہمارے علماء کرام اسلام کو بحیثیت مذہب کے ہی پیش کرتے تھے اور اسلام کا عیسائیت سے تقابل کرتے تھے اگر ان حضرات کے سامنے اسلام بطور دین کے ہوتا تو یہ حضرات اسلام کا تقابل جمہوریت سے کرتے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ اسلام کا نظام جمہوریت کے نظام سے بہت بہتر ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے علماء کرام نے اسلام کا تقابل عیسائیت سے کیا اور اسلام کو مذہبی سطح تک ہی رکھا۔

اب بھی ہمارے دینی مدارس اور یونیورسٹی کے اسلامیات کے شعبوں میں تقابل مذاہب A Comparative Study of Religions میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں اسلام کا تقابل ان مذاہب سے ہی ہوتا ہے۔ جب یہ صورت حال ہو تو ان لبرل خیالات کے حامل افراد کا کیا قصور ہے۔

برطانیہ میں آج کل بیک وقت مذہب اور دین دونوں جاری ہیں۔ ان کے ہاں عیسائیت بطور مذہب کے ہے جو پرائیویٹ ہے اور جمہوریت ان کے ہاں دین کے طور پر رائج ہے۔ عیسائیت کو تو آپ ذاتی نجی قرار دے سکتے ہیں لیکن کیا جمہوریت کو بھی نجی قرار دے کر کوئی اور متوازی نظام جاری کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی مثال ہے۔ اسلام بطور دین کے جاری کرنے کے بعد نہ تو آپ اس کو ذاتی قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور نظام ساتھ ساتھ اس کے

متوازی جاری کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم نے ملکیت زمین کو قطعاً حرام قرار دیا۔ اس کی خرید و فروخت بالکل حرام ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام جعفر صادقؒ دونوں حضرات ملکیت زمین کی حرمت کے قائل تھے۔ البتہ بنو عباس کے دور میں جب دین کا نظام منقرض ہو چکا تھا۔ بادشاہوں کے زیر اثر سرکاری فقہا نے اس کی ملکیت کو جائز قرار دے دیا۔ اگر اسلام کو بطور دین کے جاری کیا جائے تو ظاہر بات ہے کہ زمین کی ملکیت بھی حرام ہو جائے گی۔ آپ اس قانون کو کس طرح ذاتی و نجی قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے منفرد سیاسی، معاشی، عدالتی، مالی قوانین عنایت فرمائے ہیں اور ان پر عمل کرنا فرض قرار دیا ہے۔ ان تمام قوانین کو آپ کس طرح ذاتی بنا سکتے ہیں۔ یہ تمام غلط فہمی صرف اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ ان حضرات کے سامنے اسلام بطور مذہب کے ہے اور عیسائیت کو مثال بنا کر اپنے سامنے رکھنے سے مزید گمراہی ہوتی ہے۔

جہاں تک قائداعظم علیہ الرحمتہ کا تعلق ہے ان کے متعلق بھی ۵۷ سال سے یہ بحثیں ہو رہی ہیں کہ وہ سیکولر حکومت چاہتے تھے یا مذہبی حکومت کے خواہاں تھے۔ قائداعظم کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کی بے شمار تقاریر ایسی ہیں جن میں انہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی مملکت قرآنی اصولوں پر مبنی ہو گی۔ سن ۱۹۴۰ء میں انہوں نے حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو جو انٹرویو دیا تھا وہ تو بہت ہی واضح ہے۔ اس انٹرویو میں طلباء نے ان سے سوال کیا تھا کہ اسلامی حکومت کی وہ کیا خصوصیت ہے جس سے وہ دیگر حکومتوں سے ممیز ہو جاتی ہے اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ اسلامی حکومت کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس حکومت میں آزادی و پابندی کی حدود قرآن متعین کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی ۱۱ اگست کی تقریر بھی موجود ہے۔ یہ تقریر انہوں نے کسی سڑک کے کنارے یا کسی الیکشن کے جلسے میں نہیں کی تھی بلکہ دستور ساز اسمبلی میں فرمائی تھی۔ اس بات سے اس تقریر کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ تقریر ان کی گذشتہ تقاریر کی تائید نہیں کرتی۔ اس لئے قائداعظم سے منسوب یہ دونوں

نظریات چلے آ رہے ہیں اور دونوں گروہ اپنی سند میں قائداعظم کی تقریر کے حوالے دے رہے ہیں۔

قائداعظم تھیا کریسی کے مخالف تھے اور ہر جگہ انہوں نے تھیا کریسی کی ہی مخالفت کی ہے۔لیکن وہ قرآنی مستقل اقدار کے خلاف نہیں تھے اور بار بار انہوں نے قرآنی اصولوں کا حوالہ اسی وجہ سے دیا ہے۔تھیا کریسی میں علماء کے وضع کردہ قوانین' اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے جاری کئے جاتے ہیں۔ جو سابقہ ادوار کے تدوین کردہ اور فرسودہ ہوتے ہیں۔لیکن قرآنی حکومت یا دین میں تو صرف قرآنِ کریم کی مستقل اقدار پیش نظر ہوتی ہیں اور روز بروز نئے نئے قوانین حالات کے مطابق وضع کئے جاتے ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پیشتر قرآنی حکومت کا یہ تصور عام نہیں تھا۔اس وقت سیکولر نظام کے مقابلہ میں تھیا کریسی کو ہی خیال کیا جاتا تھا۔قرآنی حکومت کا تصور پاکستان کے قیام کے بعد خالص قرآنی فکر کے حامل علماء و دانشوروں نے پیش کیا اور اس کے بعد تحریک طلوعِ اسلام نے اس کو عام کیا اور اس موضوع پر اس قدر مواد فراہم کیا کہ آج دنیا کے تمام ممالک میں یہ فکر بہت تیزی سے پھیل رہی ہے۔یہی وہ تصور ہے جس کی طرف قائداعظمؒ نے اپنی تقاریر میں بار بار اشارہ کیا ہے۔

اگر بر سبیل تنزل یہ بات درست تسلیم کر لی جائے کہ قائداعظم یہاں سیکولر سٹیٹ کے قیام کے خواہاں تھے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مسلمانوں کو تو صرف قرآن کے اتباع کا حکم ہے۔ اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہٖ اولیاء (۷/۳)۔ اور جو تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔قائداعظم کا یقیناً ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ہمارے لئے ایک اتنا بڑا ملک حاصل کیا۔لیکن ان کے اس احترام و عظمت کے باوجود قرآن کریم کے حکم کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔قرآن کے علاوہ کسی کا بھی حکم حجت نہیں ہے۔قرآنی تعلیم کے مطابق تو خود حضور ﷺ کا قول بھی حجت نہیں ہے۔قرآن میں عام مومنین کو مشاورت کا حکم ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)۔ اور ان کے کل کام آپس میں مشورے سے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح خود حضورﷺ کو بھی مشورہ کرنے کا حکم تھا وشاورھم فی الامر (۳/۱۵۹)۔ ان سے کام میں مشورہ کر لیا کرو۔ مشاورت کی اساس یہ ہے کہ خود مستشر کو اپنی بات پر حتمی و قطعی اعتبار نہیں ہے اس لئے وہ دوسروں سے مشورہ کر رہا ہے کیونکہ اگر مستشیر کو اپنے قول پر پورا اعتماد ہو اور اس پر اصرار ہو تو پھر اس میں مشاورت کی کیا ضرورت؟ مشاورت کرنے کے بعد کبھی مستشیر کا قول اختیار کیا جاتا ہے اور کبھی مستشار کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جب حضورﷺ کو مشاورت کا حکم تھا تو ان کا قول حجت نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ حضرت زیدؓ کا قصہ اور سورۃ مجادلہ کی پہلی آیت اس مضمون پر دلالت کرتی ہے کہ قول رسول حجت نہیں ہے۔ یہاں چونکہ یہ موضوع نہیں ہے' اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ جو حضرات اس بارے میں متردد ہوں وہ راقم سطور کا مضمون ''دین میں حدیث کا مقام'' ملاحظہ فرمالیں۔ جب قول رسول ہی حجت نہیں ہے تو اس اصول کا اطلاق سب شخصیات پر ہوگا خواہ وہ شخصیت کتنی ہی قابل احترام ہو۔ ایک مستحکم اصول یہی ہے کہ لا طاعة المخلوق فی معصیت الخالق۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اولین فرض ہے' خواہ اس سے کسی کی بھی مخالفت کیوں نہ ہو رہی ہو۔

وآخر دعوٰھم ان الحمدللہ رب العالمین (۱۰/۱۰)۔

اور ان کا آخری قول یہ ہوگا کہ سب تعریف خدا کو ہی سزاوار ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشن خیال معاشرہ

ایمان کا واضح تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان دین کی محکومی پر تڑپ اٹھے اور اپنا سر دے کر بھی اسے غالب کر سکتا ہو تو دریغ نہ کرے، لیکن اس حالت سے پیشتر ہر مسلمان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دلائل و براہین سے یہ ثابت کرے کہ دین کے نظام سے بہتر دنیا میں کوئی اور نظام نہیں ہو سکتا اور دین کی روشنی کو دنیا میں پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کرے کیونکہ دین الٰہی سے زیادہ روشن درخشندہ اور روشن خیالی پر مبنی کوئی اور نظام نہیں ہو سکتا۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے۔ کتب انزلنہ الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور (۱۴/۱)۔ (اے رسول) یہ قرآن وہ کتاب ہے جسے ہم نے تمہارے پاس اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آؤ۔ قرآن کریم نے حضورﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ متعین کیا کہ حضورﷺ قرآن کریم کے ذریعے نوع انسانی کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں۔ آیت کریمہ (۱۴/۵) کے مطابق ظلمت سے نور کی طرف لے آنے کا عملی مفہوم وہ ہے جو حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا۔ یعنی اس قوم کو انسانوں کی محکومی سے نکال کر خالص قوانین الٰہی کی اطاعت میں لے آئے۔ اس آیت کریمہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ نور کا لفظ بطور واحد کے استعمال ہوا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ظلمت کا لفظ جمع کے صیغے میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اندھیرے تو بے شمار ہو سکتے ہیں لیکن نور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ جو قرآن کریم کی تعلیمات کے ذریعے ہی فروغ پا سکتا ہے، کیونکہ قرآن کریم خود نور ہے۔

حضورﷺ جب مکہ میں مبعوث ہوئے تو وہ سخت تاریکیوں کا دور تھا۔ ہر طرف جہالت،

بدامنی، افلاس، نسلی تفاخر، لوٹ مار، قتل و غارت گری زندگی کا معمول بن چکا تھا اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کا عنایت فرمودہ نظام بحیثیت دین اور ضابطۂ زندگی کے متمکن فرمایا اور ساری تاریکیاں دور کر کے معاشرہ کو وحی کے نور سے مستنیر فرمایا۔ دین خداوندی کا نظام روشن خیالی پر مبنی ہوتا ہے اور ہر طرح کی روشن خیالی اس میں جگہ پا لیتی ہے اور یہی صورت ہمارے ہاں صدر اول میں رہی لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کہ دین کا نظام منقرض ہو گیا اور اس کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ چونکہ دین خداوندی میں ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے ملوکیت نے دین کا نظام درہم برہم کر کے، قرآن کریم کو بحیثیت مذہب کے برقرار و جاری رکھا اور اب دین کے بجائے مذہب کا تمکن ہو گیا۔ بدقسمتی یہ کہ احکامات تو ملوکیت کے جاری ہوتے رہے لیکن ان پر ٹھپہ اسلام کا لگتا رہا اور اس طرح اسلام مسلسل بدنام ہوتا چلا جاتا رہا۔ دین روشنی خیالی پر مبنی ہوتا ہے۔ مذہب تاریکیوں کا مجموعہ ہوتا ہے آج ہم مسلمان جن نظریات کے حامی و متبع ہیں وہ مذہب پر مبنی ہیں اور اسی سے ہم مسلمانوں کے سارے ممالک تاریکیوں سے پُر، پسماندہ، ذلیل و خوار ہیں۔ مسلمانوں کا اس حالت سے باہر نکلنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس مذہب کو جلد سے جلد ترک کر کے، دین کو بحیثیت نظام جاری کریں۔ مذہب کے فرسودہ قوانین کی، بیک جنبش قلم تنسیخ کر کے، موجودہ دور کے مطابق قوانین وضع کریں جن کا ماخذ صرف قرآن کریم ہو۔

ہم مسلمانوں کے موجودہ مذہب کا دارومدار حدیث و فقہ پر ہے۔ یہ وہ دو ستون ہیں جن پر ہماری پیشوائیت کی ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔ چونکہ ان کا دارومدار ہی ان دوستونوں پر ہوتا ہے، اس لئے وہ ان کو ترک کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ کچھ عرصہ بیشتر تک تو صرف مشرقی علوم کے واقف لوگ پیشوائیت کے زمرہ میں آتے تھے، لیکن اب انگریزی خواندہ حضرات بھی، جو موجودہ علوم سے خوب خوب واقف ہیں، وہ بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ پیشوائیت یا مولویت کا تعلق پیکروں سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک ذہنیت ہے۔ ہر وہ شخص جو حدیث کو وحی اور حجت قرار دیتا ہو اور فقہ کو غیر متبدل سمجھتا ہو، وہ پیشوائیت کا نمائندہ ہے اور نرا مولوی محض ہے۔ خواہ اس کا

لباس عمامہ' عبا' لمبے لمبے کرتے' اونچی اونچی شلواریں ہوں خواہ کوٹ پتلون اور ٹائی اور Bow ہو۔ لباس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل شے وہ ذہنیت ہے جو مذہب میں پیدا ہوتی ہے اور جب تک یہ مذہب کی ذہنیت' یعنی حدیث کی حجیت اور فقہ کی تقلید باقی رہے گی' ہمارا معاشرہ تاریک' رجعت پسند رہے گا اور یہ ایک روشن خیال معاشرہ نہیں بن سکتا۔

قرآن کریم پر مبنی روشن خیال معاشرہ (جو کہ دین خداوندی ہے) کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور اس میں انسان کی حکومت دوسرے انسانوں پر قطعاً حرام ہے۔ انسان' انسان سب برابر ہیں اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت و ترجیح نہیں ہے۔ ساری انسانیت قابل تکریم ہے۔ حکومت صرف اللہ کے قانون کی ہوتی ہے۔ وما اختلفتم فیہ من شیٔ فحکمہ الی اللہ (۴۲/۱۰) اور تم لوگ جس چیز میں بھی اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں ہر چیز کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق ہوگا' وہاں قرآن ہی کا نظام جاری ہوسکتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں قرآن کے مطابق فیصلے کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اس آیت سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ ہم مسلمانوں پر قرآن کا نظام جاری کرنا فرض ہے' جب ہی تو اس کے مطابق فیصلے ہو سکتے ہیں۔ حکومت خداوندی تو ایک ادارہ یا ایک ایجنسی ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کو جاری کرتی ہے۔ جو لوگ ان قوانین کو جاری کرتے ہیں وہ پہلے خود ان قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اور پھر دوسروں سے ان کی اطاعت کراتے ہیں۔ نہ وہ خود حاکم ہوتے ہیں اور نہ ہی عوام ان کے محکوم ہوتے ہیں۔ دوسروں کو احکام پر عمل کرانے والے خود بھی ان قوانین کے محکوم ہوتے ہیں اور دیگر عوام بھی۔ اس حکومت میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ حالانکہ خود سربراہ مملکت تھے لیکن اس کے باوجود تمام احکامات کے پابند ہوتے تھے۔ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی (۶/۵۰'۷/۲۰۳)۔ میرے پاس جو وحی کی جاتی ہے' میں اس کا اتباع کرتا ہوں۔ وانا اول المسلمین (۶/۱۶۳) اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔ اس میں تقدم زمانی اور تقدم کیفی دونوں

شامل ہیں کہ حضور وحی کے احکامات کے سب سے زیادہ پابند تھے۔ وہ ہی معاشرہ بہترین معاشرہ ہوتا ہے جس میں ہر فرد قانون کا پابند ہو اور ہر شخص پر، خواہ وہ کسی حیثیت کا بھی ہو، قانون کا اطلاق برابر ہوتا ہے۔ قرآنی معاشرہ میں یہی صورت ہوتی ہے کہ ہر فرد قانون کا پابند ہوتا ہے اور صرف قرآن کریم کو سامنے رکھ کر معاشرہ کی ضرورتوں کے مطابق قانون وضع کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو بھی وقت کا اقتضاء ہو قرآن کی حدود میں، اس کے مطابق قانون کی تشکیل کر دی جاتی ہے۔ اس معاشرہ میں سابقہ فرسودہ قوانین کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح معاشرہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے اور ترقی پذیر بھی رہتا ہے اور روشن خیال اور Liberal قوانین پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں کوئی حکمران طبقہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی طبقہ کو Privileges مراعات ہوتی ہیں اور نہ ہی کسی کو V.I.P. جیسا سلوک (Treatment) ملتا ہے۔ وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کو زمین کے رقبہ جات یا قیمتی پلاٹس دینے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور نہ ہی بینک کے قرضہ جات معاف (Write Of) کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

انسانی قوانین پر متفرع معاشروں میں ہمیشہ ایک طبقہ مفت خوروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسے قرآن کریم نے مترفین کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ جو معاشرہ کو آکاس بیل (Parasite) کی طرح کھائے جاتا ہے۔ اس میں جاگیردار، پیر، فقیر، مرید، مولوی، مُلا نے، ذخیرہ اندوز، سب شامل ہیں۔ اس معاشرہ کا بیشتر حصہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑاتا ہے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں خواتین کا بیشتر حصہ، جو عمداً تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے، سارا مذہبی طبقہ، جو دارالعلوم سے بطور استاد و شاگرد وابستہ ہوتا ہے، سارے سیاسی حلقے، جو دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کرتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی Earning Member نہیں ہوتا۔ جو محنت کرتے ہیں وہ کاشتکار، کارخانوں کے مزدور، چھوٹے صنعتکار ہیں جو مشکل سے چند فیصد آبادی پر مشتمل ہیں۔ چونکہ زیادہ لوگ مفت خورے ہیں اس لئے مجموعی طور پر ملک کی آمدنی کم ہوتی ہے اور جو چند فیصد لوگ محنت کرتے ہیں وہ ہی سب سے پست تر طبقہ میں شمار ہوتے ہیں جن سے ان کی کمائی غصب کر لی جاتی

ہے۔لیکن قرآنی معاشرے میں یہ بات نہیں چل سکتی۔وہاں کا قانون یہ ہے کہ لیس الانسان الا ما سعٰی انسانوں کو صرف اس کا حق ہے جو وہ محنت سے کماتے ہیں۔دوسروں کی کمائی پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔اس کے علاوہ معاشرہ میں درجات کا تعین بھی اسی طرح ہوگا کہ ولکل درجت مما عملوا (۱۹/۴۶'۱۳۳/۶)۔ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔اس میں جو شخص بھی محنت کرے گا' علمی' فکری' فنی مہارتیں حاصل کرلے گا اس کے مطابق اس کو مقام و مرتبہ دیا جائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ایک لڑکا جو بالکل نکما ہے جس نے کوئی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل نہ کی ہو' اور نہ ہی کوئی ٹیکنیکل فن حاصل کیا ہو وہ اپنے والدین یا خاندان کی مدد سے اعلیٰ مقام حاصل کرے اور ایک غریب لڑکا' عمدہ تعلیم کے باوجود پست درجہ پر رہے۔قرآنی معاشرہ جو روشن مستقبل کا ضامن ہوتا ہے' اس میں مراتب اعمال کے مطابق ملتے ہیں۔اعمال کی بجا آوری یا محنت کے بغیر کوئی درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

جو معاشرہ خالص قرآن کریم کی ہدایت پر متشکل ہوتا ہے' جس میں تمام امور کے فیصلے قرآن کریم کے احکامات کے مطابق ہوتے ہیں' اور قرآن کا نظام اس میں جاری ہوتا ہے اس میں اتنی صلاحیت و لچک Flexibility ہوتی ہے کہ وہ زمانہ کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں جو معاشرہ قائم ہے وہ خالص مذہب کی اساس پر قائم ہے جس میں وہ سابقہ قوانین جاری ہیں جو ٹھیٹھ ملوکیت کے تراشیدہ ہیں اور موجودہ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔اسی لئے معاشرہ جامد Static اور رجعت پسند ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ملوکیت کے دور کے تراشیدہ اور اس دور کے مروج کردہ قوانین وعقائد میں عمداً تقدیر کے عقیدے کو خوب خوب فروغ دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں ہماری پیشوائیت اور تمام مذہب گزیدہ طبقہ کا کائنات اور دنیاوی امور کے بارے میں منفیانہ انداز نگاہ ہوگیا ہے جو دنیا کی ہر چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کا منطقی نتیجہ معاشرہ میں مزید تاریکی کا اضافہ ہوتا ہے۔اس سے بڑھ کر بھی جو چیز سم قاتل کا درجہ رکھتی ہے یہ ہے کہ ہمارا مروجہ اسلام' تصوف کے زیر اثر' حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کردہ علوم کو قابل

اعتناء اور لائق اعتبار ہی نہیں سمجھتا۔ یہ نہ صرف کائنات کو باطل قرار دیتے ہیں بلکہ حواس انسانی کو علم کا ذریعہ ہی نہیں سمجھتے۔ جس کے لئے صدہا اشعار اور اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ؎

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آپڑا
علم کا سودا مجھے مہنگا پڑا

ان کے نزدیک صرف وہ علم قابل اعتماد ہے' جس کے حاصل کرنے میں حواس خمسہ کا استعمال نہ کیا گیا ہو' اور جو ان کی اصطلاح میں ''علم لدنی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' لیکن افسوس کہ یہ علم موجودہ دور کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

روشن خیال معاشرہ میں کوئی طبقہ بھی جائز حقوق و مراعات سے محروم نہیں رہ سکتا۔ خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں ہمارے فقہی قوانین کو دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے جن میں عورت کی جان کی قیمت مردوں سے نصف قرار دی گئی ہے۔ شہادت سے محروم کیا گیا ہے۔ محض شبہ کی بناء پر زدوکوب کی اجازت دی گئی ہے۔ بیک وقت کئی کئی بیویاں رکھنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ نان و نفقہ کے لئے چار ماہ دس دن کی مدت کا تعین از خود کیا ہے' قرآن کریم میں اس کی کوئی قید نہیں ہے۔ زنا کے واقعات میں چار گواہ ضروری قرار دیئے ہیں جس کی قرآن میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ اور اسی طرح کے تمام قوانین جو ہماری فقہ میں متداول ہیں' ملوکیت و پیشوائیت کی آپس کی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ قرآن پر مبنی روشن خیال معاشرہ میں بھلا ان کا کیا کام؟ عورتوں کے بارے میں ہماری فقہ کے قوانین چونکہ بہت ہی فرسودہ ہو چکے ہیں' اس لئے اس دور میں ان کے خلاف اس قدر تحریری مواد مہیا کر دیا گیا ہے کہ اس تحریری مواد نے ان فرسودہ قوانین کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ طلوع اسلام نے ہی اس کے لئے بہت کثیر تعداد میں مضامین و مقالات طبع کئے ہیں جن کا بہت مفید اثر نہ صرف عوام پر ہوا ہے بلکہ عورتوں سے متعلق N.G.Os نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ راقم سطور کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان تمام N.G.Os میں طلوع اسلام کی شائع کردہ کتاب ''طاہرہ کے نام خطوط'' موجود رہتی ہے' جس میں عورتوں کے حقوق سے بحث کی

گئی ہے۔اس سے یہ N.G.Os وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔اس مختصر مضمون میں اس موضوع پر تحریر کرنے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔جن صاحبان کواس موضوع سے دلچسپی ہووہ طلوع اسلام کا مہیا کردہ مواد حاصل کر سکتے ہیں۔یا ''طاہرہ کے نام خطوط'' کا مطالعہ فرمالیں۔یہاں عورتوں کے حقوق کے بارے میں صرف دونکات اصولی طور پر پیش کئے جاتے ہیں' جوموضوع کو کافی حد تک سمیٹ لیتے ہیں۔

ارشادہوتا ہے ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف و للرجال علیھن درجۃ (۲/۲۲۸)۔اورعورتوں کی (مردوں پر) ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں' اورمردوں کوعورتوں پر یک گونہ برتری ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو باتیں نہایت غور طلب اور قابل تعریف وستائش ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق پر پہلے زور دیا اوراس کا تذکرہ کیا گیا اورمردوں کے حقوق بعد میں بیان فرمائے۔حقوق کی یکسانیت کا بیان یوں بھی ہوسکتا تھا کہ ولھم مثل ما علیھم یعنی مردوں کے عورتوں پر بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں۔لیکن قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق (ولھـــن) پر پہلے اصرار کیا ہے اورمردوں کے حقوق کا بیان بعد میں فرمایا ہے۔یہ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے کہ قرآن کریم کس قدر باریک امور کا بھی لحاظ رکھتا ہے۔اس آیت کریمہ میں ایسا ابدی وسرمدی چارٹر Charter بیان کر دیا گیا ہے کہ جو اپنی جامعیت میں اپنی نوعیت کا بالکل منفرد ہے۔اس میں اضافہ کرنے کے لئے مزید کسی بات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔چونکہ کمترین راقم سطور کے پیش نظر یہ احتیاط ہے کہ کوئی بات ایسی نہ رہ جائے جس سے قارئین کرام کے دل میں کسی قسم کی خلش رہ جائے کہ یہ بات عمداً نظرانداز کر دی گئی ہے' اس لئے آیت کریمہ کے آخری حصہ کے لئے بھی چند سطور تحریر کرنی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وللـــرجال علیھن درجۃ ۔اورمردوں کوعورتوں پر یک گونہ برتری ہے۔ ہمارے علماء کرام Intellectual Dis-honesty کا ارتکاب کرتے ہوئے' اس آیہ کریمہ

کے اس حصہ کو عمداً سیاق و سباق (Context) سے نکال کر ایک مستقل حکم کی حیثیت سے کہ مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری ہے' پیش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے۔ آیہ کریمہ ذرا طویل ہے آپ خود اپنے قرآنی نسخہ میں ملاحظہ فرمالیں کہ اس آیت میں طلاق و عدت کے احکامات بیان ہو رہے ہیں اور حمل کا تذکرہ تفصیل سے ہو رہا ہے کہ حمل کا تعین صحیح طریقہ سے ہونا چاہئے۔ قرآن کریم چاہتا ہے کہ یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ ہونے والا بچہ کس کا ہے۔ کس کی دراثت پائے گا' کون اس کا کفیل ہو گا۔ اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے لئے عدت گذارنی لازمی قرار دی ہے جو کہ مردوں کے لئے نہیں ہے اور یہی وہ درجہ اور یک گونہ برتری ہے جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے۔

عورتوں کے حقوق کے بارے میں دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف امر یا امر بالمعروف ونھی عن المنکر حکومت کرنے کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ یہ قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے' اس کے لئے آیات ۴/۲۲ ' ۴/۸۳ ' ۴/۵۴ ' ۴/۵۹ ' ۳/۱۵۴ ' ۳/۱۵۹ ' ملاحظہ فرمائیں۔ ان آیات کریمات میں اس اصطلاح کو پیش نظر رکھ کر سورۂ نور کی یہ آیۂ کریمہ ملاحظہ فرمائیں والمومنون و المومنت بعضهم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں اور قرآن کی اصطلاح کے مطابق حکومت چلاتے ہیں۔ اس آیۂ کریمہ میں مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا مددگار بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد وہی امر بالمعروف ونھی عن المنکر دونوں کا فریضہ قرار دیا ہے۔ اس کام میں یعنی حکومت چلانے میں قرآن کریم نے دونوں کو شامل کیا ہے۔ چونکہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے اس لئے جب قرآن کریم کے مطابق عورتیں حکومت چلاسکتی ہیں تو (میری رائے میں) قرآن کریم کی رو سے وہ نماز کی امامت بھی کرا سکتی ہیں۔ فتدبروا۔

یہ دو آیات جن میں مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق اور عورتوں کا حکومت کرنے کا حق بیان کیا گیا ہے ان میں ہی اتنے حقوق آ جاتے ہیں کہ مزید حقوق بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جس زمانہ میں پاکستان اور ترکی میں بیک وقت دو خواتین وزیر اعظم تھیں اس سال اخبارات کی خبر کے مطابق' انگلینڈ میں دس ہزار خواتین مسلمان ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ سب حقوق اور اکرام و احترام نسواں دین میں ہوتا ہے' مذہب میں ان کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ہمارے ہاں سیکولر سٹیٹ کے متعلق عام طور پر یہ تصور عام ہے کہ سیکولر سٹیٹ میں مذہب کو تو کوئی دخل نہیں ہوتا' لیکن یہ سٹیٹ لا مذہب بھی نہیں ہوتی۔ جو لوگ سیکولر سٹیٹ میں مذہب کی پابندی کرنا چاہتے ہوں' وہ بے شک مذہب کی پابندی کر سکتے ہیں لیکن مذہب کو سٹیٹ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس میں سٹیٹ کی طرف سے یہ پابندی نہیں ہوتی کہ کوئی شخص مذہب کی رسوم ادا نہ کرے۔ ہمارے ہاں اخبارات اور ٹی وی چینلز میں سیکولر سٹیٹ کو اسی طرح سے Project کیا جاتا ہے۔ سیکولر سٹیٹ کی اصل تعریف (Definition) یہ ہے کہ سیکولر سٹیٹ وہ ہوتی ہے جس میں اکثریت کو ہر طرح کے قوانین بنانے کا اختیار ہوتا ہے۔ کسی قسم کی کوئی پابندی خارج سے اس سٹیٹ پر Impose نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم جنس پرستی جیسا شنیع و مکروہ فعل اس میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر اس سٹیٹ میں چوری کو جائز قرار دینا ہو تو بے شک چوری جائز قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر اکثریت حقیقی بہن بھائی کا نکاح جائز قرار دے دے تو اس پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ البتہ اس میں زمانہ کی ضروریات کے مطابق قوانین بنائے جاتے ہیں اور اس حد تک وہ معاشرہ روشن خیال ہوتا ہے۔

اس کے مدمقابل تھیوکریسی ہوتی ہے' جس میں حکومت مولوی صاحبان کی ہوتی ہے۔ تھیوکریسی کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں خدا کے نام پر بنے بنائے' ڈھلے ڈھلائے قوانین جاری کئے جاتے ہیں۔ اس میں تقلید پرستی عام شیوہ ہوتا ہے اور دنیا کے امور سے عموماً منفیانہ Attitude لیا جاتا ہے۔ جو قوانین ہزار بارہ سو سال پیشتر علماء کرام نے بنا دیئے اس

پر عمل پیرا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔موجودہ حالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔نہ موجودہ ضروریات کے متعلق قوانین بنائے جاسکتے ہیں۔ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی سابقہ قوانین کی تقلید ضروری سمجھی جاتی ہے۔تھیوکریسی کا سارا دارومدار ہی سابقہ قوانین پر ہوتا ہے۔کیونکہ اس کا کوئی تعلق موجودہ تقاضوں سے نہیں ہوتا' اور نہ ہی موجودہ تقاضوں کے مطابق اس میں قوانین وضع کئے جا سکتے ہیں اس لئے تھیا کریسی ایک تاریک ترین معاشرہ ہوتا ہے۔فرقہ بندی' تعصب' دنیا سے نفرت' دنیاوی علوم سے بیزاری' ویڈیو' ٹی وی' وغیرہ سے کراہت' نفاق' مداہنت کا اس میں عام رواج ہوتا ہے۔

خالص قرآن کریم پر تشکیل کردہ معاشرہ (جس کو ہمارے ہاں عموماً تھیا کریسی سے Confuse کیا جاتا ہے) روشن ترین اور درخشندہ معاشرہ ہوتا ہے۔اس میں صرف قرآن کریم کی مستقل اقدار کی پابندی لازم ہوتی ہے جو انسانیت کے ارتقاء میں ممد و معاون ہوتی ہیں اور جن کی پابندی سے آزاد ترین معاشرہ وجود میں آتا ہے۔قرآن کریم نے ان مستقل اقدار کی وضاحت فرمادی ہے۔ان مستقل اقدار میں رہتے ہوئے' زمانہ کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے قوانین وضع کئے جاتے ہیں جن سے معاشرہ ہر دور میں جدید ترین Modern رہتا ہے اور قوانین میں فرسودگی ذرہ برابر نہیں آتی۔نزول قرآن سے پیشتر تک مذہب کا تصور انفرادی' نجی اور ذاتی تھا اور انسان اور خدا کا براہ راست تعلق عبادت کے ذریعہ قائم سمجھا جاتا تھا۔قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے اور اس کی حقانیت کی یہ واضح دلیل و شہادت ہے کہ قرآن کریم نے مذہب کا سابقہ تصور ہی بدل کر رکھ دیا اور یہ انقلابی تصور پیش کیا کہ انسان کا خدا سے بُراہ راست تعلق نہیں ہوسکتا بلکہ انسان کا خدا سے تعلق صرف اس نظام کے ذریعے ہوسکتا ہے جو اس نے وحی کے ذریعے قرآن کریم میں عطا فرمایا ہے۔نزول قرآن کے وقت عرب شریف میں قبائلی طریقہ رائج تھا اور کوئی باضابطہ تصور نظام یا حکومت کا نہیں تھا۔اس دور میں قرآن کریم کا ہی یہ مقام تھا کہ اس نے سٹیٹ کا تصور دیا اور اس سٹیٹ کی اطاعت کو ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا۔اور صرف اس سٹیٹ کو ہی خدا اور بندے

کے درمیان واسطہ قرار دیا۔ نزول قرآن کے بعد اگر کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت کرنے کا خواہشمند ہے تو اس پر لازم ولابدی ہے کہ وہ قرآن کریم کا نظام قائم کرے اور اس نظام کی اطاعت کرے۔ اس نظام کی اطاعت سے ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر وہ نظام باقی نہیں ہے تو اللہ ورسول کی اطاعت کسی طرح بھی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی انسان کا کوئی تعلق اللہ تعالیٰ سے باقی رہتا ہے۔ فلہٰذا مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد' مکمل اور آخری ضابطہٗ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو' وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمیں پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی' عاری' نافرمان اور مجرم ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں۔

ہمارے علماء کرام یہ بات بکثرت دہراتے ہیں کہ اسلام میں دین ودنیا میں کوئی فرق نہیں لیکن فی الحقیقت یہ بات درست نہیں ہے۔ مذہب میں' مذہبی امور اور دنیاوی امور کو بالکل الگ الگ کر دیا جاتا ہے اور مذہبی امور کو صرف عبادات' رسوم اور نماز وروزہ وغیرہ تک محصور کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومت کے ٹیکس اور زکوٰۃ بالکل جداگانہ چیزیں قرار پاتی ہیں۔ مذہبی جماعتیں اور سیاسی جماعتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ لیکن دین (جس کی اصل شکل یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کے قوانین جاری ہوں اور اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت قرار دی گئی ہو) میں دین ودنیا کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ اس میں اسلامی حکومت کے Taxes ہی زکوٰۃ بن جاتے ہیں اور دنیا کا

ہر وہ کام جس کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کیا جائے یا جس میں قرآنی حکومت کی اطاعت کی جائے وہ دینی کام ہو جاتا ہے۔ جو تاجر اپنے Taxes اسلامی حکومت کے قواعد وقوانین کے مطابق ادا کرتا ہے تو اس کا یہ دنیاوی کام دینی بن جاتا ہے۔ جو شخص اپنے دفتر اس لئے وقت کی پابندی سے جاتا ہے کہ وہ اس طرح قرآنی حکومت کی اطاعت کر رہا ہے تو اس کے دفتر جانے کا یہ عمل جو خالص دنیاوی ہے دینی بن جاتا ہے کیونکہ اس کو قرآنی حکومت کی اطاعت سے ثواب ہوتا ہے۔ اگر آپ کار چلاتے ہوئے ٹریفک لائٹ پر اس وجہ سے رک گئے ہیں کہ آپ اس سے اسلامی حکومت کی اطاعت کر رہے ہیں' تو آپ کا رکنا' ایک دینی کام بن جاتا ہے۔ اسلامی حکومت میں اس طرح دین ودنیا کی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور علامہ اقبال کا وہ مصرع منطبق ہو جاتا ہے۔

از کلید دین در دنیا کشاد

اور ہر وہ چیز جس کا تعلق اسلامی حکومت سے ہوتا ہے وہ شعائر اللہ میں شمار ہو جاتی ہے۔ مملکت کے محسوس علامات (Symbols) اس مملکت کے شعائر ہوتے ہیں۔ ان علامات کے احترام کے معنے اس مملکت کا احترام ہے۔ اسلامی حکومت کے شعائر اس حکومت کا قومی جھنڈا' ترانہ' کرنسی' اسلامی حکومت کی حدود ونفوذ' اسلامی حکومت کی طرف سے جاری کردہ پاسپورٹ' پوسٹل Stamps اور Judicial Papers الغرض ہر وہ چیز جو اسلامی حکومت کی طرف منسوب ہے وہ شعائر اللہ میں شمار ہوتی ہے۔ جس کا وقار واحترام سب شہریوں پر فرض ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی تقویٰ ہے اور جو یہ اطاعت کرتا ہے وہ متقی ہوتا ہے۔

قرآنی حکومت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں جرائم از خود ختم ہو جاتے ہیں اور خارج سے جرائم روکنے کی مشینری کی اتنی ضرورت نہیں رہتی۔ سیکولر سٹیٹ یا تھیاکریسی میں حکومت کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی خلاف ورزی یا جرائم کے ارتکاب سے اللہ ورسول کی نافرمانی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص یہ بندوبست کر لے کہ وہ ارتکاب جرم کے بعد پکڑا نہیں جائے گا تو وہ جرم کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کیونکہ اس سے وہ اللہ و

رسول کی کسی طرح کی نافرمانی نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص حکومت کا ٹیکس ادا نہیں کرتا تو وہ سٹیٹ کا مجرم ہے' اللہ و رسول کا مجرم نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قرآنی حکومت کی تو نوعیت ہی بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں جو شہری سٹیٹ کی نافرمانی کرے گا وہ ساتھ ساتھ اللہ و رسول کا بھی مجرم ہو گا۔ اگر کوئی شخص دفتر کے اوقات کی پابندی نہیں کرتا تو وہ جس قدر دفتر میں اپنے افسران کو جواب دہ ہے اسی قدر وہ اللہ و رسول کی جناب میں بھی جواب دہ ہے۔ اگر کوئی شخص ٹریفک سگنل پر اس وجہ سے نہیں رکتا کہ وہاں کوئی سپاہی موجود نہیں ہے تو بے شک وہ پولیس کی گرفت سے تو بچ گیا لیکن وہ اللہ و رسول کے ہاں جواب دہ ہے۔ قرآنی سٹیٹ میں Sin اور Crime ایک ہو جاتے ہیں اور جو لوگ Sin نہیں کرتے وہ حکومت کی نافرمانی Crime بھی نہیں کرتے۔ اس طرح اس حکومت کے شہری از خود جرائم کے ارتکاب سے ایک بڑی حد تک باز رہتے ہیں اور وہاں جرائم کو روکنے کے لئے خارج سے کسی فورس کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ شہریوں کو جرائم سے باز رکھے۔ اس حکومت میں حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔ ہر زمانہ کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے' اس لئے یہ معاشرہ جرائم سے خالی اور روشن ترین معاشرہ ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے سورۂ فاطر کی آیات کریمات (۲۸' ۲۷) میں علماء کا لفظ ٹھیک سائنسدانوں کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ یہ آیات کریمات ذرا طویل ہیں آپ خود اپنے قرآن کریم کے نسخے میں ملاحظہ فرما کر کمترین راقم سطور کے خیال کی تصدیق فرمالیں۔ ان کے علاوہ بے شمار آیات وہ ہیں جو تسخیر فطرت' تسخیر ملائکہ سے متعلق ہیں جن میں یہ حکم کے طور پر لکھا ہے کہ مومن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرے۔ مومن کا فرض ہے کہ قوانین فطرت میں تحقیق کر کے' فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں قرآن میں عطا کردہ قوانین کے مطابق استعمال کرے۔ اس طرح انسان کی دنیا بھی سنور جاتی ہے اور آخرت بھی۔ اس موضوع پر اس قدر آیات کریمات موجود ہیں کہ ان کا احصاء بڑا دشوار ہے اور اس مختصر مضمون کا یہ موضوع بھی نہیں ہے۔ البتہ صرف دو تین آیات کریمات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) تخلیق کائنات کے متعلق متعدد جگہ پر ارشاد ہوتا ہے کہ کائنات کسی خاص مقصد کے لئے تخلیق کی گئی ہے خلق السمٰوت والارض بالحق۔ تعالی عما یشرکون (۱۶/۳)۔ اس نے زمین و آسمان کو بطور ایک حقیقت کے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس نکتہ کو قرآن کریم بار بار تاکیداً دہراتا ہے۔ یہ اس نظریہ کی تردید ہے جس کی رو سے کائنات صرف سراب ہے اور جس نظریہ کو افلاطون جیسا مفکر، تمام ہندو فلاسفہ اور ہمارے ہاں کے وحدت الوجود کے قائل صوفیاء کرام درست خیال کرتے ہیں۔ یہ بیان ایجابی ہے، اسی کو تاکیداً سلبی طور پر فرمایا کہ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلاً۔ ذلک ظن الذین کفروا (۳۸/۲۷) اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان ہیں بے کار نہیں پیدا کیا۔ یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو کافر ہیں۔ کائنات کے متعلق مجموعی طور پر یہ بات ایجابی و سلبی طور پر دیا کہ کائنات کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعین مقصد رکھتی ہے اور انسانیت کے لئے کسی نہ کسی حیثیت سے نفع رساں ہے۔ جنہوں نے کفر کیا اور جن کا خیال ہے کہ کائنات باطل ہے ان کا تو کوئی فرض نہیں بنتا، البتہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ قرآن کے اس دعویٰ کو ثابت کریں کہ واقعاً کائنات کا ایک مقصد ہے۔ نیز یہ کہ کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کریں اور مسلسل تحقیق و تفتیش کے بعد ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کریں کہ یہ شے فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس کی تخلیق بیکار نہیں ہے۔ یہ کچھ ثابت کرنا قرآن پر ایمان لانے والوں کا فریضہ ہے اور عملاً ہر چیز کا فائدہ ثابت کرنے سے قرآن کریم کا دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے اور اس کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

دوسری قابل غور آیۂ کریمہ یہ ہے وان من شیئ الا عندنا خزائنہ، وما ننزلہ الا بقدر معلوم (۱۵/۲۱)۔ ہمارے پاس ان چیزوں کے بے بہا ذخیرے ہیں، لیکن ہم انہیں معینہ اندازے کے مطابق باہر لاتے ہیں۔

جس وقت نوع انسانی وجود میں آئی، اس سے پیشتر اس کی خوراک کا انتظام قدرت

نے فرما دیا تھا۔ اول دن سے آج تک زمین نوع انسانی کو رزق فراہم کر رہی ہے اس میں رزق فراہم کرنے کی صلاحیت بے اندازہ ہے' لیکن رزق کی پیداوار اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ایک خاص اندازے سے ہو رہی ہے۔ اگر یہ زمین ایک مرتبہ ہی اپنے سارے ذخیرے باہر نکال دیتی تو آنے والی نسلیں رزق سے محروم ہو جاتیں' مزید یہ کہ طاقتور قومیں باہر سے آ کر زمین پر قبضہ کر کے' ایک دفعہ ہی اس کا سارا رزق نکال کر اس کو خالی کر دیتیں' اور مقامی لوگ اس سے محروم رہتے۔ جیسا کہ عرب ممالک میں آج کل پٹرول کے سلسلہ میں ہو رہا ہے۔ ان قباحتوں کے پیش نظر قدرت کا انتظام ملاحظہ ہو کہ زمین سے رزق ''بقدر معلوم'' ہی مل سکتا ہے۔ ''بقدر معلوم'' میں اہم نکتہ یہ ہے کہ زراعت کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین میں جس قدر ریسرچ و تحقیق ہوتی جائے گی اور ان قوانین کے علم میں جس قدر اضافہ ہوتا چلا جائے گا' اسی قدر اضافہ ''بقدر معلوم'' میں ہوتا جائے گا' اور وہ یہی ''قدر معلوم'' ہوتا جائے گا اور اسی نسبت سے ارضی خزائن کی زیادہ نمود ہو جاتی جائے گی۔ سابقہ ادوار اور موجودہ دور کی پیداوار میں جس قدر فرق ہے وہ ان ہی قوانین کے معلوم کرنے اور ان پر عمل کرنے کا نتیجہ ہیں۔ پہلے ہمارے ہاں ایک ایکڑ زمین سے 8 من گیہوں آتا تھا' اب تقریباً اسی من گیہوں اسی رقبہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جو اقوام ''قدر معلوم'' میں اضافہ کرتی جائیں گے' اور اس کے مطابق زراعت کریں گی' ان کے ہاں اسی قدر رزق کی فراوانی ہوتی جائے گی۔

ان دو آیات کو خصوصی طور پر اس لئے یہاں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ان دو آیات پر ہمارے مسلمان سائنسدان اپنی توجہ کو مرکوز رکھیں تو معاشرے میں رزق کی فراوانی ہونے کے علاوہ سائنسی تحقیقات کسی مقام پر بھی نہیں رک سکتی۔ ساری کائنات ان کی Laboratory ہوگی اور وہ کائنات کی ہر چیز کے لئے یہ ثابت کریں گے کہ اس چیز سے مسلمان فلاں فلاں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جس معاشرہ میں ریسرچ کا یہ معیار ہو' اور رزق کی فراوانی ''قدر معلوم'' کے مطابق ہو' اس سے زیادہ پر سکون اور روشن خیال معاشرہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟

قرآن کریم کے مطابق وحدت خالق کا لازمی نتیجہ وحدت مخلوق ہے۔ یعنی تمام انسانیت ایک عالم گیر برادری ہے۔ تمام نوع انسانی کی تخلیق ایک نفس واحدہ سے ہوئی ہے۔ ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ (۷/۱۸۹)۔ تمام انسان ایک ہی درخت کی شاخیں' ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔

بنی آدم اعضاء یکدیگر اند

اور مولانا حالی کا مشہور شعر ہے

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ھدیٰ کا
کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

قرآن کریم کا تو مقصود ہی یہ ہے کہ تمام انسانیت مل جل کے زندگی بسر کرے۔ اس لئے بہترین معاشرہ میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اقلیتوں سے بہت ہی اچھا سلوک کیا جائے۔ انہیں ہر وہ سہولت فراہم کی جائے جو عام مسلمانوں کو حاصل ہو۔ ان کی ملازمت' ان کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم' مذہب کی آزادی' رزق کی فراہمی' جان کی حفاظت' حکومت کا فرض ہے۔ قانونی معاملات میں ان کی شہادت تسلیم کی جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ان کی شہادت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم (۵/۱۰۶) دو شخص معتبر چاہئیں تم میں سے یا دو اور ہوں تمہارے سوا۔ اس آیہ کریمہ کے ذیل میں 'موضح القرآن' میں تحریر ہے کہ ''اگر سفر میں لگا مرنے' وہاں مسلمان پیدا نہ ہوئے تو دو کافر بھی روا ہیں''۔ انہیں پورے پورے انسانی حقوق مہیا ہوں گے۔ ان سے بالکل مسلمانوں کی طرح عدل کیا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے ولا یجرمنکم شنان قومٍ علی الا تعدلوا۔ اعدلوا۔ ھو اقرب للتقویٰ (۵/۸) اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو۔ (خبردار) تم ہر حال میں انصاف کرو' یہی پرہیز گاری سے بہت قریب ہے۔ عدل کے علاوہ قرآن کریم نے ان سے حسن سلوک کا بھی حکم دیا ہے۔ ان تبروھم و تقسطوا

الیھم (۸/۶۰)ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ عدل کرو۔غیر مسلموں کو نہ صرف اپنی عبادت اور رسوم کی ادائیگی کی کھلی اجازت ہوگی بلکہ حکومت قرآنی کا فریضہ ہے کہ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرے ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیر (۲۲/۴۰) اور اگر خدا ان لوگوں کو ایک دوسرے سے دور دفع نہ کرتا رہتا' تو گرجے' اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوس کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے' کب کے ڈھادیئے گئے ہوتے۔ان کی حفاظت کے علاوہ یہ بھی تاکید ہے کہ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (۶/۱۰۹) یہ (مشرکین) جن کی اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) عبادت کرتے ہیں' انہیں تم برا نہ کہا کرو ورنہ یہ لوگ بھی خدا کو بے سمجھے عداوت سے برا (بھلا) کہہ بیٹھیں گے۔ملک میں تو خیر ان کی حفاظت کرنی ہی ہے لیکن اگر وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یمع کلٰمہ اللہ ثم ابلغہ ما منہ ذلک بانھم قوم لا یعلمون (۹/۶)ان مشرکین میں سے (جن کے ساتھ معاہدات ختم کردیئے گئے ہیں) کوئی تمہارے پاس آکر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو پھر اسے اچھی طرح سمجھادو کہ قوانین خداوندی کی رو سے اس نظام میں اس کی کیا پوزیشن ہوگی' اگر اس کو یہ پوزیشن قابل قبول نہ ہو' اور وہ مملکت سے چلا جانا چاہے تو تم اسے حفاظت کے ساتھ اس کی پناہ گاہ تک پہنچادو۔یہ اس لئے کہ یہ لوگ جہالت کی وجہ سے ایسا کررہے ہیں۔

غیر مسلموں کے ضمن میں قرآن کریم میں جزیہ کا ذکر بھی آتا ہے۔جزیہ کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک مرتبہ سورہ توبہ میں آیا ہے' اس کے علاوہ یہ لفظ قرآن میں اور کہیں نہیں آیا۔اس کے لغوی معنے عہد یا کسی خدمت کا معاوضہ ہیں۔اصطلاحاً یہ وہ Tax ہے جو اسلامی حکومت ان سے ان کی حفاظت کرنے کے بدلے میں لیتی ہے۔مزید یہ کہ غیر مسلموں سے زکوٰۃ بھی نہیں لی جاتی' اس لئے یہ جزیہ زکوٰۃ کا قائم مقام ہوجاتا ہے آیۂ کریمہ میں حتی یعطوا الجزیۃ

عن یدو ھم صاغرون آیا ہے(۹/۲۹) تاکہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر' تمہارا غلبہ وحکومت اور تمہارا اقتدار تسلیم کرلیں (وھم صاغرون) اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا منظور کر لیں۔ لیکن موجودہ دور میں تو حالات ہی بدل گئے ہیں اور تمام اسلامی ممالک بشمول پاکستان میں غیر مسلم امن پسند شہریوں کی طرح زندگی بسر کررہے ہیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی طرح اسلامی ممالک کے قدیم و آبائی باشندے ہیں اور ان سے جنگ کے سے حالات بھی کبھی پیش نہیں آتے۔ اس لئے ان حالات میں جزیہ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور آج کل تو اس پر عمل کرنے کے متعلق سوچنا بھی بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے ملک کے غیر مسلموں سے بہت محبت سے پیش آئیں۔ ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح شمار کریں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کریں اور ہر ممکن سہولت ان کو فراہم کریں تاکہ ان کو بھی ملک سے محبت ہو اور ہماری محبت اور حسن سلوک سے متاثر ہوکر وہ اسلام کی طرف راغب ہوں اور اس طرح ایک روشن خیال معاشرہ قائم کرنے میں ان کا حصہ بھی شامل ہو۔

قرآنی روشن خیال معاشرہ میں ہر شخص امن پسند Peaceful ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے بعد حضورﷺ نے اپنے ان دشمنوں کو جنہوں نے ساری عمر حضورﷺ کو تنگ کیا' اور بالآخر مکہ چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا' کو معاف فرمادیا۔ حضورﷺ نے جس دن مکہ سے مدینہ شریف کی طرف ہجرت فرمائی تو چلنے سے ایک رات پیشتر کعبہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے کیونکہ حضور کو کعبہ چھوڑنے کا سخت رنج تھا۔ شیبانی' جو اس وقت کعبہ شریف کا کلید بردار تھا' اس سے حضورﷺ نے منت سماجت کی کہ وہ کعبہ کا دروازہ کھول دے تاکہ آپ کعبہ کی زیارت فرمالیں۔ لیکن شیبانی نے دروازہ نہیں کھولا اور حضورﷺ زیارت کئے بغیر ہجرت فرما گئے۔ فتح مکہ کے بعد کعبہ کی چابیاں اب خود حضورﷺ کے پاس تھیں لیکن آپؐ ان کو کسی کے سپرد کرنا چاہتے تھے تو حضورﷺ نے اعلان کرادیا کہ میں کل یہ چابیاں کسی مناسب شخص کے سپرد کردوں گا۔ صحابہ کرامؓ میں سے ہر کسی کی

تمنا تھی کہ چابی انہیں ملے اور جب حضورﷺ نے چابیاں واپس کرنے کے لئے صحابہؓ کو جمع کیا تو ہر شخص ملتجی و ملتمس نگاہوں سے آپؐ کو دیکھ رہا تھا کہ شاید اسے یہ چابیاں مل جائیں کیونکہ کعبہ کی کلید برداری ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ لیکن حضورﷺ نے یہ چابیاں اسی شیبانی کے سپرد کر دیں اور اس سے یہ بات فرمائی کہ اگرچہ تم نے تو مجھے ہجرت کے وقت زیارت سے محروم رکھا تھا لیکن آج میں یہ چابیاں تمہارے اس طرح سپرد کر رہا ہوں کہ قیامت تک یہ چابیاں تمہاری اولاد میں رہیں گی اور کوئی شخص تمہاری اولاد سے یہ چابیاں چھین نہیں سکتا۔ اسی طرح حضورﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اس قدر دب کے صلح کی کہ تاریخ روایات کے مطابق صحابہؓ کی کثیر تعداد اس پر خوش نہیں تھی لیکن اس صلح کے نتائج اس قدر خوش گوار نکلے کہ وہی فتح مکہ کے پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

حضورﷺ کو یہی حکم تھا کہ جادلھم بالتی ھی احسن (۱۶/۱۲۵) قرآن کریم کی تبلیغ نہایت خوشگوار طریقہ پر فرمائیں۔ اس لئے حضورﷺ فرماتے تھے کہ ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی (۱۲/۱۰۸) میری راہ تو بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی راہ کی طرف دلائل و براہین کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ حضورﷺ کی یہی سنت ہے لیکن افسوس کہ آج یہ صورت نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کا وہ طبقہ جو سب سے زیادہ اتباع رسولؐ کا غل مچاتا ہے' وہ ہی سب سے زیادہ تشدد پسند ہے۔ حالانکہ تشدد کا طریقہ قرآن و سنت دونوں کے خلاف ہے' اور اس سے مسلمانوں کی تو ہے ہی' خود اسلام کی سخت توہین ہوتی ہے۔

قرآن کریم کا حکم تو یہ ہے کہ فاعف عنھم واصفح (۵/۱۳) تم ان کے قصوروں کو معاف کردو اور ان سے درگذر کرو۔ فاصفح الصفح الجمیل (۱۵/۸۵) ان (کافروں) سے شائستہ عنوان کے ساتھ درگذر کرو۔ نیز ارشاد ہوا واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجرا جمیلا (۷۳/۱۰) اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور ان سے بعنوان شائستہ الگ تھلگ رہو۔ قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات

حسنہ کی اپنے اندر نمود کریں اور علیٰ حد بشریت اپنے اندر ان کا انعکاس کریں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات 'المومن' اور 'السلام' بھی ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو ان صفات کا اتباع کرنے کی وجہ سے ہر وقت امن وسلامتی کا داعی اور ان کو فروغ دینے والا ہونا چاہئے۔

ہم مسلمانوں کو روشن خیال معاشرہ تعمیر کرنے کے لئے دو باتوں کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے قوانین (جو فقہ اسلامی کہے جاتے ہیں اور جن کا صحیح نام فقہ ملوکیت ہونا چاہئے) اب بالکل فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اس فقہ ملوکیت کے جامد تصورات جو خاندانی سلطنتوں کے تقاضے پورا کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے' اس وقت کسی طور کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں عموماً اجتہاد پر زور دیا جاتا ہے' لیکن اجتہاد انہیں مردہ قوانین کی حدود کے اندر اندر جائز قرار دیا جاتا ہے۔ اگر واقعا جدید روشن خیال معاشرہ تشکیل دینا ہے تو ان قوانین کو بالکل دریا برد کر دیں۔ ان میں اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ان میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ صرف قرآن کریم کو سامنے رکھیں اور حالات کے اقتضاء کے مطابق قوانین وضع کرتے جائیں۔ اسی کے ذیل میں مذہبی علوم کے تدریسی نظام کی موجودہ علوم کی روشنی میں از سر نو تدوین کریں۔ سابقہ قوانین تو جنازے اور لاشیں ہیں جن کو ہم کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہیں۔

دوسرے یہ سنت کا غلط تصور بد آج کل رائج ہے اس کو چھوڑ کر' صحیح تصور سامنے لائیں۔ حضورﷺ کے وہ اعمال جو آپؐ نے دین کی ترویج واشاعت اور اس کے تمکن کے لئے سرانجام دیئے' سنت ہیں۔ اس کے علاوہ حضورﷺ کے ذاتی معمولات جو آپ صبح سے شام تک سرانجام دیتے تھے' وہ سنت نہیں ہیں۔ اگر حضورﷺ کسی دن کوئی خاص کھانا تناول فرماتے تھے تو مدینے کی ساری آبادی وہ ہی کھانا نہیں کھاتی تھی کیونکہ وہ آپ کا ذاتی معمول تھا۔ ہاں علیٰ وجہ البصیرت دین کی دعوت دینا (۱۲/۱۰۸) حضورﷺ کا وہ عمل تھا جو آپ کی سنت ہے۔ ہمیں سب کو دین کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت دینی چاہئے۔ حضورﷺ نے اپنی سیرت طیبہ کو اپنی صداقت کی شہادت کے طور پر پیش فرمایا تھا فقد لبثت فیکم عمراً من قبله افلا تتفکرون (۱۰/۱۶) یہ

حضورﷺ کی سنت ہے۔ ہم سب کو اپنی سیرت اس درجہ پختہ رکھنی چاہئے کہ وہ دین کی اشاعت میں مددگار و معاون بنے۔ البتہ عقال باندھنا' اونٹ پر سفر کرنا' سنت نہیں ہے۔ ہمارے علمائے کرام اس دور میں بھی ایسا لباس زیب تن فرماتے ہیں جس سے وہ بالکل کارٹون معلوم ہوتے ہیں اور بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سنت پر عمل کررہے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حضورﷺ کسی Choas یا Void میں تولد نہیں ہوئے تھے۔ ان کے گرداگرد ایک معاشرت تھی جو عربی معاشرت تھی' اس معاشرت کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے علماء کرام نے عرب کے اس دور کی معاشرت کو دین بنالیا ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک آیۂ کریمہ کی وضاحت

حضورﷺ کے دور کے مشرکین جو حضور کی دعوت کی مخالفت میں اعتراضات اٹھاتے تھے ان میں ان کا ایک اعتراض خود نظام رسالت پر بھی تھا۔ وہ اس سلسلہ میں یہ اعتراض کرتے تھے کہ اللہ کو واسطہ یا نمائندہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ براہ راست خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا۔ وقال الذین لا یعلمون لولا یکلمنا اللہ او تاتینا آیة. کذالک قال الذین من قبلھم مثل قولھم تشابھت قلوبھم (۲/۱۱۸)۔ اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں، کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گذرے ہیں انہوں نے بھی انہی کی طرح بات کہی تھی۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہو گئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ حضور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا ان سے ہم کلام ہوتا ہے' اگر ایسا ہے تو خدا نے ان کو ہی ہمارے میں سے کلام کرنے کے لئے کیوں منتخب کیا ہے۔ ہم جو قریش کے سردار وعمائدین ہیں خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا۔ ان کے اس مطالبہ کی وضاحت کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہر شخص اس مقام ومرتبہ کا اہل نہیں ہوا کرتا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون اس منصب کے لئے اہل ہے۔ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (۶/۱۲۴)۔ اللہ ہی اس محل کو جانتا ہے جہاں وہ اپنی رسالت قرار دیتا ہے لیکن یہاں خاص اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا اور اس کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو اس بات کا احساس دلانا مقصود تھا کہ ان کا مطالبہ ہی نہایت غیر دانشمندانہ ہے اور اسکا جواب نہ دینا ہی ان کا جواب تھا۔

ہمارے نزدیک تو اس کی وجہ بالکل بدیہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو آزاد اور اپنے افعال واعمال میں خودمختار پیدا کیا ہے۔ اگر ہر شخص کو براہ راست وحی وہدایت ملنے لگتی تو ہر شخص اس پرعمل کرنے کا مکلف بھی ہوتا' پوری انسانیت میں اختیار وخودمختاری سلب ہو جاتی۔ آزادی واختیار جو انسانیت کے لئے باعث شرف ومجد ہے انسانیت اس سے بالکل محروم وعاری ہو جاتی۔ کفار و مشرکین کے اس اعتراض کے بارے' دوسرے پیرائے میں' اللہ تعالیٰ نے انسان سے کلام کرنے کے طریقوں کی وضاحت میں سورہ شوریٰ میں فرمادیا اور سورۃ شوریٰ کی اسی آیت کی وضاحت اس مضمون کا عنوان ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء. انه علی حکیم (۴۲ / ۵۱)۔ (ترجمہ) کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے' یا پردے کے پیچھے سے' یا بھیجے کسی فرشتہ کو پس وہ وحی کرے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ وہ عالی مقام اور حکمت والا ہے۔

مشرکین کا یہ اعتراض جو قرآن کریم میں کئی جگہ پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ان سے براہ راست کلام کیوں نہیں کرتا' اسی آیۂ کریمہ میں اس کا بیان ہے۔

یوں تو قرآن کریم کی سب آیات بے مثل واہم ہیں لیکن بعض آیات وہ ہیں جن پر عقائد کی اساس ہوتی ہے اور وہ نہایت غور وتفحص کی متقاضی ہوتی ہیں۔ یہ آیہ کریمہ بھی ایسی ہی اہم آیت ہے لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین نے ایسی اہم آیت کی بالکل غلط تفسیر وتوجیہ کی ہے جس سے ہمارے ہاں خارج از قرآن وحی کے تصور کی تائید ہوتی ہے اگر پہلے سے خارج از قرآن وحی کا تصور ذہن میں نہ ہو تو اس آیت کی تفسیر بالکل واضح ہے لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں تفاسیر جب لکھی گئیں اس وقت تک خارج از قرآن وحی کا عقیدہ وضع کر دیا گیا تھا۔ اسی عقیدہ کو پیش نگاہ رکھ کر' اس آیت کی تفسیر کی گئی جس سے ہمارے مفسرین کرام نے لغزش کھائی۔

البتہ ہمارا یہ دور خوش قسمت ہے کہ اس دور میں قرآنِ خالص سامنے آ رہا ہے۔ اسی لئے علماء قرآن نے تفسیر القرآن بالقرآن کے اسلوب پر اس آیت کی درست تفسیر فرمائی ہے۔ اب آپ کے پیش نظر اس آیت کی گذشتہ تفاسیر کا ملخص، اس کے اسقام اور آیت کی درست تفسیر پیش کی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ اس آیۂ کریمہ میں پوری انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ملنے کے طریقے بتائے جا رہے ہیں۔ صرف انبیاء کرام کے لئے نہیں۔ ہمارے مفسرین کرام نے اس آیت کے سلسلہ میں جو تحریر فرمایا ہے وہ بہت طویل و ثقیل ہے۔ ان کے لمبے لمبے اقتباسات کا مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کا ملخص نہایت احتیاط سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کا پورا مفہوم سامنے آ جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

(۱) (ان کے نزدیک) پہلا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے رسول کے دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے اور رسول اس بات کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ پردے کے پیچھے سے بات کرتا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کا کلام اور اس کی آواز تو سنتا ہے لیکن اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ سے خطاب ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ کے حکم سے جو چاہتا ہے رسول کے دل پر الہام کر دیتا ہے۔

سابقہ تمام مفسرین کرام نے بغیر کسی ایک استثناء کے، اس آیت کی تفسیر اسی مفہوم میں کی ہے اور وحی کے یہ تین طریقہ اس طور پر بتائے ہیں۔ گو مذکورہ بالا سطور میں ان کا ملخص پیش کر دیا گیا ہے تاہم اس کو مزید واضح اور آسان کرنے کی غرض سے راقم سطور اپنے الفاظ میں اسی مفہوم کو دوبارہ پیش خدمت کرتا ہے۔

(وہ فرماتے ہیں کہ) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان سے کلام کرنے کے تین طریقے بیان فرمائے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام کسی شخص پر بغیر واسطہ کے نازل کر

دے۔ دوسرا طریقہ وحی کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الفاظ نازل نہ ہوں بلکہ وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے۔ اس کو آیت میں من وراء حجاب سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ طریقہ حضرت موسیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام فرشتہ پر نازل کرے اور وہ فرشتہ وہ کلام رسول تک پہنچا دے۔

اس آیۂ کریمہ کی اس طرح تفسیر کرنے سے مفسرین کرام نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ پہلی قسم کی وحی کو الہام والقاء قرار دے کر اسے ''حدیث'' کے مفہوم میں لے لیا ہے اور تیسری قسم کی وحی جو فرشتہ کی معرفت آتی تھی، اسے قرآن کریم سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح سے وحی خفی کا دروازہ کھول دیا گیا۔ لیکن یہ تفسیر بوجوہ غلط ہے۔

اس آیت میں وحی کرنے کا دوسرا طریقہ من وراء حجاب جو بیان کیا گیا ہے، اس میں اکثر مفسرین کرام کا یہی خیال ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کے متعلق ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کیونکہ (۴/۱۶۳) میں متعدد انبیائے کرام کے متعلق فرمایا گیا کہ اللہ نے ان پر وحی کی، اور اس آیت میں حضرت موسیٰ کو ان سے الگ کر کے فرمایا گیا کہ وکلم اللہ موسیٰ تکلیما (۴/۱۶۴)۔ کہ اللہ نے موسیٰ سے بھی باتیں کیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو تمام انبیاء کرام کی وحی سے الگ اور منفرد کر کے، ان کے کلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز فرمایا، ونادینہ من جانب الطور الایمن وقربنہ نجیا (۱۹/۵۲) اور ہم نے اسے کوہ طور کی دائیں جانب پکارا اور (وحی کی باتیں بتانے کے لئے) اپنے قریب کر لیا۔

اب غور طلب صرف دو صورتیں باقی رہ گئیں پہلی صورت کے لئے مفسرین کرام کا خیال ہے کہ یہ القاء یا الہام ہوتا تھا۔ اس طرح ایک فکر یا ایک بات دل میں ڈال دی جاتی تھی جس کو رسول اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔ لیکن قرآن کریم اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا۔ قرآن کریم کی رو سے وحی بمعنی الفاظ نازل ہوتی تھی فرمایا نزل بہ روح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین (۲۶/۱۹۵)۔ جسے روح الامین

صاف عربی زبان میں لے کر تمہارے دل پر نازل ہوئے تا کہ تم بھی اور رسولوں کی طرح ڈراؤ۔
ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے لا تحرك به لسانک لتعجل به (۷۵/۱۶) (اے رسول) وحی کے جلدی یاد کرنے کے واسطے اپنی زبان کو حرکت نہ دو نیز فرمایا۔ فاذا قرانه فاتبع قرانه (۷۵/۱۸) جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اسی کو سنا کرو) اور پھر اسی طرح پڑھا کرو۔ اس آیت سے واضح ہے کہ صرف خیال دل میں نہیں ڈالا جاتا تھا بلکہ حضور کو کسی زبان میں وحی سنائی جاتی تھی اور پھر حضور اس وحی کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔ سورۃ الدخان میں ارشاد ہوتا ہے۔ فانما یسرنه بلسانک لعلهم یذکرون (۴۵/۵۸)۔ تو ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ نیز آیت (۲۶/۱۹۶، ۱۴/۴) ملاحظہ ہوں۔ البتہ زمانہ حاضرہ کی مشہور تفسیر ''تدبر قرآن'' نے ہمارے ہی موقف کی تائید کی ہے اور تحریر فرمایا ''ہمارے نزدیک ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ وحی مجرد فکر کی شکل میں دل پر القاء ہوتی ہے جس کو الفاظ کا جامہ پیغمبر پہناتا ہے''۔ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ ''تدبر قرآن'' نے سابقہ اہل روایات مفسرین کے برخلاف اہل قرآن مفسرین کے موقف کی تائید کی ہے۔

تیسری صورت وحی کی او یرسل رسولا فیوحیٰ باذنه ما یشاء ہے۔ اس میں ہمارے مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ کے حکم کے مطابق رسول کے دل پر القاء کرتا تھا۔

دوسری صورت کو چھوڑ کر جس پر سب کو اتفاق ہے، پہلی اور تیسری صورت جو ہمارے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں وہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ جس کی یہ دو وجوہات ہیں۔

(۱) مفسرین کرام نے جو تفسیر کی ہے اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت کو صرف انبیاء کرام کو وحی ملنے کے طریقوں تک محدود کر لیا ہے۔ حالانکہ اس میں پوری انسانیت کو وحی ملنے کے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر مفسرین کرام کی اس تفسیر کو درست خیال کر لیا جائے تو باقی انسانیت کو وحی کس طرح ملتی تھی؟ آیت کی تفسیر میں پوری نوع انسانی کو احاطہ میں لینا ہے کیونکہ

آیت کے الفاظ وما کان لبشر ہیں۔ اگر یہاں صرف انبیاء کا ذکر ہوتا تو وما کان لنبی آنا چاہئے تھا اور اس صورت میں یہ تفسیر درست ہوتی۔ لیکن ما کان لبشر کے الفاظ کے ساتھ یہ تفسیر درست نہیں ہے۔ یہ بہت واضح اور بین سقم ہے۔ جس کی وجہ سے یہ تفسیر درست نہیں ہوسکتی۔

(۲) مفسرین کی تفسیر کے مطابق دوسری قسم میں صرف آواز ماننا اور تیسری قسم میں جبرئیل کی معرفت وحی آنا تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق تو قرآن صرف جبرئیل کے ذریعے آیا ہے فانہ نزلہ علی قلبک (۲/۹۷)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی جب بھی آتی جبرئیل کے ذریعے آتی ہے۔ اس کے لئے کوئی تیسری قسم جو وحیاء اور من وراء حجاب سے الگ ہو، درست نہیں ہے۔

(۳) جب یہاں رسول کے معنی بخوبی لگ سکتے ہیں، تو فرشتہ معنی لینا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ جب کوئی لفظ اپنے اصلی معنے میں استعمال ہوسکتا ہے تو وہ ہی معنے اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس آیت میں رسول کے معنے فرشتہ کرنے کے لئے دور دور کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ اپنا ذاتی مفہوم لینے کے لئے کھینچ تان کرنا ہے۔ قریبی معنے چھوڑ کر بعید معنے لینا مناسب نہیں ہے۔

(۴) کلام الٰہی کی یہ تیسری قسم یعنی بذریعہ فرشتہ ارسال کرنا تو خود ہی وحیا میں داخل ہے، اس کا الگ ذکر کرنا، بیکار ہے۔

سابقہ مفسرین کرام کی تفسیر میں یہ چار ایسے واضح نقائص ہیں جن کی وجہ سے یہ تفسیر درست تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ حالانکہ وہ سب اس تفسیر میں متفق ہیں۔ لیکن ان سب کا اس پر اتفاق کر لینا حجت نہیں ہے۔ اب اس کا درست مفہوم غور اور توجہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں پوری نوع انسانی تک اللہ کی ہدایت موصول ہونے کا ذکر ہو رہا ہے۔ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ تمام نوع انسانی، جیسا کہ آیت کریمہ سے ظاہر ہے فلنسئلن الذین ارسل الیھم و فلنسئلن المرسلین

(۷/۶)' (پھر ہم ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے تھے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے)۔ سورۃ شوریٰ کی مذکورہ آیت کے پہلے حصہ میں رسولوں کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کی ہدایت کس طرح پہنچتی تھی۔

رسولوں کو ہدایت ملنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک وہ دحی جو جبرئیل لاتے تھے جیسا کہ حضور پر وحی آتی تھی یعنی جبرئیل کے ذریعے سے جس کی بابت ارشاد ہوتا ہے۔ فانہ نزلہ علیٰ قلبک (۲/۹۷)۔ دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہ راست۔ اس طریقہ سے کہ آواز تو سنائی دے لیکن متکلم دکھائی نہ دے جیسا کہ حضرت موسیٰ کی طرف وحی ہوتی تھی اور جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔

یہ مذکورہ بالا دونوں طریقے انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے۔

اب رہے وہ تمام لوگ جن پر تمام بنی نوع بشر مشتمل ہے اور جو رسول نہیں ہیں تو ان کے ساتھ کلام خداوندی کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا رسول روانہ کرتا تھا اور اس رسول کی معرفت اپنا کلام عام انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ یہ رسول ان کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تو رسول کے علاوہ کسی بھی بشر سے بات نہیں کرتا تھا اور وحی الٰہی یعنی ہدایت خداوندی انسانوں میں صرف انبیاء کرام کی طرف آتی تھی۔ رسولوں کے علاوہ عام انسانوں کو خدا کی وحی صرف انبیاء کرام کی معرفت ملتی تھی۔

اس آیت کریمہ میں دو نکات مزید قابل غور ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ قرآن نے لبشر کا لفظ استعمال کر کے یہ واضح کر دیا کہ انبیاء کرام بھی بشر ہی ہوتے تھے ان کی کوئی الگ نوع یا جنس نہیں ہوتی تھی۔

(۲) دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے کلام کرے سوائے ان طریقوں کے۔ یعنی انسان خدا سے کلام نہیں کر سکتا' خدا انسان سے کلام کرتا تھا اور اس میں بہت فرق ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ تصوف کے زیر اثر یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ عبادت و

ریاضت کے ذریعے انسان اپنی سعی وکوشش سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ سے کلام کر سکے اس آیت نے اس نظریہ کی جڑ کاٹ دی اور واضح کر دیا کہ کلام خداوندی سے مشرف وسربلند وسرفراز ہونے کے لئے انسان کو قطعاً کوئی اختیار و دخل نہیں' اس سے الہام' القاء' کشف ورویا' سب کی تردید ہو جاتی ہے اور یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک آیت سے تصوف کی ساری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ یہ آیہ کریمہ قرآن کریم کی مشکل آیات میں شمار ہوتی ہے اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے سخت غور کی متقاضی ہے۔ حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ اس کو عام فہم انداز میں اپنے قارئین کرام کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ وحی موصول ہونے کی دوسری صورت میں مفسرین کا زیادہ تر اتفاق ہے اور ہمارا بھی یہی موقف ہے۔ وحی موصول ہونے کی پہلی صورت کے متعلق جو مفسرین نے تحریر فرمایا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے اور ہمیں بھی اسی بناء پر اس سے اختلاف ہے۔ البتہ تفاسیر میں سے ''تدبر قرآن'' ہمارے ہم خیال ہے تیسری صورت میں ہمارا خیال پھر بالکل منفرد رہ جاتا ہے۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس تشریح پر غور فرمائیں اور اس ہیچ مدان کو اپنے غور وفکر سے مطلع فرمائیں۔ یہ ایک باہمی اجتماعی کوشش ہے اور اس میں اپنے غور وتفحص میں دوسروں کو شریک کرنا فائدہ مند ہوگا۔

ان ارید الا الا صلاح ما استطعت (۱۱/۸۸)۔

جہاں تک مجھ سے بن پڑے میں تو اصلاح کے علاوہ اور کچھ چاہتا ہی نہیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند غور طلب سوالات

موقر اخبار ''دی نیوز'' میں فکر انگیز مضامین طبع ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر فرخ سلیم صاحب کے مضامین کثرت سے آتے ہیں۔ جن میں ان کا موضوع عموماً اسلام کے متعلق ہوتا ہے۔ مورخہ ۱۶ مارچ کے اسی اخبار میں پروفیسر ڈاکٹر انوار الحق صاحب کا ایک مراسلہ طبع ہوا ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ انہیں ڈاکٹر فرخ سلیم صاحب کے اس مضمون سے اتفاق ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب قرآن کو چھوڑنا ہے ان کے اپنے الفاظ میں:

Because they have abandoned the Quran.

ڈاکٹر فرخ سلیم صاحب اور ڈاکٹر انوار الحق صاحب نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب قرآن کریم کو چھوڑنا ہے تو ہمارے علماء کرام اور تمام مذہبی طبقوں کا بھی یہی خیال ہے کہ قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کو زوال ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا فقرہ ہے جسے آپ بکثرت سنتے ہوں گے۔ لیکن اصل سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن کو چھوڑنے سے مسلمانوں کو زوال ہوا ہے۔ اس بات سے تو ہم میں سے ۹۰ فیصدی مسلمان اتفاق کرتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ آخر مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ کیوں دیا۔ ایک ایسی کتاب جو قوم کو عروج دینے کی خود بھی مدعی ہے اور جس نے صدر اول میں مسلمانوں کو عروج و اقتدار دیا بھی۔ جس کتاب پر عمل کرنے کے نتائج ہم نے خود دیکھ لئے پھر آخر ایسی کتاب کو مسلمانوں نے کیوں چھوڑا اور اس کو پھر دوبارہ پکڑنے میں کیا رکاوٹ ہے۔ جب ہر شخص کو مسلمانوں کے زوال کا سبب معلوم ہے تو اس کتاب کو دوبارہ

کیوں نہیں پکڑ لیتے نیز یہ بات بھی خیال میں رکھیں کہ ہمارا پڑوسی ملک چین بھی تقریباً ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا ہےاس نے اس درجہ ترقی کی ہےان کے پاس تو قرآن نہیں تھا۔انہوں نے اس درجہ ترقی کیسے کر لی یہ تین سوالات (۱) کہ مسلمانوں نے قرآن کو کیوں چھوڑا (۲) اب اس کے پکڑنے میں کیا رکاوٹ ہےاور (۳) چین نے بغیر قرآن پکڑے کیسے ترقی کر لی۔نہایت قابل غور ہیں۔کوشش کی جائے گی کہ ان سوالات کا جواب اس مضمون میں قارئین کے پیش خدمتِ عالی کیا جائے۔

جہاں تک قرآن چھوڑنے کے شکوہ کا تعلق ہےتو آپ ملاحظہ فرمائیں گے بظاہر ہماری زندگی میں قرآن کریم ہمارا دن رات کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مذہبی اجتماعات' روزے' نمازیں' تراویح' عید میلا دالنبی' اعتکاف' رائے ونڈ میں سالانہ اجتماع کے علاوہ سال بھر بیان اور گشت' مجالس عزا' شبرات' بائیس رجب کے کونڈے' ہزاروں تعداد میں دینی مدارس''علماء کرام'' کے غول کے غول' صوفیائے کرام کی فوج کی فوج' عمرے' حج' حدود آرڈیننس' اس پر مزید یہ کہ جس قدر بھی ٹی۔وی چینلز ہیں ان سب میں مذہب کا پرچار' استخارہ' نجوم' روحانی علاج''الف''۔''آغاز''۔''آج اور اسلام'' اور اس قسم کے بے شمار پروگرام جو مذہب کے متعلق ہوتے رہتے ہیں آپ کتابوں کی بڑی بڑی دوکانوں میں داخل ہوں زیادہ تر لٹریچر آپ کو مذہب اور خصوصاً تصوف پر نظر آئے گا۔ جتنے ماہوار رسالہ جات جاری ہیں ان میں زیادہ تر مذہبی ہیں اب تو شاید ہی کوئی ادبی رسالہ نکلتا ہوگا۔کسی زمانہ میں شاہد احمد دہلوی کا 'ساقی' صلاح الدین احمد کا 'ادبی دنیا'۔محمد طفیل کا سویرا اور ادب لطیف' کئی ماہوار رسالے ادب کے متعلق نکلتے تھے۔ہماری سیاسی جماعتوں میں بھی بیشتر مذہبی لوگ نمایاں ہیں' اسی وجہ سے دوصوبوں میں''علماء کرام'' کی حکومت قائم ہے۔جن علماء کرام کو رائے ونڈ تک کا کرایہ نصیب نہیں ہوتا تھا' وہ آج ۵ سٹار ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں۔نئی نسل کے نوجوان زیادہ تر مذہب گزیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد یہاں پاکستان میں بھی نوجوان ہروقت تسبیح ہاتھ میں لئے پھرتے تھے۔یہی حال اس زمانہ میں

فوجی افسران کا تھا جس پر مرحوم علامہ احسان الٰہی ظہیر نے فرمایا تھا کہ جب جرنیل تسبیحوں کے اورادو وظائف میں مصروف رہیں گے تو کیا میدان جنگ میں علماء کرام جا کرلڑیں گے۔ پھر محکمہ اوقاف نے قوم کی یہ 'خدمت' کی اور اس کی یہ ''برکت'' ہے کہ جو پرانے اور بوسیدہ مزارات اور قبریں گر رہی تھیں ان کو لیپ پوت کے پھر محفوظ کر دیا تا کہ محکمہ کی آمدنی میں کمی واقع نہ ہو۔ سالانہ عرس جو معمولی طریقے پر منعقد ہوتے تھے اب ان پر بڑے بڑے وزراء چراغاں کرتے ہیں۔ داتا صاحب میاں میر صاحب اور شاہ جمال صاحب کے عرس پر خود گورنر صاحب تشریف لاتے ہیں۔

جو چند امور تحریر کئے گئے ہیں وہ سب ایسے ہیں جن میں ہمارے علماء کرام اور مذہبی حضرات Believe کرتے ہیں اور ان کو ثواب کا باعث سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ جاری بھی ہیں۔ ان سب رسوم کے ہوتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ البتہ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ سب مسلمان تہجد و اشراق کی نمازیں بھی ادا کریں۔ ہر ماہ پندرہ روز اعتکاف میں رہیں اور صرف پندرہ روز دنیاوی کاروبار میں گذاریں۔ نیچے کرتے اور اونچے اونچے پاجامے پہنیں۔ نماز میں خضوع و خشوع زیادہ کریں۔ تمام ٹی۔ وی چینلز بند کر دیں۔ عورتوں کو لحافوں میں لپیٹ کر گھر کی چار دیواری میں بند کر کے دروازوں پر تالا لگا دیں تو پھر یقیناً مسلمان قرآن کو پکڑ بھی لیں گے اور انشاء اللہ ترقی بھی خوب کریں گے۔ لیکن ہم میں جو لوگ عمر رسیدہ ہیں وہ خوب اندازہ کرتے ہوں گے کہ گذشتہ بیس سال میں ہمارے ہاں جس قدر مذہب کا فروغ ہوا ہے۔ اسی قدر معاشرہ میں مصائب و نوائب کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ جن مندرجہ بالا رسومات کی ادائیگی میں جس قدر انہماک کر رہا ہے اسی قدر ہم قرآن کو چھوڑتے جا رہے ہیں اور قرآن کو چھوڑنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے ان مذہبی رسومات کو قرآن پر عمل کرنا سمجھ لیا ہے۔

قرآن کریم کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن کریم اپنے کو بطور ایک آئیڈیالوجی یا دین کے پیش کرتا ہے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ہر آئیڈیالوجی یا نظام ایک اکائی ہوتا ہے اور اس

کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔ جب ایک آئیڈیالوجی یا نظام پر مکمل عمل ہوگا وہ نتائج دے گی۔ لیکن اگر اس پر جزوی عمل ہوگا یا اس میں اپنے نظریات کا اضافہ کر دیا جائے گا تو اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ افتومنون ببعض الکتٰب و تکفرون ببعض فما جزاء ومن یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوٰۃ الدنیا و یوم القیمٰہ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)۔ تو پھر کیا تم (کتاب خدا کی) بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں گے ان کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو اور قیامت کے دن بڑے سخت عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ یاایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعو اخطوٰت الشیطٰن انہ لکم عدو مبین (۲/۲۰۸)۔ ایمان والو تم سب کے سب ایک بار اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ تمہارا یقینی ظاہر بظاہر دشمن ہے۔ ان اور اسی قبیل کی دوسری آیات بینات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ جب تک قرآن کریم پر بطور ایک نظام یا منظم آئیڈیالوجی یا ضابطۂ حیات کے عمل کیا جائے گا' اس کا نتیجہ سرفرازی و سربلندی ہوگا لیکن جب اس کے ایک حصہ کو تسلیم اور دوسرے حصہ کو مسترد کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خزی فی الحیوٰۃ الدنیا' دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب ہوگا۔ آخرت کا تو اس وقت علم نہیں' لیکن دنیا میں جو رسوائی ہمیں مل رہی ہے' اس سے قرآن کریم نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ صدر اول میں مسلمانوں نے قرآن کریم کو دین کی حیثیت سے قائم (Establish) کیا۔ اس کے نتائج ان کے سامنے آ گئے لیکن ہماری بدقسمتی کہ ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے دین قائم نہیں رہ سکا اور قرآن کریم مذہب کی سطح پر آ گیا اور قرآن کی تعلیم کے دو حصہ کر دیئے گئے۔ دنیاوی امور سلاطین اور بادشاہوں کے حیطۂ اقتدار میں آ گئے اور باقی امور علماء کرام کے دائرہ اثر میں چلے گئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہم مسلمان قرآن کریم پر بطور مذہب کے عمل کر رہے ہیں اور جس دن دین' مذہب میں تبدیل ہوا وہ پہلا دن تھا جب مسلمانوں نے

قرآن کو چھوڑا تھا۔ اور اس کے بعد چونکہ قرآن پر بطور مذہب کے عمل ہو رہا ہے' اس لئے قرآن کے وعدے بھی پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ قرآن کے نتائج و ثمرات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے دوبارہ قرآن کو نہیں پکڑا۔ اب قرآن کو دوبارہ پکڑنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کو بطور دین کے جاری کیا جائے جو چیزیں آج ہم بطور مذہب کے کر رہے ہیں ان سب کو چھوڑ دیا جائے اور خالص قرآنی نظام پر عمل کیا جائے۔ جب تک ہم ان چیزوں کو قرآن کی تعلیم کے مطابق سمجھ کر' ان کو جاری رکھیں گے۔ اس وقت تک کبھی ترقی نہیں کر سکتے اور نہ قرآن کے قریب آ سکتے ہیں۔ قرآن کریم کو دوبارہ پکڑنے کا اور دنیا میں ترقی کرنے کا واحد حل اس کا نظام جاری کرنا ہے۔ ہمارا ایک ہزار سال کا لٹریچر جو تفاسیر' اصول تفاسیر' فقہ' اصول فقہ' تاریخ' حدیث' وغیرہ پر مشتمل ہے وہ سب مذہب کی ترویج و تبلیغ کرتا ہے اور دین کے تصور اور اس کی اہمیت کو محو کرتا ہے اس لئے اس کو بیک قلم مسترد کر دیا جائے۔ اس کے بجائے قرآن کریم کی وہ تفاسیر پڑھائی جائیں تو تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر تحریر کی گئی ہیں اور جو آج کے ذہن کو مطمئن کرتی ہیں اور جو اس دور کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ جن میں خارج از قرآن نظریات داخل ہو ہی نہیں سکتے اور یہ تفاسیر دین کا تصور اجاگر کرتی ہیں۔

اس کے برخلاف ہمارے علمائے کرام قرآن کو چھوڑنے کے معنے یہ لیتے ہیں کہ مسلمانوں نے عموماً عربی معاشرت کو ترک کر دیا اور انگریزی یا مقامی معاشرت اختیار کر لی ہے وہ اس کو قرآن چھوڑنا خیال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء کرام لباس و ماند و بود میں حد درجہ عربی کلچر کی پیروی ضروری سمجھتے ہیں۔ علماء کرام کے علاوہ ہم میں سے جس شخص میں بھی مذہبی رجحانات پیدا ہونے لگتے ہیں وہ فوراً اپنی تراش خراش' اسی معاشرت کے مطابق کرنے لگتا ہے۔ مذہبی طبقہ کی ایک الگ معاشرت ہے' جس کو ہماری عام تعلیم یافتہ نسل اختیار نہیں کرتی۔ ہمارا مذہبی طبقہ اس معاشرت کو اختیار نہ کرنے کو قرآن چھوڑنا سمجھتا ہے حالانکہ یہ قرآن چھوڑنا نہیں ہے بلکہ قرآن چھوڑنا اس کے نظام کو چھوڑنا ہے۔ اس کے نظام کو تشکیل نہ کرنا' اور اس کے خوشگوار ثمرات و

نتائج سے محروم ہونا ہی قرآن چھوڑنا ہے اور اس چھوڑنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے اللہ کی عبادت کو پرستش تک محدود کر دیا ہے حالانکہ قرآن کریم میں خدا کی عبادت کے معنے اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ولا یشرك بعبادت ربــــہ احــداً (۱۸/۱۱۰)۔ اور ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ لا یشـرك فـی حـکمـہ احداً (۱۸/۲۶)۔ وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ان الـحـکـم الا لـلــــہ (۱۲/۴۰)۔ حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی۔ اسی کے فوری ساتھ فرمایا۔ امـــــر الا تعبدوا الا ایاہ (۱۲/۴۰)۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت ومحکومیت اختیار نہ کرو۔ آپ غور فرمائیں کہ کس طرح تصریف آیات سے محکومیت اور عبادت ایک دوسرے کے ہم معنے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس موضوع کے ثبوت کے لئے متعدد آیات کریمات ہیں جن کے حوالے سابقہ مضامین میں دیئے جا چکے ہیں۔ یہاں بار بار یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہے اور اللہ کی اطاعت براہ راست نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کی اطاعت اس کی حکومت کی فرمانبرداری کرنے سے ہوتی ہے۔ اس طرح حکومت خداوندی کی اطاعت کرنے سے اللہ کے وہ سارے وعدے پورے ہو جاتے ہیں جو اس نے ہم مسلمانوں سے غلبہ و اقتدار حاصل ہونے کے کر رکھے ہیں کیونکہ اللہ کے وعدے اس کے نظام کی معرفت ہی پورے ہوتے ہیں۔ جب تک ہم مسلمان یہ نظریہ اختیار کر کے قرآن پر عمل نہیں کریں گے، ہم قرآن کو چھوڑے رکھیں گے۔

قرآن کریم کو چھوڑنے کی وجہ اور اس کو دوبارہ پکڑنے کا طریقہ کی وضاحت کے بعد اب یہ غور کرنا ہے کہ چین نے قرآن کریم پیش نظر نہ رکھنے کے باوجود کیسے ترقی کر لی؟ قرآن کریم عقل انسانی کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ اس کی حد درجہ تعریف وتوصیف کرتا ہے۔ لیکن عقل انسانی جو ضابطۂ حیات تشکیل دیتی ہے ایک تو وہ پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نہیں ہوسکتا وہ صرف

اس قوم کو ترقی دیتا ہے جس قوم نے اس کو اپنے لئے وضع کیا ہے اور وہ قوم دوسری اقوام کی سلب و نہب کو جائز سمجھتی ہے جبکہ وحی الٰہی کا عطا کردہ ضابطہ پوری انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ قرآن کریم وہ واحد کتاب ہے جس کا تخاطب پوری انسانیت سے ہے۔ اس کے ثمرات و خوشگوار نتائج سے ساری انسانیت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عقل انسانی کا طریقہ Trial & Error کا ہوتا ہے۔ وہ مختلف ضوابط بناتی ہے اور توڑتی رہتی ہے۔ جبکہ وحی الٰہی کا ضابطہ غلط نظریات سے مبرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی عقل کے وضع کردہ ضابطے پائیدار نہیں ہوتے۔ ایک دو صدیاں گذار کے ناکام ہو جاتے ہیں۔ وحی الٰہی کا ضابطہ پائیدار ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایک جیسے اور دائمی نتائج دیتا ہے۔ توتی اکلھا کل حین باذن ربھا (۱۴/۲۵)۔ قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں، ہر وقت پھل دیئے جاتا ہے۔ بشرطیکہ خالص اس ضابطہ پر عمل کیا جائے۔ اگر اس ضابطہ میں اپنے خیالات کی آمیزش کی، تو اس کا نتیجہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہے۔

چین میں خالص عقلی بنیادوں پر بنے ہوئے ضابطہ پر عمل کیا گیا۔ وہ کامیاب ہو گئے۔ ہم نے وحی اللہ کے عطا کردہ ضابطہ میں اپنے نظریات داخل کئے، اس لئے ہم ناکام ہوئے۔ اگر ہم اس میں اپنے نظریات داخل نہ کرتے تو ہم کامیاب بھی ہوتے اور ہمارا نظام ساری انسانیت کو محیط ہوتا اور سرمدی و دائمی ہوتا۔ جو نظریات ہم نے داخل کئے آپ ان کو ملاحظہ فرمائیں یہ وہ نظریات ہیں جو ہمارے زوال کا باعث ہیں اور ان کی عدم موجودگی چین والوں کی ترقی کا باعث ہے۔ ہمارے ہاں ان کی موجودگی اور چین میں ان کی عدم موجودگی کو ساتھ ساتھ ملاحظہ کرتے چلیں۔

ہمیں تصوف دیمک Termile کی طرح چاٹ گیا۔ تصوف کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ عقل انسانی سے حاصل کردہ علوم قابل بھروسہ نہیں ہوتے۔ اس لئے تصوف عقل انسانی کی حد درجہ تنقیص و تضحیک کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے عالم تصور میں حاصل کیا جائے۔ قرآن کریم نے کائنات کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بالحق پیدا کیا

ہے۔خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق ان فی ذلک لاٰیۃ للمومنین (۴۴/۲۹)۔ اللہ نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے یوں ہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔تخلیق کائنات ایک نہایت اہم کام ہے۔لیکن تصوف کے نزدیک اس ساری کائنات کا وجود ہی نہیں ہے۔ جب کائنات کا وجود ہی نہیں ہے' تو اس میں Scientific Discoveries سائنسی اکتشافات کیسے ہوں گے۔اسی وجہ سے مسلمان سائنس میں بالکل پیچھے رہ گئے۔تصوف کا انداز کائنات کی طرف بالکل Negative (منفی) ہوتا ہے اور اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان دنیا سے بیزار رہتا ہے اور اس کے معاملات سے بے نیاز (Indifferent) ہو جاتا ہے۔ ہمارا مذہبی یا تصوف زدہ طبقہ یہ خیال کرتا ہے کہ کائنات کو تسخیر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت میں فرق آ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جب چاند پر پہلی مرتبہ انسان نے قدم رکھا یا جب Mount Everest کی چوٹی پر آدمی پہنچا' تو ہمارے ہاں پاکستان میں ان مہمات پر پہلے تو یقین ہی نہیں کیا گیا لیکن جب یہ خبر یقین کی حد تک پہنچ گئی تو اس کو بالکل Appreciate نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کو کسی درجہ سراہا گیا۔ جب پوری قوم کا کائنات کے متعلق یہ انداز ہو تو وہ قوم سائنس میں کیا اقدامات لے سکتی ہے۔آج مسلمان سائنسی علوم میں جس درجہ پیچھے ہیں' اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے برخلاف چین والوں نے سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی پر حد درجہ قابو کیا اور یہ موجودہ مقام سائنس اور ٹیکنالوجی کے قابو کرنے کی وجہ سے حاصل کیا۔ اس کے برخلاف سائنس اور ٹیکنالوجی کی پسماندگی نے مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ یہ ایک Factor ہی کسی قوم کی تباہی و بربادی کے لئے کافی ہے۔

ہر ملک میں خواتین کی آبادی تقریباً نصف کے قریب ہوتی ہے۔جس معاشرہ میں کمانے والے افراد (Earning Members) زیادہ ہوں گے ظاہر ہے کہ وہ معاشرہ زیادہ ترقی پذیر ہوگا۔ ہمارے ہاں ملک کی نصف آبادی جو خواتین پر مشتمل ہے۔ان میں سے زیادہ تر بیکار کر دی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ تمام علماء کرام' اولیاء عظام' صوفیاء' پیر' فقیہ' (مترفین) ملک کی

ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیتے اس کے برخلاف چین کی آبادی میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ وہ کام جن میں جسمانی محنت و مشقت درکار ہوتی ہے ان میں بھی وہ مردوں کے پیچھے نہیں ہیں کیونکہ بچپن سے ان کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ مردوں کی طرح محنت و مشقت کے کام کر سکیں۔ چین میں تقریباً ۸۰ فیصدی آبادی کمانے والے افراد پر مشتمل ہے۔

جاگیرداری کی لعنت ہمارے ہاں موجود ہے۔ اس لعنت کی وجہ سے دولت کی تقسیم انصاف پر مبنی نہیں ہوسکتی۔ مزدور کے لئے زندگی گذارنا مشکل ہوتی ہے اور جاگیروار اور زمیندار اس کی محنت کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ دولت کی افراط انہیں محنت کی عادت سے محروم کر دیتی ہے اور وہ اپنی دولت کی بناء پر سیاسی زندگیاں اختیار کرتے ہیں۔ سیاست میں آ کر وہ ساری عمر ملک میں بدامنی، افراتفری پھیلاتے رہتے ہیں۔ چین میں جاگیرداری یا زمینداری کی لعنت کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہر شخص کام کرتا ہے اور سیاست میں وہ لوگ آتے ہیں جن میں سیاست کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ Grass Roots سے سیاست شروع کر کے، بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ دولت کے زور پر یا آبائی تعلقات کی بنا پر سیاست میں نہیں آتے۔

ہمارے ہاں فرقہ بندی نے ہمیں تباہ کیا اور جس قدر مذہب کا غلبہ بڑھتا جارہا ہے فرقہ بندی کو بھی فروغ ہوتا جارہا ہے۔ چین میں مذہب نہ ہونے کی وجہ سے فرقہ بندی کی لعنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرقہ بندی کا عنوان اور اس کے نقصانات اس درجہ کہ اس کے لئے بہت کچھ تحریر کیا جاچکا ہے۔ چین اس کے تمام نقصانات سے محفوظ ہے۔

چین کی ترقی میں سب سے زیادہ اہم سبب ان کا اپنی آئیڈیالوجی سے اخلاص Devotion، اور وہاں کے لیڈروں کا اس پر عمل کرنا ہے۔ ہم تقریباً ۵۸ سال سے اپنے ملک کے لئے اپنی آئیڈیالوجی کو ہی طے (Definite) نہیں کر سکے۔ عوام جن کی اکثریت مذہبی طبقہ پر مشتمل ہے اس کے نزدیک پاکستان کی آئیڈیالوجی اسلام اور عملاً اسلامی حکومت ہے اور ان کے

خیال کی رو سے پاکستان اسی لئے وجود میں آیا تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم کیا جائے لیکن اس کے برخلاف ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اور پورا Intellegentia یہاں سیکولر حکومت کا خواہشمند ہے۔ ٹی۔وی کی مختلف چینلز پر کثرت سے اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے۔ ہر بار ہر پروگرام میں آپ کو یہ نظریاتی اختلاف نمایاں طور پر محسوس ہوگا ان چینلز پر بھی یہ پروگرام تقریباً دس سال سے ہو رہے ہیں لیکن نتیجہ آج تک کوئی نہیں نکلا۔ دونوں طرح کے نظریات کے حامل افراد اپنی اپنی رائے پر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں جب کہ ملک کے سامنے نہ کوئی آئیڈیالوجی ہو نہ کسی آئیڈیالوجی پر عمل کرنے والے مخلص لیڈر ملک کیسے ترقی کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس چین کی ایک واضح آئیڈیالوجی موجود ہے۔ خواہ وہ درست ہو یا غلط اس کے لیڈر اس سے مخلص ہیں اور اسی وجہ سے وہ آئیڈیالوجی اپنے نتائج برآمد کر رہی ہے جو ہمارے اور ساری دنیا کے لوگوں کے سامنے رونما ہو رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کو چھوڑنے کا مطلب ہمارے علماء کرام کے نزدیک ایک خاص وضع کی معاشرت کو چھوڑنا اور نماز روزے اور دیگر رسومات کو ترک کرنا ہے۔ ان کے نزدیک جمعہ کی تعطیل ٹی۔وی چینلز پر اذان دینا وغیرہ بہت اہم ہیں۔ حالانکہ قرآن کو چھوڑنے کا اصل مفہوم قرآن کے نظام کو چھوڑنا ہے اور قرآن کو دوبارہ پکڑنے کا مفہوم بھی اس کے نظام کو دوبارہ جاری کرنا ہے۔ اب یہ سوال کہ مسلمان قرآن کو دوبارہ کیوں نہیں پکڑ لیتے' اس کا عملی مفہوم یہی ہے کہ اس کا نظام دوبارہ کیوں جاری نہیں کرتے۔ اس کے نظام کو دوبارہ جاری نہ کرنے کا سبب یہی ہے کہ ہمارے علماء کرام کے سامنے نظام کا تصور ہی نہیں ہے اور جو چند تحریکات یہاں اسلامی نظام کی داعی ہیں وہ بھی مذہب کے زیر اثر اسلامی نظام کی دعوت قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں دے رہی ہیں۔ قرآن کے نزدیک تو اسلامی نظام کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے لیکن ہمارے علمائے کرام نیز یہ قرآنی نظام کی داعی تحریکات سب اللہ کی اطاعت کے لئے قرآنی نظام کو ضروری قرار نہیں دیتی بلکہ قرآن بوجہ حدیث کی انفرادی اطاعت کو ہی عبادت خداوندی قرار دیتی ہیں۔ اس

خلافِ قرآن عقیدہ کی موجودگی میں نہ قرآنی نظام قائم ہوسکتا ہے نہ ہی مسلمان قرآن کو دوبارہ پکڑ سکتے ہیں۔

دو سوالات کا جواب تو آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ چین کی ترقی کے اسباب بھی آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ ان کا بھی اصل سبب آئیڈیالوجی کا واضح ہونا اور ان کے لیڈروں کا اس آئیڈیالوجی سے اخلاص ہے۔ تبعاً وضمناً عرض ہے کہ ہمارے برصغیر میں جب انگریزوں نے یہاں اپنے Tentacles پھیلانے شروع کئے تو ۱۸۵۷ء کے وقت میں ہمارے برصغیر پاک و ہند، بنگلہ دیش کی مجموعی آبادی ۲۰ کروڑ تھی جبکہ اس وقت انگلستان کی آبادی صرف ایک کروڑ تھی۔ لارڈ کلایو (Lord Clive) کے پاس انگریزی سپاہی صرف ۱۲۰۰ تھے۔ باقی یہاں کے ہی سپاہیوں کو وہ استعمال کرتا تھا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کا اخلاص و Devotion ہی تھا۔

ان فی ذلک لعبرۃ لا ولی الابصار (۳/۱۳)۔

بے شک آنکھ والوں کے واسطے اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین کے اجزاء اسلامی مملکت کی بنیاد ہوتے ہیں

قرآن کریم کو انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے مسائل کا اور کوئی حل موجود نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ ایک ضروری بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ابتداء آفرینش سے آج تک انسانی عقل نے رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ ذہن انسانی ابدی حقائق کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لایا ہے اور ان سے بتدریج مانوس و واقف ہوا ہے۔ اگر وہ حقائق انقلابی طور پر بیک وقت نمودار ہو جائیں تو وہ انقلابی نظریات کہلاتے ہیں اور عام ذہن ان کا عادی نہیں ہوتا۔ وہ نظریات اپنے زمانہ کی سطح سے بہت بلند ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے تو وہ انقلابی ہوتے ہیں۔ اگر وہ نظریات اپنے زمانہ کی سطح کے مطابق ہوں تو پھر وہ انقلابی کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے انقلابی نظریات قبل از وقت ہوتے ہیں۔ اس زمانہ کا انسان ان کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہوتی ہے کہ ذہن انسانیت کو تعلیم و تربیت کے ذریعے بلند لیا جائے۔ جس درجہ ذہن انسانی بلند ہوتا جائے گا اسی نسبت سے وہ انقلابی نظریات کو اپناتا چلا جائے گا۔ قرآن کریم اپنے وقت سے بہت پہلے نازل ہوا ہے اور اس دور کی علمی سطح اس درجہ پست تھی کہ وہ اسے قبول ہی نہیں کر سکی۔ ہمارے ہاں حضور ﷺ کی سیرت پر بہت کام ہوا ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کے تمام گوشے زیر نظر آئے۔ لیکن حضور ﷺ کی سیرت کا یہ پہلو نہایت ہی قابل مدح و لائق صد توصیف ہے کہ یہ صرف حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ آپ کی رات دن کی انتھک محنت و کوشش اور آپ کی انسانیت سے غم گساری ہی تھی کہ آپ نے اس قدر عظیم اور ہمہ گیر

انقلاب اس دور میں برپا کر دیا کہ جس کے لئے اس دور کی انسانیت بالکل تیار و آمادہ ہی نہیں تھی۔ اس دور میں اس کے برپا ہونے سے کم سے کم اتنا تو ثبوت مل گیا کہ یہ انقلاب اور ضابطۂ حیات اس دور میں بھی قابل عمل تھا اور آج بھی قابل عمل ہے۔ یہ تو پھر اس دور کی بات ہے۔ آج جب کہ ذہن انسانیت بہت بلند ہو گیا ہے ہم مسلمان آج بھی قرآن کریم کی خالص تعلیم کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں جو جماعتیں توہم پرستی پر مبنی عقائد کو رواج دے رہی ہیں وہ عوام میں مقبول ہوتی جا رہی ہیں اور جو خالص قرآنی نظریات کی داعی جماعتیں ہیں وہ کسی طرح بھی عوام میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ اس کی واضح مثال ہمارے ہاں تصوف اور تبلیغی جماعت کی ہے۔ جو ہمارے سامنے وجود میں آئی اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں کی تعداد میں پھیل گئی۔ اس کے برخلاف قرآنی نظریات کی حامل تحریکیں بہت ہی آہستہ آہستہ اثر و رسوخ حاصل کر رہی ہیں۔ آپ اس تجربہ کو بحیثیت ایک Barometer کے خیال فرمائیں کہ جو تحریک جس قدر قرآنی نظریات کے قریب ہوگی، وہ عوام میں اسی قدر مشکل سے پاؤں جما سکے گی۔

قرآن کریم نے اس دور میں ارشاد فرمایا کہ وما خلقنا السمٰوٰت والارض وفیھما باطلاً (۳۸/۲)۔ ہم نے زمین و آسمان کو باطل پیدا نہیں کیا، یہ سلبی بیان تھا اسی کو اصرار کے ساتھ ایجابی طور پر بیان فرمایا کہ خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق و لتجزیٰ کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون (۴۵/۲۲)۔ اور اللہ نے سارے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے۔ اور ان پر ظلم نہ کیا جائے۔ اس آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ کائنات کا مقصد تخلیق یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے۔ اس دنیا میں صرف وہ معاشرہ قائم رہ سکتا ہے جو کائنات کی تخلیق کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوگا اور ہر وہ معاشرہ جو کائنات کی تخلیق کے مقاصد کے خلاف ہوگا، وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال اس کشتی کی ہوگی جو دریا کے دھارے کے خلاف چل رہی ہے۔ قرآن کریم نے معاشرہ کی تعمیر کے لئے جو اساسی اصول اور مستقل اقدار فراہم کی

ہیں وہ کائنات کی تخلیق کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ہی ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں صرف وہ معاشرہ پائیدار ہوگا جس میں علاوہ دیگر مستقل اقدار کے یہ دو اقدار لازمی طور پر جاری ہوں کہ ہر شخص کو اس کا بدلہ مل جائے اور کسی فرد پر بھی کوئی ظلم نہ ہو۔ جو معاشرہ باطل کی بنیادوں پر استوار ہوگا وہ زیادہ دیر ۔ ۔ چل سکتا۔ زیادہ دیر صرف وہ معاشرہ چلے گا جو حق کی بنیاد یعنی مستقل اقدار پر قائم ہو گا۔ آپ ان بنیادوں کو ملاحظہ فرمائیں پھر آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ معاشرہ کی یہ بنیادیں کس درجہ قبل از وقت تھیں اور کیوں وہ معاشرہ قائم نہیں رہ سکا۔

(۱) نظام کائنات کی یکسانیت' اس کے قوانین کی عالم گیریت اور توحید خداوندی کا لازمی نتیجہ وحدت مخلوق ہے۔ اس اعتبار سے ساری مخلوق ایک عالم گیر برادری ہے جس میں حدود و قیود کی تقسیم غیر فطری اور نقصان رساں ہے۔

(۲) چونکہ اللہ تعالیٰ ہی خالق و رب ہے' اس لئے انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے اور حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۳) چونکہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور رزق کی ذمہ داری اس پر ہے (۱۱/۶) اس لئے رزق فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر لیتا ہے۔

(۴) روحانی یا مقدس ہستی ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت شعبدہ یا کرامت ہونا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ حضورﷺ کا یہ اعلان کہ وہ تمام انسانوں جیسے انسان تھے۔ خصوصی امتیاز صرف یہ تھا کہ انہیں وحی ملتی تھی اور جب وہ اپنی وحی دوسروں کو پہنچا دیتے تھے' پھر وہ بالکل عام بشر ہو جاتے تھے اور ان میں پھر وہی عام انسانوں جیسے احساسات ہوتے تھے' اور کوئی مافوق الفطرت قوت نہیں ہوتی تھی' یہ نظریہ اپنے دور سے بہت قبل از وقت تھا اور حق پر مبنی معاشرہ کی ایک اہم شق۔

(۵) کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ رزق کے دروازے تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں (۵۶/۷۳)۔

(۶) ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)۔بقا اسی کے لئے ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔ یہ قرآن کریم کا ایک محکم اور بنیادی اصول ہے۔ کسی خاص جماعت' خاص پارٹی' خاص گروہ' خاص ملک' خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش' حتی کہ اس میں مسلم و غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

(۷) نوع انسانی کی ربوبیت سے ہر فرد کی اپنی تربیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم ایک ایسی مملکت قائم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمینی کی مظہر ہوتی ہے اور جس میں دوسروں کی ذات کی تکمیل کرنے سے اپنی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اصل مقصد انسانی ذات کا ارتقاء ہوتا ہے جو ربوبیت عامہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور مجموعی طور پر زندگی ترقی کرتی جاتی ہے۔

اسلامی مملکت کی یہ وہ اساسات تھیں جو وقت سے پیشتر و بلند ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل نہیں کر سکیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد دین کے اجزاء پر ہوتی ہے۔ دین کے یہ اجزاء محکم' ابدی' سرمدی میں اور ان کو آیہ کریمہ (۲/۱۷۷) میں مفصل بیان کر دیا ہے یہ اللہ' رسل' ملائکہ' کتب اور آخرت پر ایمان ہے۔ ان پر ایمان ہی اس وجہ سے لاتے ہیں کہ جب ہم ان اجزاء ایمان کو روبہ عمل لاتے ہیں' تو ان پر ہی اسلامی ریاست کا قیام ہوتا ہے۔ ان اجزاء میں سب سے پہلا جز ایمان باللہ اور خالص توحید ہے۔ خدا پر ایمان سے عملی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس عطا کردہ وحی پر ایمان لایا جائے اور وحی الٰہی کے احکام و قوانین کے مطابق معاشرہ قائم کیا جائے۔ یاایہا الذین آمنوا کے عملی معنے یہ ہیں کہ اے وہ لوگوں جو اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ ہم اس بات پر ایمان لائے ہیں کہ اللہ کے عطا کردہ نظام سے بہتر کوئی اور نظام نہیں ہے۔ محض اللہ تعالیٰ کو معبود مان لینا اور اس کو خارجی کائنات کا خالق' مالک و حاکم قرار دینا کافی نہیں ہے۔ اس پر ایمان لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے عطا کردہ نظام کو عملاً اس دنیا میں رائج کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ایک ذات ہے اور انسان بھی ایک ذات ہے۔ انسان کی ذات خدا کی عطا

فرمودہ ہے ذات خداوندی کا جز و نہیں ہے۔ کیونکہ ذات تقسیم نہیں ہو سکتی۔ خدا کی ذات چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ہوتی ہے اس لئے اس کی صفات بھی مکمل ترین اور اعلیٰ ترین ہیں قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو اسماء الحسنیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ انسانی ذات اللہ کی ذات کے مقابلہ میں فروتر اور محدود ہے لیکن اس میں تمام صفات خداوندی موجود ہوتی ہیں سوائے ان صفات کے جو خدا کی لامحدودیت اور ابدیت سے متعلق ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو اپنے اندر اجاگر کرے کہ یہی زندگی کا مقصود ہے۔ اسلامی حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے قوانین کو صفات الٰہی کی اساس پر قائم کرے۔ اسلامی حکومت، صفات الٰہی یا دوسرے الفاظ میں مستقل اقدار کو نافذ کرتی ہے۔ چونکہ انسان ان قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے جو صفات الٰہی پر قائم ہوتی ہیں اس لئے ان کی اطاعت سے انسان کی ذات از خود نشوونما حاصل کرتی چلی جاتی ہے۔ غیر اسلامی حکومت میں یہ بات نہیں ہو سکتی۔ عملی طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رب العالمینی ہے۔ اسلامی حکومت کے قوانین اس صفت سے متصف ہوں گے۔ زکوٰۃ، صدقات، عشر، خیرات، ایثار، احسان وغیرہ چونکہ اس مملکت کے قوانین ربوبیت پر قائم ہوں گے، اس لئے اس مملکت کے شہری اس صفت کو بروئے کار لا رہے ہوں گے۔ اس لئے ان میں یہ صفت خود مشہود ہوتی جا رہی ہوگی، اس کے برخلاف غیر اسلامی حکومت جس میں سب قوانین ربا پر منحصر ہوں گے وہاں کے عوام ربا پر موقوف قوانین کی پیروی کریں گے تو ان میں صفت ربوبیت پرورش نہیں پائے گی۔ اسلامی حکومت میں صفات خداوندی شہریوں میں از خود اجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے اس کا قیام ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ طاغوتی حکومت میں ذات انسانی روز بروز اضمحلال پذیر ہوتی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اس لئے بھی قدم قدم پر اطاعت خداوندی ہوتی چلی جاتی ہے۔ آپ گھر سے برآمد ہوئے، آپ نے اپنی کار کو ٹریفک سگنل پر روکا، اسلامی حکومت میں آپ کا ٹریفک سگنل پر رکنا ''اللہ و رسول'' کی

اطاعت ہوگا۔ اسی مثال کے ذریعے آپ سمجھ لیں کہ اسلامی حکومت میں قدم قدم پر آپ اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں جبکہ طاغوتی نظام میں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے اور آپ رات دن معصیت و عصیان الٰہی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔ ان دو مثالوں سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ایمان باللہ یا توحید الٰہی کس طرح اسلامی حکومت کی اساس قرار پاتے ہیں۔

جب بھی چند افراد زندگی کا ایک نصب العین مقرر کر لیتے ہیں تو ان میں نصب العین کے اشتراک کی وجہ سے آپس میں باہم محبت' مودت و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نام وحدت فکر و خیال ہے۔ اب اسی اصول کو آپ وسیع کرتے چلے جائیں۔ جب دنیا کے تمام افراد انسانیہ ایک ہی نصب العین مقرر کر کے' اس کے حصول کی کوشش کریں گے' تو توحید کا لازمی نتیجہ وحدت انسانیت ہوگا۔ اس کے علاوہ وحدت انسانیت کے حصول کا دوسرا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دین کے اجزاء میں سے اس پہلے جز پر ایمان لانے سے ساری دنیا کے انسان ایک امتہ واحدہ بن جاتے ہیں۔ خطہ زمین پر خود ہی لکیریں کھینچ کر آپس میں افتراق انشقاق پیدا کرنا اور ایک دوسرے کا دشمن بن کے ایک دوسرے کو ہلاک کرنا' اس جز پر ایمان لانے سے ختم ہو جاتا ہے۔

توحید پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت خاص اللہ تعالیٰ کے لئے' مختص ہو جاتی ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کی حکومت جائز نہیں رہتی۔ توحید کا نظریہ اسلامی حکومت میں کس طرح روبہ عمل ہوتا ہے' یہ اہم نکتہ مضمون کے آخر میں آتا ہے۔

دین کا دوسرا جز جس پر ہم ایمان لاتے ہیں رسالت یا نبوت ہوتا ہے۔ نبوت کے معنے خدا کی طرف سے وحی کا علم حاصل ہونا ہے۔ نبی اس علم کو حاصل کر کے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے' اس کے اس منصب کو رسالت کہا جاتا ہے۔ یعنی نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کی دو اطراف یا دو جہتیں ہیں۔ ہر رسول نبی ہوتا تھا اور ہر نبی رسول۔ قرآن کریم کی رو سے ہر نبی اور رسول کو کتاب ملی تھی۔ رسول کا فریضہ وحی خداوندی کو صرف دوسروں تک پہنچانا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اس وحی خداوندی کے مطابق معاشرہ کو عملاً متشکل کرتا تھا۔

اسے نظام خداوندی یا اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا عملی پہلو ہی تھا کہ حضورﷺ نے یہ نظام اپنی حیات مبارکہ کے دوران قائم فرمایا۔ حضورﷺ کے بعد یہی نظام خلافت راشدہ میں قائم رہا۔ اسے ہمیشہ قائم رہنا چاہئے تھا اور اب بھی ہم سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہم اس کو قائم کریں۔ دین کے اس جز کا عملی تقاضہ ہے کہ ہم اس نظام کو قائم کریں۔ یہ دوسرا جز اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اس نظام کو قائم کریں اور اسی وجہ سے وہ اسلامی حکومت کی اساس بنتا ہے۔

ابتداء آفرینش سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ انبیاء کرام اپنی اپنی قوم کی طرف تشریف لاتے اور وحی کے مطابق معاشرہ قائم فرماتے۔ اگر ان کی قوم ان کو اس طرح کا معاشرہ قائم کرنے میں مزاحم ہوتی تو وہ اس مقام سے ہجرت کرتے اور ایسے مقام پر تشریف لے جاتے کہ جہاں وہ اس قسم کا معاشرہ قائم کر کے اس میں اللہ تعالیٰ کے قوانین جاری کر سکتے۔ رسالت پر ایمان کا مفہوم ہی یہ ہے کہ ہم بھی رسول کی عطا کردہ وحی کے مطابق معاشرہ قائم کریں اور اس طرح دین کا یہ دوسرا جز یعنی ایمان بالرسل اسلامی حکومت کی اساس قرار پاتا ہے۔

زندگی جب انسانی پیکر میں آئی تو یہ حیوانی سطح کی تین جبلتیں یعنی افزائش نسل اپنی حفاظت اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا اپنے ساتھ لائی۔ حیوانی سطح تک تو ان جبلتوں پر فطرت کا کنٹرول تھا جو حیوانات میں از خود موجود تھا۔ وہ اس کنٹرول کے باہر نکل ہی نہیں سکتا لیکن انسانی زندگی میں یہ کنٹرول نہیں رہا۔ اب انسان آزاد ہے جو جی میں آئے کرے۔ حیوان کے پاس تو دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ محض اس کی جسمانی طاقت تھی۔ لیکن انسان کے پاس تو مہلک ترین ہتھیار ہیں اور جس قدر انسان ترقی کرتا جارہا ہے اس کے ہتھیاروں کی ہلاکت میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ جب اس قدر قوت مہیا ہو اور پابندیاں کوئی نہ ہوں تو دنیا کا کیا حال ہوگا۔ اس کے لئے کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ اس کا گواہ ہے۔ ہلاکت و تباہی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ جاری فرمایا اور کتابوں پر ایمان لانا ہمارے دین کے اجزاء میں شامل فرمایا۔ اب انسان اس بات کا

پابند ہے کہ وہ وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق اپنا معاشرہ قائم کرے اور اس کے عطا کردہ قوانین واحکامات کو اپنے معاشرہ میں جاری کرے کہ یہی دین ہے۔

قرآن کریم نے آیہ کریمہ ولا یدینون دین الحق (۹/۲۹)(ترجمہ)(اور نہ ہی سچے دین کو اختیار کرتے ہیں)۔ میں دین کے ساتھ حق کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور حق کے معنے کسی چیز کا اس طرح موجود و واقع ہونا اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے ہے۔ حق کے بنیادی معنی میں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت ثابتہ بن کر آنا' لازمی شرط ہے۔ قرآن کریم نے دین کے ساتھ حق کا لفظ استعمال فرما کر یہ بات واضح کر دی کہ دین کوئی تصوراتی' ذہنی یا ذاتی احساسات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جو خارج میں واقع ہوتی ہے اور عملی طور پر معاشرہ میں اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

آج دنیا جن مصائب ومشکلات سے دوچار ہے اس کا ایک بڑا سبب دین و دنیا کو مختلف دو دوائر میں تقسیم کرنا اور سیاست کو مستقل اقدار سے آزاد کرانا ہے۔ یہ دین و دنیا کی تقسیم مذہب میں تو چل سکتی ہے۔ دین میں یہ دخل نہیں پا سکتی۔ مذہب تو خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی' عمرانی' سیاسی' معاشی' معاشرتی' زندگی سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ہر مذہب کا پیرو (Follower) اپنے خیال کے مطابق' اپنے اپنے طور پر ہر جگہ قائم کر سکتا ہے اور بس یہاں یہی مذہب کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس دین کا تصور یہ ہے کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے۔ یہ زندگی کا ایک ضابطۂ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی سب پر محیط ہے اور اسی وجہ سے اس میں دین ودنیا(Church and State) کی تفریق نہیں ہوسکتی۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہے۔

الذین ینقضون عهدالله من بعد میثاقه و یقطعون ما انزالله ان یوصل و یفسدون فی الارض اولک هم الخسرون (۲/۲۷)۔ جو خدا سے

باندھے ہوئے عہد کو توڑ دیتے ہیں جنہیں خدا نے باہمی ملانے کا حکم دیا ہے ان کے ٹکڑے کر دیتے ہیں وہ اس طرح ملک میں فساد پھیلاتے ہیں۔ جو احکام الٰہی کی اطاعت (محکومیت) کا عہد و میثاق کر کے پھر اسے توڑ دیتے ہیں' اس عہد سے پھر جاتے ہیں اور جن عناصر و اجزاء یعنی مذاہب و سیاست کو ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے' ان کو قطع کرنے میں بیباک ہیں اور اپنی سرکشیوں سے ملک میں فساد پھیلاتے ہیں' یہ لوگ بہت ہی نقصان میں ہیں۔

عہد اللہ درحقیقت احکام خداوندی کی اطاعت کرنے کا دوسرا نام ہے ایک شخص جب خدا کی کتاب پر ایمان لاتا ہے تو وہ اس امر کا عہد کرتا ہے کہ وہ اس کے ہر اس حکم کی اطاعت کرے گا جو اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے لوگوں کے حقوق درہم برہم کرنا فساد ہے (۸۵/۷) صالح نظام کو درہم برہم کرنا فساد ہے (۳۴/۲۷) ارتکاب جرائم کرنا فساد ہے (۱۲/۷۳)۔ اس کی علاوہ بھی بہت سے امور فساد کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ فساد کی ان خصائص و نظائر کے پیش نظر آیت بالا کی رو سے دنیاوی اور دینی امور کو الگ الگ کر دینا بھی فساد میں ہی شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو دنیاوی اور دینی دونوں امور کو کتاب الٰہی کے تابع کیا ہے۔ جو امر بھی کتاب الٰہی کی اتباع سے نکل گیا' وہ باعث فساد ہے۔ جب تمام امور کتاب الٰہی کے اتباع میں آ گئے تو پھر دین و دنیا کی تفریق از خود ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح کتاب پر ایمان اسلامی مملکت کی بنیاد بن جاتا ہے۔

دین کا چوتھا جز ملائکہ پر ایمان ہے۔ ملائکہ کا عقیدہ گذشتہ امتوں میں ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں انسانی ذہن نے افراط و تفریط کی ہے' بعینہٖ یہی شکل ملائکہ کی رہی ہے۔ ان کے متعلق عجیب و غریب تصورات اختیار کئے گئے تھے۔ قرآن کریم نے ان خودساختہ عقائد کو الگ کر کے' ملائکہ کی حقیقت تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔ اس مضمون کا موضوع چونکہ ملائکہ نہیں ہے اس لئے اس مضمون میں صرف ملائکہ پر ایمان اور اس کا اسلامی حکومت کی بنیاد بننا' بیان کیا جائے گا۔ جن حضرات کو ملائکہ کے مضمون سے دلچسپی ہو وہ راقم

سطور کا مضمون ''ملائکہ کی حقیقت'' ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے سابقہ تفسیر بالروایات کے لٹریچر میں بھی ملائکہ کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اسکا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اس سارے لٹریچر کا دارومدار روایات پر ہے اور ان روایات میں دو نمایاں سقم ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں دوسرے وہ روایات اپنے دور کی ذہنی سطح کے مطابق وضع کی گئی تھیں' اس لئے وہ تمام تر توہم پرستی علمی کم مائیگی پر مبنی ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ملائکہ کا ایک معیار بیان فرمایا گیا ہے کہ ملائکہ دکھائی نہیں دے سکتے لـم تـروھا لیکن ہماری تفاسیر میں ملائکہ کو مرئی قرار دیا گیا ہے۔ خصوصاً کلبی کی روایت اس بارے میں بہت مشہور ہے۔

قرآن کریم کے مطابق ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو اس کارگہ کائنات کو مشیتِ خداوندی کے مطابق چلا رہی ہیں اور نظام کائنات کو اس طرح چلانے کا نام قرآن کریم نے ''تدبیر امور'' کی اصطلاح سے بیان فرمایا ہے چونکہ یہ تدبیر امور ملائکہ کر رہے ہیں اس لئے ملائکہ کو فالمدبرات امـراً (۷۹/۵) بھی فرمایا گیا ہے۔ کائنات کی ان تمام قوتوں (Physical Forces) یعنی ملائکہ کو انسان اپنے تابع کر سکتا ہے اور یہی مفہوم آدم کے سجدہ کرنے سے ہے۔ جس قدر بھی سائنس نے آج تک ترقی کی' کائنات کی قوتیں یعنی ملائکہ مسخر ہوتے چلے گئے۔ ملائکہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا اور خارجی قوتوں کے مقام کا صحیح تعین کرے۔ گذشتہ زمانے میں انسان ہر مافوق الفطرت چیز سے ڈر کر اس کی پرستش کرنے لگ جاتا تھا۔ لیکن ملائکہ پر ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ ملائکہ انسان کے زیر نگیں ہیں اور ان کا یہی صحیح مقام ہے۔ مقام آدم یہ ہے کہ ان کو مسخر کرے۔ ان کی تسخیر سے انسانیت بے حد فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن تسخیر کائنات سے جو کچھ فوائد و منافع حاصل ہو رہے ہیں وہ غالب اقوام اپنے لئے مخصوص کر لیتی ہیں اور کمزور اقوام کو اس کے انتفاع سے محروم رکھتی ہیں۔ لیکن اسلامی مملکت کا یہ کام ہے کہ تسخیر کائنات کے ماحصل کو پوری نوع انسانی کے لئے کھلا رکھے اور اس کو مستقل اقدار کے مطابق پوری انسانیت کے درمیان تقسیم کرے

تا کہ پوری انسانیت اس سے فائدہ اٹھاتی رہے اور اس طرح ملائکہ پر ایمان اسلامی حکومت کی ایک بنیاد بن جاتا ہے۔

صدرِ مضمون میں آیۂ کریمہ تحریر کی گئی تھی ولتجزی کل نفس بما کسبت (۴۵/۲۲)۔ تا کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ مل جائے۔ جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں اعمال کا بدلہ فوری طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص زہر کھاتا ہے تو فوری اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو زہر کھانے کا بدلہ فوری مل گیا۔ لیکن یہ صورت اخلاقی ضابطہ یا مستقل اقدار کے سلسلہ میں پیدا نہیں ہوتی۔ جو شخص حرام مال کھاتا ہے اس کے اثرات نفس پر مرتب ہو جاتے ہیں۔ یہ اثرات ملائکہ مرتب کرتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں جان سکتے کہ ملائکہ ان اثرات کو انسانی دنیا میں کس طرح روبہ عمل لاتے ہیں اور ملائکہ اس بارے میں کیا Part Play کرتے ہیں اور انسانی ذات حرام کھانے سے کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بات ابھی انسانی ذہن سے ماوراء ہے' اور انسانی حیطۂ ادراک سے باہر ہے' لیکن سائنس کی اور خصوصاً علم نفسیات (سائیکلوجی) کی ترقی کے بعد' یہ بات بھی' انسان کے علم میں آ جائے گی۔

چونکہ نفس انسانی پر جو بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ ملائکہ کرتے ہیں' اس لئے اطاعت خداوندی اور معصیت خداوندی کی جو سزا و جزا ملتی ہے وہ ملائکہ کے ذریعے ہی ملتی ہے۔ ملائکہ پر ایمان لائے بغیر سزا و جزا کا تصور باطل ہو جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت سے جیسا کہ سابقہ میں تحریر کیا گیا ہے' از خود متواتر و مسلسل جزا یا سزا کے اثرات نفس انسانی پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اسلامی حکومت کی اطاعت یا نافرمانی کرے گا تو اس کے اثرات ملائکہ مرتب کریں گے اور اس طرح ملائکہ پر ایمان لانا اسلامی حکومت کی اساس یا اس کی بنیاد بن جاتا ہے۔

جرم و سزا کا مسئلہ بھی بڑا غور طلب اور گہری فکر کا متقاضی ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کا اس مضمون سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے تاہم یہ مسئلہ اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ جب ایک

آدمی چوری کرتا ہے تو اس کے دو اثرات واقع ہوتے ہیں۔ایک تو اس نے معاشرہ کے خلاف جرم کیا اور دوسرے اپنی ذات کے خلاف جرم کیا اور اس کی ذات پر ملائکہ نے برے اثرات مرتب کئے۔جس سے اس کی ذات میں اضمحلال پیدا ہوا۔معاشرہ نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس کو ایک سال کے لئے قید کی سزا دے دی۔وہ ایک سال قید میں گذار کر معاشرہ میں پھر زندگی گذارنے کے قابل ہو گیا۔لیکن اس چوری سے جو اثرات اس کے نفس پر مرتب ہوئے تھے وہ ایک سال کی قید کی سزا سے دور نہیں ہوئے۔اللہ اور اس کے رسول کے ہاں وہ اسی طرح جوابدہ ہے۔لیکن اگر یہ چوری اس نے اسلامی حکومت میں کی اور اس کو اسلامی قانون کے مطابق سزا ملی۔خواہ وہ قید ہو یا جرمانہ۔شرط یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے وہ سزا جاری ہو تو اس کے مکمل ہونے کے بعد اس کی ذات کے برے اثرات بھی دور ہو جائیں گے۔کیونکہ اس نے اسلامی حکومت کی سزا کو برداشت کیا اور اسلامی حکومت کی اطاعت کی ہے۔

اجزاء ایمان کا آخری جز قیامت پر ایمان لانا ہے یعنی ایمان بالآخرۃ یہ اس مضمون کی آخری کڑی ہے اور جزئیات ایمان کے سلسلہ کی بھی آخری کڑی ہے۔اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ایمان باللہ اور آخری کڑی ہے ایمان بالآخرت۔ایمان باللہ کا عملی مفہوم تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مستقل، ابدی، اقدار و قوانین کی صداقت پر محکم یقین اور ان کا اسلامی حکومت میں جاری کرنا ہے اور ایمان بالآخرۃ کا عملی مفہوم ہے اسلامی حکومت میں جاری کردہ اصول و قوانین و احکامات پر عمل کرنے کے حیات آور ثمرات اور ان کے خلاف عمل کرنے کے نقصان دہ نتائج پر ایمان رکھنا۔قرآن کریم نے جو احکامات دیئے یا جو عبادات مقرر فرمائی ہیں ان کے نتائج صرف اس نظام میں ہی برآمد ہوتے ہیں بغیر نظام قائم کئے ان عبادات کے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔اسی لئے آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج وغیرہ جیسی عبادات ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔لیکن یہ کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔یہ دوسرا موضوع ہے۔یہ مختصر سا مضمون اس موضوع کا احاطہ نہیں کر سکتا۔آخرت میں یہاں کے

اعمال کے نتائج برآمد ہونا' اسلامی حکومت کی بنیاد ہے اگر آخرت میں نتائج برآمد ہونے پر ایمان نہ لایا جائے تو پھر تو اسلامی حکومت برپا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ آخرت میں نتائج برآمد ہونے کی وجہ سے' ایمان بالآخرہ' اسلامی حکومت کی بنیاد بن جاتا ہے۔

قرآن کریم کے بیان کردہ دین کے پانچ اجزاء کا بیان یہاں ختم ہوا لیکن ہم مسلمانوں میں والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ۔ یعنی خیر و شر سب اللہ کی طرف سے ہے' کا بھی اضافہ کیا جاتا ہے جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور اس طرح انسان کو تقدیر کا پابند اور مجبور محض بنا دیا جاتا ہے۔

مولوی محمد علی مرحوم نے راقم سطور سے فرمایا تھا کہ یہ ٹکڑا بے شک قرآن میں ایزاد و اضافہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلام بطور دین کے جاری تھا اس وقت اس کا درست مفہوم اخذ کیا جاتا ہوگا' اب جبکہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کا مفہوم بھی بدل دیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس وقت اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ خیر و شر کے سب پیمانے اللہ تعالیٰ کے ہی مقرر کردہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق خیر و شر روبہ عمل ہوتے ہیں۔

دین کے یہ پانچوں اجزاء آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ ہم سب مسلمان ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان اجزاء پر ایمان لانے کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اگرچہ مذہب میں ان کے نتائج بالکل برآمد نہیں ہو رہے ہیں جب ان کو بحیثیت دین روبہ عمل لائیں گے تو ان کے نتائج یقیناً برآمد ہوں گے۔

قارئین طلوع اسلام کو بخوبی علم ہے کہ ہمارے ہاں ایک ہزار سال سے سب لٹریچر بحیثیت مذہب کے تحریر کیا گیا ہے اور تقریباً اس سارے لٹریچر میں دین کی ایک رمق بھی خوردبین لگا کر دکھائی نہیں دیتی۔ جب حالات یہ ہوں تو ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں ان سب اجزاء ایمان کو بھی محض بحیثیت مذہب کے ہی سمجھا بھی گیا اور اسی طرح ان پر عمل بھی کیا گیا۔ لیکن آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان اجزاء کو بحیثیت دین کے پیش کیا جائے۔ ان پانچوں اجزاء پر بحیثیت

دین الگ الگ مبسوط مضامین تحریر کیے جائیں۔ تحریر کرنے والے کے لئے سابقہ اور موجودہ لٹریچر میں اس کے لئے کوئی مواد دستیاب نہیں ہوگا۔ اسے خود ہی اس معاملہ میں سخت محنت کرنی ہوگی۔ اور محنت بھی بہت زیادہ درکار ہوگی۔ یہ کام صرف وہی شخص کرسکتا ہے (۱) جس کے سامنے دین کا تصور بالکل واضح ہو (۲) جسے دین کے قیام کی تڑپ رات دن بے قرار کئے ہوئے ہو (۳) اور سب سے زیادہ یہ کہ اس میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ اس موضوع سے (Full Justice) نبھا سکے۔ جو شخص بھی یہ کام کرے گا وہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے گا۔

وهنا تم منا الكلام

على مصطفنا الوف سلم

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین میں اطاعت کا مرجع زندہ اتھارٹی ہوتی ہے

جس دور میں قرآن کریم نازل ہوا' ساری انسانیت میں دین کا تصور دور دور تک کسی جگہ بھی نہیں تھا۔ ہر جگہ ''مذہب'' کا دور دورہ تھا۔ قرآن کریم وہ باعظمت کتاب ہے کہ جس نے اس دور کی انسانیت کو ''دین'' کے تصور سے روشناس کرایا۔ مذہب کا مقصد صرف خدا کی پرستش (Worship) ہوتا ہے جو کسی بھی عبادت گاہ میں کی جاسکتی ہے۔ مذہب اللہ تعالیٰ اور انسان کے مابین ذاتی' نجی' پرسنل تعلق کا نام ہے۔ اس کو انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مذہب میں ہر شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت اپنے اپنے طریقہ اور اپنے اپنے انداز سے کرسکتا ہے۔ لیکن دین کا تصور اس سے سراسر مختلف ہوتا ہے۔ اس تصور کے مطابق دین انسان کی ساری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ اس میں خدا کی اطاعت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر اختلافات ہوں' ان سب کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسی وقت ہوسکتی ہے جب کوئی ایسی زندہ اتھارٹی موجود ہو جہاں سے تمام امور کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کی رو سے کرایا جاسکتا ہو۔ اس کے لئے کسی حاکم' مقتدر اتھارٹی کی ضرورت لازمی ہے۔ مذہب میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت انفرادی طور پر ہوسکتی ہے لیکن دین میں اللہ کی اطاعت صرف اجتماعی طور پر ہوسکتی ہے۔ اسی لئے مذہب میں تو اطاعت کے لئے صرف قوانین یا خدا کی کتاب کافی ہوتی ہے' لیکن دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ایک زندہ' مرئی (Visible) شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت خود بھی کرتی ہے اور دوسروں سے بھی اس کی اطاعت کراتی ہے۔ یہ شخصیت اللہ کا رسول ہوتی تھی کیونکہ اسی کو وہ کتاب ملتی تھی اور اسی کے

ذریعے اس کتاب کا نظام قائم ہوتا تھا۔خود قرآن کریم نے اس طریقہ کو بیان بھی فرمایا ہے کہ مومنین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے احکامات سنتے ہیں اور پھر اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

وقالوا سمعنا واطعنا (۲/۲۸۵)۔

ان کی عملی زندگی کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ انہیں زندہ اتھارٹی سے جو حکم ملتا ہے اسے وہ دل کے کانوں سے سنتے ہیں اور دل کی گہرائیوں سے ان پر عمل کرتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ و انتم تسمعون (۸/۲۰)۔

تم اللہ ورسول کی اطاعت کرو اور اس کے احکام کو سن کر ان سے کبھی انحراف نہ کرو۔

یہاں بھی پہلے احکامات کو سننا شرط ہے پھر اس پر عمل پیرا ہونا ہوتا ہے۔ نیز ارشاد ہوتا ہے۔

فا تقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا و انفقوا خیرا لا نفسکم (۱۶/۶۴)۔

تو جہاں تک تم سے ہو سکے خدا سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو۔

یہاں بھی حکم پہلے احکامات کو سننے اور پھر ان پر عمل کرنے کا ہے۔ نیز یہاں تقویٰ کو 'سماعت'۔ 'اطاعت' اور 'انفاق' سے Define کیا ہے کہ تقویٰ سے مراد 'سماعت'۔'اطاعت' اور 'انفاق' ہے۔ سب میں پہلا درجہ 'سماعت' کا ہے اصرار و تشدید اس بات پر ہے کہ احکامات زندہ حاکم جاری کر رہا ہے۔سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔

و کیف تکفرون و انتم تتلیٰ علیکم ایت اللہ و فیکم رسولہ ومن یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراط مستقیم (۳/۱۰۱)۔

اے جماعت مومنین تم کس طرح کفر کی راہ اختیار کر سکتے ہو اس لئے کہ ایمان کے راستے

پر جمے رہنے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ قوانین خداوندی انسان کے سامنے ہوں اور دوسرے یہ کہ ان قوانین پر عملی طور پر چلانے کے لئے' ایک زندہ اتھارٹی موجود ہو اور یہ دونوں چیزیں تم میں موجود ہیں۔

حضورﷺ نے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین اپنی زندگی کے دوران ہی ہزاروں ہزار کوششیں کر کے' مدینہ منورہ میں عملاً متشکل کر کے دکھا دیا۔ نظام کو عملاً متشکل کرنے میں حضورﷺ کے ساتھ ساتھ ان کے چاند سے زیادہ روشن' اور سورج سے زیادہ درخشندہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین نے بھی بیش از بیش قربانیاں سرانجام دیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ نظام صرف حضورﷺ کی زندگی کے دورانیہ کے لئے ہی قائم کیا گیا ہو۔ یہ بات عقلاً محال ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ میں وفیکم رسولہ' سے مراد صرف حضورﷺ کی شخصیت یا حضورﷺ کی ذاتِ مبارک نہیں ہے بلکہ اس فیکم رسولہ' میں حضورﷺ کی ذات کے علاوہ حضورﷺ کے جانشین اور خلفاء بھی شامل ہیں۔ حضور کے بعد حضورﷺ کے خلفاء کو وہ ہی مقام حاصل ہے جو اس نظام میں حضور کا اپنا مقام تھا جس طرح اپنے دور میں حضور بحیثیت ایک زندہ اتھارٹی کے موجود تھے ان کے بعد ان کے خلفاء اس نظام میں بحیثیت زندہ اتھارٹی موجود ہوں گے اور ان کی سربراہی میں ہی وہ نظام آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ فلہٰذا جب تک تم میں قرآن اور قرآنی نظام چلانے والا باقی رہے گا تم گمراہ نہیں ہو گے۔ اسی طرح اعتصام باللہ سے عملاً مراد نظام خداوندی سے وابستہ رہنا ہے فرداً فرداً اللہ تعالیٰ کی عبادت اس سے مراد نہیں ہے۔ وفیکم رسولہ' کا یہ قرآنی مفہوم سمجھ لینے سے قرآن فہمی میں جو بے شمار الجھنیں اور اِشکال چلی آ رہی ہیں وہ خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔

جب تک قرآن کریم کا نظام قائم رہا رسول کا یہ مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے حکم الٰہی کی پیروی کرنے میں کسی قسم کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی لیکن جب وہ نظام ہی منقرض ہو گیا اور یہ نظام ملوکیت میں تبدیل ہو گیا تو رسول کا یہ صحیح مفہوم اذہان سے محو ہو گیا اور اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کی عملی شکل اختیار کرنے

میں سخت دشواری کا سامنا پیش آیا اور اس کے مختلف مفہوم اخذ کئے جانے لگے اور اس کا حل یہ سوچا گیا کہ اللہ کی اطاعت تو قرآن سے کر لی جائے اور رسول کی اطاعت احادیث کے ذریعے کر لی جائے اور عملاً رسول کا ترجمہ احادیث قرار دے دیا گیا لیکن خلافت راشدہ کے دور میں رسول اللہ کی احادیث کا کوئی مجموعہ موجود نہیں تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس وقت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کا قرآنی مفہوم ان کے سامنے تھا یعنی نظام خداوندی قائم تھا جس میں اس نظام کی اطاعت' خدا و رسول کی اطاعت کے قائم مقام تھی یعنی قرآن کریم کی اطاعت نظام اسلامی کے ذریعے۔

قرآن کریم ایک نظام' ایک ضابطۂ حیات کو عملاً جاری کرنے کا داعی اور متقاضی ہے۔ ماضی میں اس کے اس تقاضے کو اس درجہ محسوس نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے حیات چل رہے تھے اور انسانیت ان سے اگرچہ پوری طرح مطمئن نہیں تھی' تاہم ان سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھی۔ آج صورت حالات بالکل مختلف ہے کمیونزم ہماری نگاہوں کے سامنے ناکام ہوا۔ جمہوری ممالک جس باطنی اضطراب میں مبتلا ہیں' ہمیں تو اس کا اگرچہ صحیح احساس نہیں ہے لیکن وہاں کے مفکرین اس پر واویلا مچا رہے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی تہذیب کا زوال دیکھ رہے ہیں۔ خود مسلمان بھی زوال اور تباہی کے آخری درک پر کھڑے ہوئے ہیں۔ مسلمان اپنی تباہی کی وجہ سے پھر قرآن کے قریب آ رہے ہیں اور اس کو ضابطۂ حیات کے طور پر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام' بغیر کسی استثناء کے قرآن کریم کو بحیثیت دین کے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ بالکل ظاہر و باہر ہے۔ ان کو جو قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے وہ بحیثیت ''مذہب'' کے دی جاتی ہے۔ ہمارا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر قرآن کریم کو بحیثیت مذہب کے پیش کرتا ہے اور ہمارے علماء کرام اور فقہائے عظام کو وہ ہی لٹریچر پڑھایا جاتا ہے تو ظاہری بات ہے کہ ان کے سامنے قرآن بحیثیت مذہب کے ہی آتا ہے۔ اگرچہ زبانی دعویٰ ان کا دین کا ہی ہوتا ہے' لیکن ان کے سارے نظریات قرآن بحیثیت مذہب کے ہوتے ہیں۔ البتہ ہمارے ہاں وہ طبقہ جو ان دانشوروں اور مفکرین پر

مشتمل ہے جو قرآن کریم کا ازخود مطالعہ کر رہے ہیں اور علمائے کرام کے مقرر کردہ نصاب سے زیادہ متاثر بھی معلوم نہیں ہوتے۔ ان کے سامنے قرآن بحیثیت دین کے آتا تو ہے لیکن سابقہ نظریات سے وہ بھی سر مو انحراف نہیں کرتے۔ اس نکتہ کی وضاحت رسول اللہ کی اطاعت کا عملی طریقہ متعین کرنے سے ہو جاتی ہے۔ یا باندازِ دیگر دین میں اور مذہب میں حدیث کے مقام میں جو فرق ہے اس کو نمایاں کرنے سے ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس نکتہ میں ندرت اور نکارت ہے۔ اس لئے اس کے مفہوم کی تجدید کی جاتی ہے تاکہ یہ نکتہ دین میں مستقلاً محفوظ رہے۔

مذہب میں اللہ تعالیٰ اور انسان کا براہ راست تعلق ہوتا ہے جسے عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا لیکن دین میں اللہ کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر تنازعات اور جھگڑے پیدا ہوں' ان کا فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے کیا جاتا ہے۔ جس کے لئے ایک حکومت کا قیام لازمی وضروری ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مذہب میں ہر شخص اللہ کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے لیکن دین میں خدا کی اطاعت اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔ مذہب میں اطاعت کے لئے صرف قوانین کافی ہوتے ہیں لیکن دین میں اطاعت کے لئے ایک زندہ شخصیت ضروری ہوتی ہے۔ جس کے احکامات سن کران پر عمل کیا جاتا ہے۔ مذہب میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے قرآن وحدیث کی اطاعت کافی ہوتی ہے لیکن دین میں یہ کافی نہیں ہے' اس کے لئے مرکزی اتھارٹی لازمی چیز ہے۔ اس کی وضاحت زیرِ غور آیہ کریمہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد حضرت باری عزاسمہ ہے۔

> یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم' فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر و احسن تاویلا (۴/۵۹)۔

اے ایمان والوں اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی' اور صاحبان امر کی جو تم

میں سے ہوں۔ پھر اگر تم کسی چیز میں تنازعہ کرو تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اچھا اور متوازن طریقہ ہے۔

یہ آیت کریمہ بہت مشہور آیت ہے اور خصوصاً ہمارے دو فرقوں کے علمائے کرام کے لئے مناظرہ کا بہت دلچسپ عنوان ہے اور تیرہ سو سال سے مناظرے اور مجادلے کے باوجود اب تک مختلف فیہ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس آیت کریمہ کو درست طور پر سمجھنے سے ہی دین اور مذہب کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس درجہ جامع ہے کہ اس ایک ہی آیت میں اسلامی نظام کا پورا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے ''اطاعت اللہ و رسول'' یہ قرآن کریم کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور اس سے مراد اس نظام خداوندی کی اطاعت ہے جسے سب سے پہلے حضورﷺ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس نظام میں تمام جھگڑے حضورﷺ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ لیکن دور دراز کے مقامات کے سارے تنازعات ظاہر ہے کہ وہ حضورﷺ کے سامنے نہیں آ سکتے تھے وہ حکومت کے مقامی حکام' صاحبانِ امر کے سامنے پیش ہوتے تھے اور صاحبانِ امر ان کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان مقامی حکام کی اطاعت' مرکزی حکومت یا دوسرے الفاظ میں رسول اللہ کی اطاعت ہوتی تھی۔ لیکن یہ فرق ضرور تھا کہ مقامی حکام کے فیصلوں کے خلاف' مرکز میں اپیل ہو سکتی تھی کیونکہ اس بات کی اجازت تھی کہ فان تنازعتم فی شئی فردوہ' الی اللہ و الرسول۔ اگر تم میں اور **اولی الامر** (مقامی افسران) میں کوئی اختلاف ہو تو اس کو مرکز کی طرف لوٹا دو' وہاں سے جو فیصلہ ہو وہ حتمی فیصلہ ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نظام صرف حضورﷺ کی زندگی تک کے لئے نہیں تھا بلکہ اس کو آئندہ بھی چلنا تھا۔ سوال یہ ہے کہ حضور کے بعد تنازعات کا فیصلہ کس طرح کرایا جائے۔ یا دوسرے الفاظ میں **''رد الی اللہ و الرسول''** کا عملی طریقہ کیا ہے۔

ہمارے علمائے کرام کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ ''جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے اور اگر اس میں بھی نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے آداب

وشرائط جو نبی ﷺ کی تعلیم اور صحابہؓ کے تعامل سے معلوم ہوئے ہیں وہ اصول فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ایسے فطری اور عقلی ہیں کہ کسی معقول آدمی کے لئے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے''۔ نیز تحریر فرمایا گیا ہے کہ ''ظاہر ہے کہ حضور کی وفات کے بعد آپ کی سنت ہی ہے جو آپ کے قائم مقام ہو سکتی ہے''۔ (مشہور ومعرف تفسیر تدبر قرآن' جلد دوم' ص ۳۲۶)۔ یہ مذہب کی ترجمانی ہے' اور سب کا اس پر تیرہ سو سال سے اجماع ہے اور اس طرح اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ دین کا نقطہ نگاہ نہیں ہے کیونکہ کتابوں کی از خود اطاعت کرنا مذہب میں تو ممکن ہے دین میں ممکن نہیں ہے۔ دین میں جب کتاب اللہ کی اطاعت کرائی جاتی ہے تو اس کے لئے ایک محسوس شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

آگے چلنے سے پیشتر قارئین کرام سے ایک سوال نہایت عاجزی اور فروتنی سے کیا جاتا ہے۔ ''ردالی اللہ والرسول'' کے طریقہ کو قرآن کریم نے خیر واحسن تاویلا کہا ہے۔ آپ اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر نہایت دیانتداری سے ارشاد فرمائیں کہ کیا اس تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا کوئی تنازعہ بھی اس طرح کے ''ردالی اللہ والرسول'' سے طے پایا ہے۔ اندازہ تو یہ ہے کہ اس عرصۂ دراز میں مسلمانوں میں ہزاروں تنازعات پیدا ہوئے ہوں گے' لیکن ایک تنازعہ بھی اس طریقہ ردالی اللہ والرسول سے کبھی بھی طے نہیں پایا بلکہ ماشاءاللہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے تو پھر یہ طریقہ کیسے خیر و احسن تاویلا ہو سکتا ہے اور امور تو ایک طرف خود اس آیہ کریمہ کا ہی کوئی متفق علیہ مفہوم اس طریقہ کے ماتحت واضح نہیں ہو سکا اور آج تک امتِ مسلمہ کے دو فرقوں میں اس آیت کے درست مفہوم میں اتفاق نہیں ہو سکا ہے اور نہ ہی کبھی آئندہ ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم کو بحیثیت دین سامنے رکھئے تو آیت کریمہ کا مفہوم خود بخود واضح ہے۔

اے ایمان والو اس نظام کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے رسول اللہ نے قائم کیا ہے اور اس نظام کے مرکز کے مقرر کردہ نمائندگانِ حکومت (افسرانِ ماتحت) کی بھی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم میں اور ان ماتحت افسران میں کسی بات میں تنازعہ پیش

آ جائے تو اس کے مرکز کی طرف رجوع کرو۔ یعنی مقامی حکام کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کرو جو اس تنازعہ کا قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کروے گی۔ مرکزی اتھارٹی کے فیصلے کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔ اس کا فیصلہ حتمی' آخری اور فائنل ہوگا اور چونکہ وہ فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہوگا' جس پر تم ایمان رکھتے ہو' اس لئے اس فیصلہ کو بخوشی تسلیم کرو اور یہ روش نہایت عمدہ اور معاشرہ کا توازن رکھنے والی ہوگی۔

فان تنازعتم فی شئی میں ان تمام متنازعہ امور کا تذکرہ ہے جو مرکز کی طرف سے مقرر کردہ عمال کے خلاف عوام میں پیدا ہوں گے۔ خواہ عدلیہ' انتظامیہ' پانی' زراعت' صنعت' ریل' ڈاک' ریونیو' ٹیکسیز' کسی بھی محکمہ کے خلاف ہوں۔ ان کے ازالہ کے لئے مرکز ہی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت کریمہ سے سابقہ آیت نمبر ۵۸ میں ان تؤدوا الامنت الی اهلها و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل کے الفاظ میں مرکزی اتھارٹی کو تاکید کر دی گئی ہے کہ رشوت خور' بے ایمان' نااہل عمال عوام کے حکام نہ بننے پائیں اور نہ ہی نااہل افسران قاضی' جج' وغیرہ عہدوں پر متعین کئے جائیں۔

اس تاکید کے بعد آیت زیرغور نمبر ۵۹ میں عوام کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی سرکاری عاملوں' افسران اور قاضیوں کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہو' تو وہ مرکزی اتھارٹی کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اس مرکزی اتھارٹی کو ہر کسی کی شکایت بروقت سننے اور اس کا ازالہ کرنے کا حق ہوگا اور پھر ہر شخص کو اس فیصلہ کی اطاعت کرنی ضروری ہوگی۔ کیونکہ یہ اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی۔ اس قرآنی مرکز کی سب سے پہلی اتھارٹی رسول اللہ ﷺ خود تھے اور آپ کے بعد' آپ کے عالی مرتبہ' عالی مقام خلفاء کرامؓ یکے بعد دیگرے' اس مرکزی اتھارٹی کے حامل تھے۔

واضح رہے کہ محدثین کی جمع کردہ ظنی و مشکوک موضوع روایات پر عمل کرنے سے اللہ و رسول کی اطاعت ہرگز ہرگز نہیں ہوتی بلکہ قرآنی اسلامی حکومت کی اطاعت سے اللہ و رسول کی

اطاعت ہوتی ہے اسی لئے اس حکومت کا قیام از بسکہ ضروری' لازمی اور لابدی ہوتا ہے اسی لئے مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد' مکمل' اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو' وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی' نافرمان اور مجرم ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں اور خواہ کتنی ہی نعتیں رو رو کر پڑھتے ہوں' وہ خود بھی دھوکے میں مبتلاء ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطہ دے رہے ہیں۔

کیونکہ قرآن کریم کی رو سے اللہ ورسول کی اطاعت اسلامی نظام سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا قائم کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ اس موضوع پر رسالہ طلوع اسلام میں اس قدر مواد فراہم کردیا گیا ہے کہ اس کا یہاں بار بار اعادہ کرنا قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اگر کسی صاحب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تو راقم سطور کے مضامین سابقہ اشاعتوں میں ملاحظہ فرمالیں۔ البتہ یہاں صرف دو آیات اس مضمون کی درج کی جاتی ہیں۔ جن میں ان لوگوں کو سرزنش اور تنبیہہ کی جاتی ہے جو اسلامی نظام کے قیام کی کوشش نہیں کرتے اور جو غیر خداوندی نظام میں زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ان الذین توفهم الملئکة ظالمی انفسهم قالوا فیم کنتم قالوا
کنا مستضعفین فی الارض قالوا لم تکن ارض الله واسعة

فتھا جروا فیھا فاولئک ماوٰھم جھنم وساءت مصیرا (۴/۹۷)۔

وہ لوگ جو غیر خداوندی نظام کے تحت اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں اور اس طرح (طاغوت) کی اطاعت سے) اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں اگر اس حالت میں ان کو موت آ جائے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم غیر خداوندی نظام کی محکوی میں پڑے رہے۔ وہ کہیں گے کہ ہم پست' کمزور و ناتواں اور بے بس و معذور تھے ان سے کہا جائے گا کہ (یہ ٹھیک ہے کہ تم میں اتنی قوت نہیں تھی کہ تم وہاں باطل کا نظام بدل کر' نظام خداوندی قائم کر لیتے لیکن) خدا کی زمین اس قدر وسیع تھی کیا تم ہجرت کر کے کسی ایسے مقام کی طرف نہیں جا سکتے تھے جہاں نظام خداوندی قائم تھا یا جہاں کی فضا اس کے لئے سازگار تھی؟ یہ جو لوگ یوں اپنی کمزوری اور ناتوانی کا سہارا لے کر غیر خداوندی نظام کے تابع' قانع اور مطمئن ہو کر بیٹھے رہے' ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یہاں بھی جہنم کے لئے طاغوتی نظام کی غلامی میں رہے اور وہاں بھی جہنم میں۔ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہی نہیں ہوئی۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنیوالے کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ نیز دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وکذالک جعلنا فی کل قریۃ اکبر مجرمیھا لیمکروا فیھا وما یمکرون الا بانفسھم وما یشعرون (۶/۱۲۳)۔

اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے قصورداروں کو سردار بنایا تا کہ اس میں مکاری کیا کریں اور وہ لوگ جو کچھ بھی مکاری کرتے ہیں اپنے حق میں برا کرتے ہیں اور سمجھتے تک نہیں۔

قرآن کریم غیر خداوندی' طاغوت پر مبنی نظام کے عمائدین و لیڈروں کو ''اکابر مجرمین''

کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس آیہ کریمہ کی رو سے مجرم تو اس نظام کے تمام افراد ہوتے ہیں لیکن ان میں اکابر مجرمین اربابِ اقتدار ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم طاغوتی نظام کے لیڈروں اور عوام دونوں کو مجرم قرار دیتا ہے وہ عوام کو بری الذمہ نہیں ٹھہراتا۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم اندھوں کی طرح دوسروں کے پیچھے چلو۔ تم پر لازم تھا کہ تم اپنی سوچ اور سمجھ سے کام لیتے اور تباہی و بربادی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ ہو لیتے۔ ان لیڈروں کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی تم نے ہی ان کو لیڈر بنایا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ اور تم دونوں جہنم کے عذاب کے مستحق ہو۔ مختلف مقامات پر تمثیلی انداز میں قرآن کریم نے واضح طور پر فرمادیا ہے کہ طاغوت میں رہنے والے عوام اور لیڈر، مذہبی پیشوا اور اربابِ اقتدار سب جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اور آئندہ بھی جہنم ہی ان کا مقام ہوگا۔

یہاں مضمون کے اختصار کے پیش نظر صرف دو آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ اب چند ارشادات نبوی، اسلامی حکومت، امام کی اہمیت اور اطاعت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من اطاعنى فقد اطاع الله ومن اطاع الامام فقد اطاعنى. ومن عصا نى فقد عصى الله ومن عصى الامام فقد عصانى.

(بخاری۔ کتاب الاحکام)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔

عن ابی ذرقال قال رسول الله من فارق من الجماعة .... الخ.

ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو نظام جماعت سے بالشت بھر بھی ہٹا، اس نے درحقیقت اپنی گردن سے اسلام کا حلقہ اطاعت نکال پھینکا۔

من مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة الجاهلیه۔

(مسلم۔ باب الامر بلزوم الجماعۃ)

جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا قلادہ نہیں ہے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

صلوا خمسکم وصوموا شهر کم وادوا زکوة اموالکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنة ربکم۔

پانچ وقت نماز ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو' اپنے مالوں کی زکوٰۃ دیتے رہو اور اپنے صاحب امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہوں گے۔

مضمون ہذا میں آیاتِ قرآنی اور ارشادات نبوی سے یہ بات ثابت کی جا رہی ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کے لئے قرآن کریم کو بحیثیت ایک نظام' ایک ضابطۂ حیات کے متمکن کرنا لازمی وضروری ہے۔ اس نظام کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور اس نظام کا سربراہ' ایک زندہ اتھارٹی کی شکل میں موجود ہوتا ہے جس کے احکامات پہلے سنے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان پر عمل کیا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف روایتی نظریہ یہ چلا آ رہا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت قرآن اور روایات کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس کے لئے کسی حکومت' کسی مرکزی اتھارٹی' کسی زندہ سربراہ' کسی شخصیت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کتابوں کے ذریعے اطاعت کی جا سکتی ہے۔ یہ دو مختلف نظریات ہیں جس میں پہلا نظریہ یہ دین کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ دوسرا نظریہ مذہب کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن اس وقت حالات کے تقاضوں' اور وقت کے تھپیڑوں سے مجبور ہو کر مسلمان قرآن کو بحیثیت نظام اور دین کے متمکن تو کرنا چاہتے ہیں لیکن پھر اسی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ مذہب کو بحیثیت دین کے جاری کرنا چاہتے ہیں اور دین یا قرآن کے ضابطۂ حیات میں بھی اطاعت کا مرجع بجائے حکومت اسلامی کے قرآن و حدیث کو ہی اطاعت کا مرجع قرار دے رہے

ہیں لیکن اس میں خود تناقض و تضاد ہے۔ غیر اسلامی حکومتوں‘ جیسے ہندوستان‘ برطانیہ‘ فرانس وغیرہ ممالک میں بھی آپ قرآن وسنت کے ذریعے اطاعت خداوندی کر سکتے ہیں۔ وہاں قرآن وسنت پر عمل کرنے پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس لئے اب جو بھی اسلامی تحریک دین خداوندی بر پا کرنے کے لئے کھڑی ہو۔ اس کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ اطاعت کا مرجع حکومتِ اسلامی کو ہی قرار دیں‘ تب ہی قرآنی حکومت قائم ہوسکتی ہے۔ ورنہ انفرادی طور پر قرآن وحدیث کی اطاعت کرنے سے قرآنی نظام کبھی قائم نہیں ہوگا اور نہ ہی مسلمان اس موجودہ ذلت وخواری سے نکل سکیں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کا تو عروج و زوال ہی ان کے دین سے وابستہ ہے۔ اگر دین کو استحکام و عروج حاصل ہے تو مسلمان بھی صاحبِ اقتدار ہوں گے اور اگر ان کا دین ہی کمزور ہو اور عملاً موجود نہ ہو‘ تو پھر بھلا مسلمان کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ دین کا استحکام ہی مسلمانوں کو مستحکم کرتا ہے اور اسے یہ مقام عنایت کرتا ہے کہ

مومنِ بالائے بر بالا ترے
غیرتِ او سر نتابد ہم سَرے

اقبالؒ

مفہوم: انتم الاعلون کے مصداق‘ مومن ہر بالا سے بھی بالاتر ہوتا ہے مغلوب ہوکر رہنا تو ایک طرف اس کی غیرت تو کسی کی ہم سری بھی گوارا نہیں کرتی۔

وآخر دعوٰھم ان الحمد للہ رب العٰلمین (١٠/١٠)

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایڈیٹر 'ڈیلی ٹائمز' کے نام

ڈیلی ٹائمز پاکستان کا واحد انگریزی اخبار ہے جو لبرل ہونے کے علاوہ Leftist بھی ہے۔ اس کے اداریے بڑے معلومات افزا اور تعمیری تنقید پر منحصر ہوتے ہیں۔ مورخہ 7/12/05 کا اداریہ مذہبی دہشت گردی کے متعلق ہے اور خاص طور پر گلگت کی دہشت گردی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اداریہ سات پیراگرف پر مشتمل ہے اور اس قابل ہے کہ اس پورے اداریہ کا ترجمہ تحریر کیا جائے لیکن ترجمہ کرنا محنت طلب اور Time-Consuming ہوتا ہے۔ اس لئے اس پورے اداریہ کا ترجمہ تو درج نہیں کیا جاتا البتہ اس میں ایک فقرہ ایسا ہے جو تفصیلی تبصرہ کا متقاضی ہے۔ اس میں تحریر ہے۔

Islamic states tend to be Dectarian. Iran is overtly a Shia state where the Sunnis may find themselves discriminated against. The Sunni utopia created by Talban in Afghanistan was intensly Sectarian and anti-Shia.

اس کا آزاد ترجمہ یہ ہے۔

اسلامی حکومتوں کا رجحان فرقہ بندی کی طرف ہوتا ہے۔ ایران ظاہر بظاہر ایک شیعہ سٹیٹ ہے وہاں سنیوں سے امتیازی سلوک کیا جا سکتا ہے۔ سنیوں کی مثالی حکومت بھی جو طالبان نے افغانستان میں قائم کی تھی وہ بھی شدت سے فرقہ پسند اور شیعہ دشمن تھی۔

اس پوری مختصر سی تحریر میں صرف پہلا فقرہ کہ اسلامی حکومتیں فرقہ پسند ہوتی ہیں' قابل توجہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ کس طرح قرآن کریم کے درست نظریات سے ناواقف اور خلاف قرآن نظریات سے متاثر ہے وراس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مروجہ اسلام میں یہی نظریات عام ہیں' یہ حضرات چونکہ صرف مغربی علوم کے ماہر ہیں اور قرآن کریم پر براہ راست دسترس نہیں رکھتے' اس لئے ظاہر ہے کہ ان حضرات کی رسائی قرآن کی صحیح تعلیم تک نہیں ہوسکتی۔ ان کی حاصل کردہ تعلیم کے پیش نظر ان سے اس بات کی توقع کرنا بھی درست نہیں ہے۔ یہ ہماری خامی اور کمزوری ہے کہ ہم نے ان تک قرآن کریم کے درست نظریات نہیں پہنچائے ورنہ یہ حضرات مذہبی تعصب سے پاک ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے علمائے کرام عموماً اپنے عقائد اور اپنے خیالات سے اس درجہ مغلوب ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی بات توجہ سے نہیں سنتے۔ لیکن یہ طبقہ کھلے دل سے درست بات سننے کو تیار بھی ہوتا ہے' اور معقول بات کو جلدی قبول بھی کر لیتا ہے۔

مملکتوں کے سلسلہ میں عرض ہے کہ آج مملکتوں کے بارے میں چار طرح کی مملکتوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

(۱) سیکولر سٹیٹ۔ (۲) تھیا کریسی۔ (۳) مذہبی سٹیٹ۔ (۴) دینی قرآنی سٹیٹ۔

پہلی طرح کی سٹیٹ کو سیکولر کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مادہ اور توانائی کسی طرح وجود میں آ گئے۔ اس کے بعد مادہ اور توانائی میں اندھی فطرت کے قوانین کے تحت تغیرات ہوتے چلے گئے۔ ان ہی تغیرات سے یہ سلسلہ کائنات جاری ہے۔ جب توانائی کم ہو جائے گی تو مادہ کے ذرات کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اس طرح یہ کائنات ختم ہو جائے گی۔ نہ تو اس کائنات کو کسی نے تخلیق کیا ہے اور نہ ہی اس کے بنانے میں کسی اعلیٰ ہستی کا ہاتھ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی ہستی ہے کہ جو سفر زندگی میں اس کی راہنمائی کرے' انسانی راہنمائی کے لئے عقل انسانی کافی ہے۔ عقل کے علاوہ علم کا اور کوئی سرچشمہ نہیں ہے جو انسان کی راہنمائی کر

سکے۔اس نظریہ کے مطابق وحی کا کوئی بھی تصور باطل ہے۔اس نظریہ کو مادی نظریہ حیات کہا جاتا ہےاوراسی نظریہ پرسیکولرازم کا نظام قائم ہوتا ہے۔سیکولرازم کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشرہ کو قانون سازی کا پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً سیکولرازم کی واضح Definition سامنے نہیں آتی۔ ہمارے ٹی وی چینلز پر بھی سیکولرازم کے متعلق جب گفتگو ہوتی ہے، تو شرکاء مجلس عموماً اس موضوع کو الجھا دیتے ہیں اور Confuse کر دیتے ہیں۔لیکن مختصراً سیکولرازم کی کسی اساس و بنیاد یہ ہے کہ اس میں عقل انسانی پر کوئی بھی اور کسی بھی قسم کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ یہ قانون سازی کے سلسلہ میں بالکل آزاد ہے۔ یہاں تک کہ اس میں مختلف مما لک میں لواطت وسحاقت جیسے شنیع افعال کو بھی جائز قرار دے دیا ہے۔

سیکولرسٹیٹ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں قوانین کو دوام و استمرار حاصل نہیں ہوتا یہ اپنے قوانین اور قدریں (Values) تبدیل کر سکتی ہے۔عقل انسانی چونکہ اپنے حالات سے متاثر ہوتی ہے اس لئے سیکولرسٹیٹ کے قوانین ہمیشہ حالات حاضرہ سے متاثر ہوتے ہیں۔دوسری بڑی خامی اس سٹیٹ کی یہ ہے کہ یہ قوانین سازی میں صرف اپنے ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھتی ہے۔ پوری انسانیت کا مفاد ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔اس طرح یہ سٹیٹ وہ قوانین تشکیل کرتی ہے جو صرف ان کے ملک کے لئے تو فائدہ مند ہوں، لیکن وہ دوسرے مما لک کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ان کی واضح مثال آج کل کے امریکن قوانین کی ہے کہ وہ جب بھی چاہتے ہیں دوسروں پر حملہ کرنے اور Preemptive قسم کے قوانین بنا لیتے ہیں۔تیسری خامی اس حکومت کے قوانین کی یہ ہے کہ اگر مجرم کسی طرح سے بھی پہلے سے اپنی حفاظت کا انتظام کرے تو وہ قانون کی گرفت میں نہیں آتا اور نہ ہی اسے کوئی سزا ملتی ہے۔اوراس طرح جرائم عام ہوتے چلے جاتے ہیں اور طاقتور لوگ جرائم کرنے کے باوجود قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہ حکومت کسی طرح بھی جرائم نہیں روک سکتی۔ جرائم صرف اس وقت رک سکتے ہیں کہ جب انسان ازخود جرائم کرنے سے مجتنب رہے۔اور یہ صورت صرف اسلامی حکومت میں ہوسکتی ہے، جس کی تفصیل

آ گے آتی ہے۔

دوسرا نظام حکومت تھیاکریسی کا ہوتا ہے۔اس میں مذہبی پیشواؤں کی حکومت ہوتی ہے اس میں مذہبی راہنما اپنے وضع کردہ قوانین کو خدا کے نام کی طرف منسوب کر کے رائج کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوا چونکہ قدامت پرست اور توہم پسند ہوتے ہیں اور ان کا رویہ دنیا سے منفیانہ (Negative) ہوتا ہے' اس لئے ان کے قوانین نہایت خشک' دنیا بیزاری پر قائم اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ان میں رواداری اور لچک کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ اس طرح پوپ' اور پیشواؤں کی حکومت تھیاکریسی نے انسانیت پر جو مظالم کئے دوسری حکومتوں نے اس طرح کے مظالم نہیں کئے۔ چونکہ ان کے ہاں سند اور آخری (Authority) واضح اور متعین نہیں ہوتی اس لئے وہ ہر قسم کے قوانین بنا کر خدا کی طرف منسوب کر کے' جاری کر دیتے ہیں۔ جنسی بدنہادی (Sex Perversion) ان کے ہاں عام ہوتی ہے۔ اس کی معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں ہے۔ یورپ کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ سے ذرا بھی واقفیت اس کے جرائم اور مظالم معلوم کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

حکومت کی تیسری قسم مذہبی حکومت ہے۔ یہ ایک طرح کی سیکولر حکومت ہوتی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اول الذکر سیکولر حکومت میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوتا جیسے کمیونسٹ اور سوشلسٹ حکومتیں ہیں' لیکن مذہبی سیکولر حکومت میں مذہب کو دخل ہوتا ہے اس میں مذہبی لوگوں کو عبادت کرنے اور مختلف اعتقادات اختیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ مذہب سے متعلق انہیں اپنے پرسنل لاز اختیار کرنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن حکومت چلانے میں ان مذہبی چیزوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسے مذہب اور سیاست کی ثنویت کہتے ہیں اور قرآن کریم کی رو سے یہ مشرکانہ حکومت ہوتی ہے۔ یہ زندگی کے ایک حصہ یعنی مذہبی حصہ میں ایک خدا کو مانتی ہے اور زندگی کے دوسرے حصہ' یعنی سیاست میں انسانوں کو آخری سند تسلیم کرتی ہے۔ ثنویت کا یہ نظام جسے قرآن نے مشرکانہ انداز حکومت کیا ہے' آج کل جمہوریت میں رائج ہے' وہ اسے سیکولر

کہتے ہیں۔اس تفصیل سے آپ نے اندازہ فرمایا ہوگا کہ سیکولر نظام دو طرح کا ہوتا ہے' ایک وہ جس میں اللہ تعالیٰ کا نام تک نہیں آتا' اور دوسرا وہ جس میں مذہبی آزادی ہوتی ہے لیکن حکومت انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق چلتی ہے' اس میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔قرآن کریم کی رو سے سیکولرازم کے یہ دونوں نظام باطل ہوتے ہیں۔اول الذکر کافرانہ ہے اور ثانی الذکر مشرکانہ۔اول الذکر سیکولر کافرانہ نظام میں کوئی دھوکہ والتباس نہیں ہوتا لیکن ثانی الذکر نظام میں مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور ہم اس حکومت میں اسلام کے تمام تقاضے پورے کرر ہے ہیں۔یہ وہ نظام ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے ارشادفرمایا ہے۔وما یومن اکثر ھم باللہ الا وھم مشرکون (۱۰/۱۲)۔ اور اکثر ایسے لوگ ہیں کہ وہ خدا کے قانون کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اوروں کو بھی صاحب اختیار تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح مومن کہلانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔(ترجمہ از مفہوم القرآن)۔

حالیہ دور میں سب مسلم ممالک میں اس طرح کی حکومتیں جاری ہیں ان میں کچھ میں جمہوریت ہے اور کچھ میں ملوکیت اور کچھ میں ڈکٹیٹر شپ ہے۔لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ان سب میں اسلام بحیثیت ''مذہب'' کے رائج ہے ان سب ممالک کی قدر مشترک یہی ہے کہ ان میں اسلام ''مذہب'' کے طور پر جاری ہے اور یہی ان سب مسلم ممالک کے زوال کا مشترک سبب ہے کیونکہ مذہب ہمیشہ زوال پذیر ہوتا ہے۔مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ اور داخلی نفسیاتی تجربہ ہوتا ہے' اس میں ہر فرد اپنی نجات کا متمنی ہوتا ہے اس میں عالمگیر فلاح کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔دوسرا سبب اُن ممالک کے زوال کا یہ ہے کہ ان سب مسلم ممالک میں ایک ہزار سال کے پرانے بنائے ہوئے قوانین جاری ہیں جن کا اکثر و بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔یہ قوانین ہر فرقہ کے الگ الگ ہیں' اسی لئے ان حکومتوں میں فرقہ بندی کا ہونا لازمی ہے' اور اسی کی طرف اخبار مذکور نے اشارہ کیا ہے اخبار مذکور کی یہ غلطی ہے کہ اس نے اسلامی سٹیٹ کے الفاظ

تحریر کئے ہیں۔اسے چاہئے تھا کہ وہ مسلم سٹیٹ کے الفاظ استعمال کرتا' تو کوئی خلاف حقیقت بات نہ ہوتی۔اصل یہ ہے کہ یہ اسلامی سٹیٹ نہیں ہوتیں' اس لئے اس میں فرقہ بندی ہوتی ہے۔اسلامی سٹیٹ جس کی نشاندہی آگے آتی ہے' اس میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔کہ اس میں تو فرقہ بندی کبھی بھی نہیں ہوسکتی۔فرقہ بندی مذہبی سٹیٹ میں ہوتی ہے۔کیونکہ فرقہ بندی مذہب میں ہوتی ہے۔دین میں فرقہ بندی نہیں ہوتی۔اس وجہ سے دینی حکومت میں بھی فرقہ بندی نہیں ہوسکتی۔

حکومت کی چوتھی قسم قرآنی یا دینی حکومت ہے اور اس مضمون کا موضوع بھی یہی قرآنی یا دینی حکومت ہے اور اس حکومت کی وضاحت کرنے کی وجہ سے یہ مضمون زیر تحریر ہے۔ہم مسلمانوں میں چونکہ صدر اول کے بعد سے اسلام کے نام سے مذہبی حکومتیں رائج ہیں' اس لئے دینی حکومت جو قرآن کریم کا مقصود اصلی ہے اور جو قرآن کریم کی خالص تعلیم پر مبنی ہوتی ہے' وہ کبھی قائم نہیں ہونے دی جاتی۔پاکستان کو حاصل کرنے کا اصل مقصود بھی اس دینی حکومت کا قیام تھا۔چونکہ صدر اول کے بعد سے کبھی دینی حکومت قائم ہی نہیں ہوئی۔اور عوام مذہبی حکومت کو ہی دینی حکومت خیال کرتے رہے اس لئے دینی حکومت سے متعلق معلومات بھی کم ہیں اور اس کے متعلق تحریری مواد بھی بہت کم دستیاب ہے۔لیکن اس عرصہ سے پیشتر کے دور میں ایک ہزار سال کے بعد اس حکومت کا تصور علامہ اقبال نے دیا۔انہوں نے اس کا تصور عام کیا۔لیکن انہوں نے اس کے لئے کوئی جامع مضمون تحریر نہیں فرمایا۔یہ خوش بختی اور سعادت' علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے حصہ میں آئی کہ انہوں نے اس موضوع پر ایک جامع مضمون قبل تقسیم تحریر فرمایا۔پھر اس موضوع کو عام کرنے کی ذمہ داری طلوع اسلام نے اپنے سر لی۔اس موضوع پر طلوع اسلام میں ایک مبسوط مضمون ''اسلامی نظام'' کے عنوان سے طبع ہوا' اور پھر اس کے بعد ہزاروں ہزار صفحات اس موضوع کے متعلق تحریر کئے گئے۔دینی حکومت کا موضوع چونکہ نیا ہے' اس لئے اس میں حد درجہ نکارت ہے۔قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس موضوع پر توجہ سے غور فرمائیں۔

جن امور کو مذہبی احکام کہا جاتا ہے وہ چند اخلاقی ہدایات یا پوجا پاٹ کی رسوم پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لوگ انفرادی طور پر ان کی پابندی کر لیتے ہیں لیکن اسلام کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک نظام حیات ہے جو اجتماعی شکل میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ حضورﷺ نے سب سے پہلے اسلامی حکومت تشکیل فرمائی جس کی سنٹرل اتھارٹی حضورﷺ خود تھے۔ اس مملکت میں احکام خداوندی کی اطاعت سے مقصود ان قوانین کی اطاعت تھی جسے یہ سینٹرل اتھارٹی رائج کرتی تھی۔ یہ صورت نہیں تھی کہ قرآنی احکام پر جس طرح جس کا دل چاہا اسی طرح اس نے عمل کر لیا' بلکہ ہر مسلمان کے لئے یہ فرض اولیں تھا کہ وہ حضورﷺ کی طرف سے جاری کردہ احکامات کی اطاعت کرے اور اسی کا نام اللہ و رسول کی اطاعت تھا۔

عملی صورت میں اس بات پر اس طرح غور فرمائیں کہ آیات کریمات کی صورت میں احکامات خداوندی نازل ہو رہے تھے۔ چوری کی سزا کے سلسلہ میں السارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما (۵/۳۸)۔ چور مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ دو' نازل ہوا' تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ جس کے مال کی چوری ہوئی' اس نے اپنے محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے' اس چور کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ بلکہ وہ شخص جس کے ہاں چوری ہوئی ہے' وہ اس معاملہ کو حضورﷺ کے پاس لے جاتا تھا اور حضور بطور سینٹرل اتھارٹی کے' تفتیش و تحقیق کے بعد اس کی سزا کا حکم جاری فرماتے تھے۔ زنا اور سب حدود کے معاملات کا فیصلہ بعینہٖ اسی طرح ہوتا تھا۔ سزاؤں کے علاوہ معاشرتی معاملات میں بھی مثلاً اگر کسی شخص کو اپنی بیوی کو طلاق دینی ہوتی تھی تو یہ نہیں ہوتا کہ اس نے گھر میں طلاق دے دی بلکہ قرآنی احکامات کے مطابق' حضورﷺ یا حضور کے مقرر کردہ افسران (اولی الامر) اس کے متعلق احکامات جاری فرماتے تھے۔ اس سے بھی واضح صورت جہاد کے احکامات ہیں آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ جب جہاد کی آیات نازل ہوئیں تو یہ نہیں ہوا کہ جس نے یہ آیات کریمات سنی وہ تلوار لے کر فوری طور پر کسی پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا بلکہ حضور خود جہاد کا فیصلہ فرماتے تھے اس کے لئے باقاعدہ تیاری کی جاتی تھی اور حضور کی اپنی سرکردگی میں لوگ

جہاد کے لئے نکلتے تھے اور اس طرح حضور ﷺ کے احکامات بطور سینٹرل اتھارٹی کے جاری ہوتے اور ان احکامات کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی تھی۔

حضور، صاحب نور ﷺ کے بعد خلافت راشدہ میں خلفاء راشدینؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ بدقسمتی سے وہ نظام منقرض ہو گیا اور ہم اللہ و رسول کی اطاعت کرنے سے قطعاً محروم ہو گئے۔ آج ساری دنیا میں ایک گز زمین پر بھی وہ نظام قائم نہیں ہے اور پوری انسانیت اللہ و رسول کی اطاعت سے بالکل محروم ہے۔ اب جو حضرات اللہ و رسول کی اطاعت کے خواہش مند ہوں تو ان پر لازم ہے کہ وہ اس دور میں بھی قرآن کا نظام قائم کریں اور اس طرح اس کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت کریں۔ ہمارے نزدیک حضور ﷺ کی تشریف براری کے بعد حضورؐ کی اطاعت کے لئے حضورؐ کا زندہ جانشین ہونا لازمی ہے۔ جبکہ ہمارے علماء کرام حضور کی اطاعت کرنے کے لئے حضور کے جانشین کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ وہ حضور کے بعد روایات کی اطاعت کرنے کو حضور ﷺ کی اطاعت کرنے کے مرادف خیال فرماتے ہیں اور اس طرح وہ بزعم خویش، اللہ و رسول کی اطاعت کے فرض کی ادائیگی کر لیتے ہیں اور نیز یہ کہ اس طرح وہ اسلامی نظام یا دین کے قیام کی ضرورت سے بھی سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اس طرح یہ علماء کرام دینی حکومت قائم کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔

کسی بھی حکومت کے احکامات زندہ اتھارٹی کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے علمائے کرام کی بنیادی لغزش یہی ہے کہ وہ زندہ اتھارٹی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم نے زندہ اتھارٹی کی سماعت اور اس سماعت کے بعد اس کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے اس موضوع پر کئی مضمون راقم سطور کے طلوع اسلام میں آ چکے ہیں آپ وہ ملاحظہ فرمالیں۔ بار بار تحریر کرنے سے قارئین کرام کا وقت ضائع ہوتا ہے۔

اخبار مذکور نے اسلامی حکومت کو فرقہ بندی سے متہم کیا ہے تو یہ اخبار مذکور کی کمی اطلاعات کی بنا پر ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں کسی طرح کی فرقہ بندی نہیں

ہوتی۔ اس میں پہلی بات تو یہ دیکھنے کی ہے کہ فرقہ بنتا کس طرح ہے۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہوتا ہے تو فرقہ بنتا ہے اور اس میں سابقہ کے وضع کردہ قوانین کا نفاذ ہوتا ہے لیکن جب اسلام بطور نظام کے قائم ہوتا ہے تو سابقہ کے وضع کردہ قوانین کو صرف نظائر (Precedents) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اسلامی حکومت قرآن کریم کی حدود کے اندر خود قوانین جاری کرتی ہے جس پر عمل کرنے کے لئے ہر شہری پابند ہوتا ہے اور اس طرح فرقہ بندی کی لعنت ختم ہو جاتی ہے۔

اس کی عملی شکل یہ ہے کہ اب ہمارے ہاں سنی اور شیعہ حضرات مختلف اوقات پر روزہ کھولتے ہیں کیونکہ قرآن کریم میں حکم ہے کہ واتمو الصیام الی الیل ()اور روزے کو رات تک پورا کرو' لیکن قرآن نے لیل کو Define نہیں کیا۔ اس بارے میں دونوں فرقے کے فقہا کا اختلاف ہے۔ سنی حضرات نے لیل کو قدرے پیشتر شروع کیا اور شیعہ علماء اس کو دیر میں شروع کرتے ہیں اور اس طرح فرقے کا فرق محسوس طور پر سامنے آ گیا۔ لیکن یہ جب تک ہے جبکہ آپ مذہب کی سطح پر رہ کر سابقہ قوانین کی پابندی کے مکلف ہیں۔ جونہی اسلامی حکومت بنی وہ خود رات کا تعین کرے گی کہ اس وقت رات ہوگی اور پھر ہر شہری اسی وقت روزہ کھولنے پر مجبور ہو گا۔ اسی طرح چور کی سزا ہے۔ قرآن کریم نے چور کی تعریف کی اور نہ ہاتھ کی۔ اسی وجہ سے شیعہ سنی میں اختلاف ہے۔ شیعہ صرف انگلیاں کاٹنے میں پہنچے اور سنی کلائی تک۔ اب اسلامی حکومت طے کرے گی کہ ''ید'' سے کیا مفہوم ہے اور اس تعریف کے مطابق چور کی سزا ہوگی۔ اسی طرح تمام معاملات کا فیصلہ حکومت کرے گی' جس کی پابندی ہر شہری کرے گا اور پھر فرقہ کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

دینی حکومت سے متعلق جو ہمارے عوام اور مغربی تعلیم یافتہ حضرات کو معلومات کم ہیں تو اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ دین کا تصور کسی سابقہ مذہب میں نہیں تھا اسی وجہ سے دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ مذہب کے مرادف لفظ سے کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ

Religion اسی وجہ سے کیا گیا کہ انگریزی میں کوئی لفظ دین کے مراوف ہے ہی نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ صدر اول کے بعد سے دین کسی جگہ متمکن ہوا ہی نہیں کہ لوگوں کو دینی حکومت سے واقفیت ہو۔ نیز یہ کہ صدر اول کے بعد سے ملوکیت اور پیشوائیت نے مل کے اس کے تصور کو اس طرح محو کیا کہ ہمارے ایک ہزار سالہ لٹریچر میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے واقف نہیں ہے اور اسی وجہ سے اخبار مذکور نے یہ تحریر کیا کہ اسلامی حکومت فرقہ پسند ہوتی ہے۔

اسلامی دنیا میں عموماً اور ہمارے ہاں پاکستان میں خصوصاً ماڈریشن (Moderation) کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ ماڈریشن اور رواداری لانے سے پیشتر یہ بات غور کرنے کی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے میں ماڈریشن نہیں ہے۔ ہمارے میں ماڈریشن نہ ہونے کا اصل سبب دین کا مذہب میں تبدیل ہو جانا ہے۔ مذہب تو By Definition ہوتا ہی قدامت پسند' تنگ نظر اور توہم پرست ہے۔ جب آپ مذہب میں ایک ہزار سال کے سابقہ قوانین جاری کریں گے اور ان کو تبدیل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی' تو خود بخود ماڈریشن جاتی رہے گی۔ ماڈریشن اور رواداری لانے کا واحد علاج یہ ہے کہ آپ دین کا نظام جاری کر دیں فرسودہ قوانین و نظریات' خلاف قرآن اعتقادات کو مسترد کر دیں۔ صرف قرآن کریم کی تعلیم کو سامنے رکھیں اور اس کی حدود میں موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے سے نئے قوانین تشکیل دیں۔ ماڈریشن خود بخود آ جائے گی۔ اس کے علاوہ تنگ نظری دور کرنے اور ماڈریشن لانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اس بات کو آپ بغور ملاحظہ فرمالیں کہ آپ ہزار کوشش کر لیں' مذہب میں ماڈریشن آ ہی نہیں سکتی کیونکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مضمون کے درمیان میں یہ تحریر کیا گیا تھا کہ اسلامی حکومت میں جرائم از خود کم ہوتے چلے جاتے ہیں' تو اس کی وضاحت مضمون کے آخر میں کی جائے گی تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اسلامی مملکت میں عدل و انصاف حاصل کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے جائیں گے' وہ خود

جرائم کو کم کرتے چلے جاتے ہیں۔

تمام مملکتوں میں مستغیث مجرم کے خلاف مدعی ہوتا ہے۔لیکن چونکہ اسلامی حکومت اپنی اصل کے اعتبار سے ہر شہری کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے اس لئے اس کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس میں مستغیث حکومت کے خلاف دعویٰ کرتا ہے اور خود حکومت کو مدعی علیہ بناتا ہے کیونکہ مملکت نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کرے گی۔اگر کسی نے اس کی متاع کو جبراً اس سے چھین لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت نے اس شخص سے وعدہ خلافی کی ہے اس لئے اس کے نزدیک اس کا مجرم نظام مملکت ہے نہ کہ وہ فرد مخصوص جس نے یہ ارتکاب جرم کیا ہے۔اب یہ نظام مملکت کا کام ہے کہ وہ اس نقصان کو مجرم سے پورا کرتا ہے یا وہ خود اس نقصان کو پورا کرتا ہے۔مملکت کا فریضہ تو اس مظلوم یا اس مظلوم کے وارثوں کی پوری پوری مدد کرنا ہے۔فقد جعلنا لو لیه سلطانا فلا یسرف فی القتل انه کان منصوراً (۱۷/۳۳)۔ اگر مملکت مظلوم کے نقصان کی تلافی نہیں کرتی تو وہ اس کی پشت پناہ کیسے ہوسکتی ہے اور حامی و ناصر ہونے کا دعویٰ کس طرح کرسکتی ہے۔

دوسری خصوصیت اس مملکت کی' قصاص پر عمل کرنا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً اس کا مفہوم مجرم سے پورا پورا بدلہ لینا سمجھا جاتا ہے۔لیکن اصل میں اس کے معنے مجرم کا اس طرح تعاقب کرنا ہے کہ وہ سزا کے بغیر نہ رہ جائے۔اسے لازماً سزا ملے۔قرآن کریم اس نظام تفتیش کا نام کہ جس میں ہر شخص کو لازماً سزا ملے قصاص رکھتا ہے اور قصاص کو حیات اجتماعیہ کا راز قرار دیتا ہے۔ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الباب (۲/۱۷۹)۔

سزا تجویز کرتے وقت مجرم کی ذہنی سطح' اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اسی وجہ سے قرآن کریم نے لونڈیوں کی سزا شریف عورتوں کی سزا سے نصف رکھی ہے(۴/۲۵)۔کیونکہ یہ لونڈیاں جن حالات میں پرورش پاتی تھیں' ان کے حالات کے پیش نظر' ان سے بلند اخلاق کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی اس کے برخلاف حضور ﷺ کی

ازواج مطہرات کے لئے قرآن کریم نے دوگنی سزا مقرر فرمائی تھی کہ اگر ان سے کسی جرم کا ارتکاب ہوتا، تو انہیں دوگنی سزا دی جاتی (۳۳/۳۰)۔

جب تک جرم ثابت نہیں ہوتا، ملزم بے گناہ تصور کیا جائے گا اور ضروری ہے کہ معاشرہ اس سے حسن ظن سے کام لے۔ سورہ نور میں ہے کہ مدینہ شریف میں بعض لوگوں نے کسی عورت کے خلاف تہمت تراشی اور لوگوں نے اس افواہ کو عام کر دیا۔ اس پر قرآن کریم نے یہ ہدایت دی کہ جب تم نے یہ خبر سنی تھی تو تمہارا ردعمل ہونا چاہئے تھا کہ ھوا افک مبین (۲۴/۱۴)۔ قرآن کریم کی یہ ایک مستقل راہنمائی ہے کہ ملزم کے متعلق سوءظن سے کام نہیں لینا چاہئے۔

قانون کے نافذ ہونے سے پیشتر اگر کسی سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے تو وہ مجرم شمار نہیں ہو گا۔ کسی بھی قانون کا اطلاق گزشتہ عرصہ سے نہیں ہو سکتا۔ ہر قانون کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد سے شروع ہوگا۔ قرآن کریم میں کئی احکام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے الا ما سلف (۴/۲۳)۔ جو اس سے پیشتر ہو گیا اس پر کوئی گرفت و مواخذہ نہیں ہے۔

جرائم کو روکنے اور اس کا مکمل انسداد کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ انسان کو اس بات پر پکا یقین ہو کہ اس کی زندگی کا مقصود اصلی یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی پرورش کرے اور یہ کہ نفس کی پرورش مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے ہوتی ہے اور مستقل اقدار کی خلاف ورزی سے نفس میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ اس بات پر جس قدر ایمان و ایقان ہوگا انسان اسی قدر جرائم سے مجتنب رہے گا۔ شرط صرف اس پر یقین کی ہے۔ اگر کوئی شخص سخت بھوکا ہے اور اس کو خوراک کی سخت احتیاج ہے، لیکن وہ اس حالت میں بھی کبھی کھانا نہیں کھائے گا جس میں زہر ملا ہوا ہو، کیونکہ اس کو یقین ہے کہ وہ خوراک اس کی موت کا سبب بن جائے گی۔ اسی طرح سے اگر قرآن میں مندرج مستقل اقدار کے اثرات مرتب ہونے کا اسی طرح یقین ہو تو وہ شخص کبھی جرم نہیں کرے گا، کیونکہ اس کو اس بات کا یقین ہے کہ جرم سے اس کا نفس مضمحل ہوگا۔ جرائم کی روک تھام باہر سے سزا Impose کرنے سے نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اندر سے اس کو روکنے کی urge نہ ہو۔

جرائم کی روک تھام کرنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیا جائے تو ہر شخص اس مملکت کی اطاعت بخوشی کرے گا اور جرائم سے مجتنب رہے گا۔ اسلامی حکومت کی جس قدر اطاعت ہوگی' اسی قدر تقویٰ میں اضافہ ہوگا اور جرائم کی از خود روک تھام ہوگی۔ اور کوئی شخص بھی اسلامی حکومت کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

اس حکومت کے عدل وانصاف کے ان طریقوں اور جرائم کے انسداد کے ان اقدامات سے قرآنی حکومت' اپنی اصل میں منفرد اور نوع انسانی کی پرورش کرنے والی ہوتی ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱

حلالہ

آپ نے حلالہ کا نام ضرور سنا ہوگا۔ حلالہ کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دے تو یہ طلاقِ ثانیہ یا مغلظہ کہی جاتی ہے جس کے بعد یہ جوڑا نہ میاں بیوی رہتا ہے اور نہ ہی یہ آپس میں اس کے بعد نکاح کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات چونکہ جذبات میں آ کر طلاق دے دی جاتی ہے اور جذبات کے فرو ہونے کے بعد یہ جوڑا پھر آپس میں نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک صورت یہ نکالی ہے کہ یہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے۔ وہ مرد اس کے ساتھ لازماً ہم بستری کرے، پھر وہ اس کو طلاق دے دے تو پھر یہ سابقہ میاں بیوی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اسے حلالہ کہتے ہیں لیکن ہر شخص سمجھتا ہے کہ طریقہ نہایت شرمناک ہے اور شریف و عفیف خواتین کے لئے بہت تکلیف دہ بھی۔ بہرحال یہ مسئلہ جس آیۂ کریمہ سے نکالا گیا ہے اس آیت کی تشریح چند تفاسیر سے پیش کی جاتی ہے۔ پہلے آیۂ کریمہ بمعہ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس آیت سے پیشتر طلاق کے احکام چلے آ رہے ہیں، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجاً غیره۔ فان طلقها فلا جناح علیهما ان یتراجعا (۲/۲۳۰)۔

پھر اگر تیسری بار بھی عورت کو طلاق (بائنہ) دے تو اس کے بعد جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے، اس کے لئے حلال نہیں ہاں اگر دوسرا شوہر (نکاح کے بعد) اس کو طلاق دے دے تب البتہ ان میاں بیوی پر باہم میل کر لینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

ترجمہ کے بعد اب تفسیر ملاحظہ فرمائیں اس کے بعد اس آیۂ کریمہ کا اصل مفہوم پیش خدمت عالی کیا

جائے گا۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ نہ تو میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا نہ چھوڑوں گا۔ اس نے کہا یہ کس طرح؟ کہا طلاق دے دوں گا اور جہاں عدت ختم ہونے کا وقت آیا تو رجوع کرلوں گا' پھر طلاق دے دوں گا۔ پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرلوں گا یونہی کرتا چلا جاؤں گا۔ وہ عورت حضور ﷺ کے پاس آئی اور اپنا یہ دکھ بیان کرنے لگی۔ اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر' جلد اول' صفحہ ۲۹۱)۔

تفسیر فصل الخطاب میں ہے:

اب وہ اس مرد کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی جب تک ایک دوسرے شوہر سے اس کا عقد نہ ہو جائے اور وہ اس سے مباشرت نہ کرلے''۔ (جلد اول' صفحہ ۴۱۴)۔

''پھر اگر طلاق دے دے دو طلاق کے بعد شوہر بیوی کو تو وہ بیوی حلال نہیں رہے گی اس شوہر کے لئے بعد تیسری طلاق کے' حتیٰ کہ نکاح (شادی) کرلے وہ عورت پہلے خاوند کے علاوہ دوسرے سے اور وہ دوسرا شوہر اس عورت سے ہم بستر ہو جائے۔ جلالین۔ آیۂ زیرِ نظر کی تفسیر کے ضمن میں۔

تفسیر تدبر قرآن میں ہے: ''آخری طلاق دے چکنے کے بعد اگر کوئی شخص پھر اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو یہ اس کا حکم بیان ہو رہا ہے کہ جب تک وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کو طلاق نہ دے اس وقت تک یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے جائز نہیں ہوسکتی''۔ اس سے کچھ آگے تحریر ہے ''حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ (جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح کرے گی' میں نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک عقد نکاح ہی کے معنے میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو وطی کے معنے میں لیا ہے انہوں نے ایک غیر ضروری سا تکلف کیا ہے''۔ اس کے بعد اس کی دلیل دی ہے کہ ''یہاں تنکح کا فاعل ظاہر ہے عورت ہے۔ اگر اس کا معنی وطی کے لئے جائیں تو اس کا

ترجمہ ہوگا'' کہ یہاں تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے وطی کرے۔وطی کرنا مرد کا کام ہے نہ کہ عورت کا اور اگر یہ ترجمہ کریں کہ یہاں تک کہ'' وہ کسی اور شوہر سے وطی کرائے تو اس نادر معنے کے لئے ثبوت کہاں سے لائیں گے۔'' (جلد اول' صفحہ ۵۳۷)۔

وطی کے معنے عورت سے جماع Sex کرنے کے ہیں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں محترم مفسر معذرت خواہانہ (Apologetic) رویہ اختیار کر رہے ہیں۔انہیں اس طریقہ کار سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے اور اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ عورت کو دوسرے مرد سے صرف عقد نکاح کرنا ہوگا' ہم بستری کرنا ضروری نہیں ہوگا۔لیکن دوسرے تمام مفسرین کا اس پر اصرار ہے کہ نئے شوہر کو طلاق دینے سے پیشتر Sex کرنا لازمی ہے۔اس سلسلہ میں مشہور و مستند تفسیر' تفسیر مظہری سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس نے بات کو بہت صاف کر دیا ہے۔ راقم سطور قارئین کرام سے شرمندہ ہے کہ وہ اس اقتباس کو نقل کر رہا ہے۔لیکن اس اقتباس کے بغیر مسئلہ واضح نہیں ہوتا۔انتہائی معذرت کے بعد یہ اقتباس پیش خدمت عالی ہے:

'' حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے فرماتی ہیں کہ میں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پاس تھے کہ اتنے میں رفاعہ قرظی کی بیوی آ گئی اور حضرت سے کہنے لگی کہ رفاعہ نے مجھے مغلظہ طلاق دے دی تھی اور عبدالرحمٰن بن زبیر نے مجھ سے نکاح کر لیا تھا اور اس کے پاس (یعنی اس کا عضو تناسل) اس پھندنے جیسا ہے اور اپنے کھیس کا پھندنا پکڑ کر دکھایا۔ حضور (اس کی بات سے) مسکرائے اور فرمایا کہ تو رفاعہ کے ہاں جانا چاہتی ہے۔یہ نہیں ہوگا جب تک کہ تو اس کا مزہ اور وہ تیرا مزہ نہ چکھ لیں''۔

اس اقتباس میں قوسین (بریکٹ) کی دونوں عبارتیں اصل تفسیر سے ہی نقل ہیں۔اس سے کچھ آگے چل کر تحریر ہے:

''تمیمہ سے عبدالرزاق بن زبیر نے نکاح کر لیا تھا لیکن یہ نامرد ہونے کی وجہ سے اسے ہاتھ بھی نہ لگا سکے اور اس سے علیحدگی کر لی۔اس کے بعد پھر رفاعہ نے اس سے نکاح کرنا

چاہا تو حضور نے اسے منع کر دیا اور فرمایا جب تک عبدالرحمٰن کا مزہ نہ چکھ لے تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔(صفحہ ۳۵۸)۔

آپ نے غور فرمایا کہ صاحب تدبر قرآن نے یہ محسوس فرمایا کہ دوسرے شوہر کا مباشرت کرنا بہت شرمناک سا ہے۔اس لئے کوشش کی کہ حلالہ کو صرف عقد نکاح تک ہی محدود کر دیا جائے اور اس شرمناک بات سے ایک حد تک چھٹکارے کا یہ طریقہ بتایا کہ وہ خاتون کسی نئے شوہر سے شادی کر لے' اگر وہ نیا شوہر بغیر Sex کے طلاق دے دے تو سابقہ شوہر سے پھر نکاح کر سکتی ہیں۔ دوسرے نئے شوہر سے مباشرت کرنا ضروری نہیں ہے۔لیکن تفسیر مظہری میں واضح طور پر کئی احادیث نقل کی گئی ہیں۔جس سے انہوں نے تدبر قرآن کی تردید کردی کہ نئے شوہر کے لئے وطی (Sex) کرنا ضروری چیز ہے۔

اب آیئے آیہ کریمہ کے اصل مفہوم کی طرف۔قارئین کرام کی سہولت کے پیش نظر آیہ کریمہ دوبارہ تحریر کی جاتی ہے۔اس آیت سے فوری پہلے دو طلاقوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره (۲/۲۳۰)۔

اس آیت کا ترجمہ اور مفہوم بالکل واضح ہے کہ جب شوہر تیسری طلاق دے دے اب یہ عورت اس مرد کے لئے اس کے بعد سے حلال نہیں رہی۔اور اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوگی۔آیت کا ایک حصہ جو ایک جملہ کی شکل میں ہے مکمل ہوگیا۔یہاں حتی سببیہ ہے جیسا کہ آیت (۲/۲۱۷) میں استعمال ہوا ہے۔اس سبب سے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکے۔یہاں تک آیت میں کوئی ابہام Ambiguity نہیں ہے۔مفہوم بالکل واضح ہے۔ہمارے علمائے کرام سے جو تسامح ہوا ہے' اس کا سبب احادیث کے زیر اثر اگلی آیت کا غلط مفہوم لینا ہے جو یہ ہے:

فان طلقها فلا جناح عليهما ان يتراجعا (۲/۲۳۰).

پھر اگر طلاق دے دے دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر باہم مل جائیں۔ (ترجمہ شیخ الہند)۔

ہمارے علمائے کرام نے ان یتراجعا کے الفاظ میں سابقہ شوہر کی طرف رجوع کرنے کو بیان کیا ہے کہ اگر موجودہ نیا خاوند طلاق دے دے تو اس سابقہ شوہر سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے اور اسی جگہ انہوں نے لغزش کھائی ہے کیونکہ یہی بات قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اور اسی وجہ سے حلالہ کی صورت پیش آتی ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد رجعت کا حق بھی اسی مرد کو ہوگا جس نے طلاق دی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے نئے شوہر کے طلاق دینے پر رجعت کا حق سابقہ شوہر کو دے دیا جو تین مرتبہ طلاق دے چکا ہے کہ اگر نیا خاوند طلاق دے دے تو اس عورت سے اس کا چوتھا نکاح ہو سکتا ہے اور نئے شوہر سے رجعت کرنے کا کہیں ذکر نہیں رہتا۔ حالانکہ یہاں دوسرے نئے شوہر سے رجعت کرنے کا ذکر ہے نہ کہ سابقہ شوہر سے۔

غلط تفسیر کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ احادیث کے زیر اثر ہمارے علمائے کرام کو ان یتراجعا کے الفاظ سے لغزش ہوئی ہے۔ اگر یہ حضرات یہاں نئے شوہر کی طرف رجوع کرنے کا مفہوم لے لیں تو بات بالکل صاف ہے اور حلالہ کا امکان یا اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ قرآن کریم کے الفاظ تو بالکل واضح ہیں کہ تیسری طلاق کے بعد تم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے پر حرام ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اگر چوتھا نکاح مان لیا جائے تو چوتھی طلاق بھی ماننی پڑے گی۔ کیونکہ جب ایک جوڑا تین طلاقیں دے چکا تو چوتھی مرتبہ کا امکان بھی ہر وقت ہو سکتا ہے لیکن قرآن کریم میں چوتھی طلاق کا کوئی ذکر یا اس کے متعلق کوئی احکامات نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ قرآن کریم نے بالکل واضح لفظوں میں فرما دیا کہ الطلاق مرّتٰن صرف دو طلاقوں کے بعد تک تو نکاح ہو سکتا ہے تیسری طلاق کے بعد نہ قرآن کریم نے چوتھے پانچویں نکاح کی اجازت دی ہے اور اسی وجہ سے نہ ہی چوتھی پانچویں طلاق کا کہیں ذکر ہے۔

حلالہ کے بارے میں زیر نظر مضمون میں اس درجہ وضاحت پیش خدمت عالی کر دی گئی ہے کہ اس وضاحت کے بعد دو رائیں ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ اس مسئلہ کو سرسری نظر سے ملاحظہ نہ فرمائیں۔ اس مکروہ حالت سے بہت خواتین کو دو چار ہونا پڑتا ہے اور بہت بڑا دھبہ Blot اسلام کے نام پر حلالہ کی وجہ سے آتا ہے۔ اس کا جواز صرف اس آیت کی غلط تفسیر پر ہے۔ نیز ان احادیث کے موضوع اور وضعی ہونے کے بارے میں جن سے اس آیت کی تفسیر میں مدد لی گئی ہے' آپ خود غور فرمائیں کہ حضرت عائشہؓ اپنے والد محترم کے ساتھ حضورﷺ کی مجلس میں تشریف فرما ہیں اور روایت کے مطابق وہ محترمہ (رفاعہ کی اہلیہ) حضور کو ''پھندنا'' دکھا رہی ہیں۔ ایسی غیر شائستہ حرکت ایسی محترم مجلس میں ہو' ممکن معلوم نہیں ہوتی۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی نظام کے بارے میں دو اہم نکات کی وضاحت

کمترین راقم سطور کے چھ (٦) مضامین اسلامی نظام کے سلسلہ میں موقرہ جریدہ 'طلوع اسلام' اور دیگر رسائل میں طبع ہوئے۔ 'سلیم کے نام خطوط' کی دوسری جلد کا چوبیسواں خط ''اطاعت رسول'' نام کا میرے تمام مضامین کا محور تھا۔ اس خط میں ہی تحریر کردہ فقروں کو میں نے اپنے مضامین کا عنوان قرار دیا تھا اور انہیں فقروں کو میں نے نہایت درجہ Elaborate کیا۔ یہ مضامین ''اللہ تعالٰی کی اطاعت براہ راست نہیں ہوسکتی''۔ ''انسانوں کے باہمی معاملات کو وحی کے مطابق طے کرنا دین ہے'' ''دین کے اجزاء مملکت کی بنیاد ہوتے ہیں''۔ مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا خود ایک مستقل قدر ہے''۔ ''خدا اور رسول کی اطاعت کی عملی شکل دین کی اطاعت ہے''۔ طبع ہوئے اور ان تمام مضامین میں میں نے اسی ''سلیم کے نام'' خط کے مرکزی نقطہ کی مختلف اسالیب سے خوب خوب وضاحت کی ہے کیونکہ یہ نظریہ تحریک عالیہ طلوع اسلام کا ایک ایسا منفرد و بے مثل نظریہ ہے کہ جس کی کوئی کرن تک ساری دنیا میں کسی ملک میں بھی دکھائی نہیں دیتی اور صرف اسی نظریہ کو درست تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو عروج واقتدار حاصل ہو سکتا ہے۔ ان مضامین کو باوجود ان کی ندرت وانفرادیت کے قارئین کرام نے بہت پسند فرمایا اور بہت حد تک سراہا' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے بارے میں اعتراضات واستفسارات بھی بڑی تعداد میں' ای میل اور خطوط کے ذریعے موصول ہوئے۔ ہمارے علمائے کرام نے جب تحریک طلوع اسلام کی مخالفت شروع کی' اور جسے وہ اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں زیادہ تر طلوع اسلام کو انکار حدیث سے مطعون کرتے چلے آرہے ہیں لیکن اس موضوع پر انہوں نے زیادہ توجہ نہیں

فرمائی اور صرف چند حضرات نے ہی مرکز ملت کے تصور کی تردید میں کچھ تحریر کیا ہے۔

زمانہ کے تھپیڑوں، مسلمانوں کے زوال و ادبار، حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت تک تو عام مسلمان آ گئے ہیں لیکن اس سے آگے جو اصل مرکزی و محوری عقیدہ کہ اللہ کی اطاعت صرف اس نظام کی وساطت سے ہو سکتی ہے اور بغیر اس نظام کی وساطت کے براہ راست اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہو سکتی، اس نقطہ تک مسلمان آنے کو اب بھی تیار نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نقطہ ان کے سامنے کبھی پیش ہی نہیں کیا گیا ہے اس لئے وہ بغیر نظام قائم کئے بھی قرآن و حدیث کے ذریعے اللہ کی براہ راست اطاعت کرنے کو درست خیال کرتے ہیں۔ اس میں Core Issue، حدیث کے مقام کے صحیح تعین کرنے کا Involve ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت صرف نظام کی وساطت سے ہوتی ہے۔ اس میں اللہ و رسول دونوں کی اطاعت شامل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کا اصرار ہے کہ رسول کی اطاعت صرف احادیث کے ذریعے ہو جاتی ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت نہیں ہوتی۔

اس مختصری تمہید کے بعد اب ان بے شمار اعتراضات و سوالات کی طرف آتے ہیں جو ان مضامین کے سلسلہ میں بذریعہ ای میل یا خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان اعتراضات کی کثرت سے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے ان مضامین کو نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان پر غور و خوض بھی کیا۔ اکثر سوالات کے جوابات مستفسر حضرات کو ارسال کر دیئے گئے ہیں ان سوالات میں چند ایسے اصولی سوالات ہیں کہ ان کے متعلق یہ خیال ہوا کہ ان کو رسالہ میں طبع کرا دیا جائے تاکہ دیگر حضرات کو بھی اس سے اطلاع ہو۔

اسلامی نظام میں اطاعت رسول کے بارے میں ایک صاحب نے یہ اعتراض فرمایا ہے کہ اپنے دور میں حضور ﷺ نے جو جزئیات مقرر فرمائیں، تو ان کی اطاعت سے تو حضور ﷺ کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ لیکن بعد کے ادوار میں جب حضور ﷺ کی مقرر کردہ جزئیات کو ہی تبدیل کر

دیا جائے تو پھر ان تبدیل شدہ جزئیات کی اطاعت سے حضورﷺ کی اطاعت نہیں ہو سکتی' تو اس طرح تو ہم حضورﷺ کی اطاعت کرنے سے محروم ہو گئے اور یہ بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔

اسلامی نظام میں رسول اللہ کی اطاعت کے بارے میں یہ سوال اکثر حضرات کے ذہن میں آتا ہے اور ان کی خلش کا باعث ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک قرآن کریم محفوظ ہے' جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہوا ہے' اور جب تک ہمارا قرآن کریم پر ایمان ہے' اس وقت تک ہمارا حضورﷺ کی رسالت پر ایمان ہے۔ بے شک حضور ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہونے اور اس پر عمل کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ہم حضورﷺ کی عدم موجودگی کے باوجود ان کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کے نظام کی صورت ہے کہ جب بھی وہ نظام قائم ہوگا' کیونکہ وہ قرآنی احکامات پر قائم ہوگا جو ہمیں حضورﷺ کی معرفت ملے' اس لئے ان کی اطاعت میں ہی حضورﷺ کی اطاعت مضمر ہوگی۔ اہمیت جزئیات کی نہیں ہے' اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ نظام حضورﷺ نے عنایت فرمایا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے اصول و احکام بھی عنایت فرمائے ہیں جن میں قیامت تک تبدیلی نہیں ہوگی۔ ان کی جزئیات تبدیل ہی نہیں ہوں گی۔ اگرچہ ان احکام میں حضورﷺ نے کوئی جزئیات مقرر نہیں فرمائیں تاہم ان کی اطاعت سے حضورﷺ کی اطاعت ہوگی۔ وراثت کے تمام احکام اور عائلی زندگی کے بیشتر احکام وہ ہیں جن کی جزئیات کے سلسلہ میں حضورﷺ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن چونکہ وہ اسلامی حکومت کے احکام ہیں اس لئے ان کی اطاعت کرنے سے حضورﷺ کی بھی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی طرح روزہ' خمس اور دیگر امور ہیں۔ خمس کے حصے خود مقرر ہیں۔ زانی کی سزا' سوروں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اسی قبیل کے اور اصول بھی ہیں جو قرآن میں تفحص کرنے کے بعد جمع کئے جا سکتے ہیں' ان کی اطاعت بھی حضورﷺ کی اطاعت ہے۔

لیکن جن امور میں جزئیات تبدیل بھی ہوئیں ان تبدیل شدہ جزئیات کی اطاعت بھی حضورﷺ کی اطاعت ہے۔ کیونکہ اصل اطاعت اس نظام کی ہے۔ جزئیات کی نہیں مثلاً قرآن

کریم میں زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم نازل ہوا۔ جس سے یہ حکم تھا کہ اسلامی مملکت ہر فرد کی معاشی ضروریات پوری کرے' کوئی دوسرے کا دست نگر نہ رہے۔ سب کی جسمانی پرورش اور انسانی ذات کا ارتقاء ہو سکے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے حضورﷺ نے انتظام فرمایا' جو صاحب استطاعت لوگ تھے ان سے لیا اور ضرورت مندوں کو دیا۔ اس کے لئے ان کے خیال مبارک کے مطابق اڑھائی فیصد مال کی ادائیگی کافی ہوگی لیکن ''خدا اور رسول کی اطاعت'' سے یہ مراد نہیں تھی کہ زکوٰۃ دینے سے اللہ کے حکم کی اطاعت ہوگئی اور اڑھائی فیصد دینے سے رسول کی اطاعت ہوئی۔ بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ اس وقت کے اسلامی نظام میں اڑھائی فیصد دینے سے اللہ ورسول کی یہ اطاعت پوری ہو جاتی تھی کہ اس سے مملکت کے ہر فرد کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ اگر صرف حضور کی مقرر کردہ جزئیات سے ہی حضور کی اطاعت ہوتی تو علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدین (تم پر میری اور خلفاء راشدین کی اطاعت لازم ہے) کی سنت کی اطاعت کا اضافہ نہ کیا جاتا۔ اور خلفائے راشدین کسی خاص دور تک کے لئے مخصوص نہیں تھے۔ اگر قرآن کا وہ نظام قائم رہتا تو حضرت ابوبکرؓ سے لے کر آج تک کے تمام خلفاء' خلفائے راشدین ہی ہوتے اور ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی۔

نظام میں اصول و جزئیات الگ الگ نہیں ہوتے بلکہ یہ ایک Integrated اکائی ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ایک جز سے اتفاق نہ ہو' لیکن پھر بھی اس نظام کی اطاعت جاری رکھیں۔ مثلاً جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تو بعض صحابہؓ ذاتی طور پر اس جہاد کے خلاف تھے۔ اسی طرح جب حضرت عمرؓ نے عراق کی اراضی فوجیوں کے درمیان تقسیم نہیں فرمائی تو بہت سے صحابہؓ کو اس سے اتفاق نہیں تھا لیکن ان جزئیات کے اختلاف کے باوجود وہ نظام کی اطاعت کرتے رہے۔

یہ تو ان صاحب کے اعتراض کا تحقیقی جواب تھا' جو پیش خدمت عالی کیا گیا ہے۔ اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورﷺ نے سب جزئیات وحی

خفی کے ذریعے مقرر فرمائی تھیں' اسی لئے وہ ان میں تبدیلی کے قائل نہیں ہیں۔ جب یہ جزئیات بقول ان کے خود وحی خفی کی رو سے طے ہوئیں' تو ان کی اطاعت سے حضور کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے۔ وحی کی اطاعت سے تو اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ خواہ وہ جلی ہو یا خفی۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ حضرات وحی جلی کی اطاعت سے تو اللہ کی اطاعت تسلیم فرماتے ہیں اور وحی خفی کی اطاعت کو حضور کی اطاعت قرار دیتے ہیں۔ فتدبروا۔

ان ہی مذکورہ بالا مضامین کو مطالعہ فرما کر ایک اور صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض اوقات ان دونوں حضرات کے خلاف الزامات لگائے گئے اور یہ دونوں حضرات عدالتوں میں بھی حاضر ہوئے اور نہ صرف یہ کہ یہ دونوں حضرات عدالتوں میں حاضر ہوئے بلکہ ان عدالتوں میں فیصلہ بھی ان دونوں کے خلاف ہوا تھا۔ اگر ان دونوں حضرات کی اپنی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی تو انہوں نے عدالتوں کے فیصلوں کی کیوں اطاعت کی۔ خود حاکم ہو کر محکوم عدالتوں کی اطاعت کیوں کی۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی خود کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

ضمناً و جعاً یہ عرض ہے کہ بعض حضرات کو معاملات کو الجھا کر پیش کر کے' دوسروں کو لاجواب کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ یہ حضرات Logic و Discursive کے ماہر ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں یونانی علوم کے زیر اثر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر غور و خوض کا سلسلہ شروع ہوا تو گویا ایک Pandora Box کھل گیا۔ وضع وضع اور طرح طرح کے سوالات ہونے شروع ہوئے۔ اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ اتنا بڑا پتھر بنا سکتا ہے کہ وہ خود اس کو اٹھا نہ سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال صرف دوسرے کو عاجز کرنے کی خاطر کیا گیا۔ اسی طرح کا واقعہ ہے کہ چند لوگوں نے حضرت علی مرتضیٰ سے دریافت کیا کہ بھیڑ (Lamb) اور کتے کے اختلاط سے جو بچہ پیدا ہو وہ حلال ہے یا حرام ہے۔ اس پر آنجنابؓ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو بھیڑوں کے ریوڑ میں چھوڑ دو' اگر یہ ریوڑ کے درمیان چلتا ہے وہ بھیڑ ہے اور حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ وہ صاحبان تو

محض تنگ کرنا چاہتے تھے' اس لئے وہ چند روز بعد آئے اور کہنے لگے کہ وہ کبھی تو ریوڑ کے درمیان چلتا ہے اور کبھی ریوڑ سے آگے چلتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ پھر اسے پانی پلاؤ اگر وہ کتے کی طرح آواز پیدا کر کے پانی پیتا ہے تو حرام ہے ورنہ حلال۔ انہوں نے پھر آ کر یہی جواب دیا کہ وہ کبھی کتے کی طرح پیتا ہے اور کبھی بھیڑ کی طرح۔ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو ذبح کر لو اگر اس کے اوجڑی (Offal) نکلے تو حلال ہے ورنہ حرام ہے۔ ان کا مقصد تو صرف سوالات کر کے تنگ کرنا تھا اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

بہرحال ان صاحب کے جواب کے سلسلہ میں عرض ہے کہ بے شک حضرت عمرؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی اور یہ اطاعت اس دور کے ساتھ مخصوص تھی۔ جب وہ حکومت کے سربراہ تھے۔ اس سے پیشتر کے عرصہ میں اطاعت کی یہ صورت نہیں تھی اور بے شک وہ محترم و مکرم حضرات اس سے واقف بھی تھے لیکن وہ خود بھی تو اس نظام کی اطاعت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف دوسروں سے اس کی اطاعت کراتے تھے' بلکہ وہ خود بھی اس نظام کے تابع تھے۔ ہمارے ملک کے صدر یا وزیراعظم جب اپنی کار میں سڑک پر سے گذرتے ہیں تو وہ چوراہے پر ٹریفک کانسٹیبل کے اشاروں کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اصل میں چوک کے سپاہی کی اطاعت اس کی اپنی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس نظام کی اطاعت ہوتی ہے جسے خود صدر یا وزیراعظم جاری کرتے ہیں۔ یہاں نظام کی اطاعت اور شخصی اطاعت میں بڑا لطیف فرق ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ نے اپنی ماتحت عدالتوں کی اطاعت کرنے میں اس مقامی قاضی کی شخصی و ذاتی اطاعت نہیں کی بلکہ انہوں نے اس عدالت کی اطاعت کی جو مرکز کے احکامات نافذ کر رہی تھی اور مرکز کے احکامات کی اطاعت تو وہ دونوں حضرات خود بھی فرماتے تھے۔

میرے محترم مستفسر نے بجائے خویش یہ نکتہ اعتراضاً پیش فرمایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی حکومت اور سیکولر حکومتوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ سیکولر حکومت میں قانون تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی حکومت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ قانون کی

مخالفت کرنے اور حدود سے تجاوز کرنے کے بعد اس حکومت میں نہ کہ را منزلت ماشد نہ را۔ وہاں تو یہ حکم ہے ولا تاخذكم بهما رافة في دين الله (۲/۲۴)(اے رسول، مجرمین کے معاملہ میں قانون خداوندی کے مطابق سزا دینے میں ذرا نرمی نہ کی جائے۔ یہ دونوں حضرات حضورﷺ کے تربیت یافتہ تھے جو کچھ انہوں نے کہا یہ اسی کا اثر تھا جو انہیں حضورﷺ سے تربیت میں ملا تھا کیونکہ حضورﷺ نے ہمیشہ بشریت اور رسالت کا باریک فرق پیش نگاہ رکھا جس کی بے شمار مثالیں، تاریخ میں ملتی ہیں اور جس سے ہمارے علماء کرام خوب واقف ہیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محدث'' کی خدمتِ عالیہ میں

کمترین راقم سطور کا مضمون جو 'طلوع اسلام' کی اشاعت نومبر 2005ء میں طبع ہوا تھا اس میں اس کمترین نے پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کے نام نامی واسم گرامی کے ساتھ پروفیسر کے علاوہ بریکٹ میں مولوی کا لقب بھی قدرے از راہِ تفنن اور قدرے برائے عزت وتوقیر تحریر کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں جناب پروفیسر صاحب موصوف نے اپنے پورے مضمون میں میرے نام کے ساتھ مولوی کا لقب تحریر کیا ہے۔ مجھے اس بات سے تعجب اور خوشی ہوئی کہ حضرت کی Sense of Humour بہت اچھی ہے اور مولویوں کی سی یبوست طاری نہیں ہے۔ انہوں نے پورا Desired Effect دیا ہے اور پورے مضمون میں مجھے اچھی طرح رگیدا اور میری پوری خبر لی۔ میرا خدا گواہ ہے مجھے اس لقب سے کوئی عار نہیں۔ لیکن چونکہ میری ابتدائی زندگی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گذری اور زندگی کا بیشتر حصہ سول سروس میں گذرا' اس لئے میں مجبوراً علماء کی معاشرت اور لباس اختیار نہیں کر سکا اور اسی وجہ سے علماء کے زمرہ میں شامل ہونے کا شرف بھی حاصل نہیں کر سکا۔ اس لئے مولوی کا لقب نام کا جزو نہیں بن سکا۔ اب حضرت نے جو کرم فرمائی میرے ساتھ کی ہے اس کے لئے ان کا ممنون ہوں۔

مضمون مطالعہ کرنے کے بعد سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ محترم پروفیسر صاحب کے دل میں پرویز صاحب کے خلاف ایک گہری خلش ہے جس کا اظہار بار بار ان کے مضمون میں ہو رہا ہے۔ کمترین راقم سطور نے اپنے مضامین میں پرویز صاحب کا ذکر

نہیں کیا۔ قرآن کریم شخصیت پرستی کے سخت خلاف ہے۔ طلوع اسلام کا لٹریچر تو خصوصاً قرآن کریم کے اس پہلو کو خوب خوب نمایاں کرتا ہے۔ رسالہ 'طلوع اسلام' میں 'شخصیت پرستی' نام کا جامع مضمون بھی کئی بار طبع ہوا تھا' جس میں شخصیت پرستی کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ پرویز صاحب خود بھی بار بار اپنے متعلق یہ بات واضح کرتے رہے کہ ان کا کوئی قول حرفِ آخر نہیں ہے۔ راقم سطور نے اس معاملہ میں مزید احتیاط سے کام لیا کہ جب بھی کسی نظریہ کی وضاحت کرنی ہوتی تو اس کو ہمیشہ طلوع اسلام کی طرف منسوب کرتا رہا کہ اس بارے میں طلوع اسلام کا یہ نظریہ ہے اور خود پرویز صاحب کے نام کو تحریر کرنے کو Avoid کرتا رہا۔ ہمیشہ یہی تحریر کیا کہ اس بارے میں طلوع اسلام کا یہ نظریہ ہے۔ اس لئے پروفیسر صاحب موصوف کو جو کچھ تحریر کرنا تھا بہتر یہی تھا کہ وہ اسی راقِم سطور کو اپنا ہدف بناتے' پرویز صاحب کو درمیان میں لانا ضروری نہیں تھا کیونکہ طلوع اسلام جو قرآنی مزاج بناتا ہے اس میں شخصیت پرستی کی رمق بھی باقی نہیں رہتی۔

دوسرا تاثر وہی اصل موضوع یعنی وحی خفی کو ثابت کرنے سے گریز اور فرار کی راہ اختیار کرنا۔

میں نے اپنے متعلق تحریر کیا تھا کہ میں طبعاً مناظر نہیں ہوں اور میری روح مناظرہ سے ابا کرتی ہے۔ منظور و مقصود صرف احقاقِ حق و ابطالِ باطل یعنی حدیث شریف کے بارے میں قرآن کریم کا موقف واضح کرنا ہے۔ حضرتِ اقدس نے بھی جواباً یہی تحریر فرمایا کہ وہ بھی مناظر نہیں ہیں'' اور صرف دینی ذوق کی بنا'' پر کھلے دل سے ہر مکتبِ فکر کا مطالعہ فرماتے ہیں''۔ مگر جناب کے مضمون سے یہ تیسرا تاثر ملتا ہے کہ جناب اس غلط فہمی میں میری طرح سے مبتلاء ہیں اور جناب کی طبع مناظرہ سے خوب میل کھاتی ہے اور جناب کو دوسرے شخص کو Corner کرنے میں خوشی و لذت محسوس ہوتی ہے۔ جب ہی تو جناب نے میری گذارشات و معروضات کو' جو بہت صدق دلی' اخلاص و محبت سے تحریر کی

گئی تھیں، مناظرانہ انداز میں دس نکتوں میں تقسیم فرمایا۔ پھر ان دس نکات کا خوب خوب آپریشن فرمایا لیکن اصل موضوع کی طرف دوسرے حضرات کے مضامین کے حوالہ جات دینے کے باوجود خود ایک لفظ بھی اس بارے میں تحریر نہیں فرمایا۔ لیکن حضرت نے اپنے اس رویہ سے اس ہیچ مدان کو یہ موقع فراہم فرمادیا کہ یہ بھی نکات قائم کر کے، براہ راست جناب سے جواب کا متدعی ہو اور اس طرح گریز و فرار کی راہ مسدود کر کے، جناب کو اس موضوع پر کچھ رقم کرنے پر مجبور کر دے۔ جناب نے دس نکات قائم فرمائے تھے۔ گو میں اس سے زیادہ نکات (Issues) قائم کر سکتا تھا لیکن چونکہ میں از راہ انکسار و فروتنی اس بات کا احساس قائم رکھنا چاہتا ہوں کہ میں حضرت سے ہر بات میں کمتر و فروتر ہوں اس لئے میں نے صرف 9 نکات قائم کئے ہیں۔ البتہ میری Privilege صرف اتنی ہے کہ میرا موقف قرآن کریم کے مطابق ہے۔ اب حضرت کا فرض ہے کہ احقاق حق کی خاطر ان نکات کا جواب تحریر فرمادیں تاکہ وحی خفی کے متعلق مختلف دعاوی و نظریات کی وضاحت ہو جائے۔

یہاں تک تو لگا لائے ہیں ہم منزل پہ ناصح کو
کہ سمجھاتا ہوا، اب تا درِ میخانہ آتا ہے

مزید یہ کہ جناب سے یہ بھی مودبانہ درخواست ہے کہ اس کمترین کی اس جرأت و جسارت کو معاف فرماتے جائیں اور اب مضمون میں گریز کی راہ اختیار نہ فرمائیں۔ اب متعلقہ نکات پیش خدمت کئے جاتے ہیں۔

(1) وحی صرف جلی ہے۔

وحی کی ایک قسم کو خفی ماننا اور اس کو قرآن کے باہر تسلیم کرنا قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ وحی صرف جلی ہے جبکہ حضورﷺ کو حکم تھا کہ وحی کو انسانیت تک ضرور بالضرور پہنچادیں اور اس کو مخفی نہ رکھیں۔ وحی کا نزول اگر چلتی تلواروں میں بھی ہوتا تھا تو حضورﷺ کا فرض تھا

کہ اس کو اسی وقت پہنچا دیں۔ چنانچہ حضورﷺ کو حکم الٰہی تھا۔

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ (5/67)۔

اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے۔ پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے اس کا کوئی پیغام نہیں پہنچایا۔

وحی الٰہی کی تبلیغ حضورﷺ پر ایسی فرض تھی کہ کسی حال میں بھی اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن حدیثوں کی یہ پوزیشن نہیں تھی۔ حدیثیں صرف حیا یا دل جوئی کے خیال سے روکی جا سکتی تھیں۔ حضورﷺ کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ کھانا تیار ہونے سے کافی عرصہ پہلے ہی آ جاتے تھے اور کھانا ختم کرنے کے بعد بھی حضورﷺ کے گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ جو اگرچہ حضورﷺ کو گراں گزرتا تھا۔ اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع فرما دیتے تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن آپ شرم و حیا کی وجہ سے ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے لیکن جب یہی بات قرآن کریم میں نازل ہو گئی' تو اس وقت اس بات کے بیان میں حیا آپ کو مانع نہ ہو سکی اور اس کا فوری طور پر پہنچا دینا حضورﷺ پر فرض ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی کو تو حضورﷺ کسی حال میں بھی خفیہ رکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ وحی رسول کی ملکیت نہیں ہوتی' یہ ساری انسانیت کے لئے ہوتی ہے۔ وحی خفی کا تصور ہی باطل اور غلط ہے۔

(2) وحی صرف متلو ہے۔

ہمارے علماء کرام وحی کو دو قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔ ایک وحی متلو جو قرآن کریم میں محفوظ ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے۔ دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کے باہر ہے جس کی تلاوت نہیں کی جا سکتی۔ مگر قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وحی ساری کی ساری متلو ہوتی ہے لہٰذا قرآن کے اندر محفوظ ہے۔

کذلک ارسلناك فی امة قد خلت من قبلها امم لتتلوا علیهم الذی اوحینا الیک وهم یکفرون بالرحمن (13/30).

اے رسول اسی طرح ہم نے تم کو اس امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے اور بہت سی امتیں گذار چکی ہیں تا کہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو ہم نے تمہیں وحی کیا ہے۔

اس آیت کریمہ سے واضح اور ثابت ہے کہ مطلق مایوحیٰ متلو ہے جس کی تلاوت حضورﷺ فرمایا کرتے تھے اور وحی ساری متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ غیر متلو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وحی غیر متلو ہو ہی نہیں سکتی۔

(3) وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔

وحی کی ایک بنیادی خصوصیت جو متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے یہ ہے کہ اس کی مثل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس بارے میں قرآن کریم کی واضح نص موجود ہے کہ وحی کی مثل نہیں لائی جا سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورة من مثله (2/23).

اور اگر تم شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے کے اوپر اتاری ہے' پس لے آؤ ایک سورۃ اس کے مانند۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے ایک واضح معیار مقرر فرما دیا ہے کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔ باقی ہر چیز کی مثل بن سکتی ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں توجہ طلب اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آیت میں معارضہ صرف قرآن کریم کا نہیں کیا گیا ہے کہ کفار قرآن کا مثل نہیں لا سکتے بلکہ آیت ہذا میں معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے چونکہ یہاں ما تعیم کا ہے جس کے

معنی ہیں کہ معارضہ ہر اس چیز کا کیا گیا ہے جو کچھ بھی نازل کی گئی ہے۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے کے بعد ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے جس کا مثل ونظیر نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ کوئی چیز بے مثل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ روایات بھی بے مثل نہیں ہیں اور ہر قسم کی روایات کتب احادیث میں چلی آ رہی ہیں اور واضعین نے ان کی مثل بنا کر کتب میں داخل کر دیا ہے۔

(4) وحی قطعی ہوتی ہے ظنی نہیں ہو سکتی۔

ایمان وعمل کی ساری عمارت یقین پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں ذرا سا بھی شک وترددواقع ہو جائے تو اس پر دل جمعی کے ساتھ ایمان ویقین نہیں لایا جا سکتا اور انسان اضطراب وکشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا تو وحی کو محفوظ اور منضبط شکل میں رکھنے کا بھی وعدہ اور اہتمام فرمایا تا کہ ہر شخص یقینی طور پر ایمان لا سکے۔ قرآن کے علاوہ ہر چیز ظنی ہے اور ظن پر تو ایمان لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس پر کسی شخص کی بھی طبیعت مطمئن نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ان الظن لا یغنی من الحق شئیاً (53/28)۔
تحقیق گمان نہیں کفایت کرتا حق سے۔

نیز ارشاد ہوا۔

یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم (49/12)۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو بچو بہت گمانوں سے، تحقیق بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

ان واضح آیات کے باوجود جن میں مومنین کو ظن سے بچنے کی ہدایت ہے۔ کیا خود اللہ تعالیٰ

انسانوں کو اس حالت پر مجبور کرتا کہ اس کے ایمان و یقین کی بنیاد واضح نہ ہو اور اس سے کسی غیر واضح اور غیر متعین چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جاتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یقیناً وحی قطعی اور یقینی ہی ہوسکتی ہے اور وہ صرف قرآن کریم ہے۔ روایات اس مقام پر نہیں ہو سکتیں کیونکہ روایات کے مشہور جامعین بھی اس کے ظن ہونے پر متفق ہیں جبھی تو روایات کے آخر میں کما قال علیہ السلام تحریر کیا جاتا ہے۔

(5) وحی کے کسی حصہ کو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

پوری اور مکمل وحی پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے چنانچہ ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہے۔

افتومنون بعض الکتاب و تکفرون ببعض (2/85).

کیا پس ایمان لاتے ہو ساتھ بعض کتاب کے اور کفر کرتے ہو بعض کے ساتھ۔

وحی کے بعض حصہ پر ایمان لانا اور بعض پر ایمان نہ لانے سے ایمان درست نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن کریم کی کسی ایک آیت کا بھی انکار کردیا جائے تو وہ کفر کے مرادف ہے اس کے برعکس روایات کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ ان سب پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ مختلف فرقوں کی روایات اور کتب روایات بھی بالکل مختلف ہیں۔ کوئی فرقہ کچھ روایات کو درست مانتا ہے اور بعض کچھ دوسری کو۔ جو حضرات خارج از قرآن وحی کے قائل ہیں وہ بھی ہر روایت پر ایمان لانا ضروری نہیں خیال کرتے۔

(6) حصر تعلیم۔

اللہ تعالیٰ کی تعلیم صرف قرآن کریم ہے۔ یعنی منجانب اللہ حضور ﷺ کی طرف کوئی اور تعلیم نہیں آئی۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وما علمنه الشعر وما ینبغی له ان هو الا ذکر و قران مبین (36/69).

اور نہیں تعلیم دی ہم نے اس اپنے رسول کو کسی شعر کی کیونکہ شعر اس کے لائق نہیں ہے۔اس لئے نہیں ہے وہ تعلیم ہماری سوائے ذکر یعنی قرآن مبین کے۔

اس آیۂ کریمہ میں ان ھو الا ذکر و قرآن مبین سے واضح ہے کہ من جانب اللہ حضورﷺ کو صرف قرآن تعلیم کیا گیا تھا۔کیونکہ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین میں الا کلمۂ استثنا ہے اور مستثنیٰ منہ مذکور نہیں ہے۔اہل علم پر اور پروفیسر صاحب محترم پر یہ مخفی نہیں کہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو تو مستثنیٰ اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور الا کلمۂ استثنا وہاں حصر کا فائدہ دینے لگتا ہے جس سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو بجز قرآن مبین کے اور کوئی تعلیم نہیں دی جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم کا حصر فرما دیا تو اس حصر کے ہوتے ہوئے قرآن کے علاوہ وحی نازل ہونے کا خیال تک نہیں ہونا چاہئے۔

اس آیۂ کریمہ میں نفی و اثبات کے حصر کے ساتھ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضورﷺ کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن ہے اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کے متعلق نفی کی گئی ہے کہ جو بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف ذکر یعنی قرآن ہے۔ذکر کی وضاحت خود قرآن نے سورہ حٰم سجدہ میں یوں فرمائی کہ۔

ان الذین کفروا بالذکر لما جاء ھم و انہ لکتٰب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (41/41)۔

جن لوگوں نے نصیحت کو جب وہ ان کے پاس آئی نہ مانا (وہ اپنا نتیجہ دیکھ لیں گے) اور یہ قرآن تو یقینی ایک عالی رتبہ کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی پھٹک سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے اور خوبیوں والے دانا (خدا) کی بارگاہ سے نازل ہوئی ہے۔

اس آیۂ کریمہ نے ذکر کی وضاحت کر دی کہ ذکر قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ البتہ ایک اشکال یہاں ذکر اور قرآن کے درمیان والی واؤ کا بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اس لئے قرآن اور ذکر مختلف دو چیزیں ہیں۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ یہ واؤ عاطفہ نہیں ہے بلکہ یہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

هو الذى ارسل رسوله بالهدى و دين الحق۔

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دین کے ساتھ بھیجا۔

اگر اس آیۂ کریمہ میں واؤ کو عاطفہ قرار دیا جائے جو مغائرت کی متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور شے ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے جو بالبداہت غلط ہے۔ لہٰذا یہاں واؤ کو واؤ بیانیہ ہی تسلیم کرنا ہوگا۔ اسی طرح ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ بیانیہ تفسیریہ ہے جس کے معنے ہیں کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم صرف ذکر یعنی قرآن کیا گیا ہے۔

(7) ما یوحیٰ اور قرآن ایک ہی چیز ہے۔

واتل ما اوحى اليك من كتاب ربك لا مبدل لكلمٰته (18/27)۔

اور پڑھ جو کچھ وحی کی گئی ہے طرف تیری، کتاب پروردگار تیرے سے نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کو ( )۔ شاہ عبدالقادر۔

انما امرت ان اعبد رب هذه البلدة الذى حرمها وله كل شئى وامرت ان اكون من المسلمين وان اتلوا القرآن (27/92)۔

مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے مالک کی عبادت کروں جس نے

اسے عزت حرمت دی ہے اور ہر چیز اسی کی ہے اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کے فرمانبرداروں میں سے ہوں اور یہ کہ میں قرآن پڑھا کروں۔

پہلی آیت میں ما اوحی کی تلاوت کا حکم ہے اور دوسری آیت میں قرآن کریم کی تلاوت کا حکم ہے جس سے ظاہر ہے کہ ما اوحی اور قرآن ایک چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں اور ما اوحی صرف قرآن ہے۔ نیز یہ کہ پہلی آیت میں من بیاتیہ ہے۔ کسی طرح بھی تبعیفیہ نہیں ہو سکتا۔

(8) کتاب اور ما انزل ایک ہی چیز ہے۔

هذا كتاب انزلنه مبرك فاتبعوه واتقوا لعلكم ترحمون (6/155).

اور یہ کتاب جس کو ہم نے نازل کیا برکت والی کتاب ہے تو تم لوگ اس کی پیروی کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

اتبعوا ما انزل اليكم من ربكم ولا تتبعوا من دونه اولياء (7/3).

جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

پہلی آیۂ کریمہ میں کتاب کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری آیت میں ما انزل الیکم کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ صرف الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ رکھا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ ما انزل صرف کتاب ہے۔

(9) منزل من اللہ صرف کتاب ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتب و مھیمنا علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللہ (5/48).

اور اے رسول ہم نے تم پر بھی کتاب برحق نازل کی جو کتاب پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان ہے تو جو کچھ خدا نے تم پر نازل کیا ہے۔ اس کے مطابق تم بھی حکم دو۔

اس آیت کریمہ میں کتاب کی وضاحت خود بما انزل اللہ نے کر دی کہ کتاب سے مراد ما انزل ہے اور ما انزل اللہ سے مفہوم کتاب ہے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

چونکہ صدر مضمون میں وعدہ کیا گیا تھا کہ راقم سطور حضرت کی برابری نہیں کرنا چاہتا' اس لئے حضرت سے فروتر اور کمتر ہونے کی وجہ سے صرف ان 9 نکات پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور عقلی دلائل جو ان میں شامل نہیں کئے گئے' ان میں سے چند پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

قرآن کریم یقیناً یقیناً وحی الٰہی ہے۔ اگر احادیث بھی وحی الٰہی ہیں اور حضورﷺ کا قول نہیں ہیں' تو حضورﷺ کے ذاتی بشری اقوال کون سے باقی رہ جاتے ہیں۔ کیا حضورﷺ نے اپنی نبوت کے 23 سال کے دوران کبھی اپنی غور و فکر سے گفتگو نہیں فرمائی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی (12/108).

میں لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا ہوں' میں اور میرا پیرو دلائل کے ساتھ۔

ظاہر ہے کہ حضورﷺ جو دلائل پیش فرماتے تھے وہ حضورﷺ کی غور و فکر کا نتیجہ ہوتے تھے' اس میں وحی خفی کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حضورﷺ مختلف امور کے فیصلے فرماتے

تھے۔ ان فیصلوں کے نتائج حضورﷺ کی اپنی فہم و فراست سے مستخرج ہوتے تھے۔ ان کو وحی خفی سے کیا علاقہ۔

قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ اس کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر حدیث شریف بھی وحی الٰہی ہے تو اس سے حضورﷺ کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے۔ حالانکہ عام نظریہ یہ ہے کہ حدیث شریف سے حضورﷺ کی اطاعت ہوتی ہے۔ ایک وحی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور دوسری وحی سے رسول اللہ کی اطاعت' بھلا یہ تفریق کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جنہیں ہم احادیث کہتے ہیں' یہ احادیث ہیں ہی نہیں یہ تو روایات ہیں اور رواۃ کے اپنے الفاظ ہیں۔ ہمارے علمائے کرام بمعہ پروفیسر موصوف احادیث کے بالمعنی منقول ہونے کے معترف ہیں۔ یہ الفاظ Narrated ہیں جب ہی تو روایات کے بعد او کما قال علیہ السلام لکھا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام خود یہ مانتے ہیں کہ یہ حضورﷺ کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ رواۃ کے الفاظ ہیں۔ تعجب اور ہزار تعجب ہے کہ رواۃ کے یہ الفاظ وحی الٰہی کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ چند فقرے وضع کر کے' انہیں حضورﷺ کی طرف منسوب کر کے' ان کی اطاعت سے حضور کی اطاعت نہیں ہو جاتی۔ بلکہ ان کی اطاعت سے اس راوی کی اطاعت ہوتی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔ جرح و تعدیل کے بعد محدثین کرام نے جن روایات کو موضوع قرار دیا ہے ان کی اطاعت سے ان رواۃ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس سے حضورﷺ کی اطاعت کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔

حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ مضمون بہت مختصر Pirecise اور مرتکز بہ موضوع رہے' حشو و زوائد سے پاک رہے تاکہ جواب میں اصل موضوع ہی زیر بحث آ سکے اور فرار کی راہ مسدود رہے۔

وھھنــا تــم مــنــا الـکـلام
عـلـی مـصـطـفـنـا الوف سلٰم

☆☆☆

محمد عربی کہ آبروئے ہر دوسرا است
کسے کہ خاکِ درش نیست خاک برسرِ او

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رجم کی سزا خلاف قرآن ہے

جیسا کہ قارئین کرام کو معلوم ہے کہ مشہور ٹی۔وی چینل ''جیو'' پر حدود آرڈیننس کے سلسلہ میں ''ذرا سوچئے'' کے عنوان سے ایک مذاکرہ مورخہ ۱۱ جون کو منعقد ہوا تھا جس میں معروف علماء کرام نے حصہ لیا۔ اس مذاکرہ کے دوران یہ بھی بتایا گیا کہ اس قسم کی Debate آئندہ بھی ہوا کریں گی۔ مختلف فیہ امور پر کھلی بات کرنا اور صائب مشورے دینا بہت اچھی بات ہے۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ اس چینل نے ایک اچھی روایت کی ابتداء کر دی ہے۔ اسی مباحثہ کے دوران جو ترمیمات وتجاویز پیش کی گئیں ان سے بھی خوشی ہوئی لیکن اس بات کا سخت افسوس ہے کہ واقعاً جو Core-Issue ہیں وہ اسی طرح برقرار رہنے دیئے گئے۔ جس سے اس مباحثہ کی افادیت بالکل ختم ہو گئی۔ جرم زنا کے سلسلہ میں چار گواہوں کی شہادت پر اس مباحثہ میں اتفاق کر لیا گیا لیکن میرے نزدیک یہ بات بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ یہ موضوع ایک پورے مضمون کا متقاضی ہے جس کے بارے میں راقم سطور کے دو مضامین ایک ماہنامہ صوت الحق بابت ماہ جولائی ۲۰۰۵ء اور دوسرا رسالہ طلوع اسلام بابت اگست ۲۰۰۵ء میں طبع ہو چکا ہے۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ان مضامین کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ان مضامین کا ملخص وہی تھا کہ سورۃ نساء کی آیات ۱۵'۱۶ جن پر سے ہمارے علماء کرام چار گواہوں کی شرط مستنبط کرتے ہیں وہ جرم زنا سے متعلق ہیں ہی نہیں کیونکہ (۱) کسی بھی جرم کی ایک ہی سزا ہو سکتی ہے۔ ایک جرم کی دو مختلف سزائیں نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کریم نے سورۃ نور میں جرم زنا کی سزا سو کوڑے مقرر فرما دی ہے۔ لیکن یہاں فاحشہ کی سزا ''پابند مسکن'' کرنا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ زنا کا جرم نہیں ہے کیونکہ ایک

جرم کی دو مختلف سزائیں یعنی کہیں کوڑے مارنا اور کہیں ''پابند مسکن'' نہیں ہو سکتیں۔(۲) زنا کے ارتکاب کے لئے مرد اور عورت دونوں کا ہونا ضروری ہے۔لیکن اس آیت میں صرف عورتوں کا ذکر ہے۔مردوں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ یہ کیسی زنا ہے جس میں مرد موجود ہی نہیں۔ بغیر مرد کے ارتکاب زنا کی وضاحت ہمارے علماء کرام ہی فرما سکتے ہیں۔ان دو وجوہات کو تحریر کرنے کے بعد آیات کا صحیح مفہوم تحریر کیا گیا تھا کہ یہ دونوں متصلہ آیات لواطت وسحاقت سے متعلق ہیں ان کا جرم زنا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویسے بھی عقلاً ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اس قدر شنیع فعل کے لئے چار عینی گواہ کس طرح دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہر شخص کو اس بات کا علم ہے کہ میاں بیوی یہ کام سرانجام دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر جوڑا اس کام کو تنہائی میں کرتا ہے۔لوگوں کے سامنے نہیں کرسکتا۔ جب یہ جائز کام لوگوں کے سامنے نہیں کیا جاسکتا تو وہ کون ہوگا کہ اس طرح کا ناجائز کام علی الاعلان کرتا پھرے گا۔ پھر یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ چار متقی پرہیز گار آدمی جو اس فعل کے بعد اس کے گواہ بنیں گے' وہ اس جوڑے کو اپنی آنکھوں کے سامنے یہ کام کرنے کی اجازت ہی کیوں دیں گے' ہر متقی' تزکیۃ الشہود کا حامل مسلمان ان دونوں کو اس کام سے منع کرے گا نہ کہ ان کو اپنے سامنے یہ فعل کرنے کی اجازت دے کر' اس کے گواہ بننے پر آمادہ ہوگا۔

بہرحال اس مضمون کا تعلق مباحثہ کے دوسرے ایشو' رجم سے ہے' جس پر اس مباحثہ میں اتفاق کیا گیا ہے۔ حالانکہ رجم بالکل قرآن کریم کے خلاف ہے۔اس مضمون میں صرف رجم کے متعلق ہی گذارشات پیش کی جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کی رو سے' انسانوں کی آزادی و پابندی کے لئے جو قوانین مقرر فرمائے ہیں' انہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے یہ حدود خدا کی اس وحی نے مقرر کی ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتی تھی۔ الاعراب اشد کفرا و نفاقا و اجدر الا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ (۹/۹۷)' گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ حدود (قاعدے) جو نازل کئے اللہ

نے اپنے رسول پر۔ان حدود سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں۔ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظلمون (۲/۲۲۹' ۴/۱۷' ۶۵/۱)۔ اور جو کوئی تجاوز کرے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی ظالم ہیں' نیز ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔تلک حدود اللہ فلا تقربوھا (۲/۱۸۷)۔ یہ اللہ کی حدود میں جن کے قریب نہ جاؤ۔حدود اللہ کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کرنے سے اجتناب پر قرآن کریم نے اس درجہ زور دیا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں سورہ نور میں زنا کے متعلق جو حد نازل فرمائی گئی ہے۔ہمارے علماء کرام اس حد کو بالکل فراموش کر کے زنا کی سزا اپنی طرف سے مقرر کر دیتے ہیں اور اس طرح افتراء علی اللہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذباً لیضل الناس بغیر علم (۶/۱۴۴)۔پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر بہتان باندھے جھوٹا تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بلا تحقیق۔نیز فرمایا کہ فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عنداللہ (۲/۷۹)۔ پس خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب کو اپنے ہاتھ سے پھر کہہ دیتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے۔جو حضرات بھی قرآن کریم کی مقرر کردہ حد **مـائة جلدة** (سو کوڑے) سے تجاوز کر کے' زنا کی سزا رجم مقرر کرتے ہیں وہ مندرجہ بالا آیات کی رو سے ظالم ہیں' اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے سزا لکھ کر' اس کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اللہ کی حدود کو توڑتے ہیں۔اس تمہید کے بعد اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔اس موضوع میں پہلے قرآن کریم کا حکم پیش خدمت کیا جائے گا اور اس کے بعد ہمارے علماء کرام کا موقف عرض کیا جائے گا۔

سورہ نور میں ارشاد ہوتا ہے۔الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائة جلدة ولا تاخذکم بھما رافة فی دین (۲۴/۲)۔ بدکاری کرنے والی عورت اور مرد سو مارو ہر ایک کو دونوں میں سے سو سو درے اور نہ آوے تم کو ان پر ترس اللہ کے حکم چلانے میں (ترجمہ حضرت شیخ الہند)۔فتح الرحمٰن میں اس کا ترجمہ درج ہے۔زن زنا

کنندہ و مرد زنا کنندہ بزنید ہریکے را از ایشان صد درہ و باید کہ درنگیرد شمارا شفقت بر ایشان درجاری کردن شرع خدا۔ اس آیہ کریمہ کا سلیس اور سریع الفہم ترجمہ اس طرح ہے کہ زانی عورت اور زانی مرد دونوں کو سو سو کوڑوں کی سزا دو۔ (یہ قانون کا معاملہ ہے اس لئے) اس میں کسی قسم کی نرمی نہ برتو۔ آیہ کریمہ اور اس کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔ آیت اس درجہ واضح ہے کہ اس کو سمجھنے کے لئے نہ کسی شان نزول کی ضرورت ہے نہ کسی حدیث و روایت کی۔ اور نہ تصریف آیات کی۔ یہ خود منہ بولتی آیت ہے اور کسی قسم کا ابہام یا اغلاق اس میں نہیں ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی تفریق کر کے شادی شدہ جوڑے کے لئے سنگساری تجویز فرماتے ہیں جبکہ قرآن کریم میں اس تفریق اور اس سزا کا ذکر دور دور تک نہیں ہے۔ علمائے کرام کا موقف بعد میں بیان کیا جائے گا۔ یہاں قرآن کریم کا حکم سو کوڑوں کی سزا کی تائید میں دلائل دیئے جاتے ہیں۔

(۱) **الزانیہ والزانی** (ہر زنا کار عورت اور ہر زنا کار مرد) بالکل واضح الفاظ میں ان دونوں جگہ الف لام استغراق کا ہو یا جنس کا ہر اس شخص کو اپنے تحت لے آتا ہے۔ جس سے زنا کا ارتکاب ہوا ہے۔ اس میں جوان بوڑھا شادی شدہ غیر شادی شدہ۔ سب آ جاتے ہیں اس میں کسی قسم کی کوئی تفریق شادی شدہ و غیر شادی شدہ کی نہیں ہے۔

(۲) آیہ کریمہ میں **کل واحد منهما**۔ ''ہر ایک کو دونوں میں سے'' نے بات کو مزید واضح فرما دیا ہے کہ جو مرد و عورت بھی زنا کرے ان میں سے ہر مرد و ہر عورت کو سو سو کوڑے مارو۔ اس میں پھر شادی شدہ و غیر شادی شدہ کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ ان تین الفاظ نے آیت کو بالکل روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ ہر جوڑے کے ہر فرد کو سو سو کوڑے مارو کسی جگہ کوئی تفریق و تخصیص شادی شدہ و غیر شادی شدہ کی نہیں ہے۔

(۳) قرآن کریم نے سزاؤں کے سلسلہ میں ہمیشہ مجرم کے حالات کو پیش نظر رکھا ہے اس لئے اس نے لونڈیوں کی سزا شریف عورتوں کے مقابلے میں نصف رکھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فاذا احصن فان اتین بفاحشة فعلیھن نصف ما علی المحصنٰت من العذاب (۴/۲۵)۔ جب یہ لونڈیاں تمہارے نکاح میں آ جائیں اور اس کے بعد بے حیائی (زنا) کی مرتکب ہوں تو ان کی سزا آزاد عورتوں سے نصف ہے۔ اس آیہ کریمہ میں حکم دیا جا رہا ہے کہ محصنہ (آزاد شادی شدہ عورت) کو جتنی سزا دی جائے گی کنیزوں ولونڈیوں کو اس سے آدھی سزا دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس میں آزاد عورتوں کی سزا ایسی ہونی چاہئے کہ اس کا نصف ہو سکے تاکہ وہ نصف سزا کنیزوں کو دی جا سکے۔ کوڑوں کی سزا کی صورت میں کنیزوں کو پچاس (۵۰) کوڑے لگائے جائیں گے۔ لیکن اگر رجم کی سزا کو درست تسلیم کر لیا جائے تو رجم کی سزا کو آدھا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس آیت کے مطابق محصنٰت کی سزا ایسی ہونی چاہئے کہ جس کو آدھا کیا جا سکے۔

(۴) ینساء النبی من یات منکن بفاحشة مبینة یضعف لھا العذاب ضعفین (۳۳/۳۰)۔ اے نبی کی بیو یو تم میں سے جو کوئی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو گی تو اسے دوگنی سزا دی جائے گی۔ یہاں ازواجِ مطہرات شادی شدہ ہیں اور ان کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ اگر وہ کبھی بے حیائی کی مرتکب ہوں گی تو انہیں دوگنی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ ازواج مطہرات شادی شدہ تھیں لہٰذا اس آیت میں شادی شدہ عورتوں کو Pin-Point کر دیا گیا۔ اس آیت کی رو سے شادی شدہ عورتوں کے لئے زنا کی سزا ایسی ہونی چاہئے جسے دوگنا کیا جا سکے۔ رجم کی سزا کو دوگنا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کوڑوں کی ہی سزا مقرر ہو سکتی ہے۔ جسے دوگنا کرنا ممکن ہے۔

(۵) سورہ نور کی یہ آیت کریمہ جس میں زنا کی حد کا بیان ہوا ہے اس کے فوری بعد ارشاد ہوتا ہے۔ الزانی لا ینکح الا زانیة اوشرکة والزانیة لا ینکحھا الا زان ادمشرك و حرم ذلک علی المومنین (۲۴/۳)۔ اور زنا کار مرد نہ نکاح کرے مگر زنا کار یا مشرک عورت سے اور زنا کار عورت سے سوائے زنا کار یا مشرک مرد کے اور کوئی نکاح نہ کرے مسلمانوں پر یہ حرام کر دیا گیا ہے۔

اس آیہ کریمہ میں بھی **المزانیته** اور **المزانی** پر الف لام برائے استغراق وتعمیم کے آیا ہے۔اس میں شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ پر زانی مرد وعورت اس میں شامل ہیں۔اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ زنا کار زنا کار یا مشرک سے ہی نکاح کرے اس کے معنے یہ ہیں کہ زنا کار مرد اور عورت زنا کے بعد اسکی بھی اہلیت رکھتے ہیں کہ وہ کسی سے نکاح کر سکیں۔اس سے بخوبی واضح ہے کہ زنا کی سزا سو کوڑے ہے، رجم کرنا نہیں ہے کیونکہ رجم کر دینے کے بعد تو اس بات کا امکان ہی نہیں رہتا کہ کوئی زنا کار مرد یا عورت کسی سے نکاح کر سکے۔

(۶) اس موضوع پر جو آیۂ کریمہ حُجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے اس میں ارشاد ہوتا ہے۔ من قتل نفساً بغير نفس اوفساد فى الارض فكانما قتل الناس جميعاً (۵/۳۲)۔ تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں اس کا ترجمہ تحریر ہے۔''جس کسی نے قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کر دیا''۔حضرتِ اقدس جناب شیخ الہند نے ترجمہ فرمایا ہے'' جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلاعوض ایک جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں، تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو''۔تمام تراجم اسی طرح ہیں اور واضح ہیں۔کوئی ابہام ان میں نہیں ہے۔میں اس کا ترجمہ مزید سلیس اور سریع الفہم عرض کرتا ہوں۔''جو کسی ایسے شخص کو قتل کرے گا جس نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو اور نہ ہی زمین میں کوئی فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا''۔یہ آیۂ کریمہ بطور ایک واضح اصول وحکم کے نہایت روشن و درخشندہ ہے۔اس آیہ کریمہ میں کسی ایک فرد کے قتل کرنے کو ساری انسانیت کے قتل کے مرادف بیان کیا گیا ہے اور قتل انسانی کی حد درجہ مذمت کر دی ہے۔اس سے زیادہ پر زور اور پراثر انداز شاید ہی کوئی دوسرا ہو سکے۔لیکن کسی کو بھی قتل نہ کرنے کے سلسلہ میں یہاں صرف دو استثناء (Exceptions) دی گئی ہیں۔ایک تو قاتل کو قتل کے بدلے میں قتل کرنے کی اجازت ہے (۶/۱۵۳)۔اور دوسرے باغی کو قتل کرنے کی اجازت ہے (۵/۵۳)۔اس آیت کی یہ دونوں رخصتیں آیات (۶/۱۵۳، ۵/۳۳) میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔اس کے علاوہ اور کسی حال

میں بھی، کسی جرم کے بدلے، کسی فرد کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت نے ایک ایسا حصر قائم کر دیا ہے جس کو کسی حال میں توڑا نہیں جا سکتا۔ اس آیہ کریمہ کے پیش نظر ان دو افراد (قاتل و باغی) کے علاوہ کسی اور کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ فلہٰذا زانی کا قتل کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے اور کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔

یہاں تک قرآن کریم کا حکم واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے لئے ترتیب وار چھ (٦) دلائل پیش خدمت عالی ہوئے ہیں۔ جو اس درجہ مستحکم ہیں کہ ان سے گریز کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی۔ جہاں تک رجم کا تعلق ہے تو نفسِ مضمون یہاں ختم ہو جاتا ہے اور مزید دلائل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ البتہ ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن کریم میں حد زنا اس درجہ واضح ہے تو پھر رجم کی سزا ''شریعت حقہ'' اور ''شرع شریف'' میں کہاں سے گھس گئی ہے۔ حضرت العلام حافظ محمد اسلم مرحوم جیراجپوری کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے تیرہ سو سال سے سر پھٹول میں مصروف ہیں اور ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو باطل ٹھہراتا ہے لیکن اگر کبھی بھی کسی مسئلہ میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے اتفاق کیا ہے تو وہ ہمیشہ قرآن کے خلاف ہی کیا ہے۔ قرآن کی مخالفت میں مسلمانوں کے سب فرقے اتفاق کر لیتے ہیں۔ یہی حال رجم کا ہے صدر اول کے مسلمان فرقے، معتزلہ، خوارج، چند زیدیہ وغیرہ جو اب سب منقرض ہو چکے ہیں، ان کو چھوڑ کر، موجودہ تمام فرقوں کا رجم پر اجماع و اتفاق ہے۔ اس سوال کا جواب کہ رجم کی سزا شریعت میں کہاں سے آ گئی اس کے لئے علماء کرام کا موقف بیان کرنا ضروری ہے۔

رجم کی سزا کا کلی مدار صرف روایات شریف پر ہے اور اس کا قرآن سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ روایات جن سے رجم کا حکم ثابت ہوتا ہے وہ پیش خدمت کی جاتی ہیں۔

(۱) عن عائشته قالت لقد نزلت آية الرجم و آيه رضاعة الكبير عشراً

و لقد کانتا فی صحیفة تحت سریری فلما مات رسول الله و تشا غلنا بموته دخل راحن فاکلها۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آیتِ رجم آیت رضاعة الکبیر عشراً نازل ہوئی تھیں۔ وہ میرے تخت کے نیچے ایک صحیفہ میں تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے اور ہم ان کی موت کی وجہ سے مصروف ہو گئے تو بکری داخل ہوئی اور انہیں کھا گئی۔

(۲) رجم کے سلسلہ میں جو زیادہ مشہور روایت ہے وہ حضرت عبادہ بن صامت سے ان الفاظ میں مروی ہے اور یہ روایت صحیح مسلم' جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں بیان ہوئی ہے۔

عن النبی صلی الله علیه وسلم خذوا عنی قد جعل الله لهن...... الخ

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے یہ حکم لے لو کہ اللہ تعالیٰ نے زنا کار عورتوں کے لئے ایک راہ نکال دی ہے۔ کنوارا اگر کنواری کے ساتھ زنا کرے تو (۱) سو کوڑے مارو (۲) اور ایک سال کے لئے شہر بدر کر دو اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو (۱) سو کوڑے مارو اور (۲) رجم کرو۔ اس روایت میں شادی شدہ زانی اور غیر شادی شدہ زانی دونوں کے لئے دو دو سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ دونوں سزائیں کس طرح دی جائیں۔ بیک وقت دی جائیں یا الگ الگ' اس بارے میں علماء کرام کا یہ نظریہ ہے کہ **جلد** اور **رجم** دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتے کیونکہ حدیث میں کوڑے مارنے کی جو سزا مقرر ہوئی ہے وہ حضور ﷺ اور صحابہؓ کے عمل سے منسوخ ہو گئی ہے۔ شادی شدہ جوڑے کے لئے صرف رجم کی سزا مقرر ہے۔

(۳) ترمذی شریف میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ:

حضورؐ نے رجم کیا اور ابوبکرؓ نے رجم کیا اور خود میں نے رجم کیا۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں کتاب اللہ میں کسی اضافہ کو پسند نہیں کرتا تو میں اسے مصحف میں لکھ دیتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ بعد میں آئیں گے تو وہ اس حکم کو کتاب اللہ میں نہ پائیں گے اور اس طرح کفر کے مرتکب ہوں گے۔ (جمع الفوائد' جلد دوم' صفحہ

۲۸۵)۔

اس حدیث کو خود ہمارے علماء کرام ہی درست قرار نہیں دیتے کیونکہ اس حدیث میں رجم کے انکار کو کفر قرار دیا گیا ہے جبکہ ہمارے علماء کا اتفاق ہے کہ رجم کا انکار کفر نہیں ہے۔ بلکہ رجم کے منکر کو گمراہ کیا گیا ہے۔

(۴) عن ابن عباس قال قال عمر قد خشیت ان یطول بالناس زمان حتی یقول قائل لا نجد الرجم فی کتاب .... الخ

ابن عباس راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ جب لوگوں پر کچھ زمانہ گذر جائے گا تو وہ وقت آ جائے گا کہ کہنے والے کہنے لگیں گے کہ رجم کا ذکر اللہ کی کتاب میں تو ہم کہیں نہیں پاتے اور اس طرح وہ خدا کے ایک فریضہ کو جو اس نے نازل فرمایا تھا ترک کر کے گمراہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ ہم نے خود یہ آیت تلاوت کی ہے۔ الشیخ و الشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ۔

میری حیثیت بہت پست ہے میں اپنے کو اس مقام پر نہیں سمجھتا کہ اس حدیث پر کوئی تبصرہ کروں۔ میرا مرتبہ چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مراوف ہوگا۔ اس لئے اس حدیث پر جو مفصل تبصرہ تفسیر ''تدبر قرآن'' میں تحریر کیا گیا ہے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اگر چہ یہ تبصرہ قدرے طویل ہے لیکن اس حدیث کے بارے میں بہت اہم اور سدید ہے۔ تحریر ہے:

''اس روایت پر غور کیجئے تو ہر پہلو سے یہ کسی منافق کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور مقصود اس کے گھڑنے سے قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ ٹھہرانا اور سادہ لوحوں کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا کرنا ہے کہ قرآن کی بعض آیات قرآن سے نکال دی گئی ہیں۔

سب سے پہلے اس کی زبان پر غور کیجئے۔ کیا کوئی سلیم المذاق آدمی اس کو قرآن کی ایک آیت قرار دے سکتا ہے۔ اسکو تو قول رسول قرار دینا بھی کسی خوش ذوق آدمی کے لئے ناممکن ہے چہ جائیکہ قرآن حکیم کی آیت۔ آخر قرآن کے مخمل میں اس ٹاٹ کا

پیوند آپ کہاں لگائیں گے۔قرآن کی لاہوتی زبان اور افصح العرب والعجم کے کلام کے ساتھ اس عبارت کا کیا جوڑ ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کی ایک آیت تھی تو اس کو نکال کس نے دیا جب کہ اس کا حکم یعنی سزائے رجم باقی ہے۔آیت کو نکال دینے اور حکم کو باقی رکھنے کا آخر کیا تُک ہے۔اگر یہ قرآن کی ایک آیت تھی اور نکال دی گئی تو یہ اس بات کا ثبوت ہوا کہ رجم کا حکم پہلے تھا پھر منسوخ ہو گیا۔پھر اس سے رجم کے حق میں استدلال کے کیا معنی؟

تیسری بات یہ ہے کہ اس کو اگر صحیح باور بھی کر لیجئے جب بھی اس سے ہمارے فقہاء کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ان کو ثبوت چاہئے شادی شدہ زانی کے رجم کا اور اس میں حکم بیان ہوا ہے بوڑھی زانیہ اور بوڑھے زانی کا۔ہر شادی شدہ کا بوڑھا ہونا تو ضروری نہیں ہے۔پھر دعویٰ اور دلیل میں مطابقت کہاں رہی۔

بہر حال یہ روایت بالکل بیہودہ روایت ہے اور ستم یہ ہے کہ اس کو منسوب حضرت عمرؓ کی طرف کیا گیا ہے۔حالانکہ ان کا عہد مبارک میں اگر کوئی یہ روایت کرنے کی جرات کرتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان کے درے سے نہ بچ سکتا۔ہمارے فقہاء میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ جب وہ اپنے حریف سے مناظرہ پر آتے ہیں تو جو اینٹ پتھر ان کے ہاتھ آ جائے وہ اس کے سر پر دے مارتے ہیں۔پھر یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی زد خود دین پر کہاں تک پڑتی ہے۔

رجم کے ثبوت میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ یہی ہیں اور ان کا جو حال ہے وہ اوپر بیان ہو چکا''۔(تدبر قرآن کا اقتباس یہاں ختم ہوتا ہے)۔

یہ تبصرہ بہت جامع ہے اور ایک مستند عالم دین اور مفسر قرآن کا تحریر کردہ ہے۔یہ تبصرہ صرف اس حدیث تک محدود نہیں ہے بلکہ اصل تبصرہ فقہاء کرام کی ذہنیت پر اور روایات کے حد درجہ ظنی اور مشکوک ہونے پر ہے۔

● آپ کے سامنے مسئلہ رجم کے بارے میں قرآن و حدیث کے موقف پیش کر دیئے گئے۔ جس سے آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا کہ ''شریعت حقہ'' میں رجم کی سزا کیسے داخل ہو گئی۔ اس کے بعد آپ خود اس مسئلہ کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجنت

موت کے بعد طبعی زندگی کا ساز و سامان تو یہاں ہی رہ جائے گا' اور صرف انسانی ذات آگے جائے گی' جس ذات کی نشوونما ہوگئی ہوگی وہ زندگی کی ارتقائی منزل میں داخل ہو جائے گی۔ قرآن کریم کی رو سے یہ جنت کی زندگی ہے۔ ہم سب مسلمانوں کا اس پر ایمان ہے کہ آخرت میں جنت و جہنم کی زندگی ہوگی۔ اس پر ایمان لائے بغیر' ایمان ہی پورا نہیں ہوتا لیکن یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کا عملی Test اس دنیا میں نہیں ہوسکتا۔ مذہب کی دنیا میں یہ نظریہ چل جاتا ہے' لیکن دین کی تو نگاہ حقائق و نتائج پر ہوتی ہے' اس لئے اس کا عملی Test' اس دنیا میں ہونا ضروری ہے تاکہ ہر شخص جان لے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ جنت اس دنیا کو بھی اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ (۳/۱۳۲)۔ ایسی جنت جس کی وسعت ارض و سماوات کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۵۷/۲۱)' اس کا عرض زمین و آسمان کے عرض کی مانند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے دو جنتوں کا ذکر کیا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ (۵۵/۴۶) جس شخص کو اس بات کا یقین ہے کہ اسے عدالت خداوندی میں حاضر ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے' اس کے لئے دو جنتیں ہیں' ایک اس دنیا کی جنت' ایک اخروی زندگی کی جنت۔ کفار

ومشرکین حضورﷺ سے مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ (۹۰/ ۱۷)۔تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہونا چاہئے۔کفار کے اس اعتراض کے جواب میں فوراً اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ایک باغ کا مطالبہ کرتے ہیں خدا تمہیں اپنے قانون مشیت کے مطابق کئی باغات (جنت) عطا کرے گا۔اس جنت کو حاصل کرنے کے لئے حضورﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے سخت جان توڑ محنت کی اور وہ جنت اسی زندگی میں حاصل کر لی جس کے متلق ارشاد ہوتا ہے کہ خدا تمہیں عنقریب فتح دے گا يُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (۵/ ۴۸) تاکہ وہ مومن مردوں اور عورتوں کو اس جنت میں داخل کرے جن کے نیچے پانی بہہ رہا ہے۔اس کی مزید تائید میں ارشاد ہوتا ہے۔وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (۱۶/۴۱)۔اور جنہوں نے اللہ کے واسطے ہجرت کی، جب کہ ان پر ظلم کیا گیا تھا، تو ہم ان کو دنیا میں بہت اچھا گھر دیں گے۔ یہاں قرآن کریم نے وضاحت فرما دی کہ یہ اس دنیا میں واقع ہوگا۔اس بات کی مزید وضاحت کے لئے کہ جنت اس دنیا میں بھی ہوتی ہے یہ آیت کریمہ حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے جبکہ ارشاد ہوتا ہے،وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ (۳۹/۷۴) اور کہتے تھے کہ لائق حمد ہے وہ خدا جس نے ان وعدوں کو اس طرح پورا کیا کہ ہمیں اس ملک کا وارث بنا دیا کہ ہمیں اس جنت میں پورا پورا اقتدار حاصل ہے اور یہ عمل کرنے والوں کا کیسا اچھا اجر ہے اس آیہ کریمہ میں ارض کے لفظ نے ثابت کر دیا کہ وہ اسی دنیا کی جنت ہے۔

یہاں تک گفتگو اصولی و تجریدی تھی۔لیکن یہ کہ اس جنت کے حصول کا عملی طریقہ قرآن کریم نے کیا بیان فرمایا ہے وہ اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (۹/۱۱)۔اس

میں شک نہیں کہ خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ ان کی قیمت ان کے لئے جنت ہے۔ اس وجہ سے یہ لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے ہیں اور خود بھی مارے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے جنت کے حصول کا یہ عملی طریقہ بیان کر دیا ہے۔ آیہ کریمہ میں اللہ سے مراد اسلامی نظام کا مرکز ہے۔ جیسے کہ سورہ فتح میں ارشاد ہوتا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (۴۸/۱۰)۔ اے رسول جو لوگ تیرے ہاتھ پر اپنی جانیں بیچ رہے ہیں وہ دراصل خدا کے ساتھ اپنا معاملہ کر رہے ہیں۔ دیکھنے کو تو ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے اپنے دور میں اللہ سے مراد حضور کی اپنی ذاتِ مبارک تھی کیونکہ آپ خود ہی مرکزِ حکومت قرآنیہ تھے آپ کے بعد اس سے مراد اسلامی حکومت کا سربراہ ہے۔ دوسری پارٹی جس سے اشتراء ہونا ہے وہ مومنین ہیں' اور مال برائے فروخت مومنین کے جان و مال۔ مومنین اپنے نفوس و مال کے ذریعے جو چیز خریدتے ہیں وہ الجنتہ ہے۔ اس بیع وشریٰ میں' خریدار سربراہ مملکت' سودا کرنے والے مومنین' فروخت کرنے کا مال مومنین کے جان و مال' تینوں چیزیں مرئی اور Tangible ہیں۔ جو سامنے موجود ہیں۔ اس لئے اس معاملہ کو طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ البتہ چوتھی چیز جو مومن خریدتے ہیں وہ جنت ہے' جب معاہدہ اس دنیا میں ہو رہا ہے اور معاہدہ کرنے والے اس دنیا میں موجود ہیں تو لازم بات ہے کہ معاہدہ کا چوتھا جزو' جنت بھی اسی دنیا میں ہمارے سامنے مرئی طور پر بطور ایک حقیقتِ ثابتہ سامنے موجود ہو' اس لئے اس سے مراد آخرت کی حقیقت نہیں ہے۔ اسی لئے اس آیہ کریمہ کی تشریح کرنے سے پیشتر قرآنی آیات کے ساتھ یہ بات ثابت کر دی گئی تھی کہ یہاں جنت سے مراد ارضی جنت ہے۔

ہم اس آیہ کریمہ کو پڑھتے ہیں۔ صد بار اس کی تلاوت کرتے ہیں لیکن [illegible] پہلو پر کبھی غور نہیں کرتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق صرف صحابہ کرام [illegible] اور

ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم نے مسلمان ہونے کا دعویٰ کر دیا تو ہم اس معاہدہ کے ازخود اس طرح پابند ہیں کہ اسکی اقالت کی ہمارے پاس کوئی راہ نہیں نکل سکتی اور جس دن ہم نے اس معاہدہ کی تجدید کر کے اس پر عمل شروع کر دیا اس وقت سے ہمارے دن پھرنے شروع ہو جائیں گے۔اس کے لئے شرط ہے کہ ہم اس آیہ کریمہ کی دینی نقطہ نگاہ سے تشریح کریں اور جنت کا اس دنیا سے بھی کوئی تعلق قرار دیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آتشِ نمرود

آتشِ نمرود کے متعلق بارہا استفسار کیا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈال دیا گیا تو وہ گلزار کس طرح بن گئی۔ جو حضرات معجزات پر اصرار کرتے ہیں وہ اس واقعہ کو معجزات کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ برسبیل تنزل اگر آپ معجزات کو تسلیم بھی کر لیں تو یہ صرف ایک Academic Discussion ہے۔ کیونکہ نہ تو اب انبیاء کرامؑ ہیں اور نہ ہی اب معجزات کا صدور ہو سکتا ہے۔ اگر انبیاء کرامؑ سے وہ معجزات صادر ہوئے تو کیا اور اگر صادر نہیں ہوئے تو پھر کیا۔ ہمارے زمانے میں ان کے صادر ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جو حضرات معجزات کے وقوع پر اصرار کرتے ہیں' انہیں معجزات سے چنداں دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے پیروں یا اماموں کی کرامات ثابت کرنا ہوتی ہیں۔ اگر آپ معجزات سے انکار کر دیں تو پھر پیروں کی کرامات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ ہے اصل سبب معجزات پر اصرار کرنے کا۔ معجزات کا موضوع طویل وعریض ہے اور ایک الگ مضمون کا متقاضی یہاں صرف آتشِ نمرود کے متعلق استفسار کیا گیا تھا' اس سلسلہ میں چند سطور پیش خدمت عالی ہیں۔

آتشِ نمرود کا ذکر قرآن کریم میں دو مقام پر آتا ہے۔ ایک سورہ انبیاء اور دوسرے سورہ الصٰفٰت میں۔ قارئین کرام' عالی مقام' کی سہولت کی خاطر دونوں مقامات مع ترجمہ کے تحریر کئے جاتے ہیں۔ مخالفین و معاندین حضرت ابراہیمؑ جب ہر طرح سے حضرت ابراہیمؑ کی مخالفت کر چکے اور وہ اپنے ارادے اور تبلیغ سے دست بردار نہیں ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے جو آخری

تدبیر اختیار کرنا چاہی اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ○ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْداً وَسَلاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ ○ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ○ وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطاً إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ○ (۶۸-۷۱/۲۱)۔

(آپس میں) کہنے لگے کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ تو ہم نے فرمایا کہ اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا۔ اوران لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ چال بازی کرنی چاہی تھی تو ہم نے ان سب کو ناکام کر دیا اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو صحیح وسالم نکال کر اس سرزمین میں پہنچا دیا جس میں ہم نے سارے جہاں کے لئے برکت عطا کی تھی۔

آیۂ کریمہ کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے۔ لیکن مترجم نے اپنی طرف سے بریکٹ میں (غرض ان لوگوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا) کا اضافہ اپنی طرف سے کیا ہے تاکہ حضرت ابراہیم کا آگ میں ڈالنا ثابت ہو جائے' ورنہ آیت میں ان کے آگ میں ڈالے جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ حضرات قرآن کریم میں بھی اضافہ کرنے سے باز نہیں رہتے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَاناً فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ○ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ○ (۹۷-۹۸/۳۷)۔

بولے بناؤ اس کے لئے ایک عمارت' پھر ڈالو اس کو ایک آگ کے ڈھیر میں' پھر چاہنے لگے اس پر برا داؤں کرنا' پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی ان کے ارادے کا اظہار کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کے لئے کہا' آگ میں ڈال دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

ان دونوں آیات میں دو باتیں غور طلب ہیں' ان دونوں آیات میں اس بات کا ذکر

ہے کہ قوم نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کی سکیم تیار کی لیکن یہ ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا بلکہ دونوں جگہ یہ ارشاد ہے کہ انہوں نے ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو ناکام بنا دیا۔ ایک آیہ کریمہ میں اسفلین کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ حضرت اقدس نے انہیں نیچے کر دینا کہا ہے اور دوسری جگہ اخرین کا لفظ ہے جس کے معنے ناکام کے ہیں۔ آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ وہ قوم حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال نہیں سکی۔ اور جب وہ آگ میں ڈالے ہی نہیں گئے تو آگ کے گلزار بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہ سب سکیم قوم کر رہی تھی اس میں نمرود خود شامل (Involve) نہیں تھا۔ ان دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کی جو سکیم بنائی جا رہی تھی وہ صرف قوم کے درمیان تھی۔ نمرود کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا خیال نہیں کیا گیا اور عموماً آتش نمرود کا ہی مرکب اضافی اس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا عنوان بھی عام محاورہ کے مطابق ہی تحریر کیا گیا ہے۔

ہماری کتب تفاسیر میں ان آیات کی تفسیر بہت طویل وعریض تحریر کی گئی ہے۔ صفحے کے صفحے کالے کئے گئے ہیں۔ جن کا ملخص یہ ہے کہ ''چنانچہ حضرت ابراہیم کے ہاتھ پاؤں خوب باندھ کر، آپ کو آگ میں پھینک دیا گیا''۔ سورہ انبیاء والی آیت کے ضمن میں تحریر کیا گیا ہے کہ ''منجنیق ہی رکھ کر آپ کو آگ کی طرف پھینک دیا گیا۔'' (تفسیر مظہری، جلد ۹، صفحہ ۳۰)۔

ان دونوں آیات میں سے صرف سورۃ انبیاء والی آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِيْ بَرْداً وَسَلَاماً عَلىٰ إِبْرَاهِيْمَ۔ (۲۱/۶۹)۔

ہم نے حکم دیا کہ اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو۔

اس آیہ کریمہ سے مفسرین کرام نے آگ کو گلزار میں تبدیل ہونے کا واقعہ اختراع کیا ہے۔ قرآن کریم نے لفظ ''نار'' کو متعدد معانی میں استعمال کیا ہے جس میں سے چند معانی پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

(۱)إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً (۴/۱۰)۔

جولوگ یتیموں کا مال ناحق چٹ کر جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے یتیموں کے مال کے ناحق کھانے کو آگ کے کھانے کے مرادف قرار دیا ہے۔ یہاں آگ کے لغوی معنے لئے ہی نہیں جاسکتے۔

(۲)وَكُنتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا (۳/۱۰۳)۔

اورتم گویا آگ کی بھٹی کے کنارے پر کھڑے تھے کہ خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

کفار آپس میں ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ اسلام نے ان میں آپس میں محبت پیدا کر دی اور وہ بھائیوں کی طرح ہو گئے' اسلام سے پیشتر کی دشمنی کی حالت کو آگ کے کنارے پر کھڑے ہونے کے مرادف بیان کیا گیا ہے۔

(۳)نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ ۞ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (۷۔۶/۱۰۴)۔

ایک آگ ہے اللہ کی سلگاتی ہوئی وہ جھانک لیتی ہے دل کو۔

تفسیر عثمانی میں مرقوم ہے ''اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھو' بڑی سمجھدار ہے' دلوں کو جھانک لیتی ہے جس دل میں ایمان ہو نہ جلائے' جس دل میں کفر ہو' جلا ڈالے۔

(۴)فَاتَّقُواْ النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲/۲۴)۔

پھر ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

یہ وہ آگ ہے جس کا ایندھن کافر اور پتھر میں ظاہر ہے کہ یہاں بھی آگ لغوی معنے میں استعمال نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔

(۵)كُلَّمَا أَوْقَدُواْ نَاراً لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ (۵/۶۴)۔

جب کبھی آگ سلگاتے ہیں لڑائی کے لئے۔ اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔

اس کی تفسیر میں تحریر ہے کہ لڑائی کی آگ سلگانے کو تیار ہوں گے' لیکن اسلامی برادری کے خلاف

ان کی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہوں گی۔

(۶) فَالَّذِيْنَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ۔ (۲۲/۱۹)۔

سوجو منکر ہوئے ان کے واسطے قطع کیے گئے آگ کے کپڑے۔

تفسیر عثمانی میں تحریر ہے کہ کسی ایسی چیز کے کپڑے پہنائے جائیں گے جو آگ کی گرمی سے بہت سخت اور بہت جلد تپنے والے ہوں گے۔

قرآن کریم نے 'نار' کو اور بھی معانی میں استعمال کیا ہے یہاں ان کا استحصار مقصود نہیں ہے۔صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ''نار'' کے معنے صرف آگ 'Fire' کے ہی نہیں ہیں بلکہ قرآن کریم میں اس کو متعدد معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں قوم کے اکابرین وعمائدین حضرت ابراہیم کی آواز کو دبانے اور ان کی تبلیغ کو روکنے کے لئے وہی حربے استعمال کر رہے تھے جو اول دن سے استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں۔ وہ اکابرین لوگوں کے جذبات اس طرح مشتعل کر رہے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ راہنمائی کے مطابق حضرت ابراہیم کی یہ تدبیر تھی کہ ان کے غصے کی آگ بھڑکنے نہ پائے وران اکابرین کی مخالفت کی آگ حضرت ابراہیم کے حق میں امن و سلامتی میں تبدیل ہو جائے۔قُلْنَا يَا نَارُ كُونِيْ بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيْمَ۔ (۲۱/۶۹)۔ چنانچہ عملاً یہ ہوا کہ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِيْنَ (۲۱/۷۰)۔وہ حضرت ابراہیم کے خلاف تدبیر کر رہے تھے لیکن ہم نے ایسا کیا کہ وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہ گئے وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطاً إِلَى الْأَرْضِ الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا لِلْعَالَمِيْنَ (۲۱/۷۱)۔اور ہم ہی ابراہیم اور لوط کو صحیح وسالم نکال کر' اس سرزمین میں لے گئے جس میں ہم نے سارے جہاں کے لئے برکت عطا کی ہے۔

اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان مخالف و معاندانہ حالات میں جو غیض وغضب کی آگ حضرت ابراہیم کے اندر سلگ رہی تھی ہم نے اس کو کہا کہ وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی رہتا کہ ابراہیم دلجمعی اور علم کے ساتھ اپنی تبلیغ اور اپنا مشن جاری رکھیں۔

یہاں یہ بات بھی اضافہ کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ''آگ سرد وسلامتی والی ہو

جا''۔ سے مراد یہ نہیں ہے کہ واقعتاً یہ الفاظ جاری کئے گئے بلکہ یہ ارادۂ تکوینہ کی ایک لفظی تعبیر ہے۔ جسے اور مقامات پر لفظ ''کن'' سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی سے بلا تاخیر ایسا ہوگیا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (۴۱/۱۱)۔ پھر کہا اس کو اور زمین کو کہ آؤ تم دونوں خوشی سے یا زور سے، وہ بولے ہم آئے خوشی سے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ آسمان و زمین کو واقعاً یہ الفاظ کہے گئے کہ وہ آئیں اور اطاعت کریں بلکہ تکوینی طور پر وہ اطاعت خداوندی کے لئے مجبور ہیں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین و مذہب میں قانون سازی کے فاصلے

یہ انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلام کا حقیقی اور سنہری دور منقرض ہوگیا اور چند وجوہ و اسباب کی بناء پر خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ بنو امیہ کا دور ۴۰ ہجری سے شروع ہوکر ۱۳۲ ہجری پر ختم ہوا۔ یہ اموی دور ۹۲ سال جاری رہا۔ اگر چہ یہ ملوکیت کا دور تھا لیکن یہ خالص عربی دور تھا۔ بنو امیہ کا تختہ الٹنے کے بعد' بنو عباس برسر اقتدار آئے جن کا دور تقریباً چھ سو سال تک جاری رہا۔ اس دور میں ملوکیت ایرانیوں کے زیر اثر رہی۔ ایرانیوں کے اثرات خلافت راشدہ سے ہی شروع ہوگئے تھے۔ خلافت راشدہ میں تین خلفاء کرام کا دارالخلافہ مدینہ شریف رہا لیکن حضرت علی المرتضیٰؓ کے دور میں مرکز خلافت کوفہ تھا بلکہ کوفہ آباد ہی حضرت علی المرتضیٰؓ نے کیا تھا۔ اس زمانہ میں شرق وسطیٰ کا جغرافیہ آج سے بالکل مختلف تھا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی یہ صورت نہیں تھی۔ اس وقت ایران کوفہ سے Govern کیا جاتا تھا اور دریائے فرات Boundary Line تھی۔ کوفہ میں ایرانیوں کا اثر زیادہ تھا اور ایرانیوں کے ان اثرات میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چونکہ عباسیوں کو اقتدار ہی ایرانیوں کی وجہ سے ملا تھا' اس لئے ظاہر ہے کہ اس Regime پر ان کا اثر بہت زیادہ تھا خصوصاً برامکہ کے دور میں تو خلفاء نے سارا اقتدار ان کو ہی دیا ہوا تھا۔ خلافت راشدہ کے دور میں فتوحات اس قدر تیزی سے ہوئیں کہ جو آبادیاں بھی اس مملکت میں شامل ہوتی گئیں۔ ان کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں ہوسکی۔ اس زمانہ میں رسل و رسائل بھی نہایت مشکل و محدود تھے اور زیادہ تر آبادی بھی غیر تعلیم یافتہ تھی۔ اس لئے' ظاہر ہے' کہ حکومت کی آئیڈیالوجی (اسلام) کی نشر و اشاعت نہیں ہوسکی۔ لیکن اس سب کے باوجود

مسلمان جہاں کہیں بھی گئے وہاں کی آبادیوں نے نہ صرف اسلام قبول کر لیا بلکہ عربوں کی معاشرت وزبان بھی اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں عربی زبان صرف عربوں (موجودہ سعودی حکومت کا علاقہ) تک محدود تھی لیکن مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ عربی زبان مصر' سوڈان' لیبیا وغیرہ سے لے کر مراکش تک عربوں کے ساتھ ساتھ چلتی چلی گئی اور ہر مفتوح ملک نے اپنی زبان چھوڑ کر عربی زبان اختیار کر لی۔ لیکن یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ ایرانیوں کی ساتھ صورتِ حال بالکل مختلف رہی حالانکہ وہ بالکل متصل علاقہ میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو انہوں نے عربی زبان کو اختیار کیا اور نہ ہی عربوں کی معاشرت کو کوئی اہمیت دی۔ اگر اس وقت اور دیگر ممالک کی طرح ایرانی بھی عربی زبان اختیار کر لیتے تو آج ہماری مادری زبان بھی عربی ہوتی لیکن ایرانیوں نے عربی زبان اور عربی کلچر دونوں کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ خود ایرانیوں نے عربی معاشرت کو بے حد متاثر کیا اور اس طرح بیشتر مجوسی نظریات مسلمانوں میں سرایت کر گئے۔

بنوامیہ کے دور میں عربوں/مسلمانوں کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی صرف قرآن کریم ان کے پاس تھا۔ اس وقت تک نہ تفاسیر واحادیث کے مجموعے جمع کئے گئے تھے اور نہ قانون سازی شروع ہوئی تھی۔ ہماری بدقسمتی کہ بنوعباس کے دور میں جبکہ ایرانی مجوسی نظریات خوب فروغ پاگئے' اس وقت ہمارے ہاں یہ سب علمی وتحریری کام شروع ہوئے۔ قانون سازی بھی اس دور میں شروع ہوئی۔ ہم مسلمانوں میں قانون سازی اس وقت شروع ہوئی جب دین کا تصور دور دور بھی نہیں تھا۔ ملوکیت خوب اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ خالص مذہب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری یہ ساری قانون سازی' دین وقرآن کے خلاف ہے۔ دین اور مذہب میں قانون کے مصادر ومنابع (Sources of Law) ہی مختلف ہوتے ہیں۔ جب ان دونوں میں قانون کے ماخذ ہی مختلف ہیں تو ان دونوں میں قانون ایک جیسا کیسے ہوسکتا ہے۔ جب بنیاد ہی غلط ہے' تو قانون کی ساری عمارت ہی غلط اٹھتی ہے۔ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

خلاف قرآن قانون سازی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قانون سازی کے مطامح نگاہ و مقاصد ہی قرآن کے خلاف ہو گئے۔ملوکیت' پیشوائیت قرآن کریم کے خلاف بلکہ قطعاً حرام ہے۔قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے باوجود' جابر' فاسق' بدچلن' برکردار' بدعہد' عنید و فاسق بادشاہ محض اپنی تلوار کی دھار کے زور پر مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے اور اس دور میں جس قدر قوانین بنائے گئے' ان سب کے پیش نظر ملوکیت کو تقویت و استقلال دینا اور بادشاہوں کی بدکرداری کی تصویب کرنا تھا۔ چونکہ ان بادشاہوں کے حرم میں کئی کئی سو کنیزیں' اور کام کرنے کے لئے غلام ہوتے تھے ان قوانین نے قرآن کے واضح حکم کے خلاف کنیزوں اور غلاموں کا جواز فراہم کیا۔حالانکہ قرآن کا واضح ارشاد ہے۔

اما منا بعد و اما فداءً (۴/۴۷)۔

(ان کو) یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

قرآنِ کریم نے زمین کی ملکیت' اس کی خرید و فروخت حرام قرار دی لیکن مذہبی قانون نے اس کو بالکل جائز کر دیا۔ یہ سب قوانین ملوکیت کی تائید و استقلال میں اس وجہ سے بنے ممکن ہو سکے کہ ہمارے مقننین و فقہائے کرام نے' قانون سازی کے ماخذ ہی غلط اختیار کر لئے۔اس مضمون میں مذہب میں قانون سازی کے جو غلط مصادر و منابع ہیں' ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں ہزار سال سے قانون سازی' یعنی اصول فقہ میں ادلہ اربع کو ماخذات قانون قرار دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں میں' ہزار سال سے اس بات پر اتفاق چلا آ رہا ہے لیکن افسوس کہ یہ ادلہ اربعہ ہی قرآن کے خلاف تصور ہے اور ہمارے تمام فرقوں پر ان کا اتفاق ہی قرآن کے خلاف ہے اور ان کا اس پر ایک ہزار سال سے اتفاق ہی اس وجہ سے ہے کہ یہ تمام فرقے مذہب کے دائرہ میں رہتے ہیں۔ دین کا کوئی تصور ان میں سے کسی کے سامنے ہے ہی نہیں۔ مذہب تو سب ہی غلط ہوتے ہیں خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو صحیح اور درست تو صرف دین ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(۱) ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلئک ھم الکافرون (۵/۴۴)۔

جو ماانزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ہے۔

(۲) ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلئک ھم الفاسقون۔

جو ماانزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ فاسق ہے۔

(۳) من لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلئک ھم الظالمون۔

جو ماانزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ ظالم ہے۔

(۴) اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء (۷/۳)۔

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے' اس کا اتباع کرو' اس کے سوا اور کارسازوں کا اتباع نہ کرو۔

(۵) وان احکم بینھم بما انزل اللہ (۵/۴۹)۔

جو احکام خدا نے نازل کئے' ان کے مطابق فیصلے کرو۔

ان پانچ آیات کریمات اور اسی قبیل کی مزید بیشتر آیات میں قرآنِ کریم نے واضح حکم فرمایا ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے' یعنی جو کچھ بھی ''منزل من اللہ'' ہے صرف اور صرف اس کے مطابق فیصلے کرو اور جو کوئی بھی ''منزل من اللہ'' کے مطابق فیصلے نہیں کرتا وہ ظالم' کافر' فاسق ہے۔ ''منزل من اللہ'' میں تخفیف و اضافہ کرنے سے کفر و فسق کا ارتکاب ہوتا ہے کیونکہ یہ حکم اس درجہ واضح ہے کہ ہمارے علماء کرام' جو مذہب کے داعی ہیں' اس کے خلاف جا ہی نہیں سکتے تھے اور ان کو ملوکیت کے استقلال و بقاء و تحفظ کے لئے' قانون بنانے کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی' اس لئے انہوں نے یہ ترکیب کی کہ انہوں نے حدیث کو ہی ''منزل من اللہ'' میں شامل کر دیا' اور وحی خفی کا نظریہ کی بنیاد ڈال دی۔ اب ان کے سامنے ہر طرح کا قانون بنانے کے لئے میدان صاف تھا۔ یہ چور دروازہ کھولا ہی اس لئے تھا۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک اقوال رسول یعنی روایات و احادیث وحی ہیں اور اسی وجہ سے وہ حدیث کو قانون کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بات ثابت

کردی جائے کہ حدیث وحی نہیں ہے' تو پھر حدیث کو قانون کا ماخذ تسلیم نہیں کیا جا سکتا' پھر تو پاؤں کے نیچے سے زمین ہی سرک جاتی ہے' اگر اس کے باوجود بھی کوئی حدیث کو قانون کا ماخذ تسلیم کرے گا' تو وہ قرآن کی رو سے کافر' فاسق' ظالم ہوگا۔

''وحی صرف قرآن میں ہے'' کے موضوع پر کمترین کے آٹھ مقالے' طلوع اسلام اور دیگر قرآنی جرائد میں طبع ہوئے جو بعد میں ہزاروں کی تعداد میں مفت بھی تقسیم کئے گئے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو' وہ ان مضامین میں سے ایک دو ہی مضامین ملاحظہ فرمالیں۔ زیرِ نظر مضمون میں صرف ان مزید تین دلائل کا حوالہ دیا جاتا ہے' جو ان آٹھ مضامین میں تحریر نہیں کئے گئے تھے۔

(۱) سب مومنین کو حکم ہے کہ وہ اپنے کام مشورے سے کریں۔ وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)۔ ان کے کام آپس میں مشورے سے ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر مستزاد یہ کہ حضورﷺ کو الگ حکم ہوا۔ شاورھم فی لامر (۳/۱۵۹)۔ ان سے امور میں مشورہ کرلیا کرو۔ حضورﷺ کو یہ قرآنی حکم ہے۔ مشورے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کبھی مستشیر کی رائے درست ہوتی ہے اور کبھی مستشار کی۔ جب حضورﷺ مشورہ فرماتے ہوں گے تو کبھی آپﷺ کی بات درست ہوتی ہوگی اور کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی۔ اگر حضورﷺ کے سارے اقوال وحی تھے تو وحی کی تو یہ صورت نہیں ہوسکتی۔ وحی میں تو ظن وگمان شامل ہی نہیں ہوسکتا۔ وحی کے نزول کے وقت ملائکہ اس کی حفاظت کرتے تھے (۷۲/۲۷)۔ آپ خود اندازہ فرمالیں کہ کیا وحی بھی مشورہ کی طلبگار ہوسکتی ہے۔ بہت واضح بات ہے کہ یا وحی ہوگی یا مشورہ۔ کسی کا مشورہ وحی نہیں ہوسکتا۔ وحی اور مشورہ ایک ساتھ نہیں ہوسکتے۔

(۲) ارشاد ہوتا ہے۔ قل ھذہ سبیلی ادعوالی اللہ علی لبصیرۃ انا ومن اتبعنی (۱۲/۱۰۸)۔ کہہ دو یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ میں بھی اور وہ لوگ جو میری پیروی کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' اسی طرح

میرے پیرو بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور ہم سب اس دعوت الی اللہ میں بصیرت و دلائل سے کام لیتے ہیں۔ یہ بصیرت سے کام لینا میرا اور میرے متبعین کا مشترک عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ حضورﷺ کی سوچ جو بالکل حضورﷺ کے متبعین کی طرح کام کرتی تھی' وحی کیسے ہو سکتی تھی۔ وحی تو خالصتہً تنزیل من رب العالمین ہوتی تھی۔ اللہ کی طرف سے نازل کردہ' اس میں پوری پوری معروضیت Objectvity ہوتی تھی۔ اس میں نبی کی خواہش یا سوچ کو دخل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ حضورﷺ کے اقوال وحی نہیں تھے۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم (۴/۸۳)۔ اور اگر یہ ان (افواہوں) کو رسول اور اپنی اولوالامر کے سامنے پیش کر دیتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں' وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ یہاں پھر فرمایا کہ اگر یہ افواہوں کو رسول اور اولی الامر کے سامنے پیش کر دیتے تو خود رسول اور اولی الامر اس میں غور و خوض کر کے' معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ یہاں پھر حضورﷺ کو اولی الامر کے ساتھ Bracket کیا گیا ہے کہ استنباط کے عمل میں حضورﷺ دیگر اولی الامر کی طرح تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کے بھی استنباط میں وحی کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

(۳) ارشاد ہوتا ہے۔ لو تقول علینا بعض الاقاویل۔ لا خذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین (۶۹/۴۶-۴۴)۔ اور اگر یہ (رسول) ہم پر کوئی بات گھڑ کے لگاتا تو ہم اس کو بائیں بازو سے پکڑتے پھر ہم اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیتے۔ تقول علیہ قولاً کے معنے ہیں اپنی طرف سے بات بنا کر دوسرے کی طرف منسوب کرنا۔ آیت کریمہ کا مفاد و فحویٰ یہ ہے کہ اگر حضورﷺ اپنے کسی قول کو' جو خدا نے نہ کہا ہوتا' اسے خدا کا قول بتاتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ خدا کا قول ہے (یعنی وہ وحی خفی ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس رسول کو قتل کر دیتے۔ آیہ کریمہ کا اعجاز یہ ہے کہ صرف ایک ہی آیت نے وحی خفی کی جڑ کاٹ دی اور قول خدا اور قول رسولﷺ کو الگ الگ نکھار کے رکھ دیا ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ رسول اللہ کے اپنے اقوال

ہوتے تھے۔ جو خدا کے اقوال نہیں ہوتے تھے۔ لیکن حضور ﷺ ان اقوال کو اپنے ہی اقوال بتاتے تھے۔ اللہ کی طرف منسوب نہیں فرماتے تھے۔ وعید و تہدید اس بات پر کی جارہی ہے کہ حضور ﷺ اپنے اقوال کو اقوال خدا کہیں' خود اقوال کے وجود کا انکار نہیں کیا جارہا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اس کی تثبیت کی جارہی ہے۔

بطور جملہ معترضہ عرض ہے کہ سر محمد ظفر اللہ خاں اپنے ایک مضمون میں اور دیگر احمدی حضرات بھی' اس آیت سے مرزا غلام احمد کی نبوت کی دلیل لائے ہیں کہ اگر مرزا صاحب جھوٹا دعویٰ کر کے' اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے تو اللہ تعالیٰ ان کو قتل کر دیتا اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی گرفت نہیں کی' اس لئے ان کا دعویٰ رسالت درست تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی کڑی نگرانی' اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کی کرتا ہے' جن کو وہ منصب رسالت پر مامور فرماتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی تحویل و حفاظت میں وحی الٰہی کا خزانہ ہوتا ہے جس کی حفاظت و صیانت ضروری ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے گا' اس کی گردن کاٹ دی جائے گی۔ جھوٹ بولنا تو درکنار' بہت سے لوگ ہیں' جو معاذ اللہ خدا کو گالیاں تک دے دیتے ہیں' لیکن اس دنیا میں ان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اگر مرزا صاحب کی صداقت کی یہ دلیل تسلیم کر لی جائے' تو ان سے بیشتر اور لوگوں نے بھی نبوت کا جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ ان کے ہی ہم عصر بہاء اللہ نے نبوت کا دعویٰ ان کے سامنے کیا تھا۔ ان کی صداقت کے لئے بھی اس آیت سے دلیل حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کا کوئی سچا رسول نہ خدا پر افتراء کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے دباؤ میں وہ وحی میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس کا اصل مضمون سے کوئی علاقہ نہیں۔

یہ بات بھی توجہ کی متقاضی ہے کہ ہم جن روایات کو حدیث یا قول رسول اور وحی خفی کہہ کر ان کو منزل من اللہ قرار دے کر' قانون کا ماخذ شمار کرتے ہیں وہ حقیقت میں نہ حدیث ہے اور نہ قول رسولؐ۔ یہ تمام احادیث و روایات تو رواۃ کے اپنے الفاظ ہیں ہمارے علمائے کرام کے اپنے

نظریہ کے مطابق احادیث باللفظ نقل نہیں ہوئی ہیں بلکہ نقل بالمعنی ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ حدیث کے شروع میں کسی صحابی کی طرف منسوب کر کے کہتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا یعنی قال ابو ہریرہؓ اور آخر میں اوکما قال علیہ السلام یعنی یا جیسے بھی حضور نے فرمایا تحریر کیا جاتا ہے اور یہ درمیان کے الفاظ راوی کے مثلاً حضرت ابو ہریرہ کے اپنے ہوتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ راوی (حضرت ابو ہریرہ) کے یہ درمیان کے الفاظ وحی کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ وحی ہو ہی نہیں سکتے' یہ تو رواۃ کے اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں فلہٰذا کبھی بھی قانون کا ماخذ نہیں بن سکتے۔

یہاں تک یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے احادیث وروایات 'منزل من اللہ' نہیں ہیں' اور جب وہ ''منزل من اللہ'' نہیں ہیں تو مندرجہ بالا پانچ آیات کریمات (اور مزید متعدد آیات) کے مطابق وہ قانون اسلامی کا ماخذ نہیں بن سکتیں۔ کیونکہ اسلامی قانون کا ماخذ صرف وہ ہے جو 'منزل من اللہ' ہے۔

حدیث کو ماخذ قانون بنانے کی وجہ سے ہمارے فقہاء کرام کے لئے بڑی سہولت ہو گئی اور ایک بڑا وسیع میدان مل گیا۔ ہمارے ہاں جو خلاف قرآن قوانین چلے آ رہے ہیں' مثلاً رجم' مرتد کی سزا' غلام ولونڈیوں کی اجازت' عورتوں پر تشدد کرنا' محجوب الارث' عَول کا مسئلہ' نا کتخدا سے دوسری شادی اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے قوانین حدیث کی اساس پر ہی بنائے گئے ہیں' جو قرآن کریم کے خلاف ہیں۔

یہاں تک آپ نے مذہب میں قانون سازی کے عمل کو ملاحظہ فرمایا ہے۔ اب دین میں قانون سازی کا اصول پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔

ہمارے اصول فقہ کے مطابق اسلامی قانون کے ماخذ چار ہیں۔ قرآن' حدیث' اجماع' قیاس' ان ہی چار مصادر ومنابع (Sources) سے اسلامی قانون یعنی فقہ اسلامی مدون کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عرض خدمت کیا گیا ہے یہ چاروں مصادر مذہب کی رو سے ہیں۔ دین کی رو سے نہیں۔ دین کی رو سے تو صرف قرآن اسلامی قوانین کا ماخذ ہے اور صرف وہی ''منزل من اللہ''

ہے۔ یہ باقی تین مصادر قانون کے مصادر نہیں ہیں بلکہ قانون بنانے کے ضابطے اور اس کے Procedure ہیں (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) ارشاد ہوتا ہے۔ یاایھا الذین امنوا اطیعو اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردہ الی اللہ و رسول۔ اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس کو خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو۔ اس آیۂ کریمہ میں' اللہ و رسول سے مراد ہمارے فقہاء کرام قرآن و حدیث لیتے ہیں۔ اس آیت میں صرف قرآن و حدیث کو حجت قرار دیا گیا ہے' اور اس آیت نے قیاس و اجماع کا بالکل پتہ ہی کاٹ دیا۔ اس آیۂ کریمہ میں صرف قرآن و حدیث کو حجت قرار دیا گیا ہے اور قیاس و اجماع کو ماخذ قانون میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مروجہ قانون کے دو مستند ترین مصادر کی تردید تو صرف اسی ایک آیت سے ہوگئی۔ جہاں تک ہمارے علماء اس آیت میں رسول سے مراد حدیث لیتے ہیں' اس کے بارے میں صدر مضمون میں بحث کر دی گئی ہے کہ وہ قانون کا ماخذ نہیں بن سکتی۔ اس سابقہ بحث میں یہ بھی اضافہ کیا جاتا ہے کہ قانون کے لئے باللفظ منقول ہونا ضروری ہے اور حدیث چونکہ باللفظ منقول نہیں ہے اس لئے وہ قانون کا ماخذ نہیں بن سکتی۔ اصل یہ ہے کہ وہ قانون کے Criterion پر آتی ہی نہیں۔ دین میں قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے اور یہ تین مصادر قانون سازی کے طریقے میں شامل ہوتے ہیں۔ جن کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت قائم ہو' وہ سابقہ اسلامی حکومت یا عملی طور پر یہ کہیں کہ حضور ﷺ کی حکومت یا خلافت راشدہ کے فیصلوں کو پیش نگاہ رکھے گی۔ حضور ﷺ کے دور کے اور خلافت راشدہ کے سابقہ فیصلے' اگر اس موجودہ دور کے مطابق ہوئے اور اس دور میں عملی طور پر نافذ ہو سکے' تو ان کو اختیار کر لیا جائے گا' ورنہ ان کو موجودہ دور کے مطابق بنا کر' ان کا اجراء کیا جائے گا' یہ طریقہ اتباع سنت' کہلائے گا۔ مثلاً قرآن کریم نے مہر کو نکاح کے شرائط میں سے ایک شرط قرار دیا ہے۔ یہ قرآن کا حکم ہے۔ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں اس کی ایک رقم متعین کر دی گئی تھی' جو شاید ہمارے دور کے مطابق ۳۲ روپے

قرار پاتی ہے اس دور میں یہ رقم مہر کے لئے مناسب نہیں ہے اس لئے اس کو بڑھا کر' اسلامی حکومت' لوگوں کے اپنے اپنے حالات کے مطابق مقرر کردے گی۔ رقم کا تعین چونکہ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں بھی ہوا تھا۔ اس لئے اس کا تعین کرنا اتباع سنت ہے اور اس رقم کو موجودہ حالات کے مطابق کرنا قیاس ہے' اور اس دور کی اسلامی حکومت کے ارکان' یا مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ کا اس کو پاس کر دینا اجماع ہے۔ اس طریقہ کار Procedure کے مطابق حکم تو صرف قرآن کریم کا ہوگا' لیکن اس کو جاری کرنے میں اتباع سنت' قیاس و اجماع سب شامل ہو جائیں گے۔ ہمارے فقہا کے نزدیک صورت حال یہ نہیں ہے ان کا خیال ہے کہ حضورﷺ کے دور اور خلافت راشدہ میں ایک رقم (مثلاً ۳۲ روپے) مقرر ہو گئی تھی' اب اس میں ترمیم نہیں ہو سکتی' وہ اس کو اتباع سنت قرار دیتے ہیں اور اسی طرح اس دور کا اجماع' قانون کا ماخذ بن جاتا ہے۔

اس Process کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ایتائے زکوٰۃ کی عملی شکل تحریر کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے ایتائے زکوٰۃ کا حکم دیا۔ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد تھی۔ لیکن اس وقت زکوٰۃ یا حکومت کے ٹیکس کے لئے یہ اڑھائی فیصد کافی نہیں ہے۔ موجودہ دور کی اسلامی حکومت اس کو دس فیصد کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ کی شرح کو چونکہ حضور کے دور اور خلافت راشدہ میں مقرر کیا گیا تھا' اس لئے اس کا مقرر کرنا اور اس کا تعین کرنا' اتباع سنت ہے۔ چونکہ اس دور کی اسلامی حکومت' موجودہ دور کے حالات کے مطابق' اس کو دس فیصد مقرر کرے گی' اس لئے اس کا دس فیصد مقرر کرنا' قیاس ہے اور اسلامی حکومت کی پارلیمنٹ کا اس پر متفق ہونا' اجماع ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کے لئے پھر وہی صورت ہے کہ وہ اس اڑھائی فیصد میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم نے (۸/۶۰) میں حکم دیا ہے کہ جس قدر بھی قوت تیار رکھ سکو' تیار رکھو مثلاً سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے باندھو تاکہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو ڈرا سکو۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا جو تیر اندازی جانتا ہو' پھر اسے ترک کر دے' وہ ہم میں سے

نہیں۔ کس درجہ شدید تہدید ہے۔لیکن یہ اس دور کی ہے۔اس دور میں اسلامی حکومت جو بھی قوت فراہم کرے گی وہ اتباع سنت ہوگی۔ جو ہتھیار بھی' اس دور کے لئے مناسب خیال کر کے حکومت خریدے گی وہ اس کا قیاس ہوگا اور حکومت کے ارکان کا اس پر اتفاق اجماع ہوگا۔ یہی چور کی سزا کا معاملہ ہے۔ کسی معمولی چیز کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ حضورﷺ کے دور میں چوری کی مالیت کو Define کیا گیا تھا۔ اس دور میں چوری کی مالیت کو' موجودہ دور کے مطابق مقرر کرنا ہوگا' چوری کی مالیت کا مقرر کرنا سنت ہے۔اس کی مالیت کا مقرر کرنا قیاس ہے اور حکومت کو بالاتفاق اس کو جاری کرنا' اجماع ہے۔

قرآن کریم کی رو سے اسلامی حکومت میں قانون سازی کی عمل شکل یہ ہوتی ہے۔

جو حضرات کفایتِ قرآن کے قائل ہیں' ان کو ہمارے علماء کرام مطعون کرتے ہیں کہ وہ اطاعتِ رسولؐ کے معاذ اللہ منکر ہیں۔ حالانکہ صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام خود اطاعتِ رسولؐ کے قائل نہیں ہیں۔ یہ جو چار مثالیں اوپر تحریر کی گئی ہیں' اس قسم کے بے شمار مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہمارے علمائے کرام کا نظریہ ہے کہ حضور جو کچھ کرتے تھے وہ صرف وحی خفی کی رو سے کرتے تھے' مثلاً مہر کا تعین' زکوٰۃ کی شرح کا تعین' چوری کی مالیت کا تعین یہ سب حضورؐ نے وحی خفی سے کیا ہے۔اس میں حضورؐ کی اپنی انتظامی' عقلی' کارگزاری کا کوئی دخل نہیں تھا اور چونکہ یہ سب وحی خفی پر مبنی ہیں اسی لئے ان میں کبھی بھی ترمیم نہیں ہوسکتی۔ یہ واضح رہے کہ وحی کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے حضورؐ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے علمائے کرام ایک وحی یعنی قرآن کی اطاعت کو تو اللہ کی اطاعت قرار دیتے ہیں اور دوسری وحی جو بقول ان کے مثلہٗ معہٗ یعنی بالکل اس کی مثل ہے' اس کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے دیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے مسلمانوں کی تباہی و بربادی شروع ہوتی ہے۔

ہمارے علماء کرام حضورﷺ کی عقلی' اجتہادی' انتظامی' اطاعت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ

صرف وحی کی اطاعت کے قائل ہیں۔انہوں نے حضورﷺ کی عقلی وانتظامی اطاعت کو' جو اطاعت صرف آپ کی زندگی تک محدود تھی' اس کو بالکل نظرانداز کر دیا حالانکہ یہی اطاعت آگے چل کر خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ان کے نزدیک حضورؐ کی عقلی اطاعت نہ فرض ہے اور نہ واجب جبکہ ہمارے نزدیک یہی اطاعت خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان (خلفاء) کی اطاعت اللہ ورسولؐ کی اطاعت بن جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے علماء کرام اس کو وحی خفی قرار دے کر' اس اطاعت کو استقلال و بقاء بھی دیتے ہیں اور اس کو احادیث کی طرف منتقل کر دیتے ہیں اور یہیں سے دین مذہب میں تبدیل ہو کر مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ اس طرح اطاعتِ رسولؐ کے لئے زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ پھر اطاعت رسول کے لئے احادیث کافی خیال کی جاتی ہیں۔

دین و مذہب میں قانون سازی کے فاصلے آپ نے ملاحظہ فرمائے۔اب مسلمانوں کی بقاء و سلامتی کی یہی راہ ہے کہ قرآن کریم کا نظام قائم کیا جائے اور صرف قرآن کو ماخذ قانون قرار دے کر' حالات حاضرہ کو پیش نگاہ رکھ کر' قوانین بنائے جائیں۔سابقہ ادوار کے قوانین جو فقہ اسلامی کہلاتے ہیں ان کو مسترد کر دیا جائے' کیونکہ اول تو ان کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے' دوئم یہ کہ وہ اپنے اپنے ادوار کو پیش نظر رکھ کر' اپنی ضرورتوں کے لئے بنائے گئے تھے۔سوئم یہ کہ وہ مذہب کی رو سے تحریر کئے گئے تھے' جن کے ماخذ ہی قرآن کے خلاف ہیں۔اگر مسلمانوں کی قسمت نے یاوری کی' اور کسی جگہ اسلامی حکومت قائم ہوئی تو وہاں اسی طرح قانون سازی ہوگی۔ ہر دور کی اسلامی حکومت کے قانون ہی اس کی شریعت اور اس کا فقہ ہوتا ہے۔سابقہ حکومتوں کے قوانین' آنے والی حکومتوں کے لئے شریعت یا فقہ نہیں بن سکتے اور نہ ہی آنے والی حکومتیں ان کی اطاعت کی مکلف ہوتی ہیں۔ ہر نئی اسلامی حکومت قرآن کی حدود میں رہ کر' اپنے حالات کے مطابق قوانین بناتی ہے اور اس کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق نہیں ہوتی۔ یہ تفریق سیکولر حکومتوں میں ہوتی ہے۔اسلامی

حکومت میں صرف ایک قانون جاری ہوتا ہے۔ جس کی اطاعت تمام رعایا کرتی ہے۔ اس میں نہ تو فرقے ہوتے ہیں اور نہ ہی مختلف فرقوں کے الگ الگ قانون۔ اس میں قانون کا Source صرف قرآن ہوتا ہے اور سنت' اجماع' قیاس' قانون سازی کے مختلف مراحل وطریقے ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا موضوع پر یہ مضمون یہاں ختم ہوتا ہے۔ البتہ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ سابقہ مضامین میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہمارا یہ دور اس معاملہ میں بڑا خوش قسمت ہے کہ صدر اول کے بعد' یہ پہلا موقع ہے کہ دین کا تصور اس درجہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے اور دین کے علمبرداروں کے لئے یہ بڑا آزمائش کا دور ہے۔ اگر اس مرتبہ پھر اس تصور کو عام نہ کر سکے' تو پھر ایک ہزار سال تک دوبارہ دین کا قیام مشکل رہے گا۔ انقلاب ایران سے بڑی توقعات وابستہ تھیں اور ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن افسوس کہ چونکہ وہ قرآن کریم کے مطابق نہیں تھا' اس لئے وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ رسالہ فرقہ بندی سے بالاتر ہے۔ اس لئے اس میں' اس انقلاب کے ناکام ہونے کی وجوہات تحریر کرنے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شیعہ مسلک کا رسالہ' اس قسم کے مضمون کو طبع کرنا چاہے' تو اس میں ایران کے انقلاب کے غیر قرآنی عناصر کی نشاندہی اور اس کے ناکام ہونے کی وجوہات تحریر کی جا سکتی ہیں اور ان خامیوں کو سامنے لانے سے ان کو ہی فائدہ ہوگا۔

ہمارے ہاں ایک غلط تصور یہ عام ہو چکا ہے کہ اگر مذہب میں اصلاح وترمیم کر دی جائے اور اس کو موجودہ حالات کے مطابق کر دیا جائے تو مسلمانوں کی قسمت بدل سکتی ہے۔ یہ ایک عام خیال ہے۔ ہمارے ہاں مختلف ٹی۔وی چینلز پر قرآن کریم سے متعلق کثرت سے پروگرام آ رہے ہیں۔ بیشتر لوگ' جو مذہب کے ہی داعی ہیں' بات بات پر آیات کے حوالے دیتے ہیں' ان کی اس ادا پر لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ حکومت بھی اپنی وسعت اور مصلحتوں کے مطابق اسلامی ادارے قائم کر رہی ہے لیکن یہ سب مذہب کو ٹھوک پیٹ کے لئے درست کرنے کا

طریقہ ہے۔ مذہب اور دین ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مذہب کی اصلاح کے بعد مذہب دین نہیں بن جاتا۔ بلکہ دین مذہب کی جگہ آتا ہے۔ پہلے مذہب کو بالکل جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیں' تب دین کا قیام عمل میں آتا ہے۔ دین اور مذہب میں کبھی مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ کوئی شخص دین کا داعی ہوگا یا مذہب کا۔ قرآنی آیات کے بکثرت حوالے دینے سے' مذہب کا داعی دین کا داعی نہیں بن جاتا۔ یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رکھئے۔

ومن احسن قولاً ممن دعا الی الله وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین (۴۱/۳۳)۔

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے اور اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً خدا کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر اسلامی حکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں ہوسکتی

ہمارے اس دور میں ہم مسلمانوں کو جس درجہ تباہی و بربادی کا سامنا ہے اس کی مثال ہماری ساری تاریخ میں صرف تاتاری دور کی تو ہوسکتی ہے' اس کے علاوہ کبھی بھی مسلمانوں کو اس درجہ زوال ونکبت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی اور آٹھویں صدی ہجری میں مسلسل تاتاریوں کے حملے ہوتے رہے۔ یہ دور مسلمانوں کا سخت Upheaval کا دور تھا۔ تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر کے' اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کا بڑا سبب مسلمانوں کا باہمی اختلاف تھا۔ کیونکہ اس سے پیشتر کرخ (بغداد کا ایک محلّہ) کو جس میں مسلمانوں کے ایک فرقہ کے لوگ آباد تھے' آگ لگا دی گئی تھی۔ اس کے ردعمل میں مسلمانوں میں آپس میں زیادہ غم و غصہ ونفرت و عداوت پیدا ہوگئی۔ ان کی نفرت سے تاتاریوں نے فائدہ اٹھایا اور چند عمائدین کا تعاون حاصل کر لیا۔ جس کی تفصیل ہماری تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہ دور شیخ سعدی کا تھا۔ چنانچہ زوالِ بغداد پر سعدی نے ایک بڑا دردناک اور الم انگیز مرثیہ لکھا تھا' جو اپنی رثائیت کی وجہ سے اب تک مشہور ہے۔ اس کا مطلع تھا کہ

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین
بر زوالِ ملکِ مُستعصم امیر المومنین

یہ دور بڑی تباہی و بربادی کا تھا اسی وجہ سے اس دور میں تصوف کو فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ تصوف کی

بنیاد Frustration ہوتی ہے اور ہمارے تمام بڑے بڑے اولیاء کرام اور صوفیائے عظام اسی دور کی پیدائش ہیں۔ تاتاریوں کا اس درجہ خوف غالب تھا کہ ایک ایک تاتاری بیس بیس مسلمانوں کو ذبح کر دیتا تھا۔ مشہور روایت ہے کہ کسی تاتاری کے پاس تلوار نہیں تھی اور اس نے کچھ مسلمانوں کو گھیر لیا تھا اس نے ان سب کو تنبیہہ کی کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں تاوقتیکہ وہ تلوار نہ لے آئے۔ چنانچہ وہ گیا اور ایک تلوار لا کر سب مسلمانوں کو قتل کر دیا اور اس کا اس درجہ خوف طاری تھا کہ وہ مسلمان اس کی عدم موجودگی میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ لیکن فطرت کے اشارے اور قدرت کے تقاضے اور ہی ہوتے ہیں کہ عرصہ بعد وہی تاتاری مسلمان ہو گئے اور پھر سے مسلمانوں کی قوت وطاقت کا ق سبب بنے۔

موجودہ دور میں مستقبل قریب میں اس قسم کی کوئی توقع بظاہر معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارا دور اس معاملہ میں بہت خوش قسمت اور بلند طالع ہے کہ اس دور میں دین کا تصور عام ہو رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے زوال کا سبب ہی یہ ہے کہ ہمارے ذہن سے دین کا تصور محو ہو گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ دور بہت خوش قسمت ہے کہ جس درجہ اس دور میں دین کا تصور واضح ہوا ہے۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ آج تک یہ تصور اس درجہ عام نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ مسلمانوں میں علوم پھیل رہے ہیں اور تعلیم اور Rationalism کا فروغ ہو رہا ہے۔ معتزلہ کی چند خوبیوں کی اہمیت اور عزت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ معتزلہ اس اعتبار سے بہت لائق مدح ہیں کہ انہوں نے فکر انسانی کو بڑی اہمیت دی تھی اور وہ صرف قرآنِ کریم اور سلطانِ عقل کے ہی قائل تھے لیکن یہ بات افسوس کے ساتھ تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ تمام فکری صلاحیت کے باوجود ان کے ہاں بھی دین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آپ ہم مسلمانوں کا ہزار بارہ سو سال کا پورا لٹریچر' تفسیر' حدیث' فقہ' تاریخ' سب بغور مطالعہ فرمالیں۔ آپ کو کسی کا ایک لفظ دین کے بارے میں کہیں نہیں ملے گا۔ برصغیر پاک وہند میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادے کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کے ہاں بھی اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ہمارے ہی برصغیر میں جب یہاں

Rationalism کی تحریک شروع ہوئی' تو جسٹس سر امیر علی' مولوی چراغ علی' شمس العلماء علامہ محب الحق بہاری' سر سید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے قرآن حکیم کے متعلق نہایت عمدہ اور حکیمانہ مضامین تحریر کئے' اور اس کے بعد پنجاب خصوصاً امرتسر میں اہل قرآن کا گروہ پیدا ہوا' جن کے سامنے خالص قرآن تھا' لیکن ان سب حضرات نے بھی' اپنے خلوص' اہلیت' قابلیت اور محنت شاقہ کے باوجود دین کا کوئی تصور پیش نہیں کیا۔ فرقہ اہل قرآن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں' لیکن انہوں نے بھی فقہ ملوکیت کو قرآنی فقہ میں تبدیل کرنے پر ہی اکتفاء کیا اور مذہب کی سطح سے بلند نہیں ہو سکے۔ دین کا تصور اجمالی طور پر علامہ اقبال نے پیش فرمایا اور اس بات کا پورا پورا Credit صرف ان کو ہی جاتا ہے' دین کے اسی تصور کو آیات قرآنی کے دلائل و براہین کے ساتھ مزین کر کے' علامہ محمد اسلم جیراجپوری نے پیش کیا۔ ان کا یہ مقالہ اس درجہ جامع' مدلل' واضح اور مسکات تھا کہ جس کی تردید نہ اس وقت بن سکی اور نہ آج بن سکتی ہے۔ پھر باقاعدہ مسلسل علمی تحریک کے طور پر اسی تصور کو عام کرنے کی سعادت مشہور و معروف مفکر قرآن محترم پرویز صاحب اور ان کی تحریک طلوع اسلام کے حصہ میں آئی۔ محترم المقام پرویز صاحب کی تو ساری عمر ہی اس تصور کو عام کرنے میں صرف ہوئی۔ ہر ہر پہلو' ہر ہر جہت' اور ہر ہر رخ سے انہوں نے دین کا تصور واضح سے واضح تر پیش کیا اور نہ صرف تصور واضح کیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کا واحد حل دین کا قیام ہے اور دین کے قیام سے ہی ان کی سرفرازی و سربلندی وابستہ ہے۔ ان کی ساری کتابوں کا نقطۂ ماسکہ دین کا قیام ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفاسیر' دین کے نقطہ نگاہ سے پیش کی جائیں۔ ہماری ساری سابقہ تفاسیر چونکہ مذہب کو پیش نگاہ رکھ کر تحریر کی گئی تھیں اس لئے وہ نہ صرف دین کا تصور پیش کرنے سے قاصر ہیں بلکہ ہر ہر آیت کی تفسیر دین کے تصور کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اور یہ تفاسیر و روایات ہی دین کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی حلقوں میں اور خاص طور پر علماء کے مابین یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ ''مفردات' اور 'کشاف' اگر کسی

کے زیر مطالعہ ہیں' تو اس کو قرآن فہمی میں مزید کسی کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ دعویٰ مذہب کی حد تک بے شک درست ہے۔ لیکن پھر وہی مصیبت کہ یہ دونوں کتابیں قرآن کریم کی صحیح تعلیم پیش نہیں کرتیں اور صرف مذہب میں پھنسائے رکھتی ہیں۔ اس دور کے مطابق' دین کو پیش نظر رکھ کر' لغات القرآن اور مطالب الفرقان (شائع کردہ از طلوع اسلام لاہور) کا مطالعہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم تک نہ صرف رسائی کرا دیتا ہے بلکہ اس درجہ خود مکتفیٰ ہے کہ یہ باقی سب تفاسیر سے مستغنیٰ کرا دیتا ہے۔ البتہ اس بات کی ضرورت پھر بھی باقی ہے کہ اس قسم کی تفاسیر' دین کو سمجھانے کی خاطر' مزید تعداد میں تحریر کی جائیں' تا کہ سابقہ تفاسیر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ خوب اچھی طرح یاد رکھئے کہ ہم جب تک سابقہ تفاسیر سے پیچھا نہیں چھڑائیں گے۔ مسلمان کسی طرح بھی ترقی واقتدار حاصل نہیں کر سکیں گے۔

تمام انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ وہ دین کو قائم کریں اور اس میں فرقے نہ ہونے دیں۔ **ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیه** (۴۲/۱۳)۔ دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ آپ سارا قرآن پڑھ ڈالیں کسی جگہ بھی مذہب کے قیام کا حکم نہیں ہے۔ سب جگہ صرف دین کے قیام پر اصرار ہے۔ دین کی کھلی کھلی' واضح اور امتیازی نشانیاں یہ ہیں کہ (۱) اس میں فرقہ بندی نہیں ہو سکتی' کیونکہ فرقہ بندی مذہب میں ہوتی ہے۔ دین میں فرقہ بندی نہیں ہوتی۔ (۲) دین کے قیام میں مسلمانوں کے پاس اقتدار کا ہونا ضروری ہے جبکہ کوئی بھی مذہب' کسی بھی ملک میں' مغلوب رہ کر بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مذہب میں غلبہ شرط نہیں ہے۔ غلبہ صرف دین میں شرط ہے۔ (۳) دین میں قانون کا ماخذ Source صرف قرآن کریم ہے۔ **وما اختلفتم فیه من شیء فحکمه الی الله** (۴۲/۱۰)۔ اور جس بات میں بھی جھگڑا ہو' تو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ۔ جبکہ مذہب میں ہمارے علماء کرام کی مصطلحہ ادلہ اربعہ' یعنی قرآن کے علاوہ سنت' اجماع' قیاس بھی قانون کے مصادر و ماخذ میں شامل ہیں۔ (۴) دین میں نظام کی اطاعت کے ذریعے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے جبکہ مذہب میں اللہ و رسول کی اطاعت الگ الگ

قرآن وروایات میں ہوتی ہے۔(۵) مذہب میں رسول کی اطاعت ذاتی، شخصی اور نجی طور پر کی جاتی ہے، جبکہ دین میں رسول کی اطاعت، بحیثیت منصب رسالت و باعتبار سربراہ مملکت اسلامی کے کی جاتی ہے کیونکہ انبیاء ورسل کی اطاعت ذاتی طور پر نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کے منصب کی اطاعت ہوتی ہے۔(٦) جوان کے انتقال کے بعدان کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی تھی۔(۷) مذہب میں اعمال کے نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے جبکہ دین میں اعمال کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں اور خدا جو وعدے مومنین سے کرتا ہے اس کا دین وہ سب وعدے اسی دنیا میں پورا کر کے دکھا دیتا ہے۔

انبیاء کرام غلطیوں سے مستثنیٰ ومبرا نہیں تھے۔حضرت نوحؑ کو حکم ہوا **احمل فیھا من کل زوج اثنین و اھلک** (۱۱/۴۰)۔ ہر چیز میں سے نر و مادہ دونوں کو اور اپنے اہل کو اس کشتی میں سوار کر لو۔ حضرت نوحؑ کو لفظ اہل سے مغالطہ لگا اور انہوں نے دعا فرمائی کہ اے میرے خدا! میرا بیٹا تو میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ پکا ہے۔ یہ دعا حضرت نوحؑ نے اس وقت فرمائی تھی جب انہوں نے بیٹے کو ڈوبتا دیکھا۔ چونکہ اہل کے لفظ میں ان کا بیٹا بظاہر شامل تھا اس لئے انہوں نے یہ دعا دفریاد کی تھی۔لیکن چونکہ وہ نابکار ونا ہنجار تھا، اور نبی کا گھرانا صرف نسب سے نہیں بنتا بلکہ ایمان و عمل صالح سے بنتا ہے۔اس لئے یہ اہل میں شامل نہیں ہو سکا اور حضرت نوحؑ کو تنبیہ ہوئی۔ **انی اعظک ان تکون من الجاھلین** (۱۱/۴٦)۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے نہ بن۔ پس حضرت نوحؑ نے اس تنبیہ کے بعد توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے اس توبہ کو قبول فرما لیا۔

اسی طرح قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کا ذکر ہے۔ **و ان یونس لمن المرسلین** (۳۷/۱۳۹)۔ یقیناً یونس بھی رسولوں میں سے تھے۔ انبیاء کرام کی سنت یہی رہی ہے کہ وہ پہلے اپنی قوم کو دعوت دیتے تھے، لیکن جب مسلسل دعوت و تبلیغ کے باوجود ان کی قوم ایمان نہیں لاتی تھی تو وہ خدا کے حکم کے مطابق اس مقام سے ہجرت کر کے، کسی ایسے دوسرے مقام پر چلے جاتے تھے

جہاں ان کو خیال ہوتا تھا کہ ان کی تبلیغ کامیاب ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس کی قوم ان کی تبلیغ کے باوجود جب ایمان نہیں لائی تو وہ اس قوم سے مایوس بھی ہوئے اور سخت ناراض بھی۔ وہ اس قوم سے ناراض ہو کر کسی دوسری طرف چلے گئے لیکن اس وقت تک انہیں خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا لیکن جب انہیں مشکلات کا سامنا ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے یہ فیصلہ خدا کے حکم سے پہلے ہی کر لیا اور یہ منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ہوا۔ اگرچہ حضرت یونس نے جو اقدام لیا تھا وہ ایک نیک جذبہ کے ماتحت تھا' لیکن چونکہ وہ اذن خداوندی کے بغیر کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے ان کی گرفت ہوئی۔ چونکہ گرفت آدمی کے درجہ اور مرتبہ کے مطابق ہوتی ہے اس وجہ سے ان کی گرفت بھی سخت ہوئی۔

اسی طرح حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا واقعہ بھی قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء کرام غلطیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ اور وہ اپنے فیصلوں میں غلطیاں کر سکتے تھے۔ حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں اللہ کے نبی و رسول تھے دونوں نے ایک ہی مقدمہ کا فیصلہ ایک دوسرے کے خلاف دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک نبی کا فیصلہ درست تھا اور دوسرے کا غلط تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل کمترین کے مضمون 'شرک خفی کا نادانستہ ارتکاب' مطبوعہ طلوع اسلام جنوری ۲۰۰۷ء میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

بعینہٖ سورہ قصص میں حضرت موسیٰ کا واقعہ قرآن کریم نے نقل فرمایا کہ ایک دن وہ شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کو لڑتے دیکھا۔ اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰ کو دیکھا تو وہ ان سے مدد کا طالب ہوا۔ حضرت موسیٰ اس مظلوم کو دیکھ کر' اس کی مدد کے لئے بڑھے' اور چاہا کہ بیچ بچاؤ کرا دیں۔ مگر وہ قبطی اپنی رعونت کی وجہ سے ان سے ہی الجھ پڑا۔ حضرت موسیٰ نے جو اس کو گھونسا مارا وہ وہیں مر گیا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ کا ارادہ اس کو قتل کرنے کا نہیں تھا لیکن جب یہ حادثہ پیش آ ہی گیا تو انہیں اپنی غلطی پر سخت پشیمانی و ندامت ہوئی اور انہوں نے اپنے رب سے معافی مانگی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی جان پر سخت ظلم کیا۔ تو مجھے معاف فرما

دے۔ چونکہ یہ غلطی ان سے بالکل بے ارادہ ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے معافی بھی فوراً مانگ لی' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو فوراً ہی معاف فرما دیا۔

مندرجہ بالا آیات کریمات سے آپ نے بخوبی اندازہ فرما لیا ہوگا کہ انبیاء کرام کے افعال ان کے ذاتی اختیار کا نتیجہ ہوتے تھے' جن میں غلطی ولغزش کا امکان ہوتا تھا اور اسی وجہ سے انبیاء کرام کی ذاتی وشخصی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور مخلوق کی اطاعت ایک جیسی نہیں ہو سکتی اللہ کی اطاعت وہ ہے جو کائنات کو پیدا کرنے والے کے لائق ہے اور مخلوق کی اطاعت وہ ہے جس کے لئے مخلوق سزاوار ہے۔ اللہ کے رسول چونکہ مخلوق ہوتے تھے' اس لئے اللہ اور اس کے رسولوں کی اطاعت میں وہ فرق رکھنا ضروری ہے جو خالق ومخلوق میں ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت بالاصل ومطلق ہوتی ہے۔ جبکہ رسول کی اطاعت بالاصل ومطلق نہیں ہوتی۔ رسول کی اطاعت قانون خداوندی کی حدود کے اندر اندر ہوتی ہے۔ **وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ** (۴/۶۴)۔ رسول کی اطاعت بالاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی اطاعت کرانے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ **من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ** (۴/۸۰)۔ جس نے رسول کی اطاعت کی' اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اللہ کی اطاعت مطلق اطاعت ہوتی ہے۔ جبکہ رسول کی اطاعت کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ جن میں بہت لطیف فرق ہوتا ہے اور جن کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

رسول کی ایک حیثیت اس کی ذاتی ہوتی ہے۔ اس میں اس کی اطاعت فرض نہیں ہوتی ہے۔ رسول کی ذاتی رائے یا مشورہ سے ہر شخص کو اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس اختلاف کا نام معصیت رسول نہیں ہوگا۔ احادیث مبارکہ میں اس قسم کے بہت سے واقعات درج ہیں کہ ایسے مواقع پر صحابۂ کرام حضور ﷺ سے دریافت فرما لیتے تھے کہ آپ کا یہ حکم ذاتی طور پر ہے یا یہ فرمودات وحی کی رو سے ہیں۔ اگر وہ حضور ﷺ کی ذاتی ہدایت یا خواہش ہوتی تھی' تو اس پر عمل کرنا ضروری لازمی نہیں ہوتا تھا۔ کھجور کے درختوں کو گابھا دینے کا واقعہ' اس درجہ مشہور ہے کہ یہ تقریباً ہر

شخص کو معلوم ہے، نیز بدر کی لڑائی میں جو مقام حضورﷺ نے منتخب فرمایا تھا وہ قدرے نشیب میں واقع تھا۔ صحابہ کرامؓ نے درخواست کی کہ اگر یہ مقام آپﷺ نے وحی کی رو سے منتخب کیا ہے، تو اس میں کوئی رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر آپﷺ نے یہ اپنی مرضی سے منتخب کیا ہے تو یہ مقام Stragically درست نہیں ہے آپﷺ اس کو تبدیل فرمادیں۔ صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے آپﷺ نے وہ مقام تبدیل کر دیا اور دوسرا جو مقام بلندی پر تھا، اسے منتخب فرمالیا۔ اس نکتہ کی وضاحت کے بارے میں حضرت مولانا اصلاحی صاحب نے اپنی مشہور زمانہ تفسیر میں تحریر فرمایا ہے کہ ''بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آپﷺ نے کوئی بات بطور تجویز یا مشورہ کے پیش کی اور صحابہ کرامؓ کو معلوم ہوا کہ یہ بات وحی پر مبنی نہیں ہے بلکہ حضورﷺ کی ذاتی رائے یا تجویز ہے تو صحابہؓ نے اس کے مقابل میں اپنی تجویزیں بھی پیش کی ہیں اور حضورﷺ نے بعض اوقات ان کی تجویز مان بھی لی۔'' حضرت مولانا اصلاحی مرحوم کی تحریر سے ہمارے موقف کی پوری پوری تائید وتصویب ہوتی ہے۔

اگر چہ حضرت کی تائید کے بعد اس سلسلہ میں مزید کچھ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں رہی، تاہم اس بارے میں ان چند مقامات کا حوالہ بھی تحریر کیا جاتا ہے جہاں قرآن کریم سے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ ایک تو حضرت زیدؓ کا واقعہ ہے جس کو قرآن کریم نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے قارئین کرام بھی اس کی تفصیل سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اس لئے اس کا اسی قدر حصہ پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے، جو صرف اس نکتہ کی وضاحت سے متعلق ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا۔ **واذ تقول للذی انعم الله علیه و انعمت علیه امسک علیک زوجک** (۳۳/۳۷)۔ اور جبکہ تم اس سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو۔'' یعنی حضرت زیدؓ دونوں کی طرف سے انعام یافتہ اور منظور نظر تھے اور آیہ کریمہ کے الفاظ **واذ تقول** سے یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ حضورﷺ نے یہ بات حضرت زیدؓ سے بار بار فرمائی کہ اپنی بیوی کو نکاح میں باقی رکھو۔ اگر یہ بات

حضورﷺ نے صرف ایک مرتبہ کہی ہوتی تو قلت کافی تھا' تقول کی ضرورت نہیں تھی' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت زیدؓ نے اپنے ارادۂ طلاق کا حضورﷺ کے سامنے متعدد مرتبہ اظہار فرمایا ہوگا' مگر حضورﷺ نے ہر مرتبہ ان کو منع کیا ہوگا لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی اور اس کے بعد بھی وہ انعام یافتہ رہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ذاتی طور پر حضورﷺ کی اطاعت ضروری نہیں تھی۔ اگر حضورﷺ کی ذاتی 'شخصی طور پر اطاعت لازم ہوتی اور حضرت زیدؓ پر حضورﷺ کے بار بار منع کرنے کے باوجود طلاق دیتے تو وہ معصیت رسول کے مرتکب ہوتے اور ہرگز انعام یافتہ نہ ٹھہرتے۔

قرآن کریم میں مومنین کے لئے عام حکم ہے کہ ان کے امور کے فیصلے آپس کی مشاورت سے ہوتے ہیں۔ وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)۔ اس حکم کے باوجود حضورﷺ کو ایک تاکیداً حکم الگ دیا گیا کہ وہ اپنے امور میں صحابہؓ سے مشورہ کرلیا کریں (۳/۱۵۹)۔ اب اگر حضورﷺ کا ذاتی حکم حجت ہوتا' اور اس کی اطاعت لازمی ہوتی تو حضورﷺ کو مشورہ کا حکم نہ دیا جاتا۔ کیونکہ یہ بات ضروری ہے کہ کبھی تو مستشیر کا فیصلہ درست ہوتا ہے اور کبھی مستشاد کا نظریہ درست ہوسکتا ہے۔ مشورہ کے بعد ظاہر ہے کہ اگر کسی صحابیؓ کا مشورہ زیادہ صائب ہوتا ہوگا' تو حضورﷺ اس کو اختیار کر لیتے ہوں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورﷺ کا ہر قول نہ تو حجت تھا اور نہ اس کی اطاعت لازی تھی۔ البتہ جب آپ بحیثیت سربراہ مملکت کے مشورہ فرماتے تھے' اور پھر مشورہ کے بعد جو حکم جاری فرماتے تھے' اس کی اطاعت ضروری اور لازمی تھی (اس کی تفصیل آگے آتی ہے)۔

دوسری حیثیت رسول کی بحیثیت رسول و نبی کے ہوتی ہے جس میں ذاتی رائے کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ رسول بحیثیت رسول ہونے کے وحی الٰہی کے احکامات جاری کرتا ہے' اس پوزیشن میں رسول کے ہر ہر حکم کی اطاعت و فرمانبرداری لازمی و ضروری ہوتی ہے۔ اس بارے میں مختلف آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ سے ہماری راہنمائی ہوتی ہے۔ سورۃ مجادلہ کی پہلی آیۃ

کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ **قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللہ** (۵۸/۱)۔ اے رسول! جو عورت اپنے شوہر کے بارے میں تم سے جھگڑتی تھی اور خدا سے شکایت کرتی تھی، خدا نے اس کی بات سن لی، اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں تمام مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ یہ آیت حضرت خولہ بنتِ تعلبہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ان کے شوہر حضرت اوسؓ نے ان کو ظہار کر دیا تھا (اپنی بیوی کو ماں کہہ کر اپنے اوپر حرام قرار دے دینا، ظہار کہلاتا ہے)۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہیں اس فعل سے ندامت ہوئی اور وہ اپنی بیوی سے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس معاملہ میں حضرت خولہؓ حضورﷺ کے پاس حاضر ہوئیں اور اس بات پر جھگڑتی رہیں کہ ظہار سے بیوی شوہر پر حرام نہیں ہو جاتی لیکن حضورﷺ کی رائے یہی تھی۔ یہاں تک تو حضرت خولہؓ حضورﷺ سے جھگڑا کرنے کی مجاز تھیں اور معصیت رسول کی مرتکب نہیں ہوئیں اور اپنا نظریہ پیش کرتی رہیں لیکن جب اس بارے میں آیۂ کریمہ نازل ہوگئی اور اس نے بھی ظہار کی کوئی حیثیت نہیں رکھی، اب حضورﷺ نے اس جھگڑے کا فیصلہ آیت کے ذریعے سنا دیا تو اب ان پر حضورﷺ کے قول، وحی کی اطاعت فرض ہوگئی اور اگر بالفرض آیت کریمہ ظہار کو طلاق قرار دے دیتی تب بھی ان پر اس کی اطاعت فرض تھی اور اس کی نافرمانی معصیت رسول قرار پاتی۔ حضورﷺ کی ذاتی رائے تک انہیں اختلاف کا حق تھا لیکن جب حضورﷺ کی ذاتی رائے وحی کے طور پر پیش کی جاتی پھر اس کی اطاعت فرض ہوتی۔

مزید وضاحت کی خاطر دوبارہ عرض ہے کہ حضورﷺ کے ذاتی قول و خواہش کی اطاعت لازمی نہیں تھی لیکن اگر وہی قول یا خواہش بطور وحی کے ہوتا تھا اور حضورﷺ بحیثیت رسول کے اس وحی کو پہنچاتے تھے، تو پھر حضورﷺ کی اطاعت لازمی ہو جاتی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے: **یاایھا الذین آمنوا لا تدخلوا ببوت النبی الا ان یوذن لکم الی طعام غیر نظرین انه ولکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستالسین لحدیث ان ذلکم کان یوذی النبی فیستحی منکم** (۳۳/۵۳)۔ اے ایمان والو! تم لوگ پیغمبر کے گھروں

میں نہ جایا کرو مگر جب تم کو کھانے کے واسطے (اندر آنے کی) اجازت دی جائے (لیکن) ان کے پکنے کا انتظار نہ کرو مگر جب تم کو بلایا جائے تو (ٹھیک وقت پر) جاؤ۔ پھر جب کھا چکو تو چلے جایا کرو اور باتوں میں نہ لگ جایا کرو' کیونکہ اس سے پیغمبر کو اذیت ہوتی ہے تو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ کھانا تیار ہونے سے پیشتر ہی آ بیٹھتے تھے اور کھانا تناول کر لینے کے بعد بھی حضور ﷺ سے گفتگو کرنے کے خیال سے بیٹھے رہتے تھے۔ اس سے حضور ﷺ کا وقت ضائع ہوتا تھا اور انہیں وقت کے ضیاع سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اب اگر حضور ﷺ ان کو ذاتی طور پر منع فرما دیتے' ممکن تھا کہ وہ حضرات اس سے باز آ جاتے' لیکن اگر وہ باز نہ آتے اور اسی معمول کے مطابق آتے رہتے تو وہ معصیت رسول کے مرتکب نہ ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ بداخلاقی کے مرتکب ہوتے۔ حضور ﷺ کو بھی یہی خیال ہوگا کہ وہ لوگ چونکہ حضور ﷺ سے بہت محبت کرتے تھے اور حضور ﷺ سے باتیں کرنے کے آرزومند تھے۔ اس لئے شاید منع کرنے کے باوجود بھی آتے رہیں گے' حضور ﷺ کی اس خواہش کے مطابق آیات الٰہی نازل ہوئیں۔ آیات کے نزول کے بعد پھر یہ حکم الٰہی کی شکل اختیار کر گیا اب جب حضور ﷺ نے یہی آیات ان حضرات کے سامنے تلاوت فرمائیں اب وہ اس بات کے مکلّف تھے' کہ اس کی اطاعت کریں اور اس کی عدم اطاعت معصیت رسول کے مرادف تھی۔ اس آیت سے حضور ﷺ کی ذاتی اطاعت' اور بحیثیت رسول اطاعت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

مزید گفتگو کرنے سے پیشتر یہ بات تاکیداً وتوثیقاً عرض کی جاتی ہے کہ یہ صورت نہیں ہے کہ ہم کوئی خدانخواستہ' معاذ اللہ' اطاعت رسول ﷺ کے منکر ہیں۔ ہم بھی دل و جان سے اطاعتِ رسول کے قائل ہیں۔ عشقِ رسول میں ڈوبے ہوئے ہیں' اور حضور ﷺ سے محبت کرنے کی وجہ سے دلی آرزومند ہیں کہ

غلام مصطفیٰ بن کر میں بک جاؤں مدینے میں
محمدؐ نام پر سودا سرِ بازار ہو جائے

لیکن ہماری اطاعت کے تصور میں اور علمائے کرام کے تصور اطاعت میں یہ فرق ہے کہ وہ حضورﷺ کی اطاعت باعتبار سربراہ مملکت کے قائل نہیں ہیں۔صرف بحیثیتِ رسول ان کی ذاتی اطاعت کے قائل ہیں' اور مذہب میں اس کے علاوہ اور کوئی راہ نکل بھی نہیں سکتی اور اس ذاتی شخصی اطاعت کر وہ حضورﷺ کے بعد ان کی احادیث کے ذریعے سرانجام دیتے ہیں۔ جبکہ ہمارا تصور اطاعت یہ ہے کہ یہ تیسری قسم حضورﷺ کی اطاعت کی باعتبار سربراہ مملکت کے ہے۔ یہ حضور کی انتظامی' عقلی' اطاعت ہے۔ جو حضورﷺ کے بعد ان کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورﷺ کی اس اطاعت کو اور مقامی حکام کی اطاعت کو قرآن نے ایک جیسا ہی قرار دیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:**یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردہ الی اللہ والرسول.** اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی' اور اپنے میں سے حکام مملکت کی اطاعت کرو' تو اگر تم میں کسی چیز میں (مقامی حکام) سے جھگڑا ہو جائے تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹا دو۔

اس آیۂ کریمہ میں یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ اس میں اللہ اور رسول کی اطاعت میں واضح فرق بیان کرنے کی وجہ سے اطیعوا کا لفظ ظاہراً بھی دو مرتبہ لایا گیا ہے۔اللہ والے اطیعوا میں صرف اللہ کا ذکر ہے اور رسول کو اولی الامر (مقامی ماتحت حکام والے اطیعوا کے ساتھ لا کر' انہیں) کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں اطاعتیں الگ الگ دو نوعیتوں کی ہیں۔ ایک اطاعت (پہلی اللہ والی) وحی کی اطاعت ہے اور دوسری اطاعت (پچھلی یعنی اولی الامر والی) عقلی' انتظامی' سیاسی اطاعت ہے' جس طرح اولوالامر سے مراد زندہ حاکم ہیں' یہی حال رسول کا بھی ہے جو اولی الامر والے اطیعوا ہی میں داخل ہیں کہ ان کے بعد ان کی اطاعت ان کی خلفاء جو زندہ حاکم ہوتے ہیں' ان کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ رسول اللہﷺ کی اطاعت صرف نظام کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے اور حضورﷺ کی یہی انتظامی اطاعت ان کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔فلہٰذا حضورﷺ کے

بعد اسلامی مملکت کے حکمران کی اطاعت ہی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ اسلامی نظام یا قرآنی حکومت کے بغیر حضور ﷺ کی اطاعت کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتی۔ نظام کے بغیر حضور ﷺ کی اطاعت کرنے کا تصور علماء کرام کا ہے' جو قرآن کے خلاف ہے۔ ہمارے عشق رسول ﷺ کے دعاوی' سنتیں ادا کرنا' عشق رسول ﷺ میں خاص وضع کا لباس پہننا' گریہ وزاری کے ساتھ نعتیں پڑھنا' عمرے ادا کرنا' رائے ونڈ کے اجتماعات میں شرکت کرنا' ماتم ومجالس عزا برپا کرنا' بغیر اسلامی نظام کے قیام کے کماحقہ بے معنے اور بے مقصد چیزیں ہیں۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً (۱۰۴/۱۸)۔ اور وہ اس خیال خام میں ہیں کہ وہ اچھے اچھے کام کر رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ طاغوتی نظام میں رہ کر اطاعت رسول ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ (نظام) تو رسول اللہ سے باغی اور عاری ہوتا ہے۔ رسول اللہ کی اطاعت صرف اور صرف اسلامی نظام میں ہو سکتی ہے اور اس کے لئے حضور ﷺ کی موتیوں سے زیادہ روشن اور ہیروں سے زیادہ درخشندہ حدیث بھی دال ہے جبکہ فرمایا۔ من اطاعنی فقدا طاع الله ومن اطاع امیری فقد اطاعنی۔ ومن عصانی فقد عصی الله ومن عصی امیری فقد عصانی۔ (بخاری ومسلم)۔ جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی اطاعت کی اس نے دراصل میری ہی اطاعت کی۔ اسی طرح میرے امیر کی نافرمانی میری نافرمانی اور میری نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

جیسا کہ صدر مضمون میں تحریر کیا گیا ہے کہ ہماری سابقہ تمام تفاسیر مذہب کی بنیاد پر تحریر کی گئی ہیں اور یہی تفاسیر اسلامی نظام کے قیام میں مانع ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کریم کی تفاسیر دین کی بنیاد پر تحریر کی جائیں اور مزید آیت کی تفسیر اسی انداز میں پیش کی جائے۔ دین اور مذہب کی تفسیر میں جو واضح فرق ہے اس کو دکھانے کے لئے نمونتہً چند آیات کی تفسیر پیش خدمتِ عالی کی جاتی ہے۔

مال فئے و مال غنیمت کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ جو کچھ رسول اللہ کسی کو دیں اسے بخوشی

قبول کر لینا چاہئے اور یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ہمیں کم دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں حکم دیا گیا۔ **وما اٰتکم الرسول فخذوہ، و ما نھٰکم عنہ فانتھوا** (۵۹/۷)۔ رسول تم کو جو دے' اسے لے لو' اور جس کے لینے سے روکے' اس سے رک جاؤ۔ ہمارے علماء کرام اس آیۂ کریمہ کو اپنے سیاق وسباق Content سے بالکل منقطع کر کے' اسکو حجیت حدیث کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت کا حجت حدیث سے دور دور تک کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس میں ایک اصولی حکم بیان فرمایا گیا ہے کہ غنیمت و فئے میں حضور جس طرح مال تقسیم فرمائیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہئے' اور اس کو ہر سپاہی بخوشی قبول کر لے۔ ہمارے علماء کرام اس کو حضورﷺ کی ذات سے وابستہ کر کے' اس سے حجت حدیث پر دلیل لاتے ہیں۔ حالانکہ یہ واضح ہے کہ مال فئے کوئی ایسی چیز نہیں جس کا حضورﷺ کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہو۔ مال فئے و غنیمت انہیں شرائط کے ساتھ اب بھی خلفاء رسول و جانشین رسول تقسیم کر سکتے ہیں۔ مذہب میں تو یہ حکم آپ کی ذات والا صفات سے وابستہ کیا جاتا ہے' لیکن دین میں عملاً یہ فریضہ حضورﷺ کے خلفاء بھی ادا کر سکتے ہیں اور اپنی صوابدید کے مطابق مال تقسیم کر سکتے ہیں اور جو حکم حضورﷺ کے متعلق تھا کہ ان کی تقسیم پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے' اس حکم کا اطلاق خلفاء پر بھی ہو گا کہ ان کی فوج کو خلفاء کی تقسیم پر راضی رہنا چاہئے۔

(۲) **انما المومنون الذین آمنوا باللہ و رسولہ اذ کانوا معہ' علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ'** (۲۴/۶۲)۔ ایمان والے تو وہی لوگ ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان لے آئیں اور جب وہ کسی ایسے کام میں رسولﷺ کے ساتھ ہوں جس میں سب کا جمع ہونا ضروری ہے۔ تو وہاں سے جب تک رسولﷺ سے باقاعدہ اجازت نہ لے لیں' چلے نہیں جاتے۔

اس آیۂ کریمہ میں پھر ہمارے علماء کرام اجتماع علی امر جامع اور استیذ ان' دونوں کو صرف حضورﷺ کی ذات سے محدود وابستہ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ دین کے

نظام میں ہر مومن پر فرض ہوگا کہ وہ سربراہ مملکت کے حکم پر امر جات پر حاضر ہو اور جب تک سربراہ مملکت یا اس مملکت کی اولی الامر اس کو جانے کی اجازت نہ دیں وہ اس مجلس مشاورت میں حاضر رہے۔

(۳) **واذا جاء هم امر من الامن اوالخوف اذا عوابه الخ.** اور جب ان کے پاس کوئی بات امن یا خوف کی آتی ہے تو یہ اسے پھیلا دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس چیز کو رسول یا اولی الامر کے پاس آ کر پیش کر دیتے تو ان میں سے استنباط کرنے کے بعد اسے جان لیتے۔

حالانکہ یہ آیۂ کریمہ خود بول بول کر پکار رہی ہے کہ اس میں رسول اور اولی الامر سے مراد صرف خود رسول اللہ یا آپ کے دور کے اولی الامر ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ اس وقت ان افواہوں کو حضورﷺ کے سامنے پیش کرنا اور ان کے متعلق حضورﷺ سے اور اس دور کے اولی الامر سے استنباط کرانا ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام اس آیت کو صرف حضورﷺ سے متعلق قرار دے دیتے ہیں لیکن درست یہ ہے کہ یہاں واضح طور پر رسول سے مراد رسول یا ان کی جگہ دوسرے کام کرنے والے خلفاء ہوتے ہیں اور یہ انتظامی کام (استنباطِ امورِ مملکت) حضورﷺ کے بعد کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

(۴) **وکیف تکفرون وانتم تتلی علیکم آیت الله و فیکم رسوله** (۳/۱۰۱)۔ اور تم کس طرح کافر ہو سکتے ہو اور تم پر پڑھی جاتی ہیں اللہ کی آیتیں اور تم میں اس کا رسول (موجود) ہے۔ یہاں ظاہر ہے کہ اس وقت' اس دور میں' و فیکم رسوله' سے مراد رسول اللہ ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اس وقت ان کے انتقال کے بعد یہ آیت بے اثر ہو جاتی ہے اور اس کو قرآن میں محفوظ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن افسوس کہ مذہب کے داعی ہمارے علماء کرام' اس آیۂ کریمہ میں رسول سے مراد صرف حضورﷺ کی ذات ہی لیتے ہیں۔ تفسیر عثمانی میں مرقوم ہے:

''یعنی بہت دور ہے کہ وہ قوم ایمان لائے پیچھے کافر بن جائے یا کافروں جیسے کام کرنے لگے جس کے درمیان خدا کا عظیم الشان پیغمبر جلوہ افروز ہو اور جو شب و روز ان کو اللہ کا روح پرور کلام اور اس

کی تازہ بتازہ آیات پڑھ کر سناتا رہتا ہے۔'' جبکہ اس کا دینی مفہوم یہ ہے: ''اے جماعتِ مومنین تم حالتِ کفر کی طرف کس طرح لوٹ سکتے ہو اس لئے کہ ایمان کے راستے پر قائم رہنے کے لئے دو بنیادی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ قوانین خداوندی (اپنی اصلی شکل میں) انسان کے سامنے ہوں اور دوسرے یہ کہ ان قوانین پر عملی طور پر چلانے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی موجود ہو۔ (مفہوم القرآن' ص ۱۴۵)۔

(۵) ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وک فاستغفروا الله واستغفر لهمْ الرسول لو جدوا الله توابا رحيما (۴/۶۴)۔ اے رسول! جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اگر وہ تیرے پاس آتے پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے بخشش مانگتا' تو اللہ کو تواب ورحیم پاتے۔

بے شک حضور ﷺ کی موجودگی میں حضور ﷺ کے پاس حاضر ہونا لازمی تھا لیکن اس وقت کوئی شخص بھی یہ خیال نہیں کرسکتا کہ اس وقت بھی حکومت کی مخالفت کرنے والوں کو حضور ﷺ کے مزار شریف پر حاضر ہوکر' اور خود حضور ﷺ سے صفائی کرانا اور حضور ﷺ سے بخشش منگوانا ضروری ہے۔ اس وقت یہ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اس وقت تو ضروری ہے کہ اپنے حکام کے پاس جا کر معاملہ کی صفائی کرائی جائے اور حکام کو بھی ضروری ہے کہ اپنی رضامندی ظاہر کردیں۔ اس آیۂ کریمہ سے بخوبی واضح ہے کہ اس قسم کی آیات کریمات میں حضور ﷺ کے انتقال کے بعد رسول سے مراد' آپ کے خلفاء کرام ہیں۔

ان پانچ آیات کریمات کی مذہبی و دینی تفسیر پیش خدمت عالی کی گئی ہے۔ ان کے مطالعہ کے بعد' آپ خود فرمائیں کہ یہ تفاسیر دین کے قیام میں کس طرح مانع اور رکاوٹ ہیں۔

ان فی ذلک لذکریٰ لمن کان لہ قلب اوالقیٰ السمع وهو شهید (۵۰/۳۷)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص دل رکھتا ہے یا کان لگا کر سنتا ہے' اس کے لئے اس میں

کافی نصیحت ہے۔

مراد ما نصیحت بود کردیم
حوالت با خدا کردیم رفتیم

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضور ﷺ کے بعد حضور ﷺ کا قائم مقام کون ہے

شروع سے سنت اللہ یہی چلی آ رہی ہے کہ انسانیت کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین نازل ہوتا تھا۔ چونکہ اس وقت معاشرہ بہت سادہ تھا اور زندگی بسر کرنے میں مسائل واختلافات کم تھے اس لئے اللہ تعالیٰ کے دین میں بھی ہدایات واحکامات اسی درجہ پر ہوتے تھے کہ وہ اس دور کی انسانیت کی پوری طرح ہدایت کر دے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **شرع لکم من الدین ماوحی به نوحاً** الخ (۴۲/۱۳) تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا نوحؑ کو حکم دیا گیا تھا۔ حضور ﷺ کو جو دین دیا گیا تھا وہ کوئی نیا نہیں تھا بلکہ وہی تھا جو گذشتہ انبیاء کرام کو دیا گیا تھا۔ البتہ چونکہ اس دین کو حضور ﷺ پر ختم ہونا تھا اس لئے اس کو اسی درجہ جامع اور انسانیت کے لئے خود مکتفی بنایا گیا کہ یہ ہر دور کی انسانیت کی راہنمائی کے لئے کافی ہو جائے۔ حضور ﷺ کو آیۂ کریمہ (۶/۹۰) میں سابقہ متعدد انبیاء کرام کے نام لے کر حکم دیا گیا ہے کہ: **اولئک الذین هدی الله فبهداهم اقتده** (۶/۹۰)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں ہم نے ہدایت دی تھی۔ اے پیغمبر آپ ان کی ہدایت کی پیروی کیجئے۔ اس آیت میں سابقہ انبیاء کرام کی ہدایت کی پیروی کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ان سابقہ انبیاء کرام میں سے کسی کی بھی کوئی حدیث یا روایت حضور ﷺ کے پاس موجود نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اقتداء وپیروی کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ پیروی ان کی ذاتی' شخصی پیروی نہیں تھی بلکہ ان کے اقتداء کرنے کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ ان کے دین کی اقتداء کی جائے۔ جو انہوں نے وحی الٰہی کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ حضور ﷺ کے دور کی وحی قرآن میں تھی۔ اس لئے قرآن کے قائم کردہ دین کا اتباع

ان انبیاء کرام کی اتباع واقتداء تھی اور ہمارے لئے بھی قرآن کے دین کا اتباع حضورﷺ کا اتباع ہے۔ قرآنِ کریم کا مقصد ذاتی یا شخصی معمولات کا اتباع نہیں ہوتا' بلکہ اس کا مقصد ہمیشہ' اس کے دین کا اتباع ہوتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

حضرت موسیٰ کا معاملہ جب دربارِ فرعون میں پیش ہوا اور فرعون نے اس بات پر اظہار رضامندی کر دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے تو انہیں میں ایک مردِ مومن بھی تھا جس نے اس وقت کے مصالح کی بناء پر اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا کیونکہ اسے خیال تھا کہ ایمان کے برملا اظہار کرنے سے وہ حضرت موسیٰ کی زیادہ مدد نہیں کر سکے گا لیکن جب اسے خیال ہوا کہ ایمان کے اظہار کا وقت آ گیا ہے تو اس نے اس بھرے دربار میں جس میں فرعون جیسا جابر حاکم موجود تھا اپنے ایمان کا اظہار کر دیا۔ اس کی تقریر اس درجہ معرکہ انگیز اور ایمان افروز تھی کہ قرآن کریم نے اس کو محفوظ کر کے' حیاتِ جاوید عطا کر دی۔ اس نے کہا کہ تم ایسے شخص کو قتل کر رہے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ اس کے بعد اس نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کے ہوتے ہوئے کہا: **یقوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد** (۳۸/۴۰)' بھائیو میرا اتباع کرو میں تمہیں ہدایت کا راستہ دکھادوں گا۔ مومنِ آلِ فرعون نے حضرت موسیٰ و حضرت ہارونؑ دونوں کی موجودگی میں اپنے اتباع کی دعوت دی۔ اس سے اس مومن کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں تھا کہ اس کی ذاتی پیروی کی جائے بلکہ مقصد وہی تھا کہ وحی کی اطاعت کی جائے' جس کی پیروی حضرت موسیٰ' حضرت ہارونؑ اور وہ مردِ مومن خود کر رہا تھا۔

حضورﷺ نے اپنی اور صحابہؓ کرامؓ کی شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد مدینہ شریف میں دین خداوندی قائم کر دیا' جس کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ چونکہ حضورﷺ خود موجود تھے' جو اس دین کے سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے' اس لئے ان کی اطاعت دین کی اطاعت تھی' اس میں کسی مسلمان کو مجال انکار نہیں ہے۔ یہ نظام وقتی یا ہنگامی نہیں تھا۔ اس کو ہمیشہ کے لئے رہنا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ نظام منقرض و منقطع ہو گیا۔ نظام کے منقرض ہونے کے بعد اہم ترین

سوال یہ ہے کہ اب اس نظام یا دین کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ اس میں دو مختلف موقف ہیں جن کی وضاحت اس مضمون میں کی جائے گی قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اس کو توجہ سے غور فرمائیں کہ یہ نکتہ بہت غور کا متقاضی ہے۔

ہمارے علماء کرام کا موقف یہ ہے کہ اب اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم قرآن و روایات کا اتباع کریں تو ہم اللہ و رسول کی اطاعت کر لیں گے۔ جہاں کہیں بھی **اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول** کے الفاظ آتے ہیں ان کے نزدیک عملاً اس کا مفہوم قرآن اور کتب روایات کی اطاعت ہوتا ہے لیکن ہمارے خیال میں علماء کرام کا یہ موقف قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے، جس کے لئے تین اعتراضات سامنے آتے ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کا ذکر آتا ہے، ان دو مطاعوں کے لئے ہمیشہ واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو اطاعتیں نہیں ہیں بلکہ دو مطاع ہونے کے باوجود اطاعت یہ ایک ہی ہے۔ اس بات کے ثبوت کے لئے سابقہ مضامین میں ہمیشہ آیات درج کی گئی ہیں۔ جو قارئین کرام کئی مرتبہ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان کو بار بار تحریر کرنے سے مضمون کو طوالت ہوتی ہے، اور قارئین کرام کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ ان آیات کریمات کے حوالے دیئے جاتے ہیں قارئین کرام خود ملاحظہ فرمالیں۔ (۲۴/۶۳، ۴_۱/۵۹، ۴۸/۸، ۱۰۷/۹، ۱۳/۵۸، ۵/۵۸، ۲۰/۵۸، ۳۶/۳۳، ۸/۵۹، ۵۴/۲۴، ۲۴/۹، وغیرہ) اس کے علاوہ

(۲) قرآن کریم نے اطاعت سے پہلے سماعت لازمی قرار دی ہے۔ قرآن و روایات پر علیحدہ علیحدہ عمل کرنے سے سماعت کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ اطاعت کے لئے سماعت شرط ہے۔ اس کے لئے آیات پہلے بھی تحریر کی گئی ہیں۔ اب صرف حوالہ جات دیئے جاتے ہیں۔ (۲۸۵/۲، ۲۰/۸، ۵/۲۴، ۱۶/۶۴)۔

(۳) اس سماعت کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔

جہاں تک حدیث کی اطاعت کا سوال ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ عرض ہے کہ

ہم حدیث و روایات میں فرق نہیں کرتے۔ حضورﷺ کے اپنے دہن مبارک سے ارشاد کردہ فرمودات حدیث تھے۔ جو ان کے مخاطبین سنتے تھے ہم جن کو حدیث کہتے ہیں۔ یہ روایات ہیں جو کہ کئی کئی واسطوں سے ہمارے تک آئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام خود اس ذخیرۂ روایات کو مشکوک اور ظنی خیال کرتے ہیں۔ وہ ہر روایات کے شروع میں **قال رسول اللہ** اور آخر میں **او کمال قال رسول اللہ** کہتے ہیں جس کے معنے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا' یا جس طرح بھی حضورﷺ نے فرمایا' اس طرح وہ خود سارے ذخیرۂ روایات کو بالکل مشکوک و ظنی قرار دے دیتے ہیں جبکہ تمام قانون دان حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قانون کا بالفظ منقول ہونا ضروری ہے۔ قانون میں تو ایک ایک لفظ اور بعض اوقات ایک ایک حرف کی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ روایات قانون بننے کے معیار پر ہی نہیں اترتیں' اس لئے ان کی اطاعت سے کسی کی بھی اطاعت نہیں ہوتی۔ اگر آپ بہت زیادہ خوش عقیدگی میں مبتلا ہیں تو ان کی اطاعت سے محدثین کی اطاعت کرنا خیال فرما سکتے ہیں۔

علماء کرام کا موقف آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اللہ و رسول کی اطاعت کے بارے میں دوسرا موقف تحریکِ طلوعِ اسلام اور علماء قرآن کا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: **مـن یطـع الـرسـول فـقـد اطـاع اللـه** (۴/۸۰)۔ جس نے رسول کی اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ حضورﷺ کی اپنی حیات مبارکہ کے دوران تو اس معاملہ میں کوئی مشکل نہیں تھی جو کچھ حضورﷺ فرماتے اس کی فوری تعمیل ہو جاتی تھی' اس وقت جو مسئلہ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ حضورﷺ کے بعد' حضورﷺ کی اطاعت کیسے کی جائے۔ ہمارے علماء کرام تو حضورﷺ کی وفات کے بعد روایات کو حضورﷺ کا قائم مقام بناتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی مشہور ترین تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں مرقوم ہے: ''ظاہر ہے کہ حضورﷺ کی وفات کے بعد آپ کی سنت ہی ہے جو آپ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔'' جلد دوم صفحہ ۳۲۶' اسی طرح تفسیر مظہری میں ارشاد ہوتا ہے ''اور رسول کی طرف پھیر دو جب تک رسول

زندہ ہیں اور وفات کے بعد ان کی سنت کی جانب رجوع کرو' تفسیر مظہری جلد سوئم صفحہ ۹۶' لیکن ہمارے خیال میں یہ بات قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے۔ حضورﷺ کی وفات کے بعد' حضورﷺ کی قائم مقام روایات نہیں ہو سکتیں بلکہ حضورﷺ کا قائم مقام ان کا خلیفہ یا جو ان کا جانشین ہوتا ہے وہ حضورﷺ کا قائم مقام بن جاتا ہے اور اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار پاتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق حضورﷺ کے بعد' روایات کے بجائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت تھی' ان کے بعد' حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی اطاعت اسی درجہ و منزلت پر تھی۔ اگر وہ نظام قائم رہتا تو آج تک اسلامی سربراہ مملکت کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت قرار پاتی۔ اسی لئے حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ: علیکم بسنتی و سنت الخلفاء الراشدین المهدین۔ تم پر میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت ضروری ہے۔ قرآنی نظام قائم کرتے' قرآنی نظام کے فیصلے' اس حکومت کے انتظامات کرنے کے اقدامات' یہ سب سنت رسول اللہ تھے اور ان کے خلفاء کے فیصلے بھی سنت تھے۔ اگر حضورﷺ کے زمانے کے فیصلوں کو ہمیشہ علیٰ حالہ رہنا مقصود ہوتا اور ان کی اطاعت روایات کے ذریعے کرنا ہوتی تو اس حدیث میں ''خلفائے راشدین مھدین کی سنت'' کی اطاعت کا اضافہ نہ کیا جاتا یہ واضح رہے کہ یہ خلفائے راشدین کسی خاص زمانے تک محدود نہیں تھے۔ اگر خلافت راشدہ مسلسل قائم رہتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے لے کر آج تک کے خلفاء' خلفاء راشدین ہی قرار پاتے۔ اور اگر اب کبھی بھی مسلمانوں کی قسمت نے یاوری کی اور پھر وہ سلسلہ قائم ہو گیا تو ان نئے خلفاء راشدین کے حکومت چلانے کے اقدامات اور ان کے فیصلے سنت کہلائیں گے اور ان کی سنت کی اطاعت واجب ہوگی اور اس دور کے مسلمانوں کو ان کی سنت کی اطاعت کرنی ہوگی۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لئے کہ حضورﷺ کی وفات کے بعد آپ کی قائم مقام کتب روایات نہیں ہو جاتیں بلکہ آپ کے خلفاء آپ کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل

دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضورﷺ نے فرمایا: ومن اطاعنی فقد اطاع الله ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصانی فقد عصی الله ومن عصی امیری فقد عصانی۔ (بخاری و مسلم شریف)۔ جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی اطاعت کی اس نے دراصل میری اطاعت کی اور اسی طرح میرے امیر کی نافرمانی میری نافرمانی ہے اور میری نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

(۲) ومن مات ولیس فی عنقہٖ بیعة مات میة جاهلیة۔ (مسلم شریف) جو شخص ایسی حالت میں مرجائے کہ اس کی گردن میں کسی امیر کی بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(۳) انما الامام جنة یقاتل من ورائهٖ و یتقی بهٖ فان امر بتقوی الله و عدل فان له بذالك اجراء وان قال بغیرہ فان علیه منه۔ (مشکوۃ شریف)۔ بے شک امام وہ سپر ہے جس کے پیچھے ہو کر جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعے سے حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔ بس اگر وہ تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو اسے ثواب ملے گا اور اس کے خلاف کرے تو گناہ گار ہوگا۔

قرآن کریم کا قائم کردہ نظام ہنگامی یا وقتی نہیں تھا۔ یہ ایک ابدی ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں بہت مقامات ایسے ہیں جن میں النبی یا الرسول مخاطب کر کے بہت سے احکامات جاری کئے گئے ہیں۔ ان الفاظ کا اطلاق حضورﷺ کے عہد میں خود حضورﷺ پر ہوتا تھا لیکن آپ کی وفات کے بعد ان احکامات کا مقصود و منطوق آپ کے جانشین اور آپ کے خلفاء ہیں۔ آپ مندرجہ ذیل آیات کریمات پر غور فرمائیں۔ یہ وہ احکامات ہیں جو حضورﷺ کے بعد ختم نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ آپ کے خلفاء و جانشینوں کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے۔ جب تک بھی ان خلفاء راشدین کا سلسلہ قائم رہے گا اگر آپ ان احکامات کو آئندہ کے خلفاء کی طرف منتقل نہ کرتے رہیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کے نزدیک وہ احکامات صرف حضورﷺ کے دور تک کے لئے تھے۔ لیکن،

اگر یہ صورت تھی تو اس کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان احکامات کی ابدیت کے لئے مندرجہ ذیل آیات پیش خدمت ہیں۔ مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے آیات کا صرف ترجمہ مع حوالہ جات تحریر ہے۔ آیات آپ خود قرآن کریم سے ملاحظہ فرما لیں۔

(۱) (اے رسول) جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اگر وہ تیرے پاس آتے' پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے بخشش مانگتا تو اللہ کو تواب و رحیم پاتے (۴/۶۴)۔

قرآنِ کریم کے حکم کے مطابق حضورﷺ کی زندگی میں تو یہی ضروری تھا کہ مومنین حضورﷺ کے پاس آ کر متعلقہ معاملہ کی صفائی حضورﷺ کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس وقت بھی حکام کی مخالفت کرنے والوں کو حضورﷺ کے مزار پر حاضر ہونا اور خود حضورﷺ کے ساتھ بالمشافہ صفائی کرانا' اور حضورﷺ سے بخشش منگوانا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت تو اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت اس کی عملی شکل یہی ہے کہ اسلامی حکومت کے موجودہ دور کے حکام کے پاس جا کر ہی صفائی کرائی جائے اور حکام کو بھی لازم ہے کہ وہ ہمارے لئے اللہ سے بخشش طلب کرتے ہوئے' اپنی رضامندی ظاہر کر دیں۔ پس اس آیہ کریمہ اور اس قسم کی تمام آیات میں رسول سے مراد رسول اور ان کے خلفاء ہیں۔

(۲) اور جب ان کے پاس کوئی بات امن یا خوف کی آتی ہے..........الخ (۴/۸۳)۔

اس آیۂ کریمہ کے حکم کے مطابق کیا ہمیں اس وقت افواہوں کو حضورﷺ کے سامنے لے جانا اور ان کے متعلق حضورﷺ سے استنباط کرانا ممکن ہو سکتا ہے اور کیا حضورﷺ اس وقت ہماری موجودہ افواہوں کو سن کر ان سے کوئی استنباط کر کے ہمیں بتا سکتے ہیں کہ کون سی خبر صحیح ہے اور کونسی غلط ہے' لازماً و یقیناً یہاں رسول اللہ سے مراد رسول اور ان کے بعد ان کے خلفاء ہیں۔

(۳) تم ان سے درگذر کرو اور ان کے لئے مغفرت کی دعا مانگو اور ان سے مشورہ کیا کرو (۳/۵۹)۔

اس آیۂ کریمہ میں رسول اللہ کومشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اب ان کی جگہ دوسرے حکام مشورہ کریں گے۔

(۴) مدینہ کے رہنے والوں اور ان کے گردونواح کے دیہاتیوں کو یہ جائز نہ تھا کہ رسول خدا کا ساتھ چھوڑ دیں اور نہ یہ جائز تھا کہ رسول کی جان سے بے پروا ہو کر اپنی جانوں کی فکر کریں (۹/۱۲۰)۔

آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ یہ امت صرف رسول اللہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی اور نہ ہی یہ حکم صرف اہل مدینہ اوران کے اردگرد کے اعراب کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بلکہ اس حکم کا اطلاق بعد کے خلفاء پر اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ خود اس کا اطلاق حضورﷺ پر تھا۔اس آیت کریمہ سے پہلی آیت میں مومنوں کو حکم دیا گیا تھا کہ صادقین کا ساتھ دیتے رہو اور اس آیت کے بعد جو اس حکم کی دلیل ہے وہ بھی بطور اصول اور ابدی حقیقت کے بیان کی گئی ہے۔ پس ایسی آیات میں حضورﷺ کے بعد ان کے خلفاء ہی مراد ہوتے ہیں۔

(۵) جو کچھ خدا نے اور اس کے رسول نے ان کو عطا کیا تھا اگر یہ لوگ اس پر راضی رہتے اور کہتے کہ خدا ہمارے لئے کافی ہے (اِس وقت نہیں تو) عنقریب یہی خدا ہمیں اپنے فضل وکرم سے اور اس کا رسول دے گا ہم تو یقیناً اللہ کی طرف لو لگائے بیٹھے ہیں (۹/۵۹)۔

اس آیت سے واضح ہے کہ صدقہ نہ ملنے والوں کو بجائے برا ماننے اور اعتراض کرنے کے قرآن کریم کے بیان کردہ الفاظ کہنے چاہئیں تھے۔اس وقت بھی حکومت کے افسران کو غریب لوگوں کی مدد کرنے کے لئے صدقات تقسیم کرنے ضروری ہیں۔تو کیا اس وقت مذکورہ بالا حکم کے مطابق لوگوں کو یہ کہنا چاہئے کہ خود رسول اللہ ہمیں صدقات دینے آئیں گے' ہرگز نہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اللہ اور ہمارے موجودہ حاکم ہمیں دیں گے ہم اللہ کی طرف راغب ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ ان خدمات کو ادا کرنے کے لئے جو رسول اللہﷺ سے دوسرے حکام کی طرف منتقل ہو سکتی ہیں رسول اللہ کے موجود نہ ہونے کے وقت ان کے خلفاء مراد ہوتے ہیں۔

(۶) اے مسلمانو آپس میں رسول کو ایسے نہ پکارو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو (۲۴/۶۳)۔

یہ حکم حضورﷺ کی وفات کے بعد ختم نہیں ہو گیا۔ حضورﷺ کے بعد آپ کے خلفاء اسلامی حکومت کے اعلیٰ افسران' سربراہِ مملکت' سب کا ایسا ہی ادب واحترام ضروری ہے۔

(۷) جب اے پیغمبر آپ ان میں موجود ہوں تو آپ انہیں نماز پڑھائیں (۴/۱۰۲)۔

تمام فقہاء اور مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضورﷺ کے بعد یہ حکم آپ کے خلیفہ کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور اسی طریقہ سے حضورﷺ کی زندگی میں اس کے مخاطب آپ تھے' اور آپ کی وفات کے بعد جو آپ کا خلیفہ ہو' وہ اس کا مخاطب ہو گا۔

(۸) سچے ایمان دار تو صرف وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب کسی ایسے کام کے لئے جس میں لوگوں کے جمع ہونے کی ضرورت ہے رسول کے پاس جمع ہوتے ہیں' تو جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں' جاتے نہیں (۲۴/۶۲)۔

اب بھی امر جامع کے لئے یہی حکم ہے کہ کسی ایسی میٹنگ میں جس میں آپ کی موجودگی ضروری ہے۔ میٹنگ کے منتظم سے اجازت لئے بغیر آپ کا جانا مناسب نہیں ہے کیونکہ میٹنگ سے بغیر اجازت لئے چلا آنا Decorum کے خلاف ہے۔ ایسی تمام آیات میں رسول سے مراد خود حضورﷺ اور آپ کے بعد' آپ کے خلفاء ہیں۔

(۹) تم کیونکر کافر بن جاؤ گے حالانکہ تمہارے سامنے خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور اس کا رسول بھی تم میں موجود ہے۔

یہاں **"فیکم رسولہ"** اور اس کا رسول تم میں ہے کے معنے حضورﷺ کی موجودگی میں خود حضورﷺ ہیں اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء ہیں لیکن ہمارے علماء کرام **"فیکم رسولہ"** سے مراد **"فیکم احادیث رسول اللہ"** لیتے ہیں' جو بداہتاً غلط ہے۔

یہ دس آیاتِ کریمات اور چند احادیث نبویہ یہ ثابت کرنے کے لئے تحریر کی گئی ہیں کہ

آپ کی اطاعت آپ کی حیات طیبہ میں لازمی تھی اور آپ کی یہ اطاعت آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ آپ کی اطاعت ایک زندہ اتھارٹی کی اطاعت کی معرفت ہوتی ہے۔ کتب روایات کے ذریعے آپ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔

ہمارے ہاں چونکہ تفاسیر ضابطۂ تحریر میں اس وقت آئیں جب اسلام مذہب کی صورت اختیار کر چکا تھا اس لئے وہ آیات کریمات جن کا خاص تعلق خالص دین سے ہے' ان کی تفسیر ہر مفسر نے مذہب کی سطح پر ہی کی ہے اور وہ اس کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ ان کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ تمام تفاسیر ڈیڑھ ہزار سال سے اسی طرح تحریر کی گئی ہیں۔ ہمارا یہ دور اس معاملہ میں بڑا خوش قسمت ہے کہ زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مسلمانوں کے سامنے پھر دین کا تصور واضح ہو رہا ہے۔ اور اس سلسلہ میں تحریک طلوع اسلام کو اس کی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ جن آیات کا تعلق خاص دینی نظام سے ہے ان آیات کی تشریح از سرِ نو دین کے معیار پر کی جائے۔ اس بارے میں سورہ النساء کی آیت انسٹھ (۵۹) بہت اہمیت کی حامل ہے اس آیہ کریمہ سے متعلق جس قدر مواد تحریر کیا گیا ہے' وہ سب کا سب قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ مواد آیت کا صحیح مفہوم سامنے آنے ہی نہیں دیتا۔ جس قدر اس آیہ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے' اسی قدر یہ ان تشریحات سے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی ہے۔ آپ کے سامنے اس کی مذہبی تفسیر یقیناً ہوگی۔ اب آپ اس آیہ کریمہ کی تفسیر دین کے معیار پر ملاحظہ فرمائیں۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ عز اسمہٗ ہوتا ہے۔ **یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان......** الخ **(۴/۵۹)**۔

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو' رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولی الامر کی پس اگر کسی امر میں اختلاف واقع ہو تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ' اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو' یہ طریقہ بہتر اور باعتبار مآل اچھا ہے۔

آیہ کریمہ نے یہ بات واضح کر دی کہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ

ہے کہ اپنے اختلافات کا فیصلہ اللہ ورسول اور اولی الامر سے کرایا جائے۔ ان کے علاوہ دنیا کی کسی اور اتھارٹی کو اس کا کوئی حق نہیں کہ ان سے فیصلہ کرایا جائے۔ دوسری بات یہ پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ آیت کریمہ تنازعات کے فیصلے کرانے کی صورتیں پیش کر رہی ہے۔ اگر کسی بات میں عوام کا کوئی تنازعہ نہیں ہے اور وہ قرآنی حکومت کے احکامات کی اطاعت کر رہے ہیں تو اس صورت میں ازخود اللہ ورسول کی اطاعت ہو رہی ہے اور یہ اطاعت بمنزلہ عباداتِ خداوندی کے ہے اور اس اطاعت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف اعلیٰ حکام کی اطاعت ہی اطاعت خداوندی شمار کی جائے بلکہ اس حکومت کی پوری Heirarchy کی اطاعت' اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ ایک سپاہی کی اطاعت' اسلامی حکومت کی سنٹرل اتھارٹی کی اطاعت کی طرح ہے کیونکہ وہ سپاہی اپنی اطاعت نہیں کرا رہا ہے بلکہ وہ حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے حکومت کی اطاعت کرا رہا ہے۔ البتہ تنازعات کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

(۱) ایک صورت تو یہ ہے کہ آپس میں عوام کا تنازعہ ہے کہ ایک مخصوص پلاٹ پر بچوں کے لئے Play Ground بنا دیا جائے' لیکن کچھ لوگوں کا اصرار ہے کہ نہیں یہ میدان بہت قیمتی ہے اور بہت اچھی جگہ شہر کے وسط میں واقع ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ایک اچھا کالج بنا دیا جائے۔ دونوں خیال کے لوگوں کا آپس میں شدید اختلاف ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد چند صاحب الرائے حضرات نے مل کر آپس میں فیصلہ کر لیا اور باہمی تنازعہ کی صورت باقی نہیں رہی۔ اس صورت میں گورنمنٹ Involve ہی نہیں ہوئی اور اللہ ورسول کی اطاعت معمول کے مطابق ہوتی رہی۔

(۲) لیکن اگر دونوں فریقین کا فیصلہ نہیں ہوا تو وہ دونوں فریق ڈپٹی کمشنر سے رجوع کریں گے اور D.C ان دونوں پارٹیوں کے مابین فیصلہ کر دے گا اب دونوں فریقوں پر D.C کا حکم ماننا ضروری ہوگا اور یہ اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی۔ (اگر کوئی فریق D.C کا حکم نہیں مانتا تو یہ اللہ و رسول کی معصیت ہوگی)۔

(۳) لیکن اگر ایک پارٹی اب بھی D.C کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے تو یہ

کیس صوبے کے گورنر کو پیش کیا جائے گا۔ اس میں بھی وہی صورت ہوگی کہ اگر دونوں فریقین نے گورنر کے فیصلے کو مان لیا' اور تنازعہ ختم ہو گیا' تو دونوں نے اللہ و رسول کی اطاعت کر لی اور معاملہ یہاں ختم ہو گیا۔ لیکن اگر اب بھی ایک فریق مطمئن نہیں ہے اور گورنر کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کیس کی آخری اپیل سنٹر میں ہوگی اور اس کیس کو سنٹر کی طرف Refer کر دیا جائے گا۔ (قرآنی حکومت کے) مرکز یا سنٹرل اتھارٹی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کی تعمیل سے انحراف نہیں کیا جا سکتا اس فیصلہ کی تعمیل کرنا دونوں فریقوں پر ضروری ہوگا۔ اور اس فیصلہ کو تسلیم کرنا' اللہ و رسول کی اطاعت ہوگا۔

(۴) ایک صورت اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود اولی الامر کے مابین آپس میں اختلاف ہو جائے۔ مثلاً ایجوکیشن منسٹری ایک خاص بجٹ چاہتی ہے کہ جس کے ذریعے وہ پروفیسروں اور اساتذہ کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کرنا چاہتی ہے تاکہ معیار تعلیم بلند ہو۔ لیکن فنانس منسٹری اپنے ہاں اس رقم کی گنجائش نہیں دیکھتی۔ دونوں وزارتوں کے افسران نے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی کہ دونوں وزارتوں کے وزراء میٹنگ کر کے اس مسئلہ کا کوئی حل نکال لیں' چنانچہ ان دونوں وزراء نے آپس میں مل کر' اس مسئلہ کا حل نکال لیا اور تنازعہ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں اللہ و رسول کی اطاعت از خود ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ بھی امکان ہے کہ دونوں وزراء میں بھی اختلاف قائم رہے اور مسئلہ کسی طرح طے نہ ہو پائے تو وہ دونوں وزراء اس مسئلہ کو سنٹرل اتھارٹی' وزیر اعلیٰ یا اس کی Cabinet کی طرف Refer کر دیں گے۔ اس اتھارٹی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت اور اس کی نافرمانی معصیت خداوندی ہوگی۔

یہ تنازعات محض مثال کے طور تحریر کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس حکومت کا ڈھانچہ بالکل مختلف ہو' وہاں اولی الامر کی کوئی اور Definition ہوگی۔ اس میں گورنر ہو یا نہ ہو۔ سپریم کورٹ کا بھی اس میں دخل کسی نہ کسی Stage پر ہونا ضروری ہے۔ تنازعات اور ان کو حل کرنے

کی صورتیں صرف بات سمجھانے کے لئے تحریر کی گئی ہیں۔ جو بات گوش گذار کرنی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ قرآنی حکومت میں مرکزِ ملت یا امیر یا سنٹرل اتھارٹی کی اطاعت ایک طرح سے عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔

اب آپ اس آیت کی تفسیر مذہب کی رو سے ملاحظہ فرمائیں۔ جب دونوں فریقوں میں ایک پلاٹ کے بارے میں تنازع واقع ہو اور دونوں فریقین موقع پر جائیں اور بخاری شریف اور مسلم شریف بھی ساتھ لے جائیں' کہ اس مسئلہ کا حل کتب روایات کی رو سے تلاش کیا جائے۔ تو معاف بفرمائیے' یہ کتب روایات باجود اپنے احترام واکرام کے دونوں فریقوں کا کوئی فیصلہ نہیں کرا سکیں گی اور اگر بالفرض ان کتابوں نے کوئی فیصلہ دے بھی دیا تو وہ اس درجہ Controvercial ہو گا کہ دونوں فریق ساری عمر ایک دوسرے کا سر پھوڑتے رہیں گے' اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے۔ اسی طرح مختلف وزارتوں کے تنازعات کے فیصلے بھی کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ ان کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔

قرآن کریم نے تنازع دور کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے اس کے لئے فرمایا کہ: **ذلک خیر و احسن تاویلا** (۴/۵۹)۔ فیصلہ کرانے کا یہ بہترین طریقہ ہے لیکن آپ خیال فرمائیں کہ ہم مسلمان ڈیڑھ ہزار سال سے اپنے تنازعات کے فیصلے کتبِ روایات سے کراتے چلے آرہے ہیں۔ آپ صدق دل سے فرمائیں کہ اس طویل عرصہ میں کسی بھی تنازع کا قابل اطمینان فیصلہ ہوا ہے۔ کتابوں سے دوٹوک اور واضح فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جب فیصلہ کرانے کا طریقہ ہی غلط ہے تو اس سے صحیح فیصلہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اولی الامر کو تو زندہ اتھارٹی خیال فرماتے ہیں لیکن اللہ و رسول سے مراد کتبِ روایات لے لیتے ہیں جو نہ تو خود زندہ ہیں' اور نہ ہی کسی قسم کا فیصلہ کر سکتی ہیں۔ فیصلے کرانے والی اتھارٹی کے لئے ناطق ہونا ضروری ہے۔ اتھارٹی صامت ہو ہی نہیں سکتی۔

اس بات میں تو ہمارا اور علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ اللہ کی اطاعت کا واحد ذریعہ رسول اللہ کی اطاعت ہے۔ من یطع الرسول فقدا طاع اللہ (۴/۸۰)۔جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اس میں دو مختلف رائے نہیں ہو سکتی۔ البتہ فیصلہ کن مسئلہ اور صرف ایک ہے اور وہ جب تک حل نہیں ہوگا مسلمان کبھی قعر مذلت سے باہر نہیں نکل سکتے اور وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ تحریک طلوع اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعد آپ کے جانشین کی اطاعت ہی رسول کی اطاعت ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ خلفاء راشدین کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضور ﷺ کی حدیث علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدین۔ (مشکوٰۃ شریف) تم پر میری سنت اور میرے خلفاء کی سنت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس حدیث شریف میں خلفاء راشدین کی سنت کا اضافہ اسی بات کی ولالت کرتا ہے۔ واضح رہے کہ خلفاء راشدین کی کوئی مقررہ تعداد نہیں ہے۔ جب تک وہ نظام جاری رہتا اس نظام کا سربراہ خلیفۂ راشد ہوتا۔ اگر اس نظام کی شکل نہ ٹوٹتی تو آج بھی اس نظام کا سربراہ خلیفہ راشد ہوتا۔ اس کے برخلاف ہمارے علماء کرام کا نظریہ یہ ہے کہ رسول اللہ کے انتقال کے بعد آپ کی اطاعت کتب روایات کے ذریعے ہوتی ہے اور حضور ﷺ کی قائم مقام روایات ہو جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک اب رسول کی اطاعت کی عملی شکل روایات کی کتابوں کی اطاعت ہے جبکہ تحریکِ طلوع اسلام کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت کی عملی شکل خلیفتہ الرسول کی اطاعت ہے۔

صرف اس ایک نکتہ کے فرق سے دین و مذہب کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس مضمون میں یہی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حضور ﷺ کے بعد ان کا جانشین ہونا ضروری ہے تاکہ اللہ و رسول کی اطاعت کی جاسکے اور اس کے لئے شروع مضمون میں دس آیات قرآنیہ اور چند احادیث نبویہ پیش کر دی گئی تھیں۔ اب اس نکتہ کا فیصلہ کرنا آپ کی صوابدید پر چھوڑا جاتا ہے۔

فستذکرون ما اقول لکم وافوض امری الی الله (۴۰/۴۴)۔

جو میں تم سے کہتا ہوں تم عنقریب اسے یاد کرو گے اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتظامی امور کی اطاعت

عقل انسانی کا خاصہ وتقاضہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنا مفاد پیش نظر رکھتی ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ جس طرح ہر فرد اپنا مفاد تلاش کرتا ہے اسی طرح ہر قوم اپنے مفاد کے پیچھے سرگرداں رہتی ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کے وجود کا مقصد ہی یہ متعین کیا ہے کہ: **کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر (۳/۱۱۰)**۔ اے جماعت مومنین تمہیں اس مقصد کے لئے اٹھا کھڑا کیا گیا ہے کہ تم انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم ساری انسانیت کو معروف کا حکم دو اور منکر سے منع کرو۔ حج بیت اللہ شریف کے مقاصد میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ حج کا سالانہ اجتماع اس لئے ہوتا ہے کہ وہاں انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے طریقوں پر غور کیا جائے اور غیر مسلم اس کو خود اپنی نگاہوں سے دیکھ لیں۔ **لیشھدو منافع لھم (۲۲/۲۸)**' سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے کہ لوہے کو اس لئے نازل کیا گیا کہ اس کے ذریعے عدل وانصاف کا وہ نظام قائم ہوتا ہے جس سے ساری انسانیت کو نفع پہنچتا ہے۔ آج مسلمان ساری دنیا میں تشدد پسند شمار کئے جاتے ہیں اور اس سے اسلام کی توسیع و اشاعت کو سخت صدمہ پہنچ رہا ہے۔ حالانکہ اسلام کی اشاعت وتوسیع کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تشدد سے بالکلیہ اجتناب واحتراز کر کے' ساری دنیا کو علمی استدلال وفکری براہین سے یہ بات باور کرائی جائے کہ اسلام کا نظام صرف مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ یہ ساری دنیا کے لئے منفعت بخش ہے' اسلام کا اللہ ساری دنیا کا رب ہے۔ وہ ہی سارے عوالم کا پروردگار ہے۔ اس کا نظام ساری مخلوق کی بھلائی چاہتا ہے۔ قرآن کریم کی اقتداء اختیار کرنے سے دنیا میں امن کو فروغ

ہوگا اور اس کے نظام کو قائم کرنے سے ہی ہر قوم کا فائدہ وابستہ ہے۔

تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس لئے خیر امت ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس منصب پر تم نسل یا نسب کی بنا پر سرفراز نہیں ہوئے ہو جیسا کہ اہل کتاب نے اپنے لئے خیال کر رکھا تھا' بلکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری نے تمہیں اس کا استحقاق دیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اس منصب کا حصول صفات و ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط و منوط ہے کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ نے اس کو باندھ نہیں چھوڑا ہے اور اس سے یہ بات بھی واضح ہے کہ چونکہ مسلمان آج کل اس منصب کے ساتھ متصف نہیں ہیں' اسی وجہ سے اب وہ **خیر امة** کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔

ساری انسانیت کو نفع پہچانے اور معروف و منکر کو جاری کرنے اور **خیر امة** کے مرتبہ پر فائز ہونے کے لئے قرآن کریم کے نظام کو قائم کرنا نہایت ضروری بات ہے۔ قرآنی حکومت کے احکامات معروف اور اس کے مناہی منکر ہوتے ہیں۔ ان کا اجراء صرف اس وقت ہی ہو سکتا ہے جبکہ اسلامی نظام یا قرآنی حکومت ہو۔ قرآن کریم نے اس کی وضاحت بخوبی فرمائی ہے۔ **شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراھم و موسی و عیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه (۴۲/۱۳)**۔ اس نے تمہارے لئے وہی دین مقرر فرمایا ہے جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ اس دین کے متعلق تمام امتوں کو ہدایت کی گئی کہ اس دین کو ہر حال میں قائم رکھنا اور اس دین میں اختلاف نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اختلاف ہونے کے بعد دین قائم نہیں رہتا پھر وہ مذہب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں قائم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو عملی شکل میں جاری رکھا جائے۔ لوگوں کی نگرانی کی جائے کو وہ اس کے عملاً جاری کرنے سے غافل یا منحرف نہ ہوئے

پائیں۔اسی کی تاکید دوسری جگہ فرمائی: **وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا** (۲/۱۴۳)۔اوراسی طرح ہم نے تمہیں وسطی یعنی بین الاقوامی مرکزی امت قرار دیا ہے تا کہ تم امامت امم کے منصب کے مطابق لوگوں کے نگران رہواور تمہارا نگران ہمارا رسول ہو۔ یہ امت وسطیٰ کے فریضۂ منصبی اوراس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں جو کچھ ''تدبر قرآن'' میں مرقوم ہے وہ ہماری توجہ اورغورکا متقاضی ہے۔اس میں ارشاد ہوتا ہے۔

''رسول تم پر گواہ ہو،اورتم لوگوں پر گواہ ہو سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علیٰ الناس کا جوفرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول کے تھا۔آپ کے بعدآپ کی امت کی طرف منتقل ہوا ہے اوراب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زمان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے اوراگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتیجے بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی۔''اس کے بعدفوری طور پر مزید تحریرفرماتے ہیں۔

''ہمارے ارباب تاویل نے عام طور پراس شہادت کوآخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت گمراہوں کے خلاف انبیاء کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کواللہ کا دین پہنچ چکا تھا اس کے باوجودانہوں نے گمراہی کی روش اختیار کی۔لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص وتحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ اس امت کوشھداءاللہ ہونے کا مرتبہ آخرت میں بھی حاصل ہوتا لیکن آخرت میں یہ مرتبہ اسی وجہ سے حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیامیں اس کواس منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔جوامت اس دنیامیں دین حق کی گواہ ہے ظاہر کہ وہی آخرت میں بھی اس پوزیشن میں ہوگی کہ گواہی دے کہ لوگوں کواللہ کا دین ٹھیک پہنچائیں''۔

(''تدبرقرآن''،جلداول،صفحہ۳۶۵)

''رسول تم پر گواہ ہو،اورتم لوگوں پر گواہ ہو''۔آیۂ کریمہ کےاس حصہ کی صحیح یا غلط تعبیر سے

ہی مذہب اور دین کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ہمارے علماء کرام جو مذہب کے داعی ہیں وہ حضور کی موجودگی میں رسول کے معنے حضور کی ذات اور آپ کے انتقال کے بعد اس کے معنے کتب احادیث وروایات لیتے ہیں' اس لئے انہیں اس آیت میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ حضور کے بعد' حضور کی نگرانی کی تشریح کس طرح کی جائے۔ لیکن دین کے تصور کے مطابق اس آیہ کریمہ کی تشریح میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ جیسا کہ تدبر قرآن میں تحریر کیا گیا ہے۔ ''جو فرض حضور پر بحثیت رسول کے تھا یہ آپ کے بعد' آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا ہے۔'' اور اسلامی حکومت کا سربراہ ہی بحثیت رسول کے جانشین وخلیفہ کے ساری انسانیت کا نگران ہوتا ہے۔

دین ومذہب میں تفریق وتمیز کرنے کے لئے یہ نکتہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے واسطے ایک ابدی ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کے دوران ہزاروں جگہ آپ کو مخاطب کر کے' مختلف احکامات دیئے گئے ہیں۔ حضور کی حیات مبارکہ کے دوران ان کا مصداق ومنطوق خود حضور کی ذات والا واعلیٰ صفات تھی۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد' ان احکامات کا مصداق ومعانی آپ کے خلفاء کرام یعنی اسلامی حکومت کے سربراہان ہوں گے۔ آپ مندرجہ ذیل قرآنی احکامات پر غور فرمائیں یہ بات آپ پر واضح ہو جائے گی۔ کیونکہ حضور کی وفات کے بعد نہ تو وہ احکام بے اثر ہو گئے ہیں اور نہ ہی ان احکام کا اتباع ختم کر دیا گیا ہے۔ اگر ان احکامات کو آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہونا ہی نہیں تھا اور وہ آپ کے بعد بے کار ہو جانے تھے' تو خدا کی اس عظیم کتاب میں جو قیامت تک کے لئے ضابطہ حیات مقرر کی گئی ہے اور جو قیامت تک محفوظ رہے گی' ان احکام کو محفوظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

مال فئے وہ مال ہوتا ہے جو بغیر کسی لشکر کشی کے حاصل ہو جائے۔ اس میں حضور کے دَور' یا اس کے بعد کے ادوار کی کوئی قید یا شرط نہیں ہے۔ حضور کے بعد بھی اگر کسی مسلمان لشکر کو اس طرح کا مال حاصل ہو جائے' وہ مال فئے ہی شمار ہوگا۔ یہ اموال حضور کی ذاتی ملکیت نہیں تھے اور

کسی وقت بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تفسیر عثمانی میں مرقوم ہے۔ ''اب اموال فئے کے متعلق عام ضابطہ بتلاتے ہیں۔ یعنی فیٔ پر قبضہ رسول کا اور رسول کے بعد امام کا ہوگا کہ اسی پر یہ خرچ پڑتے ہیں۔'' اس کے بعد تحریر ہے یعنی مال و جائیداد وغیرہ جس طرح پیغمبر اللہ کے حکم سے تقسیم کرے اسے بخوشی و رغبت قبول کرو' جو ملے لے لو' جس سے روکا جائے رک جاؤ' اور اسی طرح اس کے تمام احکام اور اوامر و نواہی کی پابندی کرو۔'' (تفسیر عثمانی' صفحہ ۷۲۵)۔ جیسا کہ حضرت نے خود تسلیم فرمایا کہ رسول کے بعد امام مال فئے کا مالک ہوتا ہے' اسی طرح تمام مسلمان رسول اللہ کے دور میں خود رسول اللہ کے اور اس کے بعد امام کے احکام کی اطاعت کے پابند ہوں گے۔ یہاں رسول سے مراد حضور کے دور میں خود حضور ﷺ ہیں اور ان کے بعد امام وقت ہے۔

اسی طرح مال غنیمت کی صورت ہے کہ حضور ﷺ کی موجودگی میں بحیثیت سربراہ مملکت یہ آپ کی تحویل میں ہوتا تھا اور آپ کے بعد امام کی تحویل میں ہوگا۔ تدبر قرآن میں ارشاد ہے۔ ''میرے ذہن میں بار بار یہ بات آتی ہے کہ رسول کا یہ حق بحیثیت رسول کے نہیں ہے بلکہ **اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت** سے بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ' اللہ کے رسول بھی تھے اور آپ کے ہاتھوں مدینہ منورہ میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی' اس کے قائد و سربراہ بھی۔ جہاں تک فریضۂ رسالت کا تعلق ہے اس پر آپ کو اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا تھا اور قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اس نے اپنے رسول کی ساری ذمہ داریاں براہ راست اپنے اوپر لی تھیں لیکن ریاست کے سربراہ کی **حیثیت** سے جب کہ آپ کے مبارک اوقات کا لحہ لحہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں صرف ہو رہا تھا یہ ضروری ہوا کہ اس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ یہ حق درحقیقت ریاست کے سربراہ کا حق تھا جو حضور کے وصال کے بعد آپ سے آپ حضور کے خلیفہ اور جانشین کی طرف منتقل ہوگیا۔'' (تدبر قرآن' جلد سوئم' صفحہ ۲۸۱)۔

آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح حضرت نے کھل کے ہمارے موقف کی تائید فرمائی ہے اور **خط کشیدہ** الفاظ میں کس طرح حضور کی دو حیثیتیں' ایک بطور رسول کے اور دوسری اسلامی

ریاست کے سربراہ کی الگ الگ متمیز کر کے دکھادیں۔

مال غنیمت ہی کے سلسلہ میں تفسیر کثیر میں ارشاد ہے۔ ''اور لوگ کہتے ہیں کہ خمس میں امام وقت مسلمانوں کی مصلحت کے مطابق جو چاہے کرسکتا ہے۔ جیسے کہ مال فئے میں اسے اختیار ہے۔ ہمارے شیخ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ یہی قول حضرت امام مالک کا ہے اور اکثر سلف کا ہے اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا اور معلوم ہوگیا تو یہ بھی خیال رہے کہ خمس جو حضور کا حصہ تھا اسے اب آپ کے بعد کیا کیا جائے تو بعض کہتے ہیں کہ اب یہ حصہ امام وقت یعنی خلیفۃ المسلمین کا ہوگا۔'' (تفسیر کثیر' جلد دوم' صفحہ ۲۶۳)۔

مال فئے کے سلسلہ میں تفسیر عثمانی کا حوالہ اوپر دیا گیا تھا۔ مال غنیمت کے متعلق بھی انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ ''بعض علماء کے نزدیک حضور کے بعد امیر المومنین کو اپنے مصارف کے لئے خمس الخمس ملنا چاہیے۔'' (تفسیر عثمانی' صفحہ ۲۴۱)۔

مندرجہ بالا احکامات کے اقتباسات کو پیش خدمت عالی کر کے' یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اس قسم کی آیات کریمات میں حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں اس قسم کے احکام کے مخاطب و مصداق حضور خود تھے اور آپ کی وفات کے بعد اس کے مخاطب اور منطوق آپ کے جانشین ہوں گے۔ چنانچہ خود ہمارے مفسرین کرام صلوٰۃ الخوف کے بارے میں متفق ہیں کہ حضور کے بعد یہ حکم آپ کے خلیفہ کی طرف منتقل ہوگیا ہے (**واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ**) (۴/۱۰۲)۔ جب اے رسول آپ ان میں موجود ہوں تو آپ انہیں نماز پڑھائیں) اور اس طریقہ سے ہر امام لشکر نماز پڑھا سکتا ہے' حضور کی اپنی زندگی کے دوران اس کے مخاطب آپ تھے' اور آپ کی وفات کے بعد جو آپ کا خلیفہ ہوگا' وہ اس کا مخاطب ہوگا۔

صاحب ''تدبر قرآن'' کا یہ فقرہ کہ ''میرے ذہن میں بار بار یہ بات آتی ہے کہ رسول کا یہ حق بحیثیت رسول نہیں بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے بیان ہوا ہے۔'' جو اوپر مال غنیمت کے سلسلہ میں Quote کیا گیا ہے۔ یہ فقرہ قرآن فہمی کے بارے میں کلیدی مقام

رکھتا ہے'اس فرق و امتیاز کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے قرآن فہمی میں بے شمار مشکلات ور پیش آتی ہیں اور اسی کو درست طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے'فلہٰذا اسی فقرہ کی مزید وضاحت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔البتہ جب نبوت عطا ہوتی تھی'تو یہ اس کی ذاتی حیثیت ہوتی تھی جس میں اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات عطا ہوتی تھیں اور وہ ان ہدایات کے مطابق ایک ریاست واسٹیٹ قائم کرتا تھا۔یہ اس کی رسالت کی حیثیت تھی۔اور اس کا یہ منصب باعتبار سربراہ مملکت کے ہوتا تھا اور رسول یا رسول کا قائم کردہ نظام اس کے سامنے کبھی مغلوب نہیں ہوسکتا تھا۔جیسا کہ سورہ الصّٰفّٰت میں ارشاد ہے۔**ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون** (۳۷/۱۷۲)۔اور ہم نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر رکھا ہے یہ ہمارا قانون ہے کہ ہمارے مرسلین جو ہمارا پیغام دوسروں تک پہنچائیں گے انہیں ضرور ہماری تائید حاصل ہوگی۔دوسری جگہ ارشاد ہے: **لاغلبن انا و رسلی** (۵۸/۲۱)۔میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے'خود حضور کے لئے ارشاد ہے۔**واللہ یعصمک من الناس** (۵/۶۷)۔اللہ تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔وحی اور نبوت کا سلسلہ حضور پر ختم ہوگیا۔اس کے بعد وہ نظام آگے چلا جو قرآنی قوانین کے مطابق قائم کیا گیا تھا۔اس نظام میں حضور کا جانشین وہ تمام فرائض و واجبات سرانجام دیتا تھا جنہیں حضور خود اپنی زندگی میں سرانجام دیتے تھے۔جن میں سے چند مثالیں'مال غنیمت'مال فئے واقامتِ صلوٰۃ کے بارے میں اوپر درج کی گئی ہیں اور جس کی چند مثالیں اور بھی پیش کر دی جائیں گی۔اس سلسلہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ حضور اپنے دور میں اپنے سربراہ مملکت کے منصب کے فرائض ادا کرنے میں جو انتظامی اقدامات لیتے تھے اور جو سنت کہلاتے ہیں'اس منصب کی اطاعت حضور پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس منصب کی اطاعت حضور کے بعد جاری رہی۔اسی کو دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور پر وحی و نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔لیکن رسالت کا فریضہ امت کے سپرد ہوا اور

جو امور حضور سربراہ مملکت کے منصب کی حیثیت سے کرتے تھے' وہ آپ کے جانشین ادا کرتے تھے۔ ہمارے علماء کرام نے حضور کی انتظامی و عقلی اطاعت کو (جو آپ کی زندگی تک محدود تھی) اس کو وحی قرار دے کر' اس کی اطاعت کو آپ کی احادیث کی اطاعت قرار دے دیا۔ حالانکہ قرآنِ کریم کی رو سے حضور کی یہی انتظامی و عقلی اطاعت آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ جس کی تائید صاحبِ ''تدبر قرآن'' نے بھی فرمائی ہے' آپ کی یہ اطاعت وحی کی اطاعت نہیں تھی' بلکہ عقلی و انتظامی اطاعت تھی اور آپ کے بعد' اسے' از خود' آپ سے آپ' خلفاء اور حکام کی طرف منتقل ہو جانا ہے' اسی وجہ سے قرآن کریم نے جس طرح آپ کی اطاعت کی تاکید فرمائی ہے' اسی طرح آپ کے خلفاء کی اطاعت کی بھی تاکید فرمائی ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلافات واقع ہو جائیں تو حکومت کو لازم ہے کہ ان دونوں کی طرف سے ایک ایک حَکَم مقرر کر دے تا کہ وہ ان کے مابین مصالحت کرا دیں **حکماً من اهله و حکماً من اهلها** (۴/۳۵)۔ ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم بیوی کے خاندان سے۔ یہ دونوں حکم اپنی عقل و بصیرت کے مطابق ان دونوں میں صلح صفائی کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے پاس کوئی وحی کا حکم نہیں ہوگا۔ حکومت ان حکموں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی ہے۔ حکومت کا یہ انتظام حضور کے دور میں بھی تھا۔ خلافت راشدہ میں بھی تھا اور ہر اسلامی حکومت میں ہوگا۔ یہ انتظامی اطاعت منتقل ہوتی چلی جائے گی' کیونکہ یہ ایک منصب کی اطاعت ہے۔

جب دو مسلمان گروہوں یا حکومتوں میں اختلاف واقع ہو جائے تو قرآنی ہدایت کے مطابق ان میں صلح کرانا ضروری ہے۔ **وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما** (۴۹/۹)۔ یہ حکم حضور کے دور میں بھی انتظامی طور پر سر انجام دیا جاتا تھا اور اس کے بعد یہ حکم حضور کے جانشینوں کو ادا کرنا ہوگا۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش خدمتِ عالی کی جا سکتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے

کہ حضور کی اطاعت میں اس دور کی انتظامی اطاعت بھی شامل تھی' اور وہ انتظامی اطاعت حضور کے جانشینوں کی طرف از خود منتقل ہو جاتی ہے۔ ہمارے علماء کرام اس انتظامی اطاعت کے قائل نہیں وہ اس کو بھی مبنی بر وحی قرار دے کر' حدیث کی اطاعت میں تبدیل کر دیتے ہیں لیکن اطاعت کے لئے تو ہر جگہ' ہر وقت زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور احادیث یہ Condition پوری نہیں کرتیں۔ اس موقف کی تائید میں ہمارے علماء کرام **اطیعوا للہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم** (۴/۵۹)۔ کی مشہور آیت پیش کرتے ہیں' اس آیت کا قرآنی مفہوم سابقہ مضامین میں بار بار واضح کیا جا چکا ہے اور آئندہ بھی حسب ضرورت پیش کر دیا جائے گا۔ اس وقت اس آیت کی تفسیر میں ہمارے علماء کرام سے جو تسامح ہوا ہے' اس کا صرف وہ حصہ پیش کیا جاتا ہے' جس کا اس مضمون سے تعلق ہے۔

اس آیۂ کریمہ کا ترجمہ یقیناً آپ کے ذہن میں ہوگا۔ اگر نہیں ہے تو آپ قرآن کے نسخے سے ملاحظہ فرمالیں۔۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک عملاً اس کا ترجمہ یہ ہے اے ایمان والو' اطاعت کرو قرآن کی' اطاعت کرو احادیث کی اور اپنے میں سے حاکموں کی پھر اگر تمہارا جھگڑا ہو اور اس جھگڑے کو قرآن و حدیث کی طرف موڑ دو۔

اس ترجمہ کے پیش نظر یہ صورت ہوتی ہے کہ اگر راشد اور سلمان کے درمیان آپس میں کوئی تنازعہ پیش آیا' جس کا فیصلہ وہ خود قرآن و حدیث کی رو سے نہیں کر سکے یا اپنے اپنے مفاد کو ترجیح دینے کے باعث' کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ ایسی حالت میں قرآن کریم و کتب احادیث و روایات ان کا فیصلہ نہیں کرا سکیں گی۔ قرآنی حکم کے مطابق وہ اپنا تنازعہ اپنے وقت کے حکام کے پاس لے جائیں گے اس بات کا امکان ہے کہ وہ اس حاکم کے فیصلے پر بھی رضامند نہ ہو سکیں۔ اس صورت میں ہمارے علماء کرام کے موقف کے مطابق وہ اپنا رخ پھر قرآن و حدیث کی طرف کریں گے۔ اس طرح ہمارے علماء کرام ان کو قرآن و حدیث کی طرف دوبارہ لوٹا رہے ہیں۔ حالانکہ وہ نہ حاکم کے پاس جانے سے قبل قرآن و حدیث سے یہ تنازعہ دور کرا سکے تھے اور نہ اب کرا سکیں

گے۔ یہ بات بالکل ظاہر و واضح ہے کہ اس طرح کے تنازعات طے کرانے کے لئے قرآن اور کتب احادیث' بلکہ کوئی قانون (کا مجموعہ) بھی زندہ حکام کے بغیر نہ پہلے فائدہ مند تھا اور نہ اب فائدہ مند ہوسکتا ہے۔ ہمارے علماء کرام کی روایتی تفسیر میں جو اصل Law اور بنیادی خامی ہے وہ یہی ہے کہ جس قانون کے ہوتے ہوئے انہیں اولی الامر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی' اب اولی الامر کے بعد پھر ایسے اشخاص کا فیصلہ اسی قانون سے ٹھہرانا (جس سے وہ پہلے فیصلہ نہیں کرا سکے) بالکل غلط ہے۔ اس Procedure سے تو یہی باور ہوتا ہے کہ وہ دونوں پارٹیاں مسلسل برسرِ پیکار رہیں اور ان کا آخری فیصلہ کر دینے والا کوئی زندہ حاکم نہ ہو۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیۂ کریمہ (۴/۵۹) میں رسول سے مراد کتب روایات نہیں ہوسکتیں بلکہ زندہ رسول مراد ہے اور ان کے بعد ان کے خلفاء و حکمران و جانشین ورنہ اس آیت کا حکم (وفات رسول کے بعد) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔

واللہ علی ما نقول شہید۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خالص قرآنی نظریات کی واحد تحریک

موقر رسالہ طلوع اسلام' قیام پاکستان سے پیشتر شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کے لئے اس رسالہ نے بھرپور کوششیں کیں۔ چونکہ ہمارا مذہبی طبقہ قیام پاکستان کے خلاف تھا' اس لئے مسلم لیگ کی طرف سے یہ رسالہ ہی علماء کے اعتراضات کا جواب دیتا تھا اور انہیں پاکستان کے قیام کی ضرورت پر قرآن وحدیث سے دلائل پیش کرتا تھا۔ چونکہ ہمارے علماء کرام دوقومی نظریہ کے مخالف تھے' اس لئے اس رسالہ نے اس موضوع پر بڑے پُرمغز مضامین شائع کئے۔ اس وقت اس مختلف فیہ نظریہ کا نام ''معرکۂ دین ووطن'' قرار پایا تھا۔ اگرچہ یہ مضامین قبل قیام پاکستان تحریر کئے گئے تھے' لیکن چونکہ یہ مسئلہ ایک استمراری حیثیت کا حامل ہے' اس لئے وہ ٹھوس مضامین آج بھی اسی اہمیت کے حامل ہیں جس قدر وہ اپنے تحریر کئے جانے کے وقت تھے چونکہ قیام پاکستان کے بعد' اب تک بھی ہمارے علماء کرام متحدہ قومیت کے ہی قائل ہیں۔ اس لئے ان مضامین کی افادی حیثیت اب بھی اسی طرح برقرار ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء سے یہ رسالہ کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا' اور اس نے ایک قرآنی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ جس درجہ اِن خالص قرآنی نظریات کی اشاعت ہوئی' اسی درجہ ہماری پیشوائیت کی طرف سے اس کی مخالفت بڑھتی چلی گئی' اس وقت تک تقریباً دو سو کتابیں اس تحریک کے خلاف طبع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بیشتر سطحی معیار کی ہیں' اس تحریک کے خلاف جو غلط الزامات لگائے گئے ہیں' ان کتابوں نے ان پر ہی تبصرہ کیا ہے۔ ان کتابوں کا زیادہ تر زور حجیت حدیث پر رہا۔ کچھ کتابوں نے اس تحریک کے نظریہ ''مرکزِ ملت'' پر بھی محاکمہ کیا اور اس کی تردید کرنی چاہی۔ البتہ اس تحریک کی

تردید میں چند کتابیں علمی انداز کی بھی بلند پایہ علماء نے تحریر کیں' جو ہمارے مذہبی' روایتی طبقہ میں بہت مقبول ہوئیں' لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان تمام کتب کا بالاستیعاب مطالعہ فرمالیں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہماری پیشوائیت اس تحریک کی اصل واساس کی گرفت ہی نہیں کرسکی کیونکہ اس اصل واساس کے خلاف ان کی تمام کتب میں ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کی اصل واساس ہمارے علمائے کرام کے اوپر سے ہی گذر گئی اور اس کی اصل حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔

اس بارے میں ہمارے علماء کرام بھی بے قصور ہی ہیں کیونکہ آپ ایک ہزار سال کا پورا تفسیری وروایتی لٹریچر مطالعہ فرمالیں آپ کو یہ فقرہ یا اس فقرے کا مفہوم یا یہ نظریہ کسی جگہ نہیں ملے گا کہ قرآن کریم کے مطابق ''خدا کی محکومیت اور خدا کی عبادت ایک ہی چیز ہے''۔ اور یہی فقرہ یا اس فقرہ کا مفہوم اس تحریک کی بنیاد اور اصل الاصول ہے۔ اور یہی وہ العروۃ الوثقیٰ ہے جو اس تحریک کا محور ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جو شخص بھی خدا کی عبادت کرنا چاہے' اس کے لئے خدا کی محکومیت اختیار کرنا لازمی ولابدی ہے وہ کسی اور کی محکومیت میں نہیں رہ سکتا۔ وہ جس درجہ خدا کی عبادت زیادہ کرنا چاہے' اس درجہ اسے حکومت خداوندی کی اطاعت کرنی ضروری ہوگی۔ طلوع اسلام کے مطابق تو متقی وہ ہے جو اسلامی حکومت کی اطاعت کرتا ہے' اسلامی حکومت کی اطاعت سے ہی تقویٰ میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی تقویٰ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے انفرادی اطاعت یا انفرادی پرستش کی جڑ بنیاد اکھڑ جاتی ہے اور انفرادی صلوٰۃ (نماز) کی کوئی جگہ نہیں رہتی۔ صلوٰۃ تمکن (۲۲/۴۱) یا صلوٰۃ موقت (۴/۱۰۳) دونوں اسلامی حکومت کے ماتحت قائم ہوتی ہیں۔ پہلے صلوٰۃ تمکن وجود پذیر ہوتی ہے تو اس میں صلوٰۃ موقت قائم ہوتی ہے۔

اس تحریک کا یہ منفرد نظریہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مومن کا فرض ہے کہ وہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ آخری ضابطہ حیات تسلیم کرے اور اس دنیا میں نظام خداوندی کو برپا کرنے کی پوری پوری جدوجہد کرے' وہ جس ملک میں بھی ہو وہاں سے اس کوشش کو

شروع کر دے کیونکہ نظام خداوندی کو برپا کرنا کسی مقام اور کسی زمانہ سے مخصوص نہیں ہے۔ اس کی، پوری پوری کوشش یہی ہونی چاہئے کہ تمام نظامہائے باطل کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ' رب العزۃ' کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کا قانون اور نظام جاری کر دے اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت ہے' جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے تو نہایت ہی ضروری ہے کہ وہ ان کا عطا کردہ نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی اور نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوں وہ اللہ کے نافرمان' مجرم (۶/۱۲۳) ظالم و فاسق (۴/۴۴' ۴/۴۵' ۴/۴۴) ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزہ کے پابند ہوں۔ کیونکہ ان کے اعمال اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوں گے اور وہ آخرت میں بھی خسارہ میں رہ جانے والے ہوں گے (القرآن ۳/۸۵) اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی خوب واضح رہے اور ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ غیر اسلامی حکومت میں جس قدر رزق بھی' معاشرہ کے مقرر کردہ جائز طریقوں سے کمایا جاتا ہے وہ بھی قرآن کریم کی رو سے حرام ہوتا ہے' اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہے کیونکہ قرآن کریم ان ذرائع کو ہی جائز قرار نہیں دیتا۔ ربٰو' ملکیت زمین' کرایہ' مضاربت' بغیر محنت کئے ہوئے سرمایہ پر سرمایہ حاصل کرنا' یہ وہ ذرائع ہیں جو طاغوتی نظام میں جائز ہوتے ہیں' لیکن قرآن کریم کے مطابق یہ تمام ذرائع بذاتِ خود حرام ہیں۔ اس لئے ان ذرائع سے حاصل کردہ آمدنی خود بخود حرام ہو جاتی ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رزق فراہم کر دیا ہے' لیکن اس کی انفرادی تقسیم انسانوں کے ہاتھوں میں نہیں رکھی' کیونکہ طاغوتی نظام میں اس تقسیم سے ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ تقسیمِ رزق ظلم پر مبنی ہوتی ہے۔ جبکہ قرآنی نظام میں یہ ناہمواریاں پیدا نہیں ہوتیں اور وہ نظام ایک ایک فرد کے رزق کا ذمہ دار ہوتا ہے (۶/۱۱' ۶/۱۵۱)۔

عبادت الٰہی کی عملی شکل محکومیت خداوندی قرار دینا...... یہ وہ نادر و منفرد نظریہ ہے کہ جو تحریک طلوع اسلام نے پیش کیا۔ یہ قرآنی نظریہ چونکہ ہمارے ہاں ایک ہزار سال سے نظر انداز کیا ہوا ہے' اس لئے ہماری پیشوائیت بھی اس کی قائل نہیں ہے اور وہ طلوع اسلام کی تحریک میں بھی

اس نظریہ کو Detect نہیں کر سکی اور یہ ان کے سر کے اوپر سے گذر گیا۔ وہ In Between the line پڑھ ہی نہیں سکے۔ کیونکہ اول تو ہمارے علماء کرام اسلامی حکومت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت بھی کی تھی' لیکن حالات کے تھپیڑوں سے مجبور ہو کر جو علماء کرام اسلامی حکومت کے قائل ہوئے بھی' اور جو چند تحریکیں اسلامی حکومت کو قائم کرنے کے لئے پاکستان یا بیرونِ پاکستان اٹھیں' ان سب کے نزدیک اسلامی حکومت کا قیام صرف ایک Luxury ہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام سے جرائم کم ہو جائیں گے' ملک میں امن وامان قائم ہوگا' فحاشی ختم ہو جائے گی' عورتیں پردہ کرنے لگ جائیں گی' مرد بڑی بڑی داڑھیاں رکھ لیں گے' پاجامے ٹخنوں سے اوپر تک ہو جائیں گے' گانا' سینما' Video' T.V پر پابندی لگ جائے گی۔ جبکہ اس کے برخلاف طلوع اسلام کے نزدیک اسلامی حکومت کا قیام ایک Luxury نہیں ہے بلکہ اس کا قیام اس تحریک کی مجبوری' ضرورت اور Requisite ہے۔ کیونکہ اس تحریک کے نزدیک اللہ کی عبادت کرنے کے لئے اس کا قیام ضروری ولازمی ہے۔ آج جبکہ دنیا میں کسی جگہ بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہے' اس تحریک کے نزدیک زمین کے ایک چپہ پر بھی عبادت خداوندی نہیں ہو رہی ہے۔ جبکہ ہمارے علماء کرام کے نزدیک عبادت الٰہی ہو رہی ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک اسلامی حکومت کا قیام کوئی اہمیت نہیں رکھتا یہ محض ایک Luxury ہے۔ جو تحریکیں اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کی داعی بھی ہیں' ان سب کی بھی وہی پوزیشن ہے جو علماء کی ہے۔ وہ بھی علماء یا عامتہ المسلمین سے نظریاتی طور پر بہتر نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ بھی عبادت خداوندی کو اسلامی حکومت کی اطاعت قرار نہیں دیتے' ایران کی اسلامی حکومت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ان کے ہاں بھی عبادت کا انفرادی تصور باقی ہے۔ یہ بات خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ جب تک اور جہاں کہیں بھی عبادت کا انفرادی تصور باقی رہے گا۔ وہاں اسلامی حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اور ہماری پیشوائیت چونکہ انفرادی عبادت کی قائل ہے' اس لئے انہیں اسلامی حکومت کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ طلوع اسلام کے لئے اسلامی حکومت ایک ضروری

Requisite ہے۔اس حکومت کے ہر حکم کی اطاعت عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔(اسلامی حکومت میں) جب آپ کسی چوراہے پر ٹریفک کے سپاہی کے حکم کی اطاعت کریں گے' تو وہ اطاعت عبادتِ خداوندی کے مرادف ہوگی۔ چوراہے کا وہ سپاہی اس اسلامی حکومت کا نمائندہ ہے جو قرآن کریم کے قوانین و احکام نافذ کر رہی ہے' اس لئے اس سپاہی کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت اور عبادتِ الٰہی ہے۔ مذہب میں اطاعت خداوندی کا یہ تصور نہیں ہے۔ یہ خالص دینی تصور ہے۔اور دین صرف اسلام ہے۔باقی سب مذاہب ہیں۔یہ جو ہمارے علماء کرام ادیانِ عالم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور تقابلِ ادیان ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے' تو یہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد' ہمارے علماء کرام انگریز پادریوں سے مناظرے کرتے تھے۔عیسائیت پر اسلام کی فوقیت و برتری کو ثابت کرتے تھے تو یہ بھی ''حدیث بے خبراں'' ہی تھی۔عیسائیت تو خود صرف مذہب ہونے کی مدعی ہے۔وہ دین ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کرتی۔عیسائیت اور اسلام' یا دوسرے الفاظ میں مذہب کا دین سے تقابل کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے ان جلیل القدر علماء کرام کے سامنے خود اسلام بھی صرف مذہب ہی تھا' وہ خود بھی اسلام کو دین نہیں سمجھتے تھے۔

اسلامی حکومت کے قیام کی فرضیت اور اس کے وجوب کے بارے میں کمترین کی کتاب ''روایتی وقرآنی دین کے فاصلے'' طبع ہوئی ہے جو بلا قیمت تقسیم کی جارہی ہے۔اس کتاب میں اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات کو نہایت وضاحت سے قرآنی آیات کے حوالے دے کر تحریر کر دیا گیا ہے۔اس لئے اس مختصر سے مضمون میں ان خصوصیات کے صرف حوالے دیئے جاتے ہیں۔جن حضرات کو اس مضمون سے دلچسپی ہو وہ اس کتاب کو ملاحظہ فرمالیں۔

اسلامی حکومت کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو وعدے اور نتائج اپنے نظام سے برآمد ہونے کے' کئے ہیں' وہ نظام ان وعدوں کو پورا کرتا ہے۔اگر کوئی اسلامی حکومت وہ وعدے پورے نہیں کرتی تو وہ اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔اسلامی حکومت مومنین کو اقتدار و تمکن

عطا کرتی ہے (۲۴/۵۵) ہر ہر فرد کو رزق فراہم کرتی ہے (۶/۱۵۱'۱۱/۶) اس نظام کی وجہ سے مرکز اور مومنین کو غلبہ حاصل ہوتا ہے (۸/۶۳'۲/۵۸) یہ نظام مومنین کو وہ قوت عطا کرتا ہے' کہ دنیا میں مومنین پر کافر کو غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا (۴/۱۴۱)' یہ ساری دنیا کے نگران ہوتے ہیں (۲/۱۴۳)۔

(۲) اس سے بڑا شرف انسان کے تصور میں نہیں آ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس حکومت کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ (۱۷/۸'۱۴/۹)۔

(۳) اس مملکت میں کوئی فرقہ بندی یا پارٹی بازی نہیں ہوتی۔ مرکز سے احکامات جاری ہوں گے پوری قوم ان احکامات کی اطاعت کرے گی۔ اس میں پرسنل لاء اور پرائیویٹ لاء کی تفریق نہیں ہوتی کیونکہ انسان کی پوری زندگی قانون خداوندی کے تابع ہوتی ہے۔

(۴) اس نظام میں لوگوں کی دعائیں' اسلامی حکومت کی معرفت پوری ہوتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ کا مشہور قول ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک پہنچنے سے روکنے کے لئے یہاں بیٹھا ہوں۔ کیونکہ تمہاری ہر دعا میرے خلاف شکایت کے مرادف ہے۔

(۵) اس نظام کی معرفت ہی لوگوں کی غلطیوں کا ازالہ ہوتا ہے' اور اسی نظام کی معرفت توبہ قبول ہوتی ہے (۴/۶۴)۔

تحریک طلوع اسلام کا جو موقف حدیث کے بارے میں ہے۔ ہماری پیشوائیت نے اس کو بھی درست طور پر نہیں سمجھا اور اس کو مزید الجھانے کی کوشش کی اور اس تحریک کو انکار حدیث سے متہم کیا۔ حالانکہ طلوع اسلام نے کبھی حدیث سے انکار نہیں کیا۔ مدتوں اس کے ٹائٹل پیج پر حدیث تحریر کی جاتی تھی' جن حضرات نے طلوع اسلام کنونشن میں شرکت فرمائی ہے وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ کنونشن کے پنڈال میں ایک طرف آیۂ کریمہ اور دوسری طرف حدیث کے بینرز (Banners) آویزاں ہوتے تھے اور ایک بینر پر یہ حدیث شریف تحریر تھی ومن استوی یوماہ' فھو مغبون' جو اپنی درخشندگی سے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ضرور حضورﷺ کا قول ہو گا۔

طلوع اسلام حدیث کا منکر نہیں ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ حدیث جو قرآن کے مطابق ہے وہ درست ہے اور ہمارے سر آنکھوں پر۔ لیکن ہر وہ حدیث جو قرآن کے خلاف ہے وہ قابل قبول نہیں ہے خواہ اسناد کے اعتبار سے وہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ اور ''صحیحین'' میں بھی درج ہو۔ اگر وہ قرآن کے خلاف ہے وہ حدیث درست نہیں ہے۔ تاہم وہ احادیث بھی جو درست بھی ہیں اور قرآن کے مطابق بھی ہیں پھر بھی وہ دحی نہیں ہوتیں' وحی صرف قرآن میں ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے علمائے کرام حدیث کو بھی وحی الٰہی اور قرآن کی مثل قرار دیتے ہیں۔ چونکہ یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے' اس لئے طلوع اسلام اس نظریہ کی تصویب نہیں کرتا' حدیث کو وحی ماننے کا نظریہ امت مسلمہ میں متفق علیہ ہے اور ہزار سال سے مسلمان اسی نظریہ پر قائم ہیں' لیکن افسوس کہ یہ نظریہ بالکل خلاف قرآن ہے۔ ''دحی صرف قرآن میں ہے''۔ یہ نظریہ صرف طلوع اسلام کا ہے مسلمانوں میں کوئی فرقہ بھی اس کا قائل نہیں رہا۔ اس بارے میں راقم سطور کے ۸ مضامین طلوع اسلام میں شائع ہوئے ہیں۔ جن میں آیات قرآنی کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ چونکہ آیات قرآنی کے حوالے ہر جگہ قارئین نہیں دے سکتے' اس لئے چند احباب کے حکم پر اس نظریہ کی تائید میں صرف عقلی دلائل پیش خدمت کئے جاتے ہیں' جن حضرات کو اس مسئلہ میں دلچسپی ہو' وہ طلوع اسلام میں طبع شدہ مضامین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ دحی صرف قرآن میں ہونے کے چند عقلی دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہمارے علماء کرام قرآن کو بھی دحی قرار دیتے ہیں' اور حدیث کو بھی وحی شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں' قرآن وحدیث' دحی ہیں تو حضور ﷺ کے اپنے ذاتی اقوال جو ان کے غور وفکر کا نتیجہ ہوتے تھے وہ کون سے ہیں؟ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے' میرا راستہ یہ ہے کہ میں دلائل کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں (۱۲/۱۰۸)۔ حضور ﷺ جو دلائل دیتے تھے وہ ان کی سوچ کا نتیجہ ہوتے تھے وہ دحی نہیں ہو سکتے تھے لیکن اگر علماء کا یہ متفق علیہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ حدیث بھی وحی ہے' تو حضور ﷺ کا اپنا کوئی قول باقی نہیں رہتا۔

(۲) ہمارئے علمائے کرام رسول اللہ کی اطاعت حدیث کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان کا یہ موقف ہے کہ قرآن سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث سے حضورﷺ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر قرآن و حدیث دونوں وحی ہیں تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک وحی (قرآن) سے تو اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اور دوسری وحی (حدیث) سے رسول اللہ کی اطاعت اگر بقول علماء کرام احادیث بھی وحی ہیں تو ان کی اطاعت سے بھی اللہ ہی کی اطاعت ہوگی رسول اللہ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ پھر علماء کرام کو رسول اللہ کی اطاعت کرنے کا کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا ہوگا۔

(۳) ہمارے علماء کرام سورۃ النجم کی آیۂ کریمہ **وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى** (۴۔۳/۵۳) (ترجمہ) رسول تو اپنی خواہش سے بولتا ہی نہیں یہ تو صرف وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔ سے دلیل دیتے ہیں کہ مطلق نطق رسول وحی ہے۔ اس لئے احادیث جو اقوال رسول ہوتی ہیں وہ سب وحی ہیں لیکن احادیث کے موجودہ ذخیرے بشمول صحاح ستہ حدیث ہی نہیں ہیں۔ یہ تو صرف روایات ہیں۔ ان کو حدیث یا قول رسول کہنا ہی غلط ہے۔ ہمارے علماء کرام خود اس بات کے قائل ہیں کہ احادیث بالمعنی روایت کی گئی ہیں اور یہ الفاظ رسول اللہ کے نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ رواۃ کے ہیں۔ اس کی عملی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک مضمون حضورﷺ نے ارشاد فرما دیا۔ اسی مضمون کو پہلا راوی اپنے الفاظ میں دوسرے راوی کو سنا دیتا (روایت کر دیتا) تھا۔ اسی طرح دوسرا تیسرے کو اور تیسرا چوتھے کو' الفاظ صرف رواہ کے ہوتے تھے۔ جو مضمون کو منتقل کرتے رہتے تھے۔ ان کا حضورﷺ کے قول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ رواۃ کے یہ الفاظ کس طرح وحی ہو سکتے ہیں؟۔ نیز یہ کہ ہر روایت کے شروع میں لکھا جاتا ہے **قال رسول الله** اور اس کے آخر میں ہوتا ہے **او کما قال علیه السلام**' یعنی جیسا بھی حضورﷺ نے فرمایا اس **کما قال علیه السلام** کہنے سے حدیث کا سارا ذخیرہ خود بخود ظنی بن جاتا ہے؟ یہ عقیدہ کہ روایات جو راویوں کے الفاظ ہیں' وحی ہیں اس قدر بودا اور کمزور ہے کہ غور و فکر کی کسوٹی پر ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن حیرت ہے کہ اس نظریہ پر ہمارے علماء کرام ایک ہزار سال سے جم

کے کھڑے ہیں اور کوئی اس عقیدہ کی کمزوری پر توجہ نہیں کرتا۔ برسبیل تنزل اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے کہ ہر نطق رسول (قول رسول) وحی ہے تو یہ روایات تو قولِ رسول یعنی نطق ہی نہیں ہیں۔ یہ تو راویوں کے الفاظ ہیں۔ راویوں کے الفاظ کس طرح وحی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام نے وحی کی اہمیت وقدر کا اندازہ ہی نہیں کیا۔ وَمَا قَدَرُواْ اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ (٦/٩١)۔

(۴) اگر حدیث بھی وحی تھی، تو حضور کا فرض تھا کہ وہ اس کو بھی قرآن کی طرح محفوظ بنا کر امت کو دے کر جاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا رسول اللہ ﷺ نے اس کی حفاظت کا اہتمام فرمایا لیکن احادیث کی حفاظت کا ذمہ نہ تو خدا نے لیا اور نہ ہی کوئی ذخیرہ احادیث کا جمع کر کے، حضور ﷺ نے چھوڑا۔ یہ کام امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ نے انجام دیا اور اس طرح انہوں نے وہ کام سرانجام دیا جو خود حضور ﷺ کو کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا ایک طرح سے وہ کارِ رسالت میں برابر کے شریک دیئے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں قرآن کریم کی تفاسیر جب تحریر ہونی شروع ہوئیں تو اس سے پیشتر اصول تفسیر طے ہی نہیں کیے گئے۔ ہر مفسر نے اپنے مزاج اور عقیدہ کے مطابق تفسیر تحریر کرنی شروع کر دی۔ قرآن کریم نے تفسیر کرنے کے اصول خود بیان فرما دیئے تھے۔ جن سے قرآن فہمی بہت آسان ہو جاتی ہے اور قرآن کریم خود آپ سے بولنے لگتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے مفسرین نے ان اصولوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا اور ان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ہماری تفاسیر میں مشکل سے پانچ فیصد نظریات قرآن کے ہوتے ہیں اور باقی خارج از قرآن نظریات تفاسیر میں داخل کر دیئے گئے ہیں، لیکن طلوع اسلام نے قرآن کی تفسیر خود قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق کر کے، قرآن فہمی کے لئے راستے وا کر دیئے۔ یہ موضوع طویل ہے جو حضرات اس پر غور کرنا چاہیں وہ راقم سطور کی مرتبہ کتاب ''قرآن فہمی کے قرآنی اصول'' ملاحظہ فرما لیں۔ کیونکہ ایک ہی موضوع پر بار بار تحریر کرنے سے قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔

اب مسلمانوں کے سامنے صرف ایک راستہ ہے کہ وہ خالص قرآنی تعلیم پر عمل کرتے

ہوئے دین کا نظام قائم کریں کہ اسی نظام سے ان کا عروج و زوال وابستہ ہے۔ اسی نظام کے ذریعے وہ عبادت خداوندی کر سکتے ہیں اور اسی نظام کے قیام کے بعد وہ حلال کا لقمہ کھا سکتے ہیں ورنہ اس نظام کی عدم موجودگی میں نہ تو وہ اللہ کی عبادت کر سکتے ہیں اور نہ ہی حلال کا لقمہ کھا سکتے ہیں۔ فی الحال ان کا کمایا ہوا ایک ایک لقمہ حرام ہے۔

مسلمانوں کی قسمت یاوری کرتی تو ہمارے علماء کرام اس خالص قرآنی تحریک کی حمایت کرتے اور اس کا دل و جان سے ساتھ دیتے لیکن ہمارے علماء کرام کی تو دنیا ہی نرالی ہے وہ اس کی حمایت تو کیا کرتے ان کی کیفیت تو اس تحریک کی مخالفت میں یہ ہے کہ ؎

سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مباہلہ۔۔دینی و مذہبی نقطۂ نظر سے

کچھ عرصہ سے' لال مسجد' اسلام آباد کے متعلق میڈیا پر مسلسل خبریں آ رہی ہیں۔ اس مسجد کے خطیب اور نائب خطیب' دونوں حضرات کے بیانات اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مشہور انگریزی اخبار ''دی نیوز'' مورخہ 31/05/2007 میں مولوی عبدالعزیز صاحب خطیب مسجد ہذا' کا ایک بیان طبع ہوا ہے جس میں انہوں نے مسجد کے تنازع کے بارے میں چند باتیں کی ہیں۔ منجملہ اور گفتگو کے حضرت اقدس نے یہ بھی فرمایا۔

"and I am ready for Mubahala in this regard"

(ترجمہ) ''اس (مسجد) کے سلسلہ میں میں مباہلہ کے لئے تیار ہوں۔'' یہ اخبار انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے پڑھنے والے زیادہ تر ''جنٹلمین'' حضرات ہوتے ہیں۔ اور ان کی مذہبی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ اس بات کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان حضرات کی اکثریت نے اس خبر کو پڑھا تو ہوگا لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکے ہوں گے کہ اس لفظ سے حضرت اقدس کا کیا مطلب ہے۔ ممکن ہے کہ میڈیا کے اکثر حضرات نے بھی اس لفظ کو پہلی مرتبہ ہی سنا ہو' اور اس اصطلاح سے بالکل ناواقف ہوں۔ یہ رسالہ چونکہ دینی و قرآنی ہے اس لئے اس کو اس مسجد کے موجودہ تنازع سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ البتہ جو گفتگو یا جو امور خلاف قرآن کئے جاتے ہیں' ان پر قرآنی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنا یہ رسالہ ضروری سمجھتا ہے۔ اسی لئے یہ مضمون حاضر خدمت ہے۔

عقل انسانی کی ہر دور کی موجودہ سطح کے مطابق' اور خارجی سہاروں اور پابندیوں کو Impose کئے بغیر قرآن کریم کو تفسیر القرآن بالقرآن کے ذریعے جب سمجھا جاتا ہے' تو یہ

انسانی عقل میں مزید وسعت بھی پیدا کرتا ہے اور دنیا کے اس دور کے مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے لیکن جب آپ اس کو خارجی سہاروں کا پابند کر دیں اور اس کو تفسیر القرآن بالقرآن کے بجائے روایات کا پابند بنا کر روایات کے ذریعے سمجھنا چاہیں' تو آپ کی فکر میں وسعت نہیں ہو سکتی۔ روایات جو آج سے ایک ہزار سال پیشتر جمع کی گئی تھیں' ان کے مطابق جو تفاسیر تحریر کی گئی تھیں' وہ بھی اسی دور کی علمی سطح کے مطابق تھیں۔ آج بھی آپ ان ہی روایات کے ذریعے تفسیر کریں گے' تو وہ تفسیر اسی سابقہ دور کی علمی سطح کے مطابق ہو گی۔ ان تفاسیر کے ذریعے موجودہ دور کے تقاضوں کا حل نہیں مل سکتا۔ نہ تو وہ تفاسیر ہمارے دور سے (متعلق)Relevant ہیں نہ ان میں ہمارے مسائل کا حل ہے۔

ہماری سابقہ تفاسیر میں مباہلہ کا تذکرہ بہت تفصیل سے آتا ہے ان تمام ''مستند'' تفاسیر میں کچھ معمولی جزوی اختلاف سے قطع نظر' سب نے تفصیلات تک میں اتفاق کر کے ایک ہی بات بیان کی ہے۔ یہاں ''مباہلہ'' کے متعلق بہت اختصار سے تحریر کیا جاتا ہے کہ پہلے قارئین کرام اس اصطلاح سے واقف ہو جائیں پھر اس پر تبصرہ پیش کیا جائے گا۔

فتح مکہ کے بعد حضورﷺ نے دعوتِ اسلام کے لئے کچھ وفود ارسال کئے ایک وفد نجران بھی گیا۔ وہاں کے عیسائیوں نے دلائل سنے تو حضورﷺ سے بحث کرنے کا خیال ان کو پیدا ہوا۔ 24 ذی الحجہ 10 ہجری کو ان کا ایک وفد جو چالیس آدمیوں پر مشتمل تھا وارِدِ مدینہ ہوا اور حضورﷺ سے اصرار کیا کہ ہم مناظرہ کریں گے۔ چنانچہ حضورﷺ ان کو کئی روز تک سمجھاتے رہے مگر وہ نہ مانے اور یہ طے پایا کہ مباہلہ کیا جائے۔ مباہلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ہر فریق یہ کہتا ہے کہ اگر میرا حریف اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے تو یا اللہ تو اس پر عذاب نازل کر' جب مباہلہ طے پایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

چنانچہ حضورﷺ مباہلہ کے لئے نکلے اس طرح کہ امام حسنؓ کی انگلی پکڑے ہوئے تھے اور امام حسینؓ کو گود میں لئے ہوئے۔ حضرت فاطمہؓ ان کے پیچھے تھیں اور حضرت علیؓ ان کے پیچھے۔

جب نصاریٰ کے پادری کی نظر ان حضرات پر پڑی تو اس نے اپنے گروہ کو مباہلہ سے منع کیا اور کہا کہ ان سے ہرگز مباہلہ نہ کرنا۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اگر محمد کو اپنی صداقت پر یقین نہ ہوتا تو وہ اپنے کنبے کو ساتھ نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے مباہلہ سے گریز کیا اور جزیہ دینا قبول کرلیا۔

میں نے اس واقعہ کا صرف ملخص تحریر کیا ہے ورنہ ہماری تفاسیر میں یہ بہت طویل و عریض لکھا گیا ہے اور صفحے کے صفحے اس واقعہ کے بارے میں کالے کئے گئے ہیں اور ہماری پیشوائیت کو اس نے اس طرح متاثر کیا ہوا ہے کہ ہمارے تمام علماء اس کے قائل ہیں۔ ماضی قریب میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے مخالف علماء کو بار بار مباہلہ کے لئے للکارا۔ ہمارے دور میں علامہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے اپنے مخالفین کو منٹو پارک میں مباہلہ کی دعوت دی تھی۔ یہ بات بیان کرنے کے لئے کہ تمام علماء کا اس واقعہ پر اتفاق ہے ایک واقعہ تحریر کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا۔

قبل پاکستان حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم علی الترتیب جمعیت العلماء ہند و جمعیت العلماء اسلام سے وابستہ تھے۔ ان میں پہلی جمعیت پاکستان کے خلاف اور دوسری پاکستان کے موافق تھی۔ دونوں حضرات ہندوستان کے نہایت بلند پایہ علماء میں شمار ہوتے تھے لیکن سیاسی مسالک کے اختلاف کی وجہ سے ذاتی تعلقات بھی کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم جو مولانا عثمانی کے حقیقی خواہر زادے تھے لیکن سیاسی طور پر کانگریسی ہونے کی وجہ سے مولانا مدنی کے بہت قریب تھے اور ان کے کیمپ میں شمار ہوتے تھے انہوں نے دونوں حضرات میں مفاہمت کرانے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں سیاسی نوعیت کے جلسے ہوتے رہتے تھے اور سارا ماحول سیاسی ہوتا تھا۔ ہر وقت ہر جگہ سیاسی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ ایک جلسہ سہارنپور (بھارت) میں ہوا جس میں مولانا عثمانی نے مسلم لیگ کی حمایت کی اور پاکستان کے قیام کے موافقت میں دلائل دیے۔ تقریر کے دوران زور خطابت میں مولانا مدنی کو "مباہلہ" کی دعوت دے دی۔ اس واقعہ کی خبر مولانا مدنی کو ہوئی

انہوں نے جمیعت العلماء کا ایک جلسہ اسی مقام پر کرنا طے کیا جس جگہ مولانا عثمانی تقریر کر چکے تھے۔ چنانچہ مولانا مدنی نے تقریر شروع کی اور دورانِ تقریر فرمایا کہ مولانا عثمانی نے اپنی تقریر کے دوران مجھے جو ''مباہلہ'' کا چیلنج دیا ہے تو وہ مجھے منظور ہے۔ میں 'مباہلہ' کے لئے تیار ہوں۔ نیز فرمایا کہ مولانا عثمانی کے تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے وہ 'مباہلہ' میں کس کو لے کر آئیں گے اور واقعہ بھی یہی تھا کہ مولانا عثمانی کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ واقعہ صرف اس وجہ سے تحریر کیا گیا ہے کہ قارئین کرام کو اندازہ ہو سکے کہ ہمارے وہ علماء کرام جو نہایت بلند پایہ تھے اور جن کا شمار نجوم السماء میں ہوتا تھا وہ کس طرح اس غیر قرآنی تصور کے حامل تھے اور اب موجودہ دور کے علماء بھی ان خلاف قرآن عقائد کو مانتے ہیں۔

اب اصل موضوع یعنی اس آیۂ کریمہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس کا شان نزول اختراع کر کے یہ نظریہ بنایا گیا ہے۔ **فمن حاجک فیه من' بعد ما جاء ک من العلم فقل تعالوا ندع ابناء نا و ابناء کم و نساء نا و نساء کم و النفسنا و انفسکم** قف **ثم نبتهل فنجعل لعنة الله علی الکذٰبین** (3/61)۔ پس جو تم سے اس بارے میں حجت کریں اس کے بعد کہ تمہارے پاس صحیح علم آ چکا ہے' تو ان سے کہو کہ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں' تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں' تم اپنی عورتوں کو جمع کرو' ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں' تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو' پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔ (ترجمہ از تدبر قرآن)

آیہ کریمہ اور اس کا ترجمہ آپ ملاحظہ فرمائیں' اس کی بہت مختصر ترین تفسیر شاہ عبدالقادر صاحب کی ''موضح القرآن'' سے دی جاتی ہے کہ یہ مختصر ترین ہے۔

''جب یہ آیت خدا تعالیٰ نے بھیجی' تب حضرت محمد ﷺ نے ان ہی (یعنی نجران) نصاریٰ کے عالموں کو بلا کر فرمایا کہ جتنا میں تمہیں سمجھاتا ہوں اور دلیلیں مضبوط سناتا ہوں تم زیادہ جھگڑتے ہو اور دشمن ہوتے ہو' اب آؤ' ہم تم اس طرح قسم کریں اور جھوٹوں پر لعنت کریں خدا کی' تو سچا اور جھوٹا سب پر معلوم ہو' نصاریٰ کے عالموں نے یہ بات قبول کی اور راضی

ہوئے اور ایک دن ایک مکان مقرر کیا۔ اور دوسرے دن حضرت محمد نے حضرت حسین کو گود میں لیا اور حضرت امام حسن کا ہاتھ پکڑا اور حضرت فاطمہ زہرا کو اپنے پیچھے' اور حضرت مرتضٰی علی کو ان کے پیچھے لے کر چلے اور فرمایا ان سب کو کہ جب میں دعا مانگوں' تو تم چاروں آمین کہیو۔ انہوں نے قبول کیا اور ادھر جو نصاریٰ کے بڑے بڑے عالم آئے اور ان کو دیکھا اور پکارا اپنی قوم کو کہ اے یارو' ان کے مقابلے سے ڈرو۔ جو ہم یہ کئی صورتیں دیکھتے ہیں۔ اگر یہ خدا سے دعا کریں تو پہاڑ زمین سے اکھڑ کر اڑ جائے۔ اگر تم ان سے مقابلہ کرو گے تو ایک نصرانی زمین پر نہیں رہے گا۔ آخر کو صلح اس بات پر ٹھہری جو ہر برس میں دو بار دو ہزار دینار' اور تیس زرہ دیا کریں گے جزیہ۔ یہ بات لکھ کر صلح ٹھہری اور نصاریٰ نے جزیہ دینا قبول کیا اور مقابلہ نہ کیا۔'' (تفسیر موضح القرآن' مطبوعہ لاہور' صفحہ 57)

اس روایتی تفسیر میں چند نکات غور طلب ہیں۔

(1) نصاریٰ کے علماء نے ان مقدس حضرات کے صرف چہرے دیکھ کر ہی یہ اندازہ کر لیا کہ یہ حضرات سچے تھے۔ ان کے نزدیک یہ وہ حضرات تھے کہ ان کی دعا سے پہاڑ بھی زمین سے اکھڑ سکتے تھے لیکن تعجب و تحیر ہے کہ نصاریٰ کے وہ علماء ان حضرات کی اس درجہ عظمت تسلیم کرنے کے باوجود خود مسلمان نہیں ہوئے اور جزیہ دینے پر صلح کر لی اور سال بہ سال وہ یہ جزیہ دیتے رہے جس کی تفاصیل ہماری تفاسیر میں درج ہیں۔

(2) جزیہ کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ 9/29 میں آیا ہے۔ وہاں اس بات کی صراحت ہے کہ جزیہ صرف قتال کے بعد مفتوح لوگوں سے لیا جا سکتا ہے' جزیہ لیا ہی اس لئے جاتا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ مفتوح ہو گئے۔ مثلاً اس دور میں دوسرے ملک کو فتح کرنے کا دستور ہی ختم ہو گیا ہے اب کسی پر بھی جزیہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پاکستان کے قیام کے بعد جو غیر مسلم یہاں آباد ہیں اور جنہوں نے پاکستان کی حکومت کی اطاعت از خود تسلیم کر لی ہے ان پر جزیہ نہیں لگایا جا

سکتا۔ موضوع روایات کے مطابق نجران کے یہ نصاریٰ بھی قرآنِ کریم یا اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور اس پر تحقیق کرنے کے لئے مدینے شریف آئے تھے اگر انہیں اسلام پسند نہیں آیا تو ان پر کوئی مجبوری نہیں تھی کہ وہ جبراً ایمان لائیں۔ وہ قتال کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ ان سے جزیہ کی ادائیگی پر یہ معاملہ کس طرح طے پا گیا۔

(3) یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اللہ اپنی دعوت کے سلسلہ میں دوسروں پر لعنت کریں اور بددعا کریں قرآن نے کہا **لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین** (26/3)' ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا رہا ہے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کسی رسول کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ اپنے مخالفین کے لئے بددعا کرے گا' مقام رسالت کی توہین ہے۔

(4) یہ بھی کوئی مسلمان تسلیم نہیں کر سکتا کہ حضورﷺ اللہ تعالیٰ کا یہ تصور رکھتے تھے کہ اس کی لعنت یا اس کے عذاب کو دعا سے Invoke کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین ایک خاص نظام کے ماتحت چل رہے ہیں۔ بددعا کرنے سے مخالف کو نقصان پہنچانے کا تصور بچوں کا سا تصور ہے بھلا ایسا تصور حضورﷺ کیسے کر سکتے تھے۔

(5) جو بنیادی غلطی ہمارے سب مفسرین کرام نے اس آیۂ کریمہ کے بارے میں کی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ندعوا کا مطلب مندرجہ حضرات کو عملاً جسمانی طور پر کسی خاص مقام میں حاضر کرنا شمار کیا ہے۔ حالانکہ کے دعوۃ میں عملاً کسی کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ** (12/108)۔ (اے رسول) کہہ دو میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ مزید ارشاد ہوتا ہے۔ **ثم انی دعوتھم جھاراً** (71/8)۔ پھر میں نے ان کو بالاعلان بلایا۔ اس قسم کی بے شمار آیات پیش کی جا سکتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دعوۃ میں جسمانی طور پر کسی مقام پر حاضر ہونا ضروری نہیں ہے۔ 'دعوت' کا مفہوم صرف اپنے نظریات کو پیش کرنا' اور ان نظریات پر عمل کرنے کا طریقہ واضح کرنا ہے۔ عملاً کسی کو کسی خاص مقام پر بلانا نہیں ہے' جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں ظاہر کیا گیا ہے۔

(6) اس آیت میں سب سے زیادہ تحیر انگیز بات یہ ہے کہ اس آیت میں جو لفظ نبتھل آیا ہے اس سے مباہلہ کا لفظ بنتا ہی نہیں۔ اس لفظ کا مادہ (ب ہ ل) ہے یعنی بَہَل ہے اس مادہ کو باب افتعال میں لاکر نبتھل ہوتا ہے جو آیت میں استعمال کیا گیا ہے۔ مباہلہ کا لفظ اس باب سے آتا ہی نہیں۔ مباہلہ تو مفاعلہ کے باب سے آتا ہے جس کا اس آیت سے دور دور کا تعلق نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے علماء نے اس آیت سے مباہلہ کا لفظ کس طرح بنالیا۔ ہمارے علماء عربی کے بہت ماہر ہوتے ہیں معلوم نہیں کہ ان کی نگاہ اس طرف کیوں نہیں گئی۔ نظریات میں تو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن عربی قواعد تو سب کو تسلیم کرنے ہوتے ہیں۔

(7) ''مباہلہ'' حق و باطل کا معیار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ مباہلہ کے نتائج فوری طور پر برآمد نہیں ہوتے۔ مباہلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو فریق ایک دوسرے کے لئے بد دعا کرتے ہیں کہ دوسرا فریق جو جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہو اب لعنت کی کوئی واضح شکل مقرر نہیں ہے۔ مباہلہ کرنے والے اس کی عملی شکل یہ قرار دیتے ہیں کہ جھوٹا فریق' سچے فریق سے پہلے فوت ہو جائے گا۔ یہ ان کے نزدیک اللہ کی لعنت کی عملی شکل ہے۔ فرض فرمائیں کہ اگر یہ دوسرا فریق دس سال بعد فوت ہوا' تو دس سال تک جو لوگ گمراہ رہے ان کی گمراہی کو ذمہ دار کون ہے؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا فریق کسی ایسی حالت میں فوت ہو کہ اس سے واضح ثبوت نہ حاصل ہو سکے۔ کوئی وبا پھیل جائے اور ہزاروں آدمی اس میں فوت ہو جائیں اور دوسرا فریق بھی اس میں فوت ہو جائے' تو اس فریق کے حامی یہی کہیں گے کہ یہ بد دعا کی وجہ سے فوت نہیں ہوا بلکہ اس وبا کے اثر سے فوت ہو گیا۔ مذہب میں چونکہ نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے' اس لئے مذہب میں تو مباہلہ چل سکتا ہے لیکن دین میں مباہلہ نہیں چل سکتا۔ اب آپ کے سامنے اس آیت کا دینی مفہوم پیش کیا جائے گا تو یہ بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔

چونکہ قرآن کریم کو سمجھنے کے ملئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو قرآن کریم کے الفاظ کا قرآنی مفہوم اور دوسرے تصریفِ آیات۔ اس لئے پہلے الفاظ کا قرآنی مفہوم پیش کیا جاتا ہے

پھر تصریف آیات کے ذریعے اس کا درست مفہوم۔

'مباہلہ' کا مادہ بَہَلَ ہے۔ اس کے بنیادی معنے آزاد ہونا ہے' یہ لازم و متعدی دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بَہَلَہٗ یا اَبْہَلَہٗ' دونوں کے معنے میں' اسے اس نے چھوڑ دیا۔ آزاد کر دیا۔

اس میں دوسرا قابل غور لفظ لعنت کا ہے۔ لَعَنَ کا لغوی معنے محروم کرنے کے ہیں۔ جب یہ خدا کی طرف منسوب ہوگا' اس کے معنے ہوں گے اللہ کے قانون کی خوشگواریوں سے محروم ہونا۔ ملائکہ کی لعنت کے معنی ہیں کائنات کے قوانین کو مسخر نہ کرنے کی وجہ سے ان کے فوائد سے محروم ہونا۔ کوئی قوم ایتھر کو مسخر نہیں کرتی تو وہ قوم ایتھر کے فوائد حاصل کرنے سے محروم ہے۔ 'الناس' لوگوں کی ملامت (2/161) کا مطلب ہے ان تمام انسانوں کے تعاون سے محروم رہنا جن کو کسی معاملہ میں ان کا ساتھ دینا تھا۔

قرآنِ کریم نے قانونِ مکافات عمل کو دین کی بنیاد کے طور پر پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **اِعملوا علی مکانتکم انی عامل ج فسوف تعلمون لا من تکون له عاقبة الدار ط انه لا یفلح الظلمون** (6/135)۔ (اے رسول) تم ان سے کہدو کہ اے میری قوم تم جو چاہو کرو' میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ پھر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دارِ آخرت کس کے لئے ہے اور ظالم کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اسلام چونکہ مذہب نہیں ہے بلکہ دین ہے۔ مذہب میں نتائج آخرت میں نکلتے ہیں لیکن دین میں نتائج اسی دنیا میں سامنے آتے ہیں۔ حضورﷺ ایک ضابطۂ حیات لائے۔ آپ نے اس ضابطۂ حیات کی صداقت و حقانیت کے دلائل دے کر ثابت کیا کہ اسلام کا ضابطہ حیات بہترین ضابطہ ہے۔ لیکن جب مخالفین نے اس کو عقلی طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو حضورﷺ نے ان کو تجویز فرمایا کہ اب وہ اس ضابطۂ حیات کی صداقت کو اس طرح آزمائیں کہ وہ خود تو اپنے ضابطہ پر عمل کرتے رہیں' اور حضورﷺ کو قرآن کے ضابطہ کے مطابق عمل کرنے دیں۔ نہ تو

مسلمان ان کے ضابطہ میں دخل اندازی کریں گے نہ وہ مسلمانوں کے ضابطہ قانون میں روڑے اٹکائیں (غیتھل)۔ دونوں ضابطے اسلام و جاہلیت کے برابر کام کرتے رہیں۔ کچھ ہی عرصہ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس ضابطہ کے نتائج اچھے برآمد ہوئے اور کون سا ضابطہ اللہ کے قوانین کے خوشگوار نتائج سے محرومؔ ہوتا ہے (لعنت) اور یہ ضابطے اس طرح روبہ عمل لائے جا سکتے ہیں کہ دونوں فریق کے لوگ، اپنے متعلقین، بیوی بچوں سمیت الگ الگ معاشروں میں رہیں۔ پھر ایک دوسرے کو آزاد چھوڑ دیں۔ ایک دوسرے میں دخل نہ دیں۔ نتائج خود بخود سامنے آ جائیں گے۔

اب آپ آیہ کریمہ کا واضح مفہوم، مفہوم القرآن میں درج شدہ ملاحظہ فرمائیں۔

اگر علم و حقیقت کے بعد بھی یہ لوگ یونہی جھگڑتے چلے جائیں تو ان سے کہدو کہ میں اس معاملہ میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتا۔ ایسی صورت میں ہماری روش یہ ہوتی ہے کہ ہم کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو اپنے مردوں اور عورتوں سمیت الگ کر لیتے ہیں (یعنی تنہا میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ میری جماعت کے افراد بھی) تم اسی طرح اپنے لوگوں کو لے کر الگ ہو جاؤ۔ نہ تم ہمارے معاملات میں دخل دو اور نہ ہی ہم تمہارے معاملات میں مخل ہوں۔ ہمارا عملی پروگرام ہے۔ اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ ہم میں سے کون جھوٹا ہے اور کون سچا۔ جھوٹا زندگی کی ان خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گا جو حق و صداقت کی راہ پر چلنے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

(مطالب القرآن، جلد 4، صفحہ 142)

آپ نے ''مباہلہ'' کا مذہبی اور دینی مفہوم ملاحظہ فرمایا۔ مذہبی مفہوم میں تو کسی طرح بھی طے نہیں ہو سکتا کہ کون سچا ہے۔ البتہ دینی مفہوم میں جب دونوں نظاموں کے نتائج اسی دنیا میں برآمد ہوں گے، تو ان نتائج سے ہر شخص خود بخوبی دیکھ سکتا ہے کہ کون سا نظام درست ہے۔

آیت کریمہ کے اس قرآنی مفہوم کے بعد، آپ مرزا قادیانی اور ہمارے علمائے کرام کے مباہلہ کے چیلنج کو ملاحظہ فرمائیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کو چیلنج کرتے تھے۔ لال مسجد کے سیاسی و انتظامی پہلو سے ہمیں کوئی تعرض نہیں۔ البتہ مولانا صاحب نے جو چیلنج دیا ہے اس سے واضح

نہیں کہ حکومت کے کس افسر کو انہوں نے چیلنج کیا۔ کون انہیں بددعا دے اور کس کو یہ بددعا دیں گے۔ اور جو فریق ہار جائے وہ جزیہ کس کو دے۔ اور غلط وصحیح کا فیصلہ کون کرے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شریعت کے نفاذ کا مطالبہ

کب تک کروں میں ضبط آہ' اب
چل رے خامہ بسم اللہ' اب

جس دن سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے بالکل ابتدائی چند سال مستثنٰی کرنے کے بعد پاکستان میں کسی دن بھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ جو حضرات گرامی قدر سن رسیدہ ہیں' وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ پاکستانی معاشرہ بتدریج بد سے بدتر ہی ہوتا چلا گیا۔ یہاں کا نظام نہ فوجی حکومتیں درست کر سکیں اور نہ ہی منتخب حکومتیں۔ بظاہر اس کے دو بڑے بنیادی اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو پاکستان کو مخلص اور قابل لیڈرشپ میسر ہی نہیں آئی۔ اس قسم کے قرآنی مضامین میں شخصیات کی نسبت کچھ لکھنا' یا سابقہ و موجودہ لیڈرشپ کو Pin-Point کرنا' مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قائداعظمؒ کے بعد سے آج تک ہمارے ہاں کوئی شخص بھی ایسا نہیں آیا جو لیڈر کہلانے کا مستحق ہو۔ اردو الفاظ صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں اس لئے انگریزی الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے۔ یہ ہمارے سارے لیڈر صرف Intriguer تھے' یا اگر آپ انہیں زیادہ Concession دینا چاہیں تو ان کو Politician کہہ لیں۔ ان میں سے ایک بھی Statesman نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی Statesman ہوتا' تو وہ سابقہ مشرقی پاکستان کے منطقی نتیجہ کو Anticipate کر لیتا اور اس کو از خود آزادی دے دیتا اور یہ واقعہ فاجعہ پیش ہی نہ آتا۔

دوسری بڑی وجہ پاکستان کے روبہ زوال ہونے کی یہ ہے کہ یہاں آج تک واضح

آئیڈیالوجی تسلیم نہیں کی گئی۔کوئی بھی ملک واضح آئیڈیالوجی کے بغیر نہیں چل سکتا۔ بر سبیل تنزل اگر یہ بات فرض بھی کر لیں کہ واضح آئیڈیالوجی کے نہ ہونے کو کسی نہ کسی طرح Compensate کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں تو دقت یہ ہے کہ بالکل دو متضاد و متناقض نظریات چل رہے ہیں جس کا مشاہدہ روز ٹی وی چینلز کے پروگراموں میں ہوتا ہے۔ملک کا ایک حصہ سیکولر نظام کا حامی ہے جبکہ دوسرا حصہ اسلامی نظام کا داعی ہے۔زیادہ اکثریت جو عوام کہی جاتی ہے وہ کنفیوژن کی شکار ہے۔اسے رزق کمانے اور بچوں کا پیٹ پالنے سے ہی فرصت نہیں ہے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دن گذارنے چاہتی ہے۔ ہمارے ہاں جو حضرات اسلامی نظام کے داعی ہیں وہ تعداد میں کم ہیں لیکن چونکہ وہ تشدد پسند ہیں' اور وہ اپنی اس تشدد پسندی کو حمیت اسلامی کا درجہ دیتے ہیں اس لئے وہ معاشرہ کو روز بروز لاقانونیت کی طرف لے جارہے ہیں۔اس سے بھی زیادہ دقت وافسوس کی بات یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کے طرفداروں کے پاس کوئی واضح تصورات نہیں ہیں اور جو کچھ بھی ہیں' وہ قابل عمل نہیں ہیں' اسی بارے میں چند معروضات وگذارشات' اس مضمون میں جناب کی خدمت عالی میں پیش کی جاتی ہیں۔

اصل یہ ہے کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پیشتر ہندوستان میں ۱۰ کروڑ مسلمانوں میں صرف مسلم لیگ پاکستان کے حصول میں ساعی تھی۔اس کے علاوہ اس وقت کے مسلمانوں میں ملک گیر نوعیت کی صرف پانچ جماعتیں تھیں جو سب کی سب مذہبی تھیں۔خاکسار' احرار' جماعت اسلامی' جمعیت العلماء ہند اور شیعہ پولیٹکل کانفرنس۔یہ ساری جماعتیں مذہبی تھیں اور سب پاکستان کے خلاف تھیں اور آخر تک' جبکہ پاکستان بنا ہے اس وقت تک خلاف رہیں۔ انہوں نے قائداعظم علیہ الرحمتہ کو کافراعظم کہا اور جن صاحب نے قائداعظم کو اس لقب سے نوازا تھا انہوں نے منیر کمیٹی میں جسٹس منیر کے استفسار پر اعتراف کیا کہ انہوں نے ہی قائداعظم کو کافر اعظم کہا تھا اور حیرت ہے کہ وہ پاکستان میں آئے اور یہاں بھی لیڈر رہے۔ ہمارے علماء کرام سب پاکستان کے خلاف تھے سوائے چند بزرگ علماء کے جو جمعیت العلماء ہند کے صدر مولانا

حسین احمد مدنی سے ذاتی اختلافات و پرخاش کی وجہ سے دیوبند چھوڑ کر ڈھابیل چلے گئے تھے اور اسی مخالفت کی وجہ سے وہ پاکستان بننے سے کچھ ہی عرصہ پیشتر لیگ میں آ گئے تھے۔ سیاسی امور میں ہر شخص کو آزادی ہوتی ہے اور سب کو اختیار ہوتا ہے کہ کسی بھی جماعت کا ساتھ دے۔ اس وقت جن عوام مسلمانوں نے لیگ کا ساتھ نہیں دیا' ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ علماء کرام کی مخالفت سے اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ ان کو یہ مخالفت زیب نہیں دیتی تھی۔ ان کو تو اس کا ہراول دستہ ہونا چاہئے تھا۔ ان کی مخالفت کے معنے یہ تھے کہ ان کے سامنے اسلام کا کوئی دینی تصور نہیں تھا اور وہ اسلام کو محض مذہبی سطح تک ہی سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ پاکستان کے قیام کے مخالف تھے۔ یہ مضمون چونکہ سیاسی نوعیت کا نہیں ہے اور نہ ہی اس کا مقصد خدانخواستہ علماء کرام کی تنقیص کرنا ہے' نکتہ جو واضح کرنا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ان حضرات کے سامنے اس وقت بھی مذہب تھا اور آج بھی مذہب ہے۔ وہی درس نظامی وہ اس وقت پڑھتے تھے' وہی درس نظامی یہ آج پڑھ رہے ہیں۔ وہی تفاسیر و احادیث کی کتابیں اس وقت زیر مطالعہ تھیں وہی آج ہیں۔ ہمارے علماء کرام کے سامنے صرف مذہب ہے اور آج یہ اسی مذہب کا بطور دین احیاء کرنا چاہتے ہیں جو ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی لئے ان کے سامنے شریعت کا صحیح تصور نہیں ہے' یہ حضرات شریعت کا دینی و قرآنی مفہوم ہی نہیں سمجھتے۔

پاکستان بننے سے پیشتر مسلم لیگ چونکہ سیاسی ہنگامہ میں مصروف تھی' سخت آزمائش میں مبتلا تھی اور چومکھی لڑائی لڑ رہی تھی' اس لئے پاکستان میں قانون سازی کے موضوع پر کوئی Home Work نہیں کر سکی۔ علماء کرام ویسے ہی قیام پاکستان کے خلاف تھے اور محض مذہب ان کے پیش نگاہ تھا۔ البتہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد تحریک طلوع اسلام اور اس کے محترم قائد و بانی نے دین کے تصور کو اس قدر بلند آواز اور دلائل و براہین سے عام کیا کہ ہمارے علماء کرام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اب موجودہ دور میں سب مذہبی حلقوں میں ہر طرف سے شریعت کے نفاذ کی پکار ہے۔ لیکن دین کا تصور اب بھی ان کے سامنے صحیح صورت میں نہیں ہے۔ دین اور مذہب کے فرق کو چونکہ صرف طلوع اسلام نے واضح کیا ہے اور اس تحریک

سے ہمارے علماء کرام کو نفرت ہے' اس لئے وہ دین کے صحیح تصور تک نہ ابھی آئے ہیں اور نہ کبھی آ سکتے ہیں۔

اب اصل موضوع شریعت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں شریعت دو مختلف معانی میں استعمال کی جاتی ہے۔ ایک معنے میں تو شریعت کا لفظ قرآن کریم نے خود استعمال کیا ہے اور ایک دوسرے معنے میں ہمارے علماء کرام اس کو استعمال کرتے ہیں۔ جو ان کے مذہب کے تصور پر مبنی ہوتا ہے اور جو دین کے خلاف ہے۔ علماء کرام جس معنے میں استعمال کرتے ہیں وہ دینی نہیں ہے بلکہ مذہبی ہے۔ اس مضمون میں شریعت کا دینی مفہوم پیش کیا جائے گا۔

امام راغب اصفہانی نے شریعت کے معنے سیدھا راستہ جو واضح ہو تحریر فرمایا ہے۔ شرعة و منهاجاً (۵/۴۵) ایک دستور اور ایک طریقہ۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ شرعة وہ راستہ ہے جسے قرآن نے بیان کیا ہے اور منہاج وہ ہے جسے سنت نے بیان کیا ہے۔

سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

شرع لکم من الدین ماوصیٰ به نوحاً و الذی اوحینا الیک وما وصینا به ابراهم و موسی و عیسی ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیه کبر علی المشرکین ماتدعوهم الیه (۴۲/۱۳)۔

تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور اسی کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے اور اسی کا ابراہیم اور موسیٰ وعیسیٰ کو بھی حکم دیا تھا (وہ) یہ کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں فرقے نہ بنانا۔ جس دین کی طرف تم مشرکین کی طرف بلاتے ہو وہ ان پر بہت شاق گذرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام انبیاء کرام کو دین دیا گیا تھا لیکن اس دین میں معاشرہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شروع میں انسانی معاشرے بہت سادے ہوتے تھے' اس لئے

انہیں دین میں ہدایات بھی بہت کم ملتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ انسانی معاشرے Sophisticated ہوتے چلے گئے تو اس کے پیش نظر' دین میں بھی ہدایات کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جو ہدایات' تعلیم' مستقل اقدار' تمام انبیاء کرام کو مسلسل دمتواتر ملتی رہیں' وہ دین تھا اور اس دین میں وقت کے تقاضوں کے مطابق جن جزئیات میں اضافہ وتبدیلیاں ہوتی گئیں وہ شریعت کے لفظ سے تعبیر کی گئی ہیں۔ مشہور ومعروف تفسیر' تدبر قرآن' میں اس بارے میں تحریر ہے:

> ''جہاں تک دین کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظواہر ورسوم ہر امت کے لئے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ مقرر فرمائے ہیں۔''
> (جلد دوم' ص ۵۳۵)۔

اللہ کا دین شروع سے اسلام ہے۔ ان الدین عنداللہ الاسلام۔ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ اسی دین کی تعلیم ابراہیم' موسیٰ وعیسیٰ کو بھی دی گئی تھی اور اسی دین کی تلقین تمہیں کی جارہی ہے۔ اس آیہ کریمہ میں حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ کے اسماء گرامی درمیان میں لائے گئے ہیں اور شروع میں حضرت نوحؑ اور حضورؐ کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ سب انبیاء کرام کو ایک ہی دین دیا گیا ہے' اس کے عقائد' اس کی اساسات شروع سے آخر تک بالکل ایک ہی ہیں۔ البتہ جزئیات شریعت میں فرق ہوا ہے جس کو قرآن کریم نے شرعۃ ومنہاجاً کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے' حضرت ابن عباسؓ نے اس کو قرآن وسنت کے راستوں سے تشبیہہ دی ہے۔ واضح رہے کہ جو چیز دین کے طور پر مستقل' متواتر اور دائمی حیثیت سے رہی ہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ: **ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ' کبر علی المشرکین ماتدعوھم الیہ** (۴۲/۱۳)۔ رہی ہے یعنی یہ کہ ہمیشہ دین کو قائم رکھو' اور اس میں فرقہ نہ بنانا' اور یہ کہ جس دین کی طرف تم مشرکین کو بلاتے ہو' وہ ان پر بہت شاق گذرتا ہے۔ قرآن کریم نے شریعت کے لفظ کو جن معنے میں استعمال کیا ہے' اس کی وضاحت پیش خدمت کی گئی ہے۔

اس کے برخلاف ہمارے علماء کرام کے نزدیک شریعت وہ قوانین ہیں جو بنو عباس کے دور میں بنائے گئے تھے اور آج تک نسلاً بعد نسلاً ہمارے پر مسلط چلے آ رہے ہیں۔

ہمارے علماء کرام کا شدید اصرار ہے کہ ان قوانین کو من وعن جاری کر دیا جائے۔ کچھ عرصہ سے ہمارے صوبے سرحد میں اس کا مطالبہ زیادہ زور سے کیا جارہا ہے اور چند روز سے 'لال مسجد اسلام آباد سے بھی اس کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق انہوں نے اپنی شرعی عدالتیں قائم بھی کر دی ہیں' جو سابقہ شریعت کے مطابق فیصلے جاری کریں گی۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کے نزدیک صرف حدود جاری کرنے سے ریاست اسلامی ہو جاتی ہے۔ ان کے اس غلط تصور کا سبب یہ ہے کہ ان کے ایک ہزار سال کے لٹریچر میں کہیں انہیں دین کے قیام کی نہ ہدایات ملتی ہیں اور نہ ہی اس کی Definition۔ ہمارے علماء کرام اسلامی ریاست کی جو Definition کرتے ہیں' وہ قرآنی اعتبار سے اسلامی ریاست نہیں ہوتی۔ اسی لئے لال مسجد' اسلام آباد' کی شرعی عدالتوں میں جو مقدمات آئیں گے' تو وہ اس کے فیصلے سابقہ شریعت وفقہ کے ذریعے ہی کریں گے۔ حدود یا معمولی تنازعات کے فیصلے تو یہ علماء کرام و مفتیان ذوی الاحترام کر دیں گے لیکن مثلاً جو تنازعات مالی امور سے متعلق ہوں گے' وہ یہ حضرات نہیں کرسکیں گے۔ قرآن کریم میں جو آیات میراث کے متعلق ہیں' ان میں ریاضی کی معمولی سی Involvement ہوتی ہے' ایک سو مولویوں میں سے شاید ہی ایک مولوی میراث کے تنازعہ کو سمجھ سکتا ہے کیونکہ ان حضرات کو تو پانچ سے آگے کے Tables (پہاڑے) ہی زبانی یاد نہیں ہوتے اسی ماہ ۴ اپریل کو اخبار اطلاعات کے مطابق' کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی (cii) نے زنا بالجبر اور زنا بالرضا کو الگ الگ کر دیا ہے اس سے پہلے تو شرع شریف میں ان دونوں جرائم میں کوئی امتیاز ہی نہیں تھا جس کی وجہ سے سخت Confusion تھا۔ اگر کوئی خاتون مفتی صاحبان سے یہ شکایت کرے کہ میرا شوہر میری مرضی کے خلاف مجھ سے زبردستی فریضۂ زوجیت کرنا چاہتا ہے' تو میں اس کے لئے آمادہ نہیں ہوں اور میرے خیال میں یہ Rape ہے آپ اس کو Rape کی سزا دیں۔ تو کیا یہ

حضرات اس کو Rape قرار دے دیں گے۔ جن کے ہاں Rape اور Adultery میں بھی فرق نہیں ہے۔ اس قسم کے فیصلے ان کے بس کی بات نہیں۔ نیست این کار فقیہاں اے پسر۔

اب شریعت کا دینی مفہوم پیش خدمت عالی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم٥ فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول (۴/۵۹)۔

اے ایمان والو خدا کی اطاعت اور رسول کی اور جو تم میں سے صاحبانِ حکومت ہوں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس کو اللہ ورسول کی طرف پھیر دو۔

آیہ کریمہ آپ نے ملاحظہ فرمائی' اس آیہ کریمہ کی تشریح اس سے پیشتر کئی مرتبہ کی گئی' لیکن یہ آیہ کریمہ اس قدر جامع ہے کہ مختلف Angles سے اس آیت کی تشریح میں نئے نئے نکات سامنے آتے ہیں مثلاً کوئی شخص ایک فیکٹری لاہور سے چند میل کے فاصلہ پر لگانا چاہتا ہے۔ اس فیکٹری سے اس قسم کی گندگی (Polution) صادر ہوتی ہے جس سے وہاں کی مقامی آبادی کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ وہاں کی آبادی' اپنے مقامی حکام (اولی الامر) کی طرف رجوع کرتی ہے۔ مقامی حکام ماحولیات کے محکمہ سے رائے طلب کرتے ہیں۔ یہ محکمہ رائے دیتا ہے کہ لاہور سے ۵۰ میل کے فاصلے تک اس قسم کی فیکٹری نہ لگائی جائے۔ اسلامی حکومت کے افسران (اولی الامر) ماحولیات کے مشورہ کے مطابق یہ حکم جاری کر دیتے ہیں۔ اب ہر شہری اس حکم کی اطاعت کرے گا۔ اس اسلامی حکومت کا یہ حکم اس کی شریعت ہوگا اور اس کی اطاعت' عبادت خداوندی ہو گی اور آئندہ کی اسلامی حکومتوں کے لئے یہ (Precedent) سنت کا درجہ رکھے گا۔

(۲) چند لوگوں نے بچوں کے لئے سکول جاری کئے اور آہستہ آہستہ تعلیم کو ذریعۂ آمدنی بنا لیا اور تمام سکولوں کی فیس اس درجہ زیادہ ہوگئی کہ بچوں کو تعلیم دلوانا مشکل ہو گیا۔ لوگوں نے مل کر' اس بارے میں احتجاج کیا اور اپنے مقامی حکام (اولی الامر) سے شکایت کی۔ مقامی حکام نے غور

وخوض کیا اور ایک خاص رقم فیس کی مقرر کر دی اور انہیں حکام نے سارے تعلیمی اداروں کو ہدایات جاری کر دیں کہ بچوں کی فیس کی یہ شرح مقرر کر دی گئی ہے۔ یہ حکم اسلامی حکومت کی شریعت ہے اور اس کی اطاعت سے اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔

(۳) کاروں اور موٹروں کی کثرت کے باعث ہوا میں حد درجہ گندگی (Pollution) پیدا ہو گئی۔ عوام کی صحت اس سے متاثر ہونی شروع ہو گئی' لیکن کسی بھی شہری نے اس کی شکایت نہیں کی۔ حکام نے خود اس صورت حال کا جائزہ لیا اور یہ پالیسی Frame کی کہ آئندہ کاروں میں ڈیزل کی بجائے پیٹرول آئل استعمال کیا جائے۔ اس پالیسی کے مطابق احکامات جاری کر دیئے گئے' یہ احکامات اسلامی حکومت کی شریعت قرار دی جائے گی اور اس کی اطاعت اللہ کی عبادت ہو گی۔

ارشاد ہوتا ہے:

واذاجاء ھم امر من الامن اوالخوف اذاعوابه ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منھم لعلمه الذين يستنبطونه منھم (۴/۸۴)۔

اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی خبر آئی تو اسے فوراً مشہور کر دیتے ہیں' حالانکہ اگر وہ اس خبر کو رسول یا ایمان والوں میں سے صاحبانِ حکومت تک پہنچا دیتے تو بے شک جو لوگ ان میں سے تحقیق کرنے والے ہیں (رسول یا اولی الامر) اس کو سمجھ لیتے۔

اس آیہ کریمہ میں قرآن کریم کے سیاسی نظام کی اہمیت' اور اس کی عملی تشکیل کو واضح کیا جا رہا ہے اور ہدایت کی جا رہی ہے کہ امن وخوف کی خبروں کو خود عوام میں پھیلانا جائز نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی نفع ونقصان کے معاملات اولی الامر تک پہنچائے جائیں اور اولی الامر پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت حکام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مملکت' حکومت کو چلانے کی اتنی اہلیت رکھتے ہوں کہ وہ درپیش آنے والے تمام معاملات میں قانون (شریعت) کے تقاضوں کے مطابق قدم

اٹھا سکیں۔

فرض کیجئے کسی جگہ بم دھماکے کا خطرہ ہے اور لوگوں میں اس کے متعلق افواہیں گرم ہیں کہ فلاں جلوس میں کوئی گروہ بم دھماکا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو اس صورت میں عوام پر ضروری ہے کہ وہ اپنے مقامی حکام (اولی الامر) کو اس کی اطلاع کریں۔ وہ حکام جلوس و جلسہ کے انتظامات کے لئے جو قوانین واحکام بنائیں وہ احکام ہی اس حکومت کی شریعت ہیں۔

ان دو آیات کریمات اور چند پیش کردہ امثلہ سے جناب پر واضح ہو گیا ہو گا کہ ہر اسلامی حکومت کے قوانین و احکام ہی اس حکومت کی شریعت ہوتے ہیں۔ سابقہ حکومتوں کے احکامات' جو گذشتہ ادوار میں جاری کئے گئے تھے' ان کی اطاعت ہم پر فرض نہیں ہے' ہم پر قرآن کریم کی رو سے' ہمارے اپنے دور کے اولی الامر کی اطاعت کرنا فرض ہے۔ اگر بالفرض سابقہ اولی الامر کا نظریہ کسی معاملہ میں مختلف ہے اور وہ اسلامی فقہ میں مستند طور پر چلا آ رہا ہے اور ہمارے دور کی اسلامی حکومت کے اولی الامر کا فیصلہ اس کے خلاف ہے تو ہمیں اپنے دور کے اولی الامر کی اطاعت کرنی لازم ہو گی۔ چور کی ایک خاص Definition ہونی ضروری ہے۔ کوئی شخص اگر کسی کا قلم لے جائے تو وہ حد کا مستوجب نہیں ہو گا۔ سابقہ حکومتوں نے چور کی جو تعریف کی ہے ہم اس کے پابند نہیں ہوں گے۔ ہمارے دور کے اولی الامر جس مالیت کی چوری کو چوری قرار دیں گے ہم اس کی اطاعت کریں گے ایک ہی وقت میں دو اسلامی مملکتوں کی شریعتیں مختلف ہو سکتی ہیں کیونکہ دو ملکوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے شریعتیں بھی مختلف ہوں گی' لیکن ان میں بنیادی باتوں و شرائط میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

(۱) صرف قرآن اسلامی شریعت کا ماخذ ہوتا ہے۔ اوپر تحریر کردہ آیہ کریمہ ۴/۵۹ نے واضح کر دیا ہے کہ اگر تمہارا جھگڑا ہو تو اللہ و رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس آیہ کریمہ سے اجماع و قیاس جو ہمارے ہاں ادلہ اربعہ میں شمار ہوتے ہیں' ان کی تردید ہو گئی۔ اس آیہ کریمہ نے صرف اللہ و رسول کو قانون کا ماخذ قرار دیا ہے۔ اللہ و رسول کی اصطلاح کی بار بار سابقہ مضامین میں وضاحت

پیش خدمت کی جا چکی ہے کہ اس سے اسلامی حکومت کا سربراہ مراد ہوتا ہے جس کو حکم ہے: **وما اختلفتم فیہ من شئی فحکمہ الی اللہ** (۴۲/۱۰)' "تمہارا جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔" اس لئے اسلامی حکومت کی شریعت کا ماخذ صرف قرآن ہوتا ہے۔

(۲) اسلامی شریعت اور اسلامی حکومت کی فقہ کی شرط ہے کہ: **ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیہ** دین کو قائم کرو اور اس میں فرقہ بندی نہ کرو۔ ہمارے موجودہ مستند شرائع و فقہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جعفری' حنفی فقہ الگ الگ ہیں۔ ہمارے علماء کرام خود فرقہ بندی کے قائل ہیں۔ فرقہ بندی اور دین کا قیام ایک دوسرے کے نقیض و متضاد ہیں جو دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

(۳) اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ یہ تفریق مذہب میں ہوتی ہے۔ دین میں نہیں۔

(۴) اسلامی حکومت میں کونسل آف اسلامی آئیڈیالوجی' شرعی عدالتیں' محکمہ زکوٰۃ و عشر' محکمہ اوقاف وغیرہ نہیں ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کا قیام کوئی معمولی یا چند روز کا کام نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس کو **ایام اللہ** اور **فک رقبۃ** سے تشبیہ دی ہے۔ نیز فرمایا: **واقاموا الصلوٰۃ و امرھم شوریٰ بینھم** (۴۲/۳۸)۔ وہ پہلے اقامت صلوٰۃ کریں گے یعنی قرآن کریم کا نظام قائم کریں گے تب اس کے بعد اس نظام میں ان کے تمام امور باہمی مشورہ سے طے ہوں گے۔ نظام صلوٰۃ کو قائم کرنے' اور اس کو جاری رکھنے' اس کو چلانے' اور اس سے اللہ تعالیٰ کے قرآنی وعدوں کو عملاً پورا کرنے کے لئے جو باہمی مشورے کئے جائیں' اور جب ان باہمی مشوروں کو عملاً نافذ کیا جائے' تو وہ اسلامی شریعت کہلاتی ہے۔

حکومتیں خواہ سیکولر ہوں' یا مولوی صاحبان کی تھیوکریسی ان کا مطمح نگاہ عوام کو رزق فراہم کرنا' بنیادی سہولتیں مہیا کرنا' ہوتا ہے لیکن یہ سطح زندگی' حیوانی سطح کی ہے۔ یہ سب حکومتیں انسانی

زندگی کے معیار تک جاتی ہی نہیں ہیں۔ یہ تمام مسائل تو انسان اور حیوان کے مشترکہ مسائل ہیں' جو دنیاوی حکومتیں پورے کر دیتی ہیں لیکن اسلامی حکومت صرف ان مسائل کو حل نہیں کرتی وہ اس سے بہت آگے لے جاتی ہے۔ اسلامی حکومت تو ان مسائل کا حل پیش کرتی ہے' جن کا تعلق خالص انسانیت سے ہوتا ہے۔ صرف اسلامی حکومت میں ہی انسانیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ انسانیت کی نشوونما بہ مجموعی ہوتی ہے۔ یہ طولاً یا عرضاً تقسیم نہیں ہو سکتی' اس کا Level پوری انسانیت کا مجموعی طور پر بلند ہوتا ہے۔ سابقہ' خلاف قرآن' شرعی قوانین کو' لال مسجد اسلام آباد' کی شرعی عدالتوں سے جاری کرنے سے' اسلامی حکومت نہیں بن جاتی۔

چونکہ قرآنی حکومت یا قیام دین کا نظریہ ہی طلوع اسلام کا پیش کردہ ہے' اس لئے اس بارے میں مکمل راہنمائی بھی اس تحریک کے لٹریچر سے ہی مل سکتی ہے ورنہ ہمارے علماء کرام کے ایک ہزار سال کے لٹریچر میں' اس موضوع پر ایک سطر بھی' تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکے گی۔ لیکن قوم کی بدقسمتی کہ مولوی حضرات طلوع اسلام سے راہنمائی حاصل کرنے کو آمادہ نہیں ہیں' اس لئے یہ اس مقصد (قیام دین) میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

فستذکرون ما اقول لکم (۴۴/۴۰)۔

عنقریب تم یاد کرو گے جو میں تم سے کہتا ہوں۔

☆☆☆